ماہنامہ ضیائے حرم کا
فاروق اعظم نمبر
جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری
مرتبین
ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

ماہنامہ ضیائے حرم لاہور

فاروق اعظمؓ نمبر

مرتبین ○

○- پیر محمد کرم شاہ الازہری

○- خواجہ عابد نظامی

نام کتاب : فاروقِ اعظم نمبر (ماہنامہ ضیائے حرم لاہور)

مرتبین : پیر محمد کرم شاہ الازہری سجادہ نشین بھیرہ شریف
خواجہ عابد نظامی

ہدیہ :

ناشر : ادارہ ضیائے حرم بھیرہ شریف ضلع سرگودھا

سرورق : یوسف مثالی

ملنے کا پتہ

دفتر ماہنامہ ضیائے حرم
بھیرہ شریف ضلع سرگودھا

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ۔ لاہور

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

سرِ دلبراں

ضیائے حرم کا یہ شمارہ

فاروقِ اعظم نمبر ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا

کون فاروقِ اعظم؟

وہ جسے اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول نے اپنے ربِ کریم سے دامنِ دعا پھیلا کر مانگا تھا۔

جس کے مشرف باسلام ہونے سے کفر و شرک کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔

باطل کے صنمکدوں میں کہرام مچ گیا تھا۔

اسلام کی بے بسی کا دور ختم ہو گیا تھا اور اس کی شوکت و سطوت کے عہد کا آغاز ہوا تھا۔

جو اپنے مرشدِ کریم کی نگاہِ لطف و کرم کا تارا تھا۔

جسے آغوشِ نبوت نے بڑے اہتمام اور ناز سے پالا تھا۔

جس کی زبان سے حق گویا تھا۔

جس کے دلِ روشن پر انوارِ الٰہی کا پیہم نزول ہوا کرتا تھا۔

جس کا سینہ علومِ محمدیہ علیٰ صاحبہا افضل الصلوٰۃ والتسلیم سے معمور تھا۔

جس کی چشمِ بصیرت مستقبل کے دھندلکوں میں مستور حقائق کو بے حجاب دیکھ لیا کرتی تھی۔

جس کا نامِ نامی آج بھی عدل و انصاف، دیانت و امانت، حق گوئی و بیباکی جرأتِ استقامت کا جلی اور زیبا عنوان بن کر چمک رہا ہے۔

اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے جس کے ادب و نیاز نے عشق کو نیا ذوقِ جمال بخشا تھا۔

جس کے فہمِ رسا اور دانشِ نورانی نے جہانِ عقل و خرد کو نئی شادابی اور تازگی ارزانی فرمائی تھی۔

جس کے دُرّے کی ہیبت سے باطل ہر وقت لرزہ براندام رہتا تھا۔

جس کے پیوند لگے لباس کے رُعب سے شاہانِ عالم پر کپکپی طاری رہتی تھی۔

جس گلی سے وہ گزرتا تھا وہاں سے ابلیس بھاگ جاتا تھا۔

جس کی وسیع و عریض سلطنت میں کوئی بھوکا نہیں سوتا تھا۔

جس کی رعایا رات کو آرام کرتی تھی اور وہ خود راتوں کو جاگ جاگ کر پہرہ دیا کرتا تھا۔

جس کی درویشی اور فقرِ غیور نے انسانوں کو عزتِ نفس اور خود داری کا درس دیا تھا۔

حق گوئی و بیباکی جس کی سرشت تھی۔ وُہ خُود بھی حق گو تھا اور دوسروں کی حق گوئی سے خوش ہوتا تھا۔

وُہ فاروقِ اعظم! جس کے بارے میں مفکرِ اسلام فیلسوفِ مشرق نے وادیٔ بطحا کے نخلستان کو مخاطب کرتے ہوئے بصد حسرت کہا: ؂

اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر

برنخیزد از تو فارُوقے دِگر

ہاں وہی فارُوقِ اعظم! رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

لیکن صد حیف! اس کی قوم اس کو بھولتی جا رہی ہے، اس سے دُور ہوتی جارہی ہے۔ اس کے قدموں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنانے کے بجائے اِس منبعِ نور کی تابانیوں

کی تاب نہ لاکر اِس سے منہ موڑ رہی ہے۔

جس نسل کو خود پرستی کی شراب پلائی گئی ہے۔ وہ اِس خدا پرست اور خود آگاہ کی عظمتوں کا ادراک کیسے کرسکتی ہے۔

عیش کوشی اور سہل انگاری سے نڈھال مسافر اس برق رفتار راہبر کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

دُنیا کی عفونتوں پر مکھیوں کی طرح گرنے والے لوگ، عقاب کی پرکشائی کی قدر واقعی نہیں کر سکتے۔

فسق و فجور کے اندھیاروں میں بھٹکنے والے وادئ ایمن کا راستہ بھُول چکے ہیں۔

بےعملی کی افیون سے اونگھنے والے، ان سدرہ نشینوں سے نفرت نہیں کریں گے تو کیا پیار کریں گے؟

لذت کام و دھن کے اسیران چھنے آٹے کی خشک روٹی کھانے والے فاروق کو پسند کریں؟ ناممکن۔

وہ تو آج اس سے پیار کریں گے جو انہیں بے راہروی کا راستہ دکھائے۔

وہ تو آج اس کو اپنا مرشد بنائیں گے جو انہیں شریعت کی پابندیوں سے آزاد کردے۔

وہ تو آج اسے لیڈر بنائیں گے جو انہیں جب تک وہ ..... بیدار رہیں، رقص و سرود میں مست رکھے جب وُہ سو جائیں تو انہیں غفلت کی میٹھی نیند کے مزے خوب لوٹنے دے۔

زندگی کی بلند چوٹیوں کو سر کرنا تو اب ان کے بس کا روگ نہیں وہ تو اب اس کو اپنا راہنما تسلیم کریں گے جو انہیں پستی کی طرف آسانی سے پھسلنے کا گر بتائے خواہ وہ پستی ذلت و نکبت کی پستی کیوں نہ ہو۔ تدبر و دور اندیشی اب فرسُودہ الفاظ ہیں۔ ان نازک مزاجوں کو ان سے ذہنی غلامی کی بو آتی ہے۔

نظم و ضبط سے اب ان کے دل اکتا چکے ہیں۔ سنجیدہ، باوقار اور پرعزم قیادت کی اب انہیں ضرورت نہیں انہیں ہر میدان میں دینی ہو یا سیاسی، اخلاقی ہو یا معاشی شعبدہ بازوں کی ضرورت ہے۔ جو انہیں زندگی کے تلخ حقائق سے غافل رکھنے میں مہارت رکھتے

ہوں۔

ہمارے نوجوان جس ڈگر پر چل رہے ہیں۔ کیا ہم انہیں چلنے دیں ؟

اس خوف سے کہ وہ برہم و برافروختہ نہ ہو جائیں انہیں خودکشی کے اس راستہ سے نہ روکیں؟

نہیں میرے دوستو ! ہم ایسا نہیں کر سکتے !

یہ بلوریں جام جس میں زہرِ قاتل گھول دیا گیا ہے اور جسے تم فرطِ شوق سے اپنے لبوں کے قریب لے جا رہے ہو۔ ہم دیکھیں اور مہر بلب رہیں !

نہیں میرے دوستو ! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔

ریشم کے رنگین تاگوں سے بنا ہُوا یہ نظر فریب جال جس کی طرف تم لپکتے جا رہے ہو۔ ہم جانیں بھی اور خاموش رہیں۔

نہیں میرے دوستو ! ہم ایسا نہیں کر سکتے !

ضیائے حرم ایسا نہیں کر سکتا۔

ہمارا ایمان ہے کہ یہ اُمت بزمِ عالم کی شمع فروزاں ہے۔

یہ بجھ گئی تو سارا جہان بے نُور ہو جائے گا۔

ہمارا یقین ہے کہ یہ اُمت گلشنِ حیات کے لیے موسم بہار ہے۔

اگر یہ بیت گیا تو سارا گلشن بے کیف ہو جائے گا۔ عنادل اُداس ہو جائیں گے۔

یہ نوجوان، انسانیت کے قافلہ کے راہنما ہیں۔ اگر یہ بھٹک گئے تو ساری انسانیت ضلالت و گمراہی کی دلدل میں پھنس کر رہ جائے گی۔

اس لیے ضیائے حرم، ناسازگار حالات میں، ان تند و تیز آندھیوں میں اپنا فرض ادا کرنا چاہتا ہے۔

"ضیائے حرم" اپنی کمسنی ہوشربا گرانی اور گوناگوں کمزوریوں کے باوصف اپنی ملت کے سلیم الفطرت نوجوانوں کی خدمت میں بصد عقیدت و خلوص، بہزار محبت و پیار "فاروق اعظم" نمبر کا یہ گلدستہ پیش کر رہا ہے۔

ع برگِ سبز است تحفۂ درویش

آؤ! اس نادرۂ روزگار ہستی کو اسلام کے دشمنوں کی نگاہ سے نہ دیکھیں، کیونکہ عقلمند ایسا نہیں کیا کرتے بلکہ رحمت للعالمین، امام الاوّلین و الآخرین، خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگاہِ حقیقت شناس سے دیکھیں۔

قرآن کریم کی وہ صدہا آیات جن میں مومنین، مہاجرین، مجاہدین اور شہداء کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے، حضرت فاروق اعظم ان تمام تعریفوں اور توصیفوں کے بدرجۂ اولیٰ مستحق ہیں۔ آپ ایمان لائے، ہجرت بھی کی، جانی اور مالی جہاد میں بھی پیش پیش رہے اور جامِ شہادت بھی نوش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جن پاکبازوں اور جاں نثاروں کے بارے میں اولئک ھم المومنون حقاً (وہی لوگ سچے مومن ہیں) کی شہادت دی ہو اور جنہیں بارگاہِ خداوندِ ذو الجلال سے لقد رضی اللہ عن المؤمنین کا مژدہ جانفزا سنایا گیا ہو، ان کی عظمتِ شان اور رفعتِ منزلت کے اظہار کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں ان صفحات میں ان ارشادات کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو سرورِ عالم، شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زبان حق ترجمان سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمائے تاکہ قارئین کرام کو پتہ چل جائے کہ جس باغبان نے یہ پودا لگایا تھا اُس کا اس کے بارے میں کیا خیال تھا، جس اُستاد نے اس کی تربیت کی تھی اسے اپنے اِس شاگردِ رشید پر کتنا ناز اور فخر تھا، جس مرشدِ کامل نے اپنی نگاہِ فیض سے اپنے اس مریدِ باصفا کا تزکیۂ قلب ونظر کیا تھا۔ اس کی اس کے بارے میں کیا رائے تھی۔

حضرت فاروق کے متعلق اگر کسی خفتہ بخت کو اپنے اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی منظور نہ ہو اور رحمتِ دوعالم کی گواہی بھی اسے قبول نہ ہو تو وہ اچھی طرح جان لے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی اُس کی ضرورت نہیں، حضور علیہ السلام کو بھی اس کی پرواہ نہیں اس کے شبانہ روز واویلا سے سپہرِ ایمان وحکمت کا یہ تابندہ آفتاب گہنا نہیں جائے گا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت کا آغاز فرمایا تو مکہ کے مشرکین نے ایک طوفان برپا کر دیا، وہی زبانیں جو پہلے مدح کے پھول

نچھاور کیا کرتی تھیں، وہ اب طعن و تشنیع کے تیر برسانے لگیں۔ وہ نگاہیں جو فرطِ عقیدت سے راہوں میں بچھی جاتی تھیں ان سے غیظ و غضب کے شعلے لپکنے لگے۔ صلۂ رحمی، قرابت داری کے سارے رشتے ٹوٹ گئے۔ جور و جفا، اور ظلم و ستم کے ایک کربناک دور کا آغاز ہو گیا۔
مٹھی بھر مسلمان جو نعمتِ ایمان سے مالا مال ہوئے تھے۔ وہ اہل مکہ کی اجتماعی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے گھر میں عبادت کیا کرتا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام اکثر دار ارقم میں تشریف فرما ہوتے اور جان نثار غلام وہیں شرفِ دیدار سے مشرف ہوتے۔
اگرچہ حضور پر ایمان لانے والے سب مخلص تھے۔ اور اپنے محبوب کے ادنیٰ اشارہ پر فرعونوں سے ٹکرا جانے کے لیے تیار تھے، لیکن رحمتِ عالم علیہ الصّلوٰۃ والسلام اپنے ان مخلص ساتھیوں کو بلاوجہ اور قبل از وقت غیر ضروری آزمائش میں مبتلا کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔ آئے روز کفار کی زیادتیاں بڑھتی ہی جاتی تھیں۔
حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہٗ کہتے ہیں۔
کان رسول اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم اذا رای عمر بن الخطاب او ابا جہل بن ھشام قال اللھم اشدد دینک باحبھما الیک (طبقات ابن سعد)
یعنی جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عمر بن خطاب یا ابوجہل کو دیکھتے اپنے مولا کریم کے حضور میں دعا کرتے اے اللہ! ان دونوں میں سے جو تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اس سے اپنے دین کو قوت عطا فرما۔
حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے بارگاہِ الٰہی میں التجا کی۔
اللھم اعز الاسلام بعمر اے اللہ! اسلام کو عمر سے عزت عطا فرما!
دوسری روایت میں ہے۔ اللھم اید الدین بعمر بن خطاب! اے اللہ عمر بن خطاب سے اپنے دین کی مدد فرما (مستدرک)
اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے دل سے نکلی ہوئی دعا کو قبول فرمایا اور قبولیتِ دعا کی یہ کمند ایک روز عمر کو کشاں کشاں لے آئی اور اسے دارِ ارقم کے دروازہ پر لا کھڑا کیا۔

جہاں اللہ تعالیٰ کا حبیب اپنے غلاموں کے ساتھ تشریف فرما تھا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ دروازہ پر عمر کھڑا ہے اور گلے میں ننگی تلوار حمائل کیے ہے۔ تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اپنا دامنِ دعا بارگاہِ خداوندِ ذوالجلال میں پھیلا دیا اور عرض کی :۔

اللھم ھذا عمر بن الخطاب۔ اللھم اعز الدین بعمر بن خطاب ! (ابن سعد)

الٰہی یہ عمر دروازہ پر کھڑا ہے، میرے مالک عمر کو مشرف باسلام کر اور اس کے مسلمان ہونے سے اپنے دین کو عزت بخش۔

ادھر زبانِ مصطفوی سے یہ جملہ نکلا ادھر اللہ تعالیٰ نے عمر کے دل کو نورِ ایمان سے منوّر کر دیا۔ عمر بلا اختیار پکار اٹھے۔

اشھد انک رسول اللہ اے اپنے خون کے پیاسوں کے لیے ہدایت کی دعا مانگنے والے) میں گواہی دیتا ہوں کہ تو اللہ تعالیٰ کا سچا رسول ہے۔

مرشدِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عمر کو اپنے پاس بٹھایا، اپنا دستِ فیض بخش تین مرتبہ ان کے سینہ پر پھیرا اور دعا کی۔ اللھم اُخرُج مَا فِی صَدرِہٖ مِن غِلٍ وَ اَبدلہ ایمانًا یقول ذلک ثلاثا (مستدرک)

الٰہی اس کے سینہ میں جو غل وغش ہے اس کو نکال دے اور اس کے بدلے اس کو نورِ ایمان سے پُر کر دے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی قسمت پر جتنا ناز کریں کم ہے یہ سعادت ان کے بغیر اور کس کو نصیب ہوئی۔ نبی پاک نے دامنِ دعا پھیلا پھیلا کر اپنے رب سے ان کے لیے سوال کیا اور اس لیے اس کو اپنے رب سے مانگا کہ اس کے اسلام لانے سے دین کو عزت و قوت نصیب ہو۔ پھر اپنے پاس بٹھا کر ان کے سینے پر بار بار ہاتھ پھیرا اس کی ہر غل و غش سے اور ہر نوع کی کدورت سے پاک صاف کر دیا اور اس کے پہلو میں ایمان کی شمع فروزاں کر دی۔

حضرت عمر کے اسلام لانے سے تمام صحابہ نے فرطِ مسرت سے بڑے جوش و خروش سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے جن سے بطحا کی وادی گونج اٹھی۔ آج صرف نبیٔ رحمت ہی

خوش وخرم نہ تھے، صرف صحابہ ہی مسرور نہ تھے بلکہ عالمِ بالا سے بھی تہنیت کے پیغام آرہے تھے۔

حضرت ابنِ عباس فرماتے ہیں:۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلّم لما اسلم عمر اتانی جبرائیل فقال استبشر اھل السماء باسلام عمر (مستدرک) ۔(ابنِ سعد)

یعنی حضور نے فرمایا جب عمر مسلمان ہوئے تو جبرئیل میرے پاس آئے اور انہوں نے بتایا کہ عمر کے مشرف باسلام ہونے سے آسمان میں بھی خوشیاں منائی جارہی ہیں۔

جس مقصد کے لیے حضور نے دعائیں مانگی تھیں، جن کے راہِ راست پر آنے سے زمین و آسمان کے اہلِ حق شاداں و فرحاں تھے۔ اس کا نتیجہ فوراً رُونما ہوگیا۔ حضرت عبداللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ کا ارشاد ہے۔

واللّٰہ ما استطعنا ان نصلّی عند الکعبۃ ظاھرین حتیٰ اسلم عمر (مستدرک) ۔

بخدا ہم کعبہ کے پاس کھلے بندوں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عمر اسلام لائے۔

حضرت صہیب بن سنان سے مروی ہے۔

کان لما اسلم عمر ظھر الاسلام ودُعی الیہ علانیۃ و جلسنا حول البیت حلقًا وطفنا بالبیت و انتصفنا ممن غلظ علینا ۔

جب حضرت عمر اسلام لائے تو اسلام کو غلبہ نصیب ہوا۔ اس کی تبلیغ اعلانیہ شروع ہوئی۔ ہم حلقے باندھ کر کعبہ کے اردگرد بیٹھنے لگے، بیت اللّٰہ کا طواف کرنے لگے۔ اب جو ہم پر زیادتی کرتا ہم اس سے بدلہ لینے کے قابل ہوگئے۔

حضرت عبداللّٰہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے۔

کان اسلام عمر فتحا وکانت ھجرتہ نصرا وکانت امارتہ رحمۃ لقد رأیتنا ما نستطیع ان نصلّی بالبیت حتی اسلم عمر ولما اسلم عمر قاتلھم حتی ترکونا فصلّینا ۔ (ابن سعد)

یعنی حضرت عمر کا اسلام لانا ہمارے لیے فتح مبین تھی آپ کی ہجرت ہمارے لیے نصرتِ الٰہی تھی۔ آپ کی خلافت سراپا رحمت تھی۔ میں نے وہ دن دیکھے ہیں جب ہم بیت اللہ شریف کے نزدیک نماز ادا نہیں کر سکتے تھے اور جب حضرت عمرؓ مشرف باسلام ہوئے تو آپ نے کفار سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ انہوں نے ہمیں نماز پڑھنے کی آزادی دے دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیبت و جلالت سے صرف مکہ کے مشرکوں کا ہی زہرہ آب آب نہ تھا بلکہ ابلیس لعین بھی آپ سے لرزہ براندام رہا کرتا تھا۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کے کتاب المناقب میں ایک حدیث روایت کی ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

وقال رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم۔ ایھایا ابن الخطاب والذی نفسی بیدہ۔ مالقیک الشیطان سالکاً فجاً قط الاسلک فجاً غیر فجک۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابن خطاب! اس ذات پاک کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے شیطان جس راہ پر آپ کو گزرتے ہوئے پاتا ہے وہ اس راستہ سے ہٹ جاتا ہے اور کسی دوسری راہ پر چلنے لگتا ہے کیا شان ہے عمر کی! کیا جلال خداداد ہے فاروق اعظم کا کہ شیطان اس کے سایہ سے بھاگتا ہے جس راہ پر آپ کا نقش پا ثبت ہو ابلیس کی مجال نہیں کہ ادھر کا رُخ کر سکے۔

اے عمر آپ پر ہزاروں ہزار رحمتیں ہوں، تیری سطوت وجلال سے شیطان کے چیلے ہی نہیں، باطل کے پرستار ہی نہیں خود شیطان اور سارا باطل تھر تھر کانپ رہا ہے۔

حضرت ایوب بن موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر وقلبہ وھو الفاروق۔ فرق اللہ بین الحق والباطل (ابن سعد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان پر جاری کر دیا ہے اور اس کے دل میں ثبت کر دیا ہے وہ فاروق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ حق و باطل میں تفریق کر دی ہے۔

اسی ارشادِ گرامی کے ہم معنی ایک حدیث حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

ملاحظہ فرمائیے۔

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال مر فتی علی عمر فقال عمر نعم الفتیٰ۔ قال فتبعہ ابو ذر فقال یا اخی استغفر لی فقال یا ابا ذر استغفر لک وانت صاحب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم قال استغفر لی قال لا او تخبرنی قال انک مررت علی عمر رضی اللہ عنہ فقال نعم الفتی وانی سمعت رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقول ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر وقلبہ (مستدرک)

ترجمہ:۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظم کے پاس سے ایک نوجوان گزرا۔ آپ نے فرمایا۔ بڑا پاکباز جوان ہے۔ ابوذر اس کے پیچھے گئے اور اسے کہا اے بھائی! میرے لیے مغفرت کی دعا مانگو اس نوجوان نے کہا اے ابوذر! کیا میں آپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگو حالانکہ آپ صحابی ہیں۔ ابوذر نے پھر کہا میرے لیے مغفرت کی دعا مانگو اس نے کہا کہ جب تک آپ اس کی وجہ نہیں بتائیں گے میں دعا نہیں مانگوں گا حضرت ابوذر نے کہا کہ جب تم حضرت عمر فاروق کے قریب سے گزرے تو آپ نے تیرے متعلق کہا بڑا پاکباز جوان ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ حضور نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان اور دل پر حق جاری کر دیا۔ یہ حق گوئی اور حق فہمی اس علم و عرفان کا طبعی ثمر تھا جس کے سمندر آپ کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہے تھے فاروقی علوم و معارف کا سرچشمہ وہ علم لدنی تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد بیکراں مرحمت فرمایا تھا۔

حضرت امام بخاری اپنی صحیح کے کتاب المناقب میں روایت کرتے ہیں۔

اخبرنی حمزۃ عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم قال بینا انا نائم شربت یعنی اللبن حتی انظر الی الری یجری فی ظفری او فی اظفاری ثم ناولت عمر فقالوا فما اولتہ قال العلم۔

ترجمہ :

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا حالتِ خواب میں میں نے دودھ پیا یہاں تک کہ اس سے خوب سیراب ہو گیا اور اس کی سیرابی کے آثار میرے ناخنوں میں نمایاں ہونے لگے پھر میں نے وہ دودھ حضرت عمر کو دے دیا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے فرمایا۔ علم۔

سبحان اللہ حضرت فاروق کا علم، علم نبوت کا فیضان ہے جس میں جہالت غلط فہمی شک و ارتیاب کا ادنیٰ واہمہ تک بھی نہیں ہو سکتا وہ نور ہی نور ہے وہ یقین ہی یقین ہے۔

ویسے بھی اگر کوئی خواب دیکھے کہ وہ دُودھ پی رہا ہے تو اس کی تعبیر علم سے کی جاتی ہے یہاں دودھ دینے والا کوئی فرشتہ نہیں، کوئی عام انسان نہیں، کوئی ولی نہیں، کوئی دوسرا نبی اور رسُول نہیں بلکہ سید الانبیاء فخر رسل دانائے سبل، مولائے کل محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس واطہر ہے۔ حضور اپنے دستِ بابرکت سے عمر کو دودھ پلا رہے ہیں۔ ویسے ہی نہیں بلکہ اپنا جھوٹا دودھ، اپنے لبِ لعلین سے مشرف کر کے اپنے لعابِ دھن کی آمیزش کے بعد۔

اس ایک ارشادِ رسالت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم کے علم وفضل کا کیا پایہ ہے۔ آپ کی حق گوئی اور حقیقت شناسی اسی بحرِ علم کا فیضانِ عمیم ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام علوم ومعارف کا شہر ہیں حضرت فاروقِ اعظم اسی شہر کا ایک بارونق محلہ ہیں، جس طرح اس شہرِ علم کا دروازہ سیدنا علی ہیں اسی طرح اس محلہ کا دروازہ بھی علی مرتضیٰ ہیں نیز جس لعاب دھن نے حضرت علی کی دکھتی آنکھوں کو شفا بخشی اسی لعاب دھن نے اس دُودھ میں آمیز ہو کر حضرت فاروق کے دیدۂ دل کو شفا بخش دی اور اسے بینا کر دیا۔

اسی نورِ بصیرت کے باعث جو حضور کی برکت سے فاروقِ اعظم کو نصیب ہوا تھا۔ رسول مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے متعلق یہ کلماتِ طیبات ارشاد فرمائے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم لقد کان فیما قبلکم من الامم محدثون فان یک فی امتی احد فانہ عمر

اس حدیث کا ترجمہ پڑھنے سے پہلے محدثون کا مفہوم ذہن نشین فرما لیجیے۔ اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر فتح الباری میں رقمطراز ہیں۔

المحدّث الملہم وھو من اُلقی فی روعہ شیئ من قبل الملاء الاعلیٰ ومن یجری الصواب علی لسانہ بغیر قصد۔

یعنی جس طرف من جانب اللہ الہام کیا جائے، عالم بالا سے جس کے دل میں حقائق کا القا کیا جائے بغیر ارادہ اور قصد کے جس کی زبان حق کی ترجمان بن جائے یعنی اس کی زبان سے جو نکلے وہ حق اور سچ ہو۔

اب حدیث کا لفظی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے جو امتیں گزر چکی ہیں ان میں محدث ہوا کرتے تھے (جن کی زبان حق کی ترجمان ہوا کرتی تھی)، اور میری اُمت میں اگر کوئی محدث ہے تو وہ عمر ہے۔

گویا نگاہ فاروق کے سامنے سے تمام حجابات الٹ دیئے گئے تھے حقائق و اسرار آپ کے سامنے آشکارا تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی ہر تدبیر ہم آہنگ تقدیر تھی، جو قدم اُٹھا راست سمت میں جو کام کیا انجام کو پہنچا۔ ہر منصوبہ کامیاب رہا۔ آپ کے لشکر نے جدھر کا رُخ کیا فتح و ظفر نے قدم چومے ہیں۔ دنیا کا کوئی فاتح، کوئی جرنیل، کوئی جہانبان کوئی تاجدار جو کسی پہلو سے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بوریہ نشین درویش کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ نہ اس کے مرشدِ کامل کا کوئی مثیل ہے اور نہ اس مرید باصفا کی کوئی نظیر۔

محبوب رب العالمین کا ایک قول ملاحظہ فرمائیے یہ بھی امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بینا انا نائم رایت الناس عرضوا علی وعلیھم قمص فمنھا ما یبلغ الثدی ومنھا ما یبلغ دون ذلک وعرض علی عمر وعلیہ

قمیص اجتر قالوا فما اولتہ یا رسول اللہ قال الدین۔

ترجمہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اس اثنا میں سویا ہوا تھا، میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ میرے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں اور انہوں نے قمیصیں پہنی ہوئی ہیں، کسی کی قمیص سینہ تک ہے اور کسی کی اس سے نیچے حضرت عمر کو بھی مجھ پر پیش کیا گیا۔ انہوں نے ایسی فراخ اور لمبی قمیص پہنی ہوئی تھی کہ وہ زمین پر گھسٹتی جاتی تھی صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ اس خواب کی کیا تعبیر ہے؟ آپ نے فرمایا ہ دین بارگاہ رسالت سے آپ کو جو ان گنت نعمتیں اور برکتیں ارزانی ہوئی تھیں، جس نورِ علم و عرفان سے آپ کو نوازا گیا تھا۔ دین و ایمان کی جو خلعتِ فاخرہ آپ کو پہنائی گئی تھی۔ آپ کے قلب مزکی پر عالم بالا سے جن تجلیات کا ہر لحظہ نزول ہونا رہتا تھا۔ انہی کے پیشِ نظر رحمتِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا۔

لو کان بعدی نبی لکان عمر

اگر میرے بعد کسی نبی کا آنا ممکن ہوتا تو وہ عمر ہوتا

معلوم ہوا کہ آپ تکمیلِ انسانیت کے اس ارفع مقام پر فائز تھے جس سے آگے نبوت کا مقام ہے خاتم الانبیاء کے تشریف لانے کے بعد اب وہاں رسائی ناممکن ہے۔ جب حضرت فاروق اعظم جیسی ہمہ صفت موصوف شخصیت نبوت کے حریمِ قدس میں قدم نہیں رکھ سکتی تو کون ہے جو اس کی تمنا کر سکے۔

ایک دفعہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ رسالت پناہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہو کر عمرہ کرنے کی اجازت طلب کی تو اس بندہ نواز آقا نے ارشاد فرمایا۔

یا اخی اشرکنا فی صالح دعائک ولا تنسنا

اے میرے بھائی! اپنی نیک دعاؤں میں ہمیں بھی شریک کرنا اور ہمیں فراموش نہ کرنا

حضرت عمر اکثر فرمایا کرتے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یا اخی (اے میرے بھائی)

فرمانا میرے نزدیک دنیا بھر کی عزتوں سے زیادہ سرمایۂ افتخار ہے۔

جس فرخندہ بخت کو نبیٔ مکرم نے اپنے رب سے مانگ کر لیا ہو، جس کے مشرف باسلام ہونے سے اسلامی شوکت کے دور کا آغاز ہوا ہو، جس کو مصطفیٰ کریم نے علوم لدنیہ سے سیراب کیا ہو۔ اس کے انجام کے بارے میں شک وشبہ کی کہاں گنجائش ہو سکتی ہے لیکن مختلف مواقع پر بڑے دلربا انداز میں نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کا نام لے کر بڑی صراحت سے آپ کے جنتی ہونے اور بارگاہ رب العزت میں بلند درجات پر فائز ہونے کی روح پرور بشارتیں دیں۔ آپ بھی پڑھیے اور اسلام کے اس مایۂ ناز فرزند کی جلالتِ شان کا اندازہ لگائیے۔

عن ابی الاشہب ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رای علی عمر قمیصا فقال اجدید ام لبیس فقال لا بل لبیس فقال البس جدیدا وعش حمیدا او توفی شہیدا ولیعطیک اللہ قرۃ عین الدنیا والآخرۃ۔ (ابن سعد)

ترجمہ

ابوالاشہب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، ایک روز حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو ایک قمیص پہنے دیکھا۔ دریافت فرمایا کیا یہ نئی قمیص ہے۔ یا مستعمل عرض کیا نہیں میرے آقا! یہ مستعمل ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا اے عمر! نئی قمیص پہنو۔ تم قابلِ تعریف زندگی بسر کرو گے۔ تمہیں شرفِ شہادت بخشا جائے گا اور (اے میرے دورلیش) تجھے اللہ تعالیٰ وہ دیگا جس سے دنیا و آخرت میں تیری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں نقل کرتے ہیں:۔

عن ابی موسیٰ قال کنت مع النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فی حائط من حیطان المدینۃ فجاء رجل فاستفتح وقال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم افتح لہ وبشرہ بالجنۃ ففتحت لہ فاذا ھو ابوبکر فبشرتہ بما قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فحمد اللہ ثم جاء رجل فاستفتح

فقال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم افتح لہٗ وبشرہٗ بالجنۃ ففتحت لہٗ فاذا ھو عمر۔ فاخبرتہ بما قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فحمد اللہ ثم استفتح رجل فقال لی افتح لہٗ وبشرہ بالجنۃ علی بلوی تصیبہٗ فاذا عثمان فاخبرتہٗ بما قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ وسلم فحمد اللہ ثم قال واللہ المستعان (بخاری شریف)

ترجمہ

حضرت ابوموسیٰ فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبّہ کے باغات میں سے ایک باغ میں مَیں حضور کی خدمت میں حاضر تھا۔ باہر سے ایک آدمی آیا اس نے دروازہ پر دستک دی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے حکم دیا جاؤ اس کے لیے دروازہ کھولو اور اسے جنت کی بشارت دو۔ میں نے دروازہ کھولا وہاں ابوبکر کھڑے تھے۔ حضور کے ارشاد کے مطابق میں نے انہیں بشارت دی اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔ ان کے بعد ایک اور آدمی آیا، اس نے دروازے پر دستک دی۔ حضور نے فرمایا اس کے لیے دروازہ کھولو اور اسے جنت کی خوشخبری دو۔ مَیں نے دروازہ کھولا تو وہاں حضرت عمر کو کھڑا پایا۔ میں نے حضور کے ارشاد کے مطابق خوشخبری دی۔ انہوں نے بھی سُن کر اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔ اس کے بعد ایک اور شخص نے دستک دی پھر حضور نے مجھے حکم دیا کہ اس کے لیے دروازہ کھولو۔ اسے جنت کی خوشخبری دو لیکن اسے آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ میں نے دروازہ کھولا تو حضرت عثمان کو کھڑا پایا رسول مکرم کا ارشادِ گرامی میں نے انہیں سُنایا اُنہوں نے سُن کر اللہ تعالیٰ کی حمد کی پھر کہا واللہ المستعان آزمائش کی ان گھڑیوں میں اللہ تعالیٰ میرا مددگار ہو۔

بخاری شریف کی ایک اور ایمان پرور حدیث سماعت فرمایئے۔

حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ ایک دفعہ حضور سرورِ عالم نبی مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جبل اُحد پر تشریف لے گئے حضور کی معیت میں ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ

عنہم بھی تھے (جلالِ نبوت کی تاب نہ لاکر) احد کا پہاڑ لرزنے لگا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے قدمِ مبارک سے اس کو ٹھوکر ماری اور فرمایا "اثبت احد۔ ما علیک الا نبی او صدیق او شھید۔ اے اُحد! ٹھہر جا تجھ پر اس وقت نبی، صدیق یا شہید کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

آپ کو یقین تھا کہ نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے شہادت کی جو بشارتیں انہیں دی ہیں وہ ضرور پوری ہوں گی لیکن آپ کو اس کے علاوہ ایک اور آرزو بے چین رکھا کرتی اس لیے آپ اکثر بارگاہِ الٰہی میں یہ التجا کیا کرتے۔

اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک وموتا فی بلد حبیبک

الٰہی! مجھے اپنی راہ میں شہادت بھی عطا فرما نیز مجھے موت آئے تو تیرے حبیب کے اس پیارے شہر میں آئے۔

آپ کی یہ دعا بھی منظور ہوئی۔ آپ کو شہادت کا تاج پہنایا گیا اور یہ تاجپوشی آپ کی تمنا کے مطابق مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ رحمتِ الٰہی نے اس کے لیے مسجد نبوی کی وہ متبرک جگہ منتخب فرمائی جو اس کے محبوب کے سجدوں سے معزز و محترم تھی اور اس وقت یہ انعام بخشا گیا۔ جب آپ صبح کی نماز کی امامت کرا رہے تھے۔ زبان اس کے کلامِ مقدس کی تلاوت سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور دل اس کے عشق اور محبت سے سرشار تھا۔ پھر ابدی آرامگاہ نصیب ہوئی تو اپنے مرشد، اپنے مربی، اپنے نبی اور اپنے رب کے حبیب و محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں۔

یہ ہے وہ فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ وارضاہ عنا، جس کی خدمتِ عالیہ میں یہ گلدستہ عقیدت و محبت بصد خلوص اور بہزار نیاز پیش کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے ضیائے حرم کو مرحمت فرمائی۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ رحمۃ للعلمین وعلی خلفائے الراشدین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

عمرؓ بن الخطاب

اسلام سے پہلے

تحریر:۔ قاضی عبدالنبی کوکب

عمرؓ بن الخطاب تقریباً تیس برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے جب انہوں نے اسلام قبول کیا(1) اور دربار رسالت سے "الفاروق" کا خطاب حاصل کر کے تاریخ کی فقید المثال شخصیات میں داخل ہو گئے۔ قبول اسلام سے بعد کے "الفاروق" کی زندگی اپنی تفصیلات سمیت' آئینۂ تاریخ میں پوری تابانی سے جگمگا رہی ہے مگر قبل اسلام کے "عمر بن الخطاب" کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں' حتیٰ کہ تاریخ اور مورخین ایک عجیب تشنگی محسوس کر کے رہ جاتے ہیں۔

شبلی نعمانی کی تالیف "الفاروق" اس موضوع پر اردو میں لکھی جانے والی کتب میں اب تک عظیم اور ممتاز کتاب ہے اس میں شبلی شکایت کرتے ہیں:

"ان کی (فاروق اعظم کی) ولادت اور بچپن کے حالات بالکل نامعلوم ہیں..... ان کے سن رشد کے حالات بھی بہت کم معلوم ہیں اور کیونکر معلوم ہوتے' اس وقت کس کو خیال تھا کہ یہ نوجوان آگے چل کر فاروق

اعظم ہونے والا ہے(2)۔"

شبلی کی "الفاروق" کے بعد، محمد حسین ہیکل (مصری) کی تالیف "الفاروق عمر" ایک بلند پایہ کتاب ہے جو اپنے موضوع پر تمام پیشتر تصانیف سے آگے بڑھ گئی ہے، اس میں دور جاہلیت کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے عمر بن خطاب کے عہد جوانی کا ایک خاکہ، تاریخ اور تخیل دونوں کی مدد سے مرتب کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ:

"اگر قاری، ما قبل شباب کا خاکہ تلاش کرنا چاہے تو تاریخ کی قدیم و جدید کتب اس کی خاطر خواہ مدد نہیں کریں گی۔"(3)

اس تشنگی کے سلسلے میں، سب سے بڑھ کر عجیب و غریب بات طنطاوی نے کہی ہے، وہ اپنی عربی تالیف عمر بن خطاب میں رقم طراز ہیں:

"حضرت عمر پینسٹھ سال زندہ رہے، آپ کی زندگی کا نصف حصہ گمنامی میں گزرا، عمر کے اس حصے میں ان کی نہ کوئی شہرت تھی اور نہ وہ کسی بزرگی کے حامل تھے، آدھی زندگی عظمت کی روشنی میں گزری جبکہ وہ ایک بزرگ ترین ہستی اور نادر روزگار شخصیت تھے۔ نقطہء انقلاب وہ لمحہ تھا جبکہ انہوں نے اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد رسول الله پڑھا۔ درحقیقت عمر اسی گھڑی پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کی تاریخی زندگی کا آغاز ہوا۔"(4)

اسی بیان میں طنطاوی نے یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت عمر کے خاندان میں سفارت اور منافرہ کے جو مناصب پائے جاتے تھے وہ بس برائے نام عہدے ہی تھے، قریش کے مخصوص حالات میں ان عہدوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ حضرت عمر کے والد خطاب کے بارے میں طنطاوی یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ کوئی ممتاز یا بڑے آدمی نہ تھے بس وہ ایک سخت گیر انسان تھے۔(5)

طنطاوی کے محولہ بالا خیالات میں سے یہ حصہ بالکل درست اور قابل تسلیم ہے کہ حضرت عمر کو اسلام ہی کی قوت نے عظمت فاروقی کے مقام رفیع تک پہنچایا۔ مگر طنطاوی کی یہ بات واقعات اور تاریخی منطق کے اعتبار سے سخت محل غور ہے کہ عمر کی شخصیت اور ان کے خاندان کو دور جاہلیت میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ حدیث اور تاریخ کی مستند کتابوں میں ہمیں رسول اکرم ﷺ کی ایک دعا ملتی ہے جس میں ابوالحکم (ابوجہل) بن ہشام اور عمر بن خطاب کا مشترک ذکر کرتے ہوئے خدائے تعالیٰ سے یہ مانگا گیا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک شخص مشرف بہ اسلام ہو جائے۔ دعائے نبوی کے الفاظ یہ ہیں:

"اللھم اعز الاسلام باحد الرجلین اما ابن ھشام و اما عمر بن الخطاب" (6)

(اے اللہ! ان دونوں میں سے کسی ایک کے ذریعے 'یا ابن ھشام اور یا عمر ابن الخطلب کے ذریعے اسلام کو عزت و قوت بہم پہنچا)۔

محمد حسین ہیکل نے اس دعا کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے: **اللھم اید الاسلام بابی الحکم بن ھشام و بعمر بن الخطاب"** (7)

(اے خداوند من! ہشام کے بیٹے ابوالحکم (ابوجہل) یا خطاب کے بیٹے عمر کے ذریعے سے اسلام کی تائید فرما)۔

دعائے نبوی سے یہ بات عیاں طور پر معلوم ہوتی ہے کہ زمانہ ء جاہلیت میں عمر بن خطاب اور ابوجہل کی حیثیت و اہمیت قریب قریب ایک جیسی تھی تبھی تو یہ فرمایا گیا ہے کہ ان دونوں میں سے جس کسی کو بھی حلقہ بگوش اسلام بنا دیا گیا وہ اسلام کے لئے قوت و عظمت کا ایک نیا دور ثابت ہو گا۔ اس حقیقت کو بھی فرمودات نبوی میں واضح فرمایا گیا ہے کہ زمانہ ما قبل اسلام (دور جاہلیت) میں جو شخصیات' عظمت انسانی کے جوہر سے بہرہ ور تھیں' وہ شخصیتیں اسلام کی روشنی میں آکر' عظمت و

رفعت کے آفتاب و ماہتاب ثابت ہوئیں۔ چنانچہ صحاح اور مشکواۃ المصابیح میں موجود درج ذیل حدیث سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے:

"عن ابی ھریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الناس معادن کمعادن الذھب و الفضۃ، خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا" (رواہ مسلم ۸)

(حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسانوں کی مثال کانوں کی سی ہے جیسے سونے اور چاندی کی کانیں۔ ان میں سے جو لوگ دور جاہلیت میں ممتاز تھے، وہ زمانہء اسلام میں بھی ممتاز اور اعلیٰ انسان ثابت ہوئے۔ جب ان میں فقاہت (بصیرت اسلامی) پیدا ہوئی)

حضرت عمرؓ بھی ان اعاظم رجال میں سرفہرست ہیں جو شخصی اور خاندانی اعتبارات سے، جاہلیت اور اسلام، ہر دو ادوار میں ممتاز و برتر انسان شمار ہوتے تھے۔

حضرت عمر کا خاندان

حضرت عمر کا تعلق، خاندان بنو عدی سے تھا۔ عدی کی طرف منسوب ہونے کی بناء پر حضرت عمر کو "العدوی" کہا جاتا تھا(9)۔ دور جاہلیت میں، قریش کے جو قبائل، معزز ترین قریش قرار دیئے جاتے تھے، "عدی" کا خاندان ان میں شامل تھا۔ "العقد الفرید" کے مصنف نے باب فضائل العرب میں ان ممتاز قبائل کی تعداد دس بتائی ہے اور ان کی فہرست حسب ذیل طریقے سے درج کی ہے(10)۔

(1) بنو ھاشم (2) بنو امیہ (3) بنو نوفل (4) بنو عبدالدار (5) بنو اسد (6) بنو تیم (7) بنو مخزوم (8) بنو عدی (9) بنو جمح (10) بنو سہم

حضرت عمر کے پدری شجرۂ نسب میں آٹھویں پشت پر عدی کا نام ملتا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

عمرؓ بن خطاب (1)، بن نفیل (2)، بن عبدالعزیٰ (3)، بن ریاح (4)، بن

عبداللہ (5)' بن قرط (6)' بن رزاح (7)' بن عدی (8) (بن کعب بن لوئی) (11)

عدی کعب کے بیٹے تھے اور کعب لوئی کے (12)۔ لوئی وہ شخصیت ہے جسے قریش کے فضل و شرف اور جاہ و حشم کا بانی کہا جاتا تھا۔ لوئی کے ایک پوتے عدی بن کعب ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان بنو عدی کے مورث اعلیٰ ہیں اور دوسرے پوتے مرہ بن کعب ہیں۔ یہ مرہ بن کعب' حضرت ابوبکر کے خاندان بنو تیم کے مورث اعلیٰ تیم بن مرہ کے باپ تھے (13)۔ گویا حضرت عمر کی نویں پشت یعنی کعب بن لوئی پر' حضرت عمر اور حضرت ابوبکر کے شجرات نسب آپس میں یکجا ہو جاتے ہیں۔ مرہ بن کعب' دوسری طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں بھی شامل ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب میں ساتویں پشت پر واقع ہیں (14)۔ اسی طرح نویں پشت یعنی کعب بن لوئی پر ہی حضرت عمر کا سلسلہء نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب سے جا ملتا ہے۔ ہر سہ شجرات کے مِلاپ کا نقشہ حسب ذیل طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے:

محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم — بن عبداللہ (1)' بن عبد المطلب (2)' بن ہاشم (3)' بن عبد مناف (4)
بن قصی (5)' بن کلاب (6)' بن مرہ (7) بن کعب بن لوی

کعب بن لوی

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ — بن عثمان (1)' بن عامر (2)' بن عمرو (3)' بن کعب (4)
بن سعد (5)' بن تیم (6)' بن مرہ' بن کعب بن لوی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ — بن خطاب (1)' بن نفیل (2)' بن عبد العزی (3)' بن ریاح (4)
بن عبداللہ (5)' بن رزاح (6)' بن عدی (7)' بن کعب بن لوی

زمانہ جاہلیت میں قریش کے نامور قبائل کو کچھ خاص مناصب موروثی طور پر سپرد کر دیئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان بنو عدی کے حصے میں سفارت اور فیصلہء منافرہ کے منصب چلے آتے تھے۔ سفارت کا مفہوم یہ تھا

کہ جب کبھی قریش کے کسی ایک قبیلے یا متعدد قبائل کی' کسی دوسرے قبیلے سے لڑائی ٹھن جاتی تو حربی مذاکرات کے سلسلے میں' قریش کا نمائندہ یا سفیر' خاندان بنو عدی کے سربراہ ہی کو بنا کر بھیجا جاتا اور منافرہ کا مطلب یہ تھا کہ کبھی دو قبیلوں میں ایک دوسرے سے شرف نجابت میں فائق و برتر ہونے کے مسئلے پر نزاع و مقابلہ ہو جاتا۔ ایسی نزاع میں فیصلہ کرنے والے کو منافر کہا جاتا تھا۔ قبائل قریش' اپنا فیصلۂ منافرہ بھی عدوی خاندان کے افراد ہی سے کراتے۔ اس کی تصریح' صاحب عقد الفرید نے حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:

"ومن بنی عدی: عمر بن الخطاب و کانت الیہ السفارۃ فی الجاھلیۃ وذالک انھم کانوا اذا وقعت بینھم وبین غیرھم حرب بعثوہ' سفیرا وان نافرھم حی لمفاخرۃ جعلوہ منافرا ورضوا بہ" (15)

عمر رضا کحالہ نے ابوالفرج بن الجوزی کی تالیف سیرۃ عمر بن الخطاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ قبائلی لڑائی خواہ قریش کے مختلف قبائل کی آپس میں ہوتی' یا قریش کی' کسی دوسرے قبیلے سے ہوتی ہر صورت میں' سفارت کی ذمہ داری بنو عدی پر ڈالی جاتی۔(16)

دور جاہلیت کی تاریخ میں مذکورہ بالا سفارت و منافرہ کے مواقع میں سے دو واقعات کا تذکرہ مورخین نے بالعموم نقل کیا ہے۔ سفارت کے واقعے کی مثال' حسین ہیکل کے بیان کے مطابق اس لڑائی سے متعلق ہے جو بنو ثقیف اور کسی قریشی قبیلے کے درمیان نمودار ہوئی۔ یہ واقعہ خود حضرت عمر کے زمانے میں ان کے اسلام لانے سے کچھ پہلے پیش آیا تھا۔ چنانچہ انہیں کو قریش کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجا گیا اور اپنے پیش رو عدوی بزرگوں کی روایات کے مطابق حضرت عمر نے اس مسئلے کو نہایت خوش اسلوبی سے سلجھایا(17)۔ اور منافرہ کا ایک واقعہ حضرت عمر کے دادا نفیل

بن عبدالعزیٰ کے زمانہء حیات میں پیش آیا۔ یہ منافرہ بنو ہاشم کے رئیس عبدالمطلب اور بنو امیہ کے سربراہ حرب بن امیہ کے مابین رونما ہوا' چنانچہ قریش کے دستور کے مطابق یہ مسئلہ' خاندان بنو عدی کے سردار نفیل کے ہاں پیش ہوا۔ نفیل نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد عبدالمطلب کے حق میں فیصلہ دیا(18)۔ اس فیصلے کے جو الفاظ کتب تاریخ و ادب میں منقول ہیں' ان سے نفیل کی معاملہ فہمی' حقیقت پسندی اور قوت خطابت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عہد جاہلیت کا ایک اور سلسلہء واقعات' خاندان عدی کی تاریخ اور قبائلی معاشرے میں ان کے رتبہء اہمیت نیز اس خاندان کے مزاج پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگرچہ بنو عدی اپنے مرتبہ اور جاہ و حشم میں بنو ھاشم اور بنو عبد شمس (بنو امیہ وغیرہ) سے پیچھے تھے بلکہ نوفل اور عبدالدار کے خاندان بھی' عدی سے بلند مرتبہ سمجھے جاتے تھے مگر عدی والے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور مہم جویانہ طبیعت کے باعث' عزت نفس اور خود اعتمادی میں بہت آگے نکلے ہوئے تھے۔ بنو عبد شمس میں سے جس طرح امویوں نے ہاشمیوں کے ساتھ فخرو منافرہ کی کشمکش شروع کی تھی' اسی طرح عبد شمس والوں کی' بنو عدی سے بھی چھیڑ خانی جاری رہتی تھی اور یہ چھیڑ خانی بارہا خونریز لڑائیوں پر بھی منتج ہو جاتی۔ چنانچہ ایسے ناخوشگوار واقعات میں' عبد شمس اور بنو عدی ہر دو خاندان کے متعدد نفوس مارے جا چکے تھے۔ چونکہ اس کشمکش کے فریقین میں سے کوئی بھی شکست ماننے پر تیار نہ تھا۔ اس لئے بالآخر بنو عدی کے اکابر نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مکہ میں اپنی جائیدادیں فروخت کر ڈالیں اور بنو سہم کے حلیف بن کر ان کے علاقہ کہسار (مضافات مکہ) کی طرف منتقل ہو جائیں۔ کتاب اخبار مکہ کے مصنف الازرقی نے اس سلسلہء واقعات کی تفصیل بیان کی ہے(19)' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان بنو عدی کا مزاج نہایت مدافعانہ اور جنگویانہ تھا' وہ مقابلے کے میدان میں اپنے سے اونچے خاندانوں کی عظمت و فضیلت سے قطعاً" مرعوب نہ

ہوتے تھے بلکہ حریفوں کو مسلسل چمٹے رہتے۔ حتیٰ کہ الازرقی کے بیان کے مطابق بنو عدی کو "لعقتہ الدم" (خون چوس لینے والے) کے نام سے پکارا جاتا تھا(20)۔ تاہم اس خاندان میں معاملہ فہمی اور حقیقت پسندی کا جوہر بھی موجود تھا۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ عبد شمس والوں سے ان کی خونریز لڑائیاں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں (کیونکہ اگر بنو عدی، عبد شمس سے شکست کھانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے، تو دوسری طرف عبد شمس کو شکست دینا بھی ان کے بس میں نہیں تھا) تو انہوں نے صفا اور کعبتہ اللہ کے درمیان واقع اپنے مکانات فروخت کر ڈالے اور بنو سہم کے خاندانوں کے حلیف بن گئے(21)۔

مذکورۂ بالا سلسلہء واقعات کے نتیجے میں خاندان عدی کو بنو سہم کی مضبوط اور قابل اعتماد پشت پناہی حاصل ہو گئی۔ بنو سہم قبیلہ، عزت و منزلت اور قوت و تعداد کے اعتبار سے قریش کے ممتاز ترین قبائل میں متصور ہوتا تھا۔ الازرقی نے ان کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:

"وکانت بنو سھم من اعز بطن فی قریش وامنعہ واکثرہ" (22)

(بنو سہم، قریش کے معزز ترین، قوی ترین اور کثیر التعداد قبائل میں سے تھا)

حضرت عمر کے والد خطاب نے بنو سہم کی مدح میں جو اشعار کہے تھے، ان میں بنو سہم کو "قریش کا سر" کہا گیا ہے(23)۔ بنو سہم کے علاوہ بنو مخزوم، بنو اسد اور بنو جمح کے ساتھ بھی بنو عدی کے نہایت قریبی روابط تھے۔ موخر الذکر تینوں خاندانوں میں، بنو عدی کے متعدد افراد نے شادیاں کی تھیں۔

ان شادیوں کی کچھ تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔

خاندان عدی کے چند نامور افراد

(1) خطاب

حضرت عمرؓ کے والد خطاب بن نفیل کا شمار قریش کے ممتاز سرداروں

میں ہوتا تھا۔ ابن قیتبہ نے خطاب کا ذکر' ان الفاظ میں کیا ہے:

"کان الخطاب بن نفیل من رجال قریش" (24)

(خطاب بن نفیل عظمائے قریش میں سے تھے)۔

اپنے وقت میں خطاب اپنے قبیلے یعنی بنو عدی کے بھی قائد اور سربراہ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ زمانہء جاہلیت کی معروف لڑائی حرب فجار میں بنو عدی نے شرکت کی تو ان کی قیادت خطاب اور ان کے بھتیجے زید کے سپرد تھی(25)۔

خطاب کو خاندان میں ایسی سرداری حاصل تھی کہ ان کے فیصلوں کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عبد شمس والوں کے ساتھ طویل خونریز کشمکش کے بعد یہ فیصلہ خطاب ہی کا تھا کہ بنو سہم کے ساتھ محالفہ (حلیف بن جانا) کیا جائے اور ان ہی کے دیہات کی طرف نقل مکانی اختیار کر لی جائے۔ خطاب نے اپنے اشعار میں اس فیصلے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا تھا:

اسکننی قوم لهم نائل رجوربا لمعرف من الله فظه۔ (26)

(اب مجھے اس قوم کے ہاں سکونت مل گئی ہے' جو اچھائی اور سخاوت میں شہرہ آفاق ہے)

اور خطاب کے اس فیصلے کو عدویوں نے بلا چون و چرا تسلیم کیا۔ چنانچہ انہوں نے مکہ میں اپنے مکانات فروخت کر دیئے(27)۔

خطاب نے معزز اور اونچے خاندانوں میں متعدد شادیاں کی تھیں۔ ان کی ایک بیوی اسماء' خاندان بنو اسد بن خزیمہ سے تھیں(28)۔ یہ بنو اسد' عدنانی قبائل میں عظیم ترین قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ علمائے انساب اس قبیلے کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اسد بن خزیمة: قبیلة عظیمة من العدنانیة" (29)۔

انہی اسماء کے بطن سے زید بن خطاب پیدا ہوئے تھے۔(30)۔

خطاب کی ایک اور بیوی حنتمہ' خاندان بنو مخزوم بن مرۃ سے تھیں۔ بنو مخزوم' قریش کے چوٹی کے چار معزز ترین قبائل میں سے ایک تھا(31)۔

جب قریش کو کوئی لڑائی درپیش ہوتی تو جنگی تیاریوں کے لئے خاص خیمے لگا دیئے جاتے' یہ جنگی خیمے بنی مخزوم کی نگرانی میں ہوتے اور ان ہی کی نگرانی میں تمام سامان جنگ جمع کیا جاتا(32)۔ حنتمہ کے بطن سے عمر بن خطاب پیدا ہوئے۔ یہ حنتمہ' ہاشم بن مغیرہ کی بیٹی اور خالد بن ولید کی چچا زاد بہن تھیں(33)۔ کیونکہ مغیرہ کے ایک بیٹے ہاشم کی صاحبزادی حنتمہ تھیں اور مغیرہ کے ایک دوسرے بیٹے ولید (بن مغیرہ) کے صاحبزادے خالد (بن ولید) تھے گویا والدہ کے اس رشتے کے اعتبار سے حضرت عمر' خالد بن ولید کے ہمشیرہ زاد ہوتے تھے۔

بنو اسد اور بنو مخزوم جیسے قبائل میں خطاب کی شادیوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ نہ صرف اپنے خاندان ہی میں' بلکہ جمیع قریش و عرب میں ان کا معاشرتی مقام کتنا بلند تھا۔ سیادت و قیادت کے ساتھ' خطاب کی شخصیت کا علمی و ادبی پہلو بھی قابل ذکر ہے۔ جسے خطاب کی شاعری اور نسب دانی کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مختصر تذکرہ ہم آئندہ سطور میں کریں گے۔

(2) زید بن عمرو بن نفیل

خاندان عدی کے مشہور موحد' جنہوں نے دور جاہلیت میں اپنی سوچ و بچار اور فطرت سلیمہ کے باعث بت پرستی سے بیزاری کا اظہار کر دیا تھا۔ زید بن عمرو کا ذہنی سفر' نبوت محمدی اور اسلام کے ظہور سے ذرا ما قبل دور میں تھا۔ اس لئے وہ دین برحق کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہی رہے۔ مکہ میں انہوں نے حضرت عمر کے والد خطاب اور دیگر کفار قریش کے ہاتھوں بہت اذیتیں اٹھائیں۔ بالاخر وہ سرزمین شام کی طرف منتقل ہو گئے جہاں عیسائیوں نے انہیں قتل کر دیا۔ زید کی شاعری کا کچھ نمونہ عربی ادب کی کتب میں منقول ہوا ہے' جس کا موضوع وحدانیت معبود ہے۔

ابنِ قیتبہ کے حوالے سے ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اسلمت وجھی لمن اسلمت

لہ المزن تحمل عذبا" زلالا" (34)

(میں نے اپنا سر اس ذات کے آگے جھکا دیا ہے' جس کے حسب فرمان' بادلوں کے قافلے شیریں پانی کے ذخیرے اٹھائے پھرتے ہیں)

زید بن عمرو کے خیالات اور ان کے ذہنی سفر سے خاندان بنو عدی کی ذہنی اور معنوی بلندی کی غمازی ہوتی ہے۔ یہ زید بن عمرو' نفیل بن عبد العزیٰ کے پوتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمر بھی نفیل کے پوتے تھے(35)۔ شجرہ یوں ہے:

عمر بن خطاب بن

زید بن عمرو بن نفیل بن عبد العزیٰ

خاندان بنو عدی کے دیگر نامور افراد میں نفیل بن عبد العزیٰ' زید بن الخطاب اور سعید بن زید کے اسماء شمار کیے جاتے ہیں۔ نفیل حضرت عمرؓ کے دادا اپنے وقت میں عظیم زعمائے قریش سے متصور ہوتے تھے۔ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ عبد المطلب اور حرب بن امیہ جیسے سرداران قریش نے اپنے مفاخرہ کے مقدمے کے سلسلے میں نفیل کی طرف رجوع کیا تھا(36)۔ مؤخر الذکر ہر دو اصحاب (زید اور سعید) نے نبوت محمدی کا زمانہ پایا اور اور ہر دو مشرف بہ اسلام بھی ہو گئے تھے۔ زید بن الخطاب' باپ کی طرف سے حضرت عمرؓ کے سگے بھائی تھے۔ انہوں نے شروع دور میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ بدر و احد کے مجاہدین میں سے تھے' ان کی شہادت عہد صدیقی میں' مسیلمہ کے لشکر سے مقابلہ کرتے ہوئے ہوئی (37) اور سعید بن زید' اوپر مذکور ہونے والے عہد جاہلیت کے موحد زید بن عمرو کے صاحبزادے تھے۔ یہ ان دس عظیم صحابہ میں شامل ہیں جن کو زبان نبوی سے جنت کی خوشخبری سنائی گئی تھی' یعنی عشرۂ مبشرہ رضی اللہ عنھم اجمعین(38)۔ اختصار

کی غرض سے ناموران بنو عدی کا تذکرہ نہایت اجمال کے ساتھ کیا گیا ہے۔

عمر بن خطاب

دور جاہلیت میں

جیسا کہ ہم پیچھے اظہار خیال کر چکے ہیں ہم ان مورخین سے اتفاق نہیں رکھتے جنھوں نے عمر بن خطاب کو دور جاہلیت میں' ایک گمنام اور غیر اہم شخصیت قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس تاریخی حقائق کی روشنی میں' ہماری رائے یہ ہے کہ عمر اپنے دور جاھلی میں اور اس دور سے پیدا ہونے والے معاشرے میں نہ صرف اہم اور معروف بلکہ زوردار اور قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے دور کی اس طاقت ور شخصیت کے دل و دماغ پر فتح پالینا' یقیناً اسلام کی بہت بڑی حیرت انگیز فتح تھی۔

جسمانی صحت و قوت کے اعتبار سے اس شخصیت کی تصویر یہ ہے: عمر قوی الجثہ' طویل القامتہ اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ طبقات ابن سعد کے حوالے سے نقل کیا جاتا ہے کہ عام لوگوں کے ہجوم میں جب کوئی شخص' باقی سب سے تین بالشت کے قریب دراز قامت نظر آتا تو کہنے والے دور سے کہہ دیتے یہ عمر بن خطاب ہے(39)۔ عمر کا لڑکپن اور عہد شباب ایک عربی فرزند صحرا کا لڑکپن اور شباب تھا۔ وہ بادیہ ء عرب کے وسیع صحراؤں اور ریگستانوں میں سالہا سال خطاب کے اونٹ چراتے رہے' جہاں صحرا کی کھلی ہوا اور شعرائے عرب کے رسیلے اشعار ان کے رفیق تنہائی ہوتے(40)۔ عمر عکاظ کے میدان میں کشتی کے مقابلوں میں بھی حصہ لیتے اور شبلی کا یہ کہنا درست ہے کہ عکاظ' چونکہ عربوں کا سالانہ قومی میلہ تھا' جس میں اہل کمال اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ لہٰذا یقیناً عمر نے کشتی اور پہلوانی میں رتبہ بہم پہنچالیا تھا(41)۔ ہیکل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے چوٹی کے پہلوانوں کو پچھاڑنے کا اعزاز حاصل کرلیا تھا۔ اسی طرح مورخین نے شہ سواری اور سپہ گری

میں بھی حضرت عمر کے کمال کا تذکرہ کیا ہے۔ سپہ گری اور امور جنگ میں حضرت عمر کی مہارت و حذاقت کے سلسلے میں ہیکل نے اہم اشارہ کیا ہے کہ یہ چیز انہیں اپنے نھیالی خاندان بنی مخزوم (خاندان خالد بن ولید رضی اللہ عنہ) کی طرف سے وراثتہ" ملی تھی' چنانچہ حضرت ابو بکرؓ بھی ان کی مہارت حربی کے معترف تھے (42)۔

ذہنی اور ثقافتی پہلو سے' عمر بن خطاب کی سطح یہ ہے کہ وہ ان سترہ قریشیوں میں سرفہرست تھے جو زمانہء جاہلیت ہی سے لکھنا پڑھنا (کتابت) جانتے تھے۔ البلاذری کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

دخل الا سلام فی قریش سبعتہ عشر رجلا کلھم یکتب عمر بن الخطاب و علی بن ابی طالب۔ (44)..... اسی مورخ کا بیان ہے کہ حضرت عمر کی صاحبزادی حضرت حفصہ (زوج النبی) بھی لکھنا سیکھے ہوئے تھیں (45)- صاحب عقد الفرید نے کاتبان وحی کی جو فہرست درج کی ہے اس میں بھی حضرت عمر کا نام شامل ہے(46)- حضرت عمرؓ کی نسب دانی' شعر کے ناقدانہ ذوق اور وصف خطابت کے بارے میں بھی مورخین نے واضح شہادات نقل کی ہیں۔ "علم الانساب" عربوں کا اہم ترین علم تھا۔ یہ علم اس قدیم دور میں دراصل' علم تاریخ کی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ الجاحظ کے بیان کے مطابق' اپنے وقت کے سب سے بڑے نسب دان حضرت ابو بکرؓ تھے اور ان کے بعد اس علم میں حضرت عمر کا مرتبہ مسلم تھا(47)- حضرت عمر کو نسب دانی کا کمال' خاندانی وراثت کے طور پر ملا تھا۔ الجاحظ ہی کی تصریح ہے کہ عمر بن خطاب کے دادا نفیل' عمر کے باپ خطاب اور خود عمر بن خطاب علم الانساب کے یکساں طور پر ماہرین تھے(48)- حضرت عمر نے یہ علم اپنے باپ خطاب سے حاصل کیا تھا۔ چنانچہ جب نسب کے کسی مسئلے پر مفصل گفتگو ہوتی تو حضرت عمر اپنے والد خطاب کے حوالے سے بات کرتے تھے کہ فلاں

بات میں نے خطاب سے سنی تھی اور فلاں بات نہیں سنی تھی(49)۔

ہمارے دور کے مؤرخین نے حضرت عمرؓ کے خطیب ہونے پر کھل کر گفتگو نہیں کی۔ شبلی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اگرچہ تاریخ میں حضرت عمرؓ کی خطابت کی تصریح نہیں ملتی، مگر سفارت وغیرہ کے منصب کا انہیں سونپا جانا یہ بتاتا ہے کہ وصف خطابت ان میں موجود تھا(50)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معاصر مؤرخین کی نظر، الجاحظ کے حسب ذیل الفاظ پر نہیں پڑی، جن میں حضرت ابوبکر کی طرح، حضرت عمر کے خطیب ہونے کی بھی تصریح کر دی ہے:

کان ابوبکر خطیبا وکان عمر خطیبا (51)

شعر کا ذوق بھی حضرت عمر کے خاندان میں موروثی تھا۔ خطاب تو خود شاعر تھے۔ الازرقی نے خطاب کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں جو قبیلہ بنو سہم کی تعریف میں کہے گئے تھے۔ ان میں سے تین شعر یہ ہیں:

رجال من بنی سہم بن عمرو
الی ابیاتہم یاوی اسطرید
ربیع المعلمین وکل جار
اذا نزلت بہم سنتہ کود
ہم الراس المقدم من قریش
وعند بیوتہم تلقی الوفود(52)

(یہ خاندان بنو سہم کے عظیم لوگ ہیں، جن کے گھر بے یار و مددگار انسان کی پناہ گاہ ثابت ہوئے ہیں۔ جب قحط سالی حملہ آور ہوتی ہے تو یہ لوگ اپنے ہمسایوں اور قلاش خاندان کے لئے پیغام خوشحالی بن جاتے ہیں، در حقیقت قریش کے سردار اور سربراہ یہی لوگ ہیں، ان کے دروازوں پر قبائل عرب کے وفود کے تانتے بندھے رہتے ہیں۔)

حضرت عمر کے خود شاعر ہونے کی تو کوئی روایت نہیں ملتی۔ مگر عربی تاریخ و ادب کے ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ شعر شناسی میں حضرت عمرؓ کا پایہ نہایت بلند تھا۔ الجاحظ نے تصریح کی ہے کہ عمر بن خطاب شعر کے سب سے بڑے عالم تھے۔ الفاظ یہ ہیں:

قال العایشی کان عمر بن الخطاب اعلم الناس بالشعر (53)۔ یہی مصنف 'محمد بن سلام الحجمی کے حوالے سے بتاتا ہے' جب کبھی حضرت عمر کو کوئی اہم معاملہ پیش آتا' تو وہ اس کے مناسب حال کوئی نہ کوئی شعر ضرور پڑھتے (54)۔ عربی شاعری کے ساتھ' ان کی دوستی' لڑکپن کے اس دور سے شروع ہو گئی تھی جب وہ بادیہء عرب میں خطاب کے اونٹ چراتے تھے۔ خلافت کے زمانے میں ایک بار انھوں نے معروف عربی شاعر نابغہ جعدی کو بتایا کہ تمھارا فلاں منظوم کلام' میں نے خطاب کے اونٹ چراتے ہوئے مدتوں گایا ہے (55)۔ جاھلی عرب شاعری کا بڑا حصہ حضرت عمر کو محفوظ تھا اور وہ متعدد شعرا کے بارے میں اپنی ذاتی تنقیدی رائے رکھتے ہیں۔

ادبی اور ثقافتی سطح کے اس امتیازی تفوق کے ساتھ' اس شخصیت کی تصویر میں تجربہ و ممارست کا پہلو بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دور جاہلیت کے عرب کی جبلت اجتماعی کا مظاہرہ عکاظ کے سالانہ ایام میں منعکس ہوتا تھا۔ جہاں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے بڑے لوگ مجتمع ہو جاتے۔ اس طرح یہ میلہ' وقت کی اہم شخصیات سے ملاقاتوں کا ایک باقاعدہ مرکز بن گیا تھا۔ اس میلے میں حضرت عمر' قبل اسلام کی زندگی میں ہر سال شرکت کرتے تھے۔ تجربہ و ممارست اور زندگی سے بھرپور عملی دلچسپی و باخبری کا ایک ذریعہ' شخصیت عمر میں یہ تھا۔

دوسرا ذریعہ' سفارت و منافرہ کے فرائض منصبی کی ذمہ داریوں نے بہم پہنچایا۔ اور تیسرا ذریعہ' ان کے وہ تجارتی سفر تھے' جن کا سلسلہ عراق و شام کے

دور دراز علاقوں تک پھیلا رہا۔ ان سفروں میں ممالک عرب و عجم کے متعدد سربراہوں سے ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے مواقع مہیا ہوتے رہے۔ یہ سفر' حضرت عمر نے زمانہء جاہلیت کی زندگی میں کئے تھے۔ افسوس ان سفروں کی تفصیلات تاحال مہیا نہیں ہو پائیں بنیادی حوالہ المسعودی کی مروج الذھب میں موجود ہے(56)۔

ان سفروں کے ذریعے سے' ایک طرف اقوام و قبائل کے حالات جاننے اور دوسری طرف جزیرۂ عرب اور اس کے آس پاس کے ممالک کی زمین اور ماحول سے واقفیت حاصل کرنے کے اہم مواقع کا مہیا ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

اس شخصیت کی تصویر کشی میں اس کے خاندانی ماحول اور روایات کو جو اہمیت حاصل ہے' اسے بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اسی غرض کے لئے خاندان بنو عدی اور اس کے بعض ممتاز اشخاص کے حالات پیچھے بیان کئے جا چکے ہیں۔

خاندان کی قابل فخر عظمت اور مشاہیر خاندان کے عظیم کارناموں کی روایات سے' عمر بن خطاب کی شخصیت میں ایک مضبوط و مستحکم انا اور خود اعتمادی کے ایک بڑے جاندار احساس کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات قرار دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ جسمانی تنومندی اور ذہنی اعتبار سے عصری ثقافت سے بھرپور بہرہ مندی نے اس شخصیت کو اور بھی طاقتور بنا دیا تھا۔ پس دور جاہلی میں عظمت و اہمیت کے ہر معیار پر پوری اترنے والی' قوت صلاحیت اور خود اعتمادی سے چھلکتی ہوئی یہ تھی منہ زور شخصیت عمرؓ۔ جس پر اسلام نے حملہ کر دیا۔

طاقت سے بھرے ہوئے عمرؓ اس حملے سے بہت جھنجھلائے۔ انہیں بے حد وحشت ہوئی۔ وہ اسلام پر حملہ کرنے کو اٹھے۔ مگر ان کے مقدر میں یہ آخری عظمت بھی درج تھی کہ وہ اسلام کے سامنے مفتوح ہو جائیں اور ہمیشہ کے لئے تاریخ کے اکلوتے "الفاروق" کی حیثیت سے یاد کئے جائیں۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ عنا!

1:- طنطاوی: عمر بن خطاب' (اردو ترجمہ: عبدالصمد صارم مکتبہ البیان لاہور' ۱۹۷۱ء) ص ۹'۱۰

2:- شبلی نعمانی: الفاروق (مطبوعہ تاج کمپنی لاہور) ص ۳۴

3:- محمد حسین ہیکل (مکتبہ النہضتہ المصریہ' القاہرہ ۱۳۶۴ھ) ص ۲۹

5'4:- طنطاوی: عمر بن خطاب (اردو ترجمہ) ص ۹

6:- ترمذی ابو عیسیٰ: الجامع الصحیح' باب مناقب عمر: معین الدین ندوی: خلفائے راشدین (دارالمصنفین اعظم گڈھ ۴۸ء) ص ۹۷

7:- محمد حسین ہیکل' الفاروق عمر' ص ۴۲

8:- ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی' مشکاۃ المصابیح (بتحقیق البانی' المکتب الاسلامی بدمشق ۱۹۶۱ء) ۱: ۷۰ (البانی نے حاشیے میں بتایا ہے کہ امام بخاری نے بھی اس حدیث کو ابواب المناقب کے آغاز میں درج کیا ہے' البتہ بخاری کی روایت میں " کمعاون الذھب والفضتہ کے الفاظ شامل نہیں)

9:- ابن قتیبہ: المعارف' (المکتبہ الحسینیتہ' مصر ۱۹۳۴ء)

10:- ابن عبدربہ الاندلسی: العقد الفرید (مطبع: لجنتہ التالیف والترجمہ والنشر' قاہرۃ ۱۹۴۸ء) ۳: ۳۱۳

12'11:- العقد ۴: ۲۶۹

13:- ابن قتیبہ: المعارف' ص ۳۲' معین الدین ندوی: خلفائے راشدین' ص ۱۲

14:- تفصیل یوں ہے: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' بن عبداللہ ۱ بن عبدالمطلب ۲' بن ہاشم ۳' ابن عبدمناف ۴' بن قصی ۵' بن کلاب ۶' بن مرہ' (بن کعب)..... دیکھئے شبلی نعمانی: سیرۃ النبی (کواپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور' طبع پنجم) ص ۱۴۰۔

15:- العقد الفرید ۳: ۱۱۳

16:- عمر رضا کحالہ: العالم الاسلامی (المطبعتہ الہاشیہ بدمشق ۱۹۵۸ء) ۱: ۱۳

17:- ہیکل: الفاروق عمر' ص ۲۸

18:- الجاحظ: کتاب البیان والتبین (المطبعتہ الرحمانیتہ مصر ۱۹۲۷ء) ۱: ۲۰۱' شبلی: الفاروق' ص ۳۲

19:- الازرقی' ابوالولید محمد بن عبداللہ: کتاب اخبار مکتہ وماجاء فیھا من الاثار (LEIPZIG-1958)۱: ۴۷۲

20:- مورخ مذکور کے الفاظ یہ ہیں: وکانت بنو علی تدعی لعقتہ الدم وکانوا لا یزالون یقتلون بمکتہ... دیکھئے محولہ بالا کتاب اخبار مکتہ' ۱: ۴۷۲

21'22:- حوالہء سابق

23:- کتاب اخبار مکتہ ۱: ۳۷۴

24:- المعارف ' ص ۷۷

25:- الفاروق عمر ' ص ۳۱

26:- کتاب اخبار مکتہ ' ۱: ۲۷۴

27:- حوالہء سابق

28:- المعارف ' ص ۷۸

29:- عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب (المطبعتہ الھاشمیتہ دمشق ۱۹۴۹ء) '۱: ۲

30:- المعارف ' ص ۷۸

31:- الفاروق عمر ' ص ۴۱

32:- العقد الفرید ' ۳: ۱۱۴

33:- المعارف ' ص ۷۸: الفاروق عمر ' ص ۳۲

34:- المعارف ' ص ۲۷ ' ۲۸

35:- المعارف ' ص ۷۷ ' ۷۸

36:- کتاب البیان والتبیین ' ۱: ۲۰۱

37:- المعارف ' ص ۷۸

38:- حوالہء سابق

39'40:- الفاروق عمر ' ص ۳۳

41:- شبلی: الفاروق ' ص ۳۵ (شبلی نے یہ روایت البلاذری کی کتاب الاشراف کے حوالے سے بیان کی ہے)

42:- الفاروق عمر ' ص ۲۴ تا ۲۷

43:- الفاروق عمر ' ص ۳۳

44:- البلاذری: فتوح البلدان (طبع ڈخویہ) ص ۴۷۱

45:- وہی کتاب صفحہ ۴۷۲

46:- العقد الفرید ۴: ۱۶۸

47:- کتاب البیان والتبیین ' ۱: ۲۰۸

48'49:- وہی کتاب ۱:۲۰۱

50:- شبلی' الفاروق' ص ۳۵'۳۶

51:- کتاب البیان و التبیین ۱:۲۲۷

52:- کتاب اخبار مکتہ' ۱:۳۷۳

53:- کتاب البیان و التبیین' ۱:۱۶۹

54:- وہی کتاب' ۱:۱۷۰

55:- الفاروق عمر' ص ۳۳

56:- المسعودی: مروج الذہب و معادن الجوہر (مطبع السعادۃ' مصر ۱۹۴۸ء) ۲:۳۳۹

فاروقِ اعظمؓ کا قبولِ اسلام

(قطرے سے گہر ہونے تک)

تحریر : محمد رضا الدین صدیقی

آتشِ غضب سے دہکتے ہوئے رُخسار، معمول سے تیز رفتار ——— ہاتھ میں برہنہ تلوار، صورتِ برقِ سرکُہسار، آج ابنِ خطاب کے انداز و اطوار غمازی کر رہے ہیں کہ یقیناً کوئی اہم مہم درپیش ہے۔

پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہونے والے شمسِ لولاک کی خواہش تو یہ تھی کہ ظلمتِ کُفر کافور ہو جائے عصیاں و سرکشی کی شبِ دیجور دُور ہو جائے۔ لوگ ایک صبحِ درخشاں کا رُوئے تاباں دیکھ لیں۔ آتشِ جہنم کے کنارے کھڑے ہوئے فردوس و علیین کے خیاباں دیکھ لیں۔

لیکن صد حیف ان پیکرانِ غرور و جہالت، پہ کہ کل تک جسے صادق و امین کہتے تھے، جس کے صدقے سحابِ رحمت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ آج اُسی صادق اللہجہ کی باتیں انہیں انہونی لگ رہی تھیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ محسنِ انسانیت کی راہ میں آنکھیں بچھاتے، سرِ تسلیم خم کرتے، خود کو مستحقِ کوثر و ارم کرتے، لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس تھا۔ جوں جوں حلقۂ عشق و مستی بڑھ رہا تھا اور وارفتگانِ حسنِ ازل کے دلوں پر صبغۃ اللہ چڑھ رہا تھا، توں توں کُفر کی آتشِ انتقام بھی تیز تر ہو رہی تھی۔

ایک دن وہ سب دشمنانِ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحنِ کعبہ میں جمع تھے۔ ابو جہل اٹھا اور کہنے لگا :

"اے معشرِ قریش! تمہاری غیرتِ عدو شکن کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہارا انبوہِ کثیر اپنے دین سے رُوگردانی کر چکا ہے۔ تین روز ہوئے حمزہ بھی آبار و اجداد کی مقدس روایات کو ٹھکرا چکا ہے۔ تم اس روز روز کے جھنجھٹ سے یکبارگی نجات حاصل کیوں نہیں کر لیتے۔ ؎

تو اپنے بادۂ خوش رنگ میں زہر بھر لا

یہ روز روز کا مرنا عذاب ہے ساقی

اے دعوائے جرأت و بسالت رکھنے والو! اٹھو! تم میں سے جو شخص محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی شمعِ حیات گُل کر دے گا، عظمتِ ہُبل کی قسم! میں اُسے سُرخ اونٹ اور چالیس ہزار درہم بطورِ انعام دُوں گا۔"

"جواب دو تم میں سے کون ہے جو یہ کارنامہ انجام دے!" ؎

خُمِ ساقی میں بجز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی

جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے

عُمر کا جوان خون کھول اٹھا۔ وہ ابنِ خطاب بول اٹھا:

"لات و عُزیٰ کے تقدّس کی قسم جب تک یہ معرکہ سر نہ کر لوں گا زمین کی پُشت پر بیٹھنے کی زحمت گوارا نہ کروں گا۔"

شمشیرِ تابدار بے نیام ہو گئی۔ کفار میں یہ خبر عام ہو گئی کہ آج عُمر سا جری اس قصّۂ پارینہ کا آخری باب رقم کرنے جا رہا ہے۔ (نعوذ باللہ) محمد بن عبداللہ کا سر قلم کرنے جا رہا ہے۔

اچانک سرِراہ گزارِ جستجو نعیم بن عبداللہ روبرو ہو جاتے ہیں۔

"عمر کہاں کے ارادے ہیں؟"

"آج دینِ آبار سے منحرف ہو جانے والے اس شخص کے رُوح و جسد کا رابطہ منقطع کرنے جا رہا ہوں۔ جس نے قریش کی یک جہتی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ جو ہمیں احمق گردانتا ہے۔ جس نے سرِ کوچہ و بازار ہمارے معبودوں

کی مذمت کی ہے۔ ہمارے دین میں کیڑے ڈالنے کی جرأت کی ہے۔"

نعیم نے کہا: "اے عمر! تمہارے نفسِ گم کردہ راہ نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اگر تم اپنے ارادہ میں کامیاب ہو بھی گئے تو کیا بنی عبد مناف تمہیں زمین پر محوِ خرام ہونے کے لئے زندہ چھوڑ دیں گے۔"

منہ زور جوانی نے جواب دیا، "مجھے کسی کا خوف نہیں مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تم بھی اس گروہ عاقبت نا شناس میں شامل ہو گئے ہو۔ کیوں نہ پہلے تم پر ہی تلوار کی دھار کو آزمایا جائے۔"

"مجھ پر وار آزمایا جائے؟" نعیم بن عبداللہ نے کہا۔ مجھے کیا مزہ چکھاؤ گے کچھ اپنے گھر والوں کی بھی خبر ہے کہ درونِ خانہ کیا ہنگامے برپا ہیں۔"

"میرے گھر والے! کیا مطلب، کیا کہنا چاہتے ہو۔" عمر نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"تمہاری بہن فاطمہ اور تمہارے بہنوئی سعید بن زید دونوں احمد مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا طوقِ غلامی زیب گلو کر چکے ہیں۔"

یہ خبر گویا اک برقِ خاطف تھی کہ عمر خاکستر ہو گئے۔ وفورِ حیرت و استعجاب سے ششدر ہو گئے۔ ان کے لئے اس سے بڑھ کر اندوہناک خبر اور کیا ہو سکتی تھی کہ جس سیلِ رواں کو وہ اُم القریٰ کی وادیوں سے نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی اپنی دہلیز پار کر چکا ہے۔ وہ نورِ لم یزلی جسے عمر بجھا دینا چاہتے ہیں، ان کے اقربا کے نہاں خانہ قلوب میں اپنی تابانیاں بکھیرنے لگا ہے۔ وحشتِ کفر کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

عمر نے جستجوئے رسولِ پاک ترک کی اور بگولے کی تیزی سے بہنوئی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

اور اس طرف بھی دیکھئے! آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ آپ

اپنے دستِ حق پرست فضا میں بلند فرما رہے ہیں۔ یہ وہ دستِ مقدس ہے کہ جب اشارہ بن کر اٹھتا ہے تو خورشیدِ افق سے واپس پھر جاتا ہے۔ تقاضا بن کر اٹھتا ہے تو مہ کامل کا کلیجہ چر جاتا ہے۔

آج یہ تمنا بن کر اٹھتا ہے۔ آج اس بے کس نواز نے دستِ دعا بلند کئے ہیں۔ ذرا سنو تو سہی اس لبِ حق طلب سے کیا شے نکل رہی ہے:

اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ دِیْنَکَ بِاَحَبِّھِمَا اِلَیْکَ (طبقاتِ ابنِ سعد)

"بار الٰہا! عمر ابن خطاب یا عمر ابن ہشام (ابوجہل) میں سے جو تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اُس کے ذریعے اپنے دین کو تقویت عطا فرما۔"

اور ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ سلطانِ کونینؐ نے ایک بار دستِ دُعا بلند کئے اور بارگاہِ ربوبیت میں التجا کی:

اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ۔

"اے مولائے قدوس! اسلام کو عمر سے عزت عطا فرما۔"

ایک اور روایت کے مطابق سرکارِ دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جوانِ رعنا کو یوں طلب فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اَیِّدِ الدِّیْنَ بِعُمَرَ بْنِ خَطَّابٍ

"اے اللہ عمر بن خطاب کے قبولِ اسلام سے اپنے دین کی مدد فرمائیے۔"

اللہ اکبر، وہاں دشمنی کا وہ عالم کہ سینۂ ارضی پر وجود تک گوارا نہیں۔ اور یہاں یہ نوازشیں کہ خود عطا و سخاوت بھی عش عش کر اٹھی ہے۔

آج کفر حیراں ہے، ظلمتِ شرک انگشت بدنداں ہے۔ اہلبیت ڈھہ کر پریشان ہے کہ جس کی تلوار ہمیشہ مخالفتِ اسلام میں عریاں ہے۔ نبیِ مقدسؐ کی زبان پر اسی عمر کے لئے تمنا و فغاں ہے۔

لیکن انہیں کیا خبر کہ نبوت کا سحابِ جود و کرم جب بھی برساہے دل کھول کر برسا ہے

تم تو محوِ غم دوش ہوا نہیں اندیشۂ فردا ہے۔
تمہاری نظر میں ابن خطاب کی شکن آلود جبین ہے آقا کی نظر میں تقدیر ایران و فلسطین ہے۔ تمہاری نظر خشمگیں نگاہوں پر ہے، نبوت کی نظر یا ساریۃ الجبل کی اداؤں پر ہے، نگاہِ نارسا برہنہ تلوار دیکھتی ہے۔ نبوت بدر و حنین کے کارزار دیکھتی ہے۔

حشر میں اُس نے چُن لئے داغِ گنہگارِ عشق
تاڑ گئی ہزار میں اُس کی نظر الگ الگ

یہاں دُعاؤں کے زمزمے تھے۔ دوسری طرف جلالتِ عمر کے ہیجے تھے۔ دروازے پر دستک دی۔
استفسار کیا، "کون ہے؟"
"عمر ابن خطاب!"
حضرت خباب بن الارت اُس وقت حضرت سعید اور فاطمہ کو قرآن مقدس کی تعلیم دے رہے تھے۔ وہ عمر کی پُرجلال آواز سُن کر مکان کے اندر چلے گئے۔ بہن گھبرا گئیں۔ افراطِ غیظ و غضب دیکھا تو تھرا گئیں۔
عمر پیکرِ جوش و اضطراب بنے ہوئے اندر داخل ہوئے۔
بہن پر نظر پڑی تو آتشِ قہر عتاب، اور بھڑک اٹھی:
"یہ مترنم آوازیں کیسی تھیں؟"
"کچھ نہیں ہم دونوں ہی محوِ گفتگو تھے۔"
جلالِ ابن خطاب اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ "میں نے سُنا ہے کہ تم دونوں بے دین ہوگئے ہو۔ سچ بتاؤ اس خبر میں کتنی حقیقت ہے۔ اس اطلاعِ جاں سوز میں کتنی صداقت ہے؟"
"بے دین؟" سعید نے جواب دیا۔ نہیں ہم بے دین نہیں ہوئے۔ ہم نے تو ازلی و ابدی حقیقتوں کو تسلیم کرلیا ہے!
اب تو یارائے ضبط نہ رہا۔ عمر یک لخت سعید پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں باہم دست و گریباں ہوگئے۔ عمر مضبوط تن و توش کے مالک تھے۔ سعید کو زمین پر دے مارا۔ ان کے سینے پر چڑھ

چڑھ گئے۔ یہ دیکھ کر فاطمہ آگے بڑھیں کہ اس نزاع سکون شکن کو ختم کرایا جائے۔ قریب آئیں تو وہ بھی آتشِ انتقام کی زد میں آگئیں۔ ایک زناٹے دار تھپڑ رسید ہوا۔

سر پہ ضرب لگی۔ وہ پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔ چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ غصے سے کپکپاتے ہوئے گویا ہوئیں:

"او دشمنِ خدا آخر ہمیں کس ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔؟"

"اس جرم کی کہ تم دونوں مسلمان ہو گئے!"

"اچھا! تو پھر اے دستِ جفا شعار تو اپنے ظلم و جور کی انتہا کر دے۔

ہمارے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آسکتی۔ یاد رکھ ہماری زبانوں سے ماسوائے اس کے اور کچھ شنید نہیں ہو گا۔"

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

ادھر آ ستم گر ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

عمر نے بھلا ایسا جذبۂ استقامت پہلے کہاں دیکھا تھا۔ انہیں کیا خبر کہ جسے وہ نگاہِ ناز اِک جرعہ سے بھی نواز دیتی ہے پھر وہ ساری عمر مستِ شرابِ عشق رہتا ہے۔

راہ کی صعوبتیں، تکلیفیں، آلام کچھ بھی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

راہِ وفا میں ہر سو کانٹے دھوپ زیادہ سائے کم
لیکن اس پہ چلنے والے خوش ہی رہے پچھتائے کم

عمر نے فاطمہ کی زبان سے جب اعلانِ عزم و ثبات سنا تو نظریں لہو زدہ چہرے پہ جم گئیں۔ بہنوئی کے سینے سے اٹھے۔ آہستگی سے بولے جو کچھ تم پڑھ رہے تھے ذرا مجھے بھی سناؤ۔"

فاطمہؓ کے لبوں پر وحیِ مقدس کے شیریں الفاظ رواں ہو گئے۔

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ

الْعُلٰى ؁ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ؁ لَهٗ مَا فِی
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ
الثَّرٰى ؁ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ
اَخْفٰى ؁ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؁

کلامِ معجز نظام اپنا اثر دکھانے لگا۔ ابنِ خطاب کے دل کی دنیا بدلنے لگی۔ پیارے مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعائیں درِ قبول تک پہنچ چکی تھیں۔ اجابت نے آغوشِ رحمت وا کر دی تھی۔ آلائشِ کفر کا دھواں قطرہ ہائے اشک بن کر رواں ہو گیا۔

چند آیاتِ قرآنیہ کی شیرینی تمام عمر کی تندی و ترشی کا تریاق بن گئی ؎

تجھ کو خبر نہیں تری سادہ سی اک نظر
تصویرِ زندگی میں کئی رنگ بھر گئی

اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

نمی دانی کہ سوزِ قرأتِ تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئے:

"جانِ برادر تم نے جو کچھ سنایا ہے وہ واقعی حق ہے۔ میں بھی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے بتاؤ وہ مسیحا نفس کہاں ہے، جس کی بارگہِ فیض و عطا سے تمہیں یہ گنجینۂ اسرارِ ازل نصیب ہوا ہے۔"

حضرت خبابؓ جو اندر تشریف فرما تھے وہاں سے برآمد ہوئے۔

"عمر مبارک ہو تمہارے بختِ بامراد کو! زبانِ نبوت نے پیر کے روز جو دعا مانگی تھی وہ تمہارے حق میں قبول ہو گئی ہے۔"

عمر عاجزی سے التجا کناں ہوئے:

"بھائی مجھے اس رحمتِ تمام کا پتہ بتاؤ!"

خبابؓ کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ آتشِ عشق جو عمر کے سینے میں بھڑک اٹھی ہے اب کبھی سرد نہیں ہوگی ؎

عشق پہ زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

فرمایا: "رسولِ کرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اِس وقت کوہِ صفا پہ دارِ ارقم میں جلوہ فرما ہیں۔"

اب عمر از سرِ نو پیکرِ حسن و رعنائی کی تلاش میں تھے۔ منزل بھی وہی مسافر بھی وہی۔ ہاں مقصودِ سفر بدل چکا ہے۔ متلاشیٔ قہرالیم رہ نوردِ شوق بن گیا ہے۔ پہلے عداوت راہنما تھی۔ اب محبت مقتدا ہے۔

دارِ ارقم کے درِ سعید پہ دستک دی۔ لوگوں کو اندیشہ ہائے گوناگوں نے پریشان کیا۔ اللہ کے رسولؐ نے لوگوں کی یہ کیفیتِ اندیشہ و اضطراب دیکھی تو پوچھا" معاملہ کیا ہے؟"

" عمر دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔"

حضرت حمزہؓ بولے" تو کیا ہوا؟ دروازہ وا کر دو۔ اگر عمر ارادۂ بھلائی لیکر آیا ہے تو فبہا ورنہ اسی کی تیغ براں سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔"

کمانِ نبوت سے ایک اور ناوکِ نازو عطا نکلا اور سینۂ عمر میں پیوست ہو گیا۔

اَللّٰھُمَّ ھٰذا عمر بن خطاب اَللّٰھُمَّ اعزّ الدین بعمر بن خطاب۔

" بارالٰہا! یہ عمر ہے۔ اسے شرفِ اسلام بخش دے اور اس کے اسلام لانے سے پیغامِ رشد و ہدایت کی عزت افزائی فرما۔"

دروازہ کھل گیا۔ حمزہؓ نے دستِ باطل گرفت سے بازو پکڑ لیا اور بارگاہِ خیر الانام میں لے آئے۔ نگاہِ ناز اٹھی اور خرمنِ باطل کو خاکستر کر گئی۔ عمر پہ رعب و دبدبۂ نبوت کی وجہ سے کپکپی طاری تھی۔ ؎

خمیدہ سر، لب گریاں، نگاہ شرمندہ

دیارِ عشق میں کیا خوب باریاب ہوئے

سرکارؐ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دستِ مبارک بڑھا کر عمرؓ کی چادر اور تلوار کی پیٹی کو پکڑ کر زور سے کھینچا کہ وہ بے بس ہو کر گھٹنوں کے بل گر پڑے:

"عمر تم آلائشِ کفر سے روگردانی نہیں کروگے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ خدائے بے نیاز تم پر بھی ولید بن مغیرہ جیسا عذاب مسلط کر دے۔ اے عمر اسلام قبول کرلو۔"

زبانِ عمرؓ بے اختیار پکار اٹھی:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔"

یہ منظر کچھ اسقدر دلکشا اور رُوح پرور تھا کہ مسلمانوں پر ایک عالمِ کیف و سرور طاری ہو گیا۔ اُن کی زبانوں پر اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا کہ مکے کے در و دیوار اور کوچہ و بازار گونج اٹھے۔ آقا نے اپنا دستِ مقدس سینۂ عمرؓ پر رکھ دیا۔

ان لمحاتِ سعیدہ پر ہزاروں شب زندہ داروں کی عبادتیں قربان۔ جب مرتبہ دانِ اَلَمْ نَشْرَحْ کا دستِ معنبر عمرؓ کے سینہ پر ہولے ہولے گردش کناں تھا۔ اور زبانِ حق ترجمان سے کتنی پُرکیف دُعا نکل رہی تھی:

اللّٰھم اخرج ما فی صدرہٖ من غل وابدلہ ایمانًا۔

"اے ربِّ کعبہ و بطحا! اس کے سینہ میں کفر و شرک کی جتنی آلائشیں ہیں انہیں دُور فرما دے۔ اور اُن کے عوض میں اسے نورِ ایمان و ایقان سے معمور کر دے۔"

ماہتابِ بطحا کا چہرۂ جمیل خوشی سے دمک رہا تھا۔ مہ کامل کے اِردگرد نظر آنے والے ستاروں کے لبوں پر دلنواز تبسّم رقص کناں تھا۔ یہی نہیں عالمِ بالا کے مکین بھی فرطِ مسرت سے پیغامِ تہنیت ارسال کر رہے تھے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم لمّا اسلم عمرؓ

اتانی جبریل فقال استبشر اھل السماء باسلام عمر۔

(روایت ابن عباس، مستدرک، ابن سعد)

"اسی اثناء میں سید الملائکہ جبرئیل امین حاضر ہوئے اور خبر دی کہ یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلّم آج مکینانِ سماوات بھی فرحت و مسرت کے شادیانے بجارہے ہیں کہ عمرؓ اسلام لے آئے ہیں۔"

عمرؓ کے بخت رسا پر قربان جایئے۔ یہ سعادت کسی اور کو میسر نہ آسکی کہ رسولِ محتشم ﷺ دامنِ طلب پھیلا کر اُسے مانگا ہو۔

اے مُرادِ نبوت! ناز کیجئے اس بلندیٔ تقدیر پر آپ جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبیٔ مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے استفسار کیا:

"یارسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلّم) کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟"

آقائے نامدارؐ نے فرمایا:

"کیوں نہیں، قسم ہے اس خدائے برتر کی جس کے قبضہ و اختیار میں میری جان ہے، بلا شک وارتیاب ہم حق پر ہیں۔"

"تو پھر اے رسولِ مکرّم! کیوں نہ اس پیغامِ حق و صداقت کی تبلیغ اعلانیہ کی جائے۔"

سرکارؐ کی تو پہلے سے ہی یہی روش تھی۔ ہاں عام مسلمان ابھی اعلانیہ تبلیغ نہیں فرمایا کرتے تھے۔ لیکن اب تو دُعائے رسولؐ مستجاب ہو چکی ہے، سعادتِ اسلام نصیبِ ابن خطاب ہو چکی ہے۔ آقا نے اجازت دے دی:

"ہاں اب تم لوگ کھُلم کھُلا اسلام کی تبلیغ کر سکتے ہو۔"

تمام مسلمان دو قطاروں میں باہر تشریف لے آئے. ایک کے آگے عمرؓ تھے اور دوسری کی قیادت حمزہؓ کر رہے تھے. ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

جماعتِ مشرکین تو محوِ انتظار تھی کہ دیکھیے آج ابنِ خطاب کی شمشیرِ آبدار بے نیام تھی اور متلاشی خیر الانامؐ تھی، لیکن یہاں تو ماجرا ہی اور تھا. رنگ ہی جدا تھا.

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لبوں پر نامِ خدا تھا. چہرے پہ ایک نیا جوش و ولولہ تھا. صرف عمر ہی نہیں ہر نفس، قدسی صفت کی نگاہوں سے وہ جذبہ ترشح ہو رہا تھا کہ آفتاب و ماہتاب بھی نگاہیں ملانے کی جرأت نہ کر سکیں.

دنیائے کفر میں صفِ ماتم بچھ گئی. رنج والم چہروں سے نحوست بن کر ٹپکنے لگا. یہ شمعِ رسالت کو بجھانا چاہتے ہیں کہ اپنی تنویریں نہ پھیلائے. تجلیاں نہ بکھیرے. اس مقصدِ مذموم کے لئے انہوں نے دامنِ جبلِ ابی قبیس کا سب سے زور آور طوفان بھیجا تھا.

لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ صرصرِ کفر مسلمانوں کے لئے نسیمِ سحری بن جائے گی. اور نہ صرف یہ کہ قندیلِ تاباں گل نہیں کرے گی بلکہ بہت سے چراغوں کی آتشِ مدھم کو تیز کر دے گی. اتنا تیز کر دے گی کہ خرمنِ کفر کے خس و خاشاک اُن کی تپش محسوس کرنے لگیں گے.

اُسی دن قاسمِ خزانہ، قدرت نے عمرؓ ابن خطاب کو فاروقِ اعظم کے لقب سے مشرف کیا تھا.

" ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر وقلبہ وھو الفاروق. فرق اللہ بہ بین الحق والباطل ."

" اللہ نے عمرؓ کے دل و زبان کو حق سے زینت بخشی ہے. وہ فاروق ہے اور مولائے قدوس نے اس کے وجودِ مسعود کے ذریعے حق و باطل کے درمیان فرق واضح کر دیا ہے."

مسلمانوں کی مدت سے یہ خواہش تھی کہ وہ جبینِ نیاز میں مچلتے ہوئے سجدوں کو سنگِ

حرم پہ نچھاور کر سکیں۔ مقام ابراہیم اور قرب حطیم پر سر جھکائیں۔ اور سبحان ربی الاعلیٰ کے مقدس زمزمے سے مشامِ جاں کو معطر کریں۔ لیکن اب تک یہ خواہش قدیم پوری نہ ہو سکی تھی ۔

ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

لیکن جب عمر، فاروق بن کر نمودار ہوئے تو مرادِ رسول کے صدقے ان کی یہ مراد بھی برآئی۔

"واللہ ما استطعنا ان نصلی عند الکعبۃ ظاہرین حتیٰ اسلم عمرؓ۔

(مستدرک۔ ابن عبداللہ)

صہیب بن سنان فرماتے ہیں:

"بخدا ہم کعبہ کے پاس کھلے بندوں نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتے تھے یہاں تک کہ عمر ایمان لائے۔"

"لما اسلم عمرُ ظہر الاسلام ودُعی الیہ علانیۃ و جلسنا حول البیت حلقاً وطفنا بالبیت وانتصفنا ممن غلظ علینا۔"

"عمر کے اسلام لانے سے دینِ حق کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس کی تبلیغ علانیہ ہونے لگی۔ ہم حلقہ بنا کر بیت اللہ کے گرد بیٹھنے لگے۔ اس کا طواف کرنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو ہم پہ زیادتی کرتا اس کا بدلہ لینے کے بھی قابل ہو گئے۔"

بیادِ
فاروقِ اعظم رضؓ

وہ عمرؓ جس کے اعدا پہ شیدا سقر
اُس خدا دوست حضرت پہ لاکھوں سلام
ترجمانِ نبی، ہم زبانِ نبی!
جانِ شانِ عدالت پہ لاکھوں سلام

اعلیٰ حضرت بریلوی

تحریر: صاحبزادہ سید نصیر الدین گولڑہ شریف

فاروقِ اعظمؓ کی شخصیت

کسی باعظمت انسان کے اعترافِ عظمت کے لیے کسی باعظمت انسان کا ہونا ضروری ہے۔ میں نے کئی مرتبہ مصر کی روایتی بڑھیا کی طرح یوسف کی خریداری کا ارادہ کیا، مگر یہ سوچ کر کہ مدّاح اور ممدوح میں ذرہ و آفتاب کی نسبت بھی نہیں ہر بار یہ عزم توڑ دیا۔
ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ مگر آج ممدوح کے اخلاقِ کریمانہ اور اطوارِ بزرگانہ کا سہارا لے کر کلکِ ارادت کو قرطاسِ اخلاق پہ ناصیہ فرسا کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اگرچہ ممدوح کی ذات والا گہر میری تعریف کی محتاج نہیں بلکہ تعریف خود محتاج ہے۔ کیونکہ تعریف کسی انسان کو متعدد اوصاف سے مزین اور پیراستہ کرتی ہے مگر حسنِ خداداد مشاطہ کا منت پذیر نہیں ہوتا ؎

حسنِ کامل بے نیاز از منتِ مشاطگاں
کاملاں را احتیاجِ جبہ و دستار نیست

میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں اپنی تعریف سے ممدوح کو عزت بخشوں گا۔ بلکہ لفظ تعریف کی اس لیے عزت کی جائے گی کہ یہ لفظ فلاں ممدوح کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔
اسی لیے تو

بزیور ہا بیارا یند وقتے خوبرویاں را
تو سیمین تن چناں خوبی کہ زیور ہا بیارائی

چونکہ سلسلۂ شوق دراز ہوتا چلا جا رہا ہے اور بات طُول پکڑ رہی ہے۔ تو سنیئے میرے ممدوح، رُوحِ حکمت، زیبِ فقر، زینتِ اخلاص، اصل نجابت ممدوحِ ممدوحِ خلاقِ عالم، لوکان نبی بعدی لکان عمرؓ ہیں۔ سید نا عمرؓ کی ذاتِ عالی مرتبت مجموعہ اوصاف تھی چنانچہ وہ وسیع النظر، دقیق الفکر اور رقیق القلب ہونے کے ساتھ ساتھ قوی الجثہ، حدید البصر، ملیح الوجہ، صبیح العذار، قلیل الکلام کثیر الصمت بھی تھے۔ اگرچہ حالتِ ایمان میں تو ایک محیر العقول امتیاز کے حامل ہی تھے، تاہم حالتِ کفر میں پروقار مستقل مزاج عدل پسند، غریب پرور، گدا نواز، یار باش اور مرنجاں مرنج الشان تھے۔ فطری صلاحیتیں تو صغر سنی ہی سے سیمائے سعادت ریز سے ٹپک رہی تھیں، لیکن اب صرف ایک ایسے مربی مزاج داں کی ضرورت تھی جو ان جبلی قوائے خفیہ کو اپنے تصرفِ نظر سے منصۂ شہود پر لا سکے چونکہ

صلاحیت نباشد ہیچ شئے جز صحبت نیکاں
کہ قطرہ تا نیفتد در صدف گوہر نمی گردد

آخر ایک دن کا ترنشوی لذتِ ایمان چہ شناسی کے جادہ دراز کو طے کرنے والا عمرؓ جو والیانِ ملک اور اہل عرب میں اپنی دھاک بٹھائے ہوئے تھا اور جس کی جبین غیرت آگیں، سلاطین جبابرہ اور اہلِ دُول کے دروازوں پر خم نہیں ہو سکی آج وہ ایک مجسمہ حسُن، شاہِ خوباں اور بادشاہِ نازو ادا کے دروازۂ فیض انداز پر اپنا وہ خود دار اور غیرت سرشت سر جھکا رہا ہے۔

آپ کے مشرف بہ اسلام ہوتے ہی دنیائے اسلام میں ایک ایسا تحیر بداماں انقلاب و تغیر رونما ہُوا۔ کہ منارۂ عدل و انصاف پر لوائے گدا پروری جنباں ہو گیا اور نگارِ علم حریم دانش و فکر میں رقصاں ہو گیا، تیغ انصاف و عدالت نے ظلم وستم کا رگِ جاں سے گلا کاٹ دیا۔ جلالِ فاروقی سے نبضِ شرک میں بہکتا خون شدتِ ہراس سے قرعۂ زمہریری بن گیا۔

جبابرہ کی گردنیں خم ہو گئیں، عناد پسند عناصر اور رعونت سرشت فراعین بارگاہِ عجز و نیاز میں ایڑیاں رگڑنے لگے، ستم کی لچکتی کمانیں ٹوٹ کر رہ گئیں، بادۂ ہوش ربا کے حبابہائے بلوریں پارہ سیماب کی طرح تھر تھرانے لگے اور زہد و تورع کے پرچم لہرانے لگے۔

بزمِ عیش و عشرت میں رقصِ بتانِ آذری رعشۂ خوف بن کر رہ گیا دنائت کی نبضیں چھوٹ گئیں۔ شرافت کے جسم بے رُوح میں از سرِ نو خونِ نجابت پر افشاں ہونے لگا۔ زمین پر مسرت و شادمانی کی شہنائیاں بجائی گئیں، آسمان پر ملاء الاعلیٰ نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ پو پھٹی، ہوا کی شاخیں ہلیں، دریا بہے، پھول کھلے غنچے چٹکے طیور چہکے چمن مہکے، صنوبر و شمشاد نے بغلیں بجائیں، بتانِ گلفام کی میخانہ بدوش انکھڑیاں شراب کیف و وجدان کی جنوں بخش و خرد ستاں بارشیں برسانے لگیں، زلفِ علم و فکر فتنہ ان عصر کے شانوں پر لہرانے لگی شاہِ آفاق بصد فخر و مباہات خاور حسن سے اٹھلا اٹھلا کر طلوع ہونے لگا، ماہ ذرہ افروز ضیائے حرم بن کر دیر و بتخانہ کو بے نور و ظلمت آگیں کرنے لگا، انجم فلک افروز بدیدہ تحیر زمین کی طرف جھانک جھانک کر دیکھنے لگا زمین پر برنائیاں چھانے لگیں آسمان کو انگڑائیاں آنے لگیں ظلم، بال عنقا عدل ظلِ ہما کفر خانہ بدوش، ایماں نوائے سردش جبن لرزہ براندام، شجاعت تیغ بے نیام جہل مرغ پر شکستہ، علم شہباز کمر بستہ افلاس، قاتل مفرور دولت مرہم ناسُور خیانت، شامِ الم، دیانت، صبحِ وطن، محبت ابراہیم و دُود بغض و عداوت پشۂ نمرود، رعونت، مسلوب تکبر مغضوب، تشنفر، نابود، سُود بے سُود، حرام خواری کالعدم، رشوت ستانی، ندیم و ندم، صدق، مہر درخشاں، کذب، مُرغ پَر افشاں بن کر کرۂ ارض سے عنقا ہو گیا۔ آتشِ فسق و فساد پر نجابت دامن کا پانی پھر گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

نوعِ انسانی کو اندازِ تکلم آ گیا
وہ تکلم جس سے باتوں میں تحکم آ گیا
وہ تحکم جس سے لہجوں میں ترنم آ گیا
وہ ترنم جس سے موجوں میں تلاطم آ گیا

وہ تلاطم جس سے پیغامِ صبا آنے لگا
وہ صبا جس میں پرِ جبریل لہرانے لگا

نہ جانے کتنے یتیموں، بیواؤں، بے گھروں اور خانہ بدوشوں کے ڈوبتے ہوئے دلوں سے صدائے آفرین نکلی ہو گی۔ کہ آج وہ قاطعِ ظلم اور قامعِ ستم محمد کا خدا سے مانگا ہوا عمرؓ سریرِ عدالت پر متمکن ہونے والا ہے۔ کہ رہتی دنیا تک اربابِ نظر اس کی محبت کا دم بھرتے رہیں گے اور جس کی خاکِ کفِ پا کو اولیائے کاملین اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنائیں گے۔ اللہ اللہ عمرؓ کا اسم گرامی اہلِ دل کے لیے حرزِ جاں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عمر کے دشمنوں کے لیے جو کسی صورت عمر کا نام لینا تو درکنار تصورِ عمر سے بھی چین بہ جبیں ہوتے ہیں۔ میر قضا کا یہ فیصلہ اور واضعِ لغت کا یہ کرشمہ قابلِ التفات ہے۔ کہ اُن دشمنانِ عمرؓ کی مدتِ حیات کا نام عمر رکھ دیا۔ تاکہ جس وقت دشمنانِ عمر سے اُن کی عمر کا سوال کریں گے تو نعم البدل لفظ نہ ملنے کی صورت میں عمر کا لفظ استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ فاروق اعظم کے اسم اعظم کی شان تو یہ تھی کہ اب آپ مسمیٰ کے مدارجِ علیا کا اندازہ خود لگا لیں۔ قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا ،

یہ سیدنا عمرؓ کی ایک بیّن اور مستند کرامت نہیں تو اور کیا ہے ؟

بہر صورت وُہ دل والوں سے دل کو چھین لیتے ہیں مچل کر مسکرا کر، روٹھ کر تن کر خفا ہو کر

تدبر کا یہ عالم کہ بڑے بڑے سیاست دان ملکی معاملات میں حضرت کے محتاجِ توجہ رہتے وجاہت ایسی کہ شیطان اُن کو دیکھتے ہی واہمۂ لات وہبل بن جاتا۔

عدل ایسا کہ اگر ایک پیر زن دروازۂ فیض اندازہ پر مصروفِ فغاں ہوتی تو عمرؓ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

پیر زن کی آہ جس کی رُوح کو تڑپا گئی
جس کو غیروں کے الم پر جھرجھری سی آ گئی

صداقت ایسی کہ جب سرِ منبر ایک شخص کے سوال پر آپ نے جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ بیت المال سے عمر اور عوام الناس کا حق برابر ہے، رہا قمیض کا سلسلہ تو میرے لڑکے نے اپنے حصے کا کپڑا مجھے دیا، اس لیے میری قمیص لانبی ہے ۔

سادگی کا یہ عالم کہ اگر مسجد میں نیند آگئی تو وہیں محوِ خواب ہو گئے اور اگر ایک سایہ دار درخت کے نیچے جگہ پائی تو اینٹ کا تکیہ رکھ کر سو گئے۔

مساواتِ محمدی کا صحیح منظر یہ کہ

واہ کس شان سے امت کا امام آتا ہے۔ آپ پیدل ہے سواری پہ غلام آتا ہے مگر آج کی مساوات کا تصور سراسر دینِ متین اور ملتِ بیضا کے خلاف ہے۔ اُس مساوات میں نفسِ ایمان کی حیثیت سے عمرؓ اور پیغمبر کی ذات برابر تھی مگر فطری خصوصیات اور مدارجِ ذاتیہ کی نسبت زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کیونکہ

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر فرقِ مراتب نکنی زندیقی

آج کل ذہنی مساوات کا دور دورہ ہے، عملی تو ہو ہی نہیں سکتی

نیاز کا یہ عالم کہ وفات سے چند گھنٹے پہلے اپنے صاحبزادے کو حضرت عائشہؓ کے دروازے پر جوارِ رحمت میں دو گز زمین کی اجازت کے لیے بھیجتے ہیں تاکہ عمر نے جس محورِ حسن کا ساری رات طواف کیا آج عمر کی لاش بھی اُس کے قریب تر سپردِ خاک کی جائے۔

دفن کرنا مری میت کو بھی میخانے میں
تاکہ میخانے کی مٹی رہے میخانے میں

اب وہ انفاس کی نجابت فکر کی صحت، عقول کی فراست قلوب کی طہارت کردار کی عظمت کہاں رہی بقولِ اکبر؎

رہ گئے کم عمر بی شعر سمجھنے والے
چل بسے گیسوئے لیلےٰ میں اُلجھنے والے

اب وہ دور کہاں کہ اہل علم وفضل کو موتیوں میں تولا جائے اور بزرگی بہ عقل نہ بسال کے اِس قولِ زریں کے پیشِ نظر ہر کہہ و مہہ خرد و بزرگ شیخ و شاب شاہ و امیر و غریب کے قولِ مُفتی بہ کو بہ چشمِ انصاف و صحت دیکھا جائے۔ سیدنا عمرؓ کا یہ استقلال اور یہ عزم ان کی صداقت اور حق کا نتیجہ ہے۔

کیوں کہ انسان کی جاسوس نگاہیں دوسرے کے معائب اور خامیاں جلدی دیکھ لیتی ہیں، مگر جب اپنی چوریاں پکڑنے کے لیے کچھ دیر اپنی گھات میں بیٹھا جائے تو ہزاروں معائب دامن زہد پر شراب ناب کے چھینٹے بن کر اُبھر آتے ہیں نظیری نے خوب کہا۔

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یکدم منافقانہ نشیں در کمیں خویش

یہی وجہ تھی کہ ایسے مشفق و مہربان خلیفہ کی وفات پر اغیار تک کی آنکھوں سے اشکِ غم بہہ نکلے کہ ؎

آنکھوں میں آکے کون الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے

اب اس عمر کی نظیر بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے، زمانے نے ایک ایسا عمر پیدا کیا تھا کہ جس کا ذکر رہتی دنیا تک صفحہ ہستی سے نہیں مٹ سکتا، اب شاید ہی کوئی ایسا مجموعہ اوصافِ انسان دیدۂ روزگار سے گزرے ؎

مدتوں روتی ہے چشم حسرت اہل چمن
سالہا رہتے ہیں گریاں دیدہ چرخ کہن
تب کہیں ہوتا ہے پیدا ایک نخلِ گلبدن
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن
زندگی رہتی ہے برسوں غوطہ زن در خاک وخوں
تاز بزم عشق تک دانائے راز آید بروں

چونکہ سیدنا عمرؓ کے مناقب دائرہ قرطاس میں نہیں سما سکتے اس لیے یہ کہہ کر اپنا قلم روکتا ہوں۔

خامۂ بشکستیم ولب بستیم از تعریف دوست
کیں نہ در تحریر ما گنجد نہ در تقریر ما

پروفیسر ڈاکٹر پروفیسر ڈاکٹر غلام جیلانی برق

فاروقِ اعظمؓ کے کارنامے

تحریر: پروفیسر غلام جیلانی

اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ صحابہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، سب سے بڑا زاہد، عادل، فقیہہ، فاتح، سیاست دان، مدبر اور مقبول کون تھا؟ تو جواب ہوگا عمر فاروق اعظمؓ زاہد تو اور بھی ملیں گے، لیکن وہ فاتح نہیں ہوں گے اگر فاتح ہیں تو بعض دیگر اوصاف سے خالی ہوں گے ہماری تاریخ میں حضرت عمرؓ وہ واحد شخصیت ہیں جو اوصافِ بالا کا حسین وجمیل امتزاج تھے۔ آپ کا خصوصی وصف حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا آپ لطیف غذا، عمدہ لباس اور دیگر سامانِ شان و شوکت سے محض اس لیے دُور رہتے تھے۔ کہ حضور اور اُن کے بعد حضرت صدیقؓ نے اِن چیزوں سے اجتناب کیا تھا۔ ایک دفعہ چند افراد نے فاروقِ اعظم کی دختر حضرت حفصہؓ سے کہا کہ اپنے والد کو اچھا کھانے اور پہننے کی ترغیب دیجیے۔ آپ نے یہ بات اپنے والدِ محترم سے کہی تو انہوں نے فرمایا۔

اے دُخترِ عمر! تم جانتی ہو کہ حضور رسالت مآب اور خلیفۂ اول نے کتنی زاہدانہ و غریبانہ زندگی گزاری تھی اور میری آرزو بھی یہی ہے کہ میں ان عظیم شخصیتوں کا اندازِ زندگی اختیار کر دوں۔"

(طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۷۷)
ایک مرتبہ کسی اور صحابی نے یہی بات کہی تو فرمایا۔
کیا تم مجھے اُن لوگوں میں شامل کرنا چاہتے ہو جن کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ..... احقاف : ۲۰)

(تم دنیوی زندگی میں اچھی چیزوں سے لُطف اندوز ہو چکے ہو اس لیے آج تمہیں ذلت کی مار دی جائے گی)

علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ آپ کا روزانہ خرچ صرف دو درہم یعنی سات آنے تھا۔ اگر وقت مِل جاتا تو مزدوری کر کے یہ رقم خود کما لاتے ورنہ بیت المال سے لے لیتے۔
(الفاروق صہ ۲۷۴)

روایت ہے کہ ایک مرتبہ قیصر روم کا سفیر مدینہ میں وارد ہُوا۔ اور کسی سے پُوچھا کہ تمہارے شہنشاہ کا محل کہاں ہے؟ اُس نے کہا ہمارے ہاں نہ کوئی شہنشاہ ہوتا ہے اور نہ محل۔ البتہ ایک خادم ضرور ہے جسے ہم خلیفہ کہتے ہیں اور وہ اُس وقت سامنے کی گلی میں گارا اُٹھا رہے ہیں۔ سفیر نے وہاں جا کر پوچھا تو کسی نے کہا کہ وہ سامنے دیوار کے سائے میں ریت پہ لیٹے ہوئے ہیں۔ سفیر کہنے لگا۔

"کیا یہ ہے وہ انسان جس کی ہیبت سے دنیا کے فرمانرواؤں کی نیند اُڑ چکی ہے۔ اے عمرؓ تو نے انصاف کیا اور تمہیں گرم ریت پر نیند آگئی۔ ہمارے بادشاہوں نے ظلم کیا اور انہیں سنگین حصاروں میں سمور و کمخواب کے بستر پر بھی نیند نہ آسکی۔"

(دانش عرب و عجم، صفحہ ۱۶۱)

حضرت عمرؓ ہماری تاریخ کا روشن ترین باب تھے۔ اگر اس باب کو تاریخ سے نکال دیا جائے تو ہماری تاریخ تاریک سالوں کی لپیٹ میں آجائے گی۔ اور ہم ایک ایسی شخصیت

سے محروم ہو جائیں گے۔ جس کی فتوحات، عدل و انصاف، رعایا پروری، زہد، انکسار، تدبر، سیاست دانی اور عشق رسولؐ کی کہانیوں سے فضائے گیتی آج تک گونج رہی ہے ہم بے خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ عمرؓ جیسا گلیم پوش فاتح اور عادل حکمران کسی قوم کی تاریخ میں موجود نہیں ہم ان کے کارناموں پر نازاں ہیں اور بہت نازاں ۲۵ لاکھ مربع میل سلطنت کا مقتدر فرمانروا پھٹا پرانا لباس پہنے، کبھی مسجد کی سیڑھیوں اور کبھی سایہ دیوار میں سویا نظر آتا ہے۔ ستو یا کھجور کھا کر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے اپنا ہو یا پرایا۔ گورنر ہو یا کوئی مزدور کسی سے کوئی رعایت نہیں کرتا۔ عمال کو باریک کپڑا پہننے، چھنا ہوا آٹا کھانے ترکی گھوڑے پر سوار ہونے اور رہائش گاہ کے سامنے حاجب رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جب آپ تک یہ خبر پہنچی کہ ایران کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص نے مکان کے سامنے ایک ڈیوڑھی بنا لی ہے اور دربان رکھ لیا ہے تو آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ کو بھیجا کہ مکان کو جلا دے اور ایسا ہی ہوا۔ (عمر فاروق ص ۱۹۰)

حضرت عیاضؓ بن غنم الجزیرہ (عراق کا حصہ) کے گورنر تھے۔ کسی نے فاروقِ اعظم کو اطلاع دی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں۔ آپ نے محمد بن مسلمہ کو بھیجا کہ انہیں جس حال میں پائے پکڑ لائے جب وہ خلیفہ کے سامنے پیش ہوئے تو خلیفہ نے اُن کے باریک کپڑے اتروا کر موٹے کمبل کا ایک کرتہ پہنا دیا۔ اور ہاتھ میں ایک لاٹھی دے کر کہا۔ کہ تم انسانوں پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہو۔ اس لیے آج سے بیت المال کے ریوڑ چراؤ۔

(عمر فاروق ۱۸۹)

عہدِ فاروقی میں جزیرہ نمائے عرب نے تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی زقند لگائی جس کی مثال کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی یہ زقند انتشار سے اتحاد، جہالت سے علم وحشت سے تہذیب بدویت سے حضارت، قبائلی زندگی سے وحدت آدم مادیت سے روحانیت، بت پرستی سے خدا پرستی بدکاری سے پرہیزگاری اور قبائلی آمریت سے جمہوریت تک تھی یہ نتیجہ تھا قرآنِ حکیم کی مقدس تعلیم کا جسے عملی صورت دینے میں حضرت عمرؓ نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ اور اس پیغام کو عرب سے باہر ایران، شام، ایشیائے صغیر اور چین

کی مغربی سرحدات تک پہنچا کے چھوڑا۔

رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ عمرؓ کیا تھے؟ جواب ملتا ہے کہ وہ کیا نہیں تھے۔ وہ نوشیرواں سے بڑے عادل سکندرِ اعظم سے بڑے فاتح، سلمان سے بڑے زاہد، سولن[1] اور حمورابی[2] سے بڑے قانون ساز اور بزرجمہر (نوشیرواں کا وزیرِ اعظم) سے بڑے مدبّر تھے۔ یہ ان کے حُسنِ تدبیر فراست اور سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا کہ ان کی حکومت شمال میں اناطولیہ، جنوب میں ہندوکش، مشرق میں چین اور مغرب میں درّہ دانیال تک وسیع ہو گئی تھی۔

وُسعتِ سلطنت کا راز

پچھلی دو صدیوں میں یورپ کی بعض اقوام مثلاً برطانیہ، فرانس، بلجیم، اٹلی، ہالینڈ اور پرتگال نے افریقہ و ایشیا کے بہت سے حصّوں پر قبضہ کر لیا تھا باوجود کہ یہ اقوام تمام جدید علوم و فنون سے آراستہ اور مہیب اسلحہ سے مسلح تھیں ان کا تسلط دیر پا ثابت نہ ہوا اور یہ بہت جلد اپنی مقبوضات کو چھوڑنے پہ مجبور ہو گئیں اس کی وجہ ایک ہی تھی کہ ان اقوام کا مقصد مفتوحہ ممالک کی خدمت نہیں بلکہ استحصال یعنی لوٹ کھسوٹ تھا۔ دوسری طرف مسلمان اپنے ساتھ اشیائے ذیل لے کر گئے تھے۔ وہ جہاں جہاں پہنچے دنیا نے انہیں دیدہ دل میں جگہ دی۔

(الف) ایک روشن اور سیدھا سادہ دین جس کی ہر ہدایت کا لازمی نتیجہ فلاح، سعادت اور کامرانی تھا۔

(ب) ایک عادلانہ نظام حکومت جو بادشاہ وگدا میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا تھا اور جو ہر

---

[1] قدیم یونان کا ایک مقنن جس نے یونان کا پہلا دستور اور ضابطۂ قوانین تیار کیا تھا۔ اس کی ولادت ۶۳۹ ق م میں ہوئی تھی اور وفات ۵۵۹ ق م میں (برطانیکا)

[2] بابل کا ایک بادشاہ جو ۲۲۲۳ ق م میں فوت ہوا۔ یہ عمارات کا شوقین اور بہت بڑا فاتح تھا۔ نیز قانون دان (پیلیز انسائیکلو پیڈیا م۱۱۱)

قسم کے استحصال سے پاک تھا۔

(ج) ایک ایسا پیغام جو انسان کی رُوحانی و اخلاقی بلندی کا ضامن تھا۔

(د) ایک ایسا علم جس کی روشنی سے زندگی کی شاہراہ چمک اٹھی تھی اور اُجالے لامکاں تک پھیل گئے تھے۔

(ہ) ایک ایسی تہذیب جس کی بنا طہارت و تقدس پر ڈالی تھی۔

(و) ایک ایسا نظامِ عبادت جس نے بندوں میں ذوقِ خدائی پیدا کر دیا تھا اور اُن کے دست و بازو میں وہ قوت بھر دی تھی کہ ؎

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ اِن کی ہیبت سے رائی

(ز) ایسے منور چہرے، سفید عمامے اور خوبصورت داڑھیاں کہ جس کی نظر پڑتی، قربان ہو جاتا۔

؎ انہیں دیکھا تصدق کر دیا دِل
کسی کو کیا، مری آنکھیں مرا دِل (داغ)

(ح) اُس وقت دُنیا میں ہر جگہ حریص، عیاش، بدچلن، بوالہوس اور ظالم بادشاہوں کی حکومت تھی۔ جن کی دراز دستی، فحاشی اور لوٹ مار سے دنیائے انسان از بس نالاں تھی جب مسلمان اپنے ہمراہ جذبۂ خدمت، حسین کردار، عدل، علم، عبادت اور قلندری لے کر نئے ممالک میں پہنچے تو دنیا اُن پر ٹوٹ پڑی اور اُن کے طرزِ حیات کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ وہ لوگ ترکی، شام، عراق، اُردن، ایران، فلسطین اور شمالی افریقہ میں آج سے چودہ سو سال پہلے پہنچے تھے اور آج تک وہیں ہیں گو آج اُن کے کردار میں وہ عظمت باقی نہیں رہی تاہم دنیا اُن سے بدستور متاثر ہو رہی ہے۔ برِصغیر میں ان کی تعداد اکیس کروڑ ہو چکی ہے اور افریقہ کا سیاہ براعظم بڑی تیزی سے اسلام قبول کر رہا ہے۔ آج (۱۹۷۴ء) اس کی آبادی ۳۵ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور مسلمانوں کی تعداد ۲۵ کروڑ سے کم نہیں۔ اسلام تیزی سے وسطی افریقہ کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے ماریطانیہ، مالی، نائجر، نائجیریا

سینیگال، اپر والٹا، آئیوری کوسٹ چاڈ، غانا، صومالیہ، یوگنڈا، ٹوجو اور دوسری اسلامی ممالک بن چکے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ کانگو اور کینیا کے شمال میں اسلامی ریاستیں ہیں اور جنوب میں غیر اسلامی۔ جن کی طرف اسلام تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

خطبہ خلافت

آپ کی سیرت پر اس خطبہ سے بھی روشنی پڑتی ہے جو آپ نے مسندِ خلافت سنبھالنے کے معاً بعد دیا تھا۔ فرمایا

" اے لوگو! میں تمہی میں سے ایک ہوں۔ اگر میں خلیفہ رسول (حضرت ابوبکرؓ) کی حکم عدولی کر سکتا تو بارِ خلافت کبھی نہ اٹھاتا یا اللہ میں سخت ہوں مجھے نرم کر۔ کمزور ہوں، قوت دے۔ بخیل ہوں سخی بنا۔ اللہ نے میرے دو رفقا (حضور و صدیق) کو اٹھا کر اور مجھے باقی چھوڑ کر میرے ساتھ تمہیں اور تمہارے ساتھ مجھے ابتلا میں ڈال دیا ہے۔ خدا کی قسم میں تمہاری ہر مشکل کو حل کروں گا اور دیانت و امانت کو کسی صورت ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ تمہارا ہر کمزور آدمی میرے نزدیک اس وقت تک قوی ہو گا۔ جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور ہر طاقتور اس وقت تک کمزور رہے گا۔ جب تک میں اس سے حق نہ وصول کر لوں۔" (طبقات ج ۳، ص ۲۷۳)

فاروق اعظمؓ کے اقوال

آپ کے چند اقوال سیرت نگاروں نے محفوظ کر لیے ہیں مثلاً

- خدا اس شخص کا بھلا کرے جو میرے پاس میرے عیوب کا تحفہ بھیجتا ہے۔
- کسی کی دیانتداری پر اس وقت تک اعتماد نہ کرو جب تک وہ لالچ سے آزاد نہ ہو جائے۔
- جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ اپنا اختیار اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے اور

راز ظاہر کرنے کے بعد اپنا اختیار دوسرے کو دے دیتا ہے۔

- نیکی کے بدلے نیکی کرنا تو نیکی کا حق ادا کرنا ہے اصل نیکی وہ ہے جو بدی کے جواب میں کی جائے۔
- حلال و حرام ایک جگہ جمع ہو جائیں تو حرام غالب آجاتا ہے۔
- تین چیزوں سے محبت بڑھتی ہے مجلس میں دوسرے کو بیٹھنے کی جگہ دینے۔ سلام کہنے، اور اچھا نام لے کر پکارنے سے۔
- تھوڑی دنیا لو تو آزاد رہو گے، زیادہ لو گے تو پا بند ہو جاؤ گے۔
- چند چیزیں چند دیگر چیزوں کے بغیر قبیح معلوم ہوتی ہیں۔

علم	پرہیز گاری کے بغیر
بادشاہ	انصاف کے بغیر
درویشی	قناعت کے بغیر
تونگری	بخشش کے بغیر
اور مرتبہ	تواضع کے بغیر

- کم کھانا صحت، کم بولنا حکمت اور کم سونا عبادت ہے۔

اوّلیاتِ عمرؓ

چند چیزیں ایسی ہیں جن کی ابتدا حضرت فاروق اعظمؓ نے کی تھی مثلاً

(ا) سالِ ہجری سے پہلے تعیینِ واقعات کے لیے عام الفیل اور رومیوں کے سال سے کام لیا جاتا تھا۔ ۱۶ھ میں حضرت عمرؓ نے سالِ ہجرت کی ترویج کی اور یہ آج تک جاری ہے (ہیکل ص ۵۸۰)

(ب) آپ نے حکم دیا تھا کہ تمام غلاموں کو آزاد کر کے اُن کے گھروں میں بھیج دیا جائے۔ (ایضاً ۵۷۹)

(ج) محکمہ قضا سب سے پہلے آپ نے قائم کیا تھا اور ان صحابہ کو قاضی مقرر فرمایا تھا۔

و قاضی شریح کو کوفہ میں
و ابو موسیٰ اشعری کو بصرہ میں
و قیس بن ابی العاص سہمی کو مصر میں
اور ابو الدرداء کو مدینے میں (ایضاً ۶۰۴)

(د) وظائف کا سلسلہ آپ ہی نے شروع کیا تھا اور تمام صحابہ وصحابیات کی حسب مراتب تنخواہیں باندھ دی تھیں۔

(ا) حضرت عباسؓ کی بارہ ہزار درہم سالانہ
(ب) امہات المومنین کی دس دس ہزار
(ج) شرکائے بدر اور امام حسنؓ، امام حسینؓ کے پانچ پانچ ہزار درہم سالانہ
(د) شرکائے احد کے چار چار ہزار درہم سالانہ
(ہ) فتح مکہ سے پہلے کے مہاجرین تین تین ہزار درہم سالانہ
(و) جو لوگ فتح مکہ کے دن ایمان لائے دو دو ہزار درہم سالانہ
(ز) اہل بدر کی اولاد دو دو ہزار درہم سالانہ
(ح) انصار ومہاجرین کی بیویاں دو سو سے چار سو درہم سالانہ
(ط) نومولود سو درہم اور بچہ دو سو درہم۔ (ایضاً ۶۱۵)

(ک) وظیفہ خوروں کے رجسٹر تیار کرائے تھے اور فرمایا تھا کہ اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو مفلس ترین آدمی کو دولتمند ترین کے مساوی کردوں گا (ایضاً ۶۱۷)

(ل) بیت المال قائم کیا۔ (الفاروق ص ۲۷۷)
(ز) زمینوں کی پیمائش کرائی۔ (ایضاً ")
(ح) مردم شماری کرائی نہریں کھدوائیں، نئے شہر آباد کیے (مثلاً کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط وغیرہ) جیلخانے بنوائے۔ فوجی چھاونیاں قائم کیں۔ پرچہ نویس مقرر کیے (ایضا ۲۷۸)
(ط) مکہ سے مدینہ تک مسافروں کے لیے سرائیں بنوائیں۔ (ایضاً ص ۲۷۸)

(ک) نمازِ تراویح کو لازمی قرار دیا۔

(ل) شراب نوشی کی حد مقرر کی

(م) نمازِ جنازہ میں چار تکبیر پہ اجماع کرایا۔

(ن) قصائد میں عورتوں کا نام لینا جُرم قرار دیا۔ (الیضاً ص ۸ ۲۷)

اولیات کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے لیکن ہم انہیں از خوفِ طوالت نظرانداز کرتے ہیں۔

طلوع و غروب

فاروقِ اعظمؓ کی ولادت ۸۲ ۔ ۵۸۰ء میں ہوئی تھی ۶۱۶ء میں اسلام لائے اس وقت ان کی عمر چھتیس سال تھی۔ ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ (۶۳۴ء) کو مسندِ خلافت سنبھالی دس برس چھ ماہ اور چار دن کے بعد ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ء کو شہید ہو گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

زمانہ ہزار کروٹ لے، حالات لاکھ بدلیں۔ لاتعداد انقلابات آئیں۔ ارتقائے انسانی کوئی رُخ اختیار کرے۔ عمرؓ جیسا زاہد، عادل، فقیر، خاک نشین اور عابد سلطان و فاتح شاید ہی پھر کبھی آئے۔

فاروقِ اعظمؓ اور کفالت نامہ

تحریر: مولانا نعیم صدیقی

ابتدائیہ

پہلے پہل آدمی شوق سے لکھتا ہے، پھر لکھنا فرض ہو جاتا ہے

اور آخر میں وہ مرحلہ آتا ہے جب قلم کش دردِ پنہاں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کلکِ خونچکاں کا سہارا لیتا ہے۔

میرے لیے ضیائے حرم کے فاروقِ اعظم نمبر کے لیے جو چیز لکھنے کی محرک بنی ہے وہ بس ایک تپشِ مسلسل اور خلشِ بے پایاں ہے۔ یہ تپش اور یہ خلش عطیہ ہے اس طاغوتی ماحول کا جس نے انسانیت کو باطل افکار کی تاریک فصیلوں میں محصور کر کے اس کے گرد اخلاقی غلاظتیں جمع کر رکھی ہیں۔ آنکھیں نور کی ایک کرن کے لیے ترس گئی ہیں، کان ایک ذرا سے حرفِ دلبرانہ کے پیاسے ہیں، ناک رقاصۂ ثقافت کے بدن سے اٹھنے والی بدبو سے پھٹی جا رہی ہے۔ تلووں میں دشتِ تہذیب کے رنگین کانٹے ہیں، بدن سیاست کے تازیانہ ہائے تشدد سے لہولہان ہے۔ دامان تار تار پر ملحدانہ ادب اور دروغ افروز صحافت اور نفرت زدہ خطابت کی اچھالی ہوئی گندگی کے چھینٹے پھیلے ہوئے ہیں پیٹ حلال کے ایک ایک لقمے کے لیے قراقرِ گرسنگی کا شکار ہے۔ دماغ میں گرہ در گرہ

سوالات مار ہائے پیچاں کی طرح اذیت دے رہے ہیں اور لبِ اظہار کا یہ ابتلا کہ اذنِ فغاں بھی نہیں۔

ایسے میں جی چاہتا ہے کہ افق کے اُس پار اگر میری آواز پہنچ سکے تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پکاروں اور سنتِ الٰہی اگر اس شہید جلیل کو اجازت دے تو یہ دعوت دوں کہ خدارا اس فتنۂ دہر کی نگری میں ظہور کیجیے، اپنا بوریائے خلافت بچھایئے، اپنی پیوند زدہ قبا کی سرسراہٹ سے منعمین و مترفین کو شرمسار کیجیے، اور اپنا کوڑا لہرا کر عدل و احسان کا وہی نظام ایک بار پھر ہمارے اُوپر جاری فرمایئے جس میں انسان تو کیا بیت المال کے اُونٹوں اور گھوڑوں تک کو بھی اطمینان تھا کہ ان کی خبر گیری کے لیے خلیفہ وقت بہ نفسِ نفیس خادمانہ کردار انجام دینے کو موجود ہے ہاں اگر ایسا ہو سکتا تو میں ہزار نالہ ہائے نیم شبی کے ساتھ پکارتا کہ اے فاروق اعظم! آیئے اور ایک طرف اس دور کے قیصر و کسریٰ کو سرنگوں کر دیجیے اور دوسری طرف امتِ محمدیہؐ کو ان سفہاء و منافقین سے نجات دلایئے جو اسلام کا نام لے لے کر عین اسلام کے روئے زیبا پر زخم لگاتے ہیں۔

پھر سوچتا ہوں کہ اگر مشیت کی طرف سے ایسا ممکن بھی ہوتا تو کیا عظمتِ فاروقی ہمارے درمیان ظہور کرنے پر راضی بھی ہو سکتی؟ ہمارا حال یہ ہے کہ ہماری شامتِ اعمال اب ہمیں اس مقام تک لے آئی ہے کہ ہم اپنے رسُولِ مقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عطا کردہ نظامِ حیات کے اصُول و مقاصد سے منہ موڑ کر تہذیب الحاد کے دروازے پر نظریات کی بھیک مانگنے کے لیے دستک دے رہے ہیں۔ اپنی تاریخ کے روشن ترین ابواب سے ہم نے اپنا ذہنی تعلق توڑ لیا ہے۔ اور ہم نے چاند تاروں کی سی لمعانی رکھنے والی اپنی عظیم شخصیتوں کو فراموش کر دیا ہے جنہوں نے انسانی زندگی کو اس کی انتہائی رفعتوں تک پہنچایا اور آج دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی خیر موجود ہے، اس کی بقاء میں ان کی قربانیوں اور جانفشانیوں کا حصّہ شامل ہے۔

اگر ہماری نگاہیں اپنی تاریخ میں خلافتِ راشدہ کے زریں باب پر مرتکز رہ سکی ہوتیں اور خصوصاً ہم دورِ فاروقی کی سعادات و برکات کا اندازہ کر سکے ہوتے تو آج ہماری یونیورسٹیوں

میں خلافتِ راشدہ کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت حاصل ہوتی اور اس وسیع موضوع کے علاوہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت آپ کے کارناموں، آپ کی شانِ قیادت اور آپ کی سیاسی، جنگی، معاشی، معاشرتی انتظامی اور روحانی و اخلاقی حکمت پر ریسرچ کا وسیع کام جاری ہوتا اور ہر چہار جانب بہت سے علمی و تحقیقی ادارات دورِ فاروقی کا ایک ایک پہلو قوم اور ساری دنیا کے سامنے اُجاگر کر رہے ہوتے[1] ایسا ہوتا تو آج ہمارا ہر بیدار دل نوجوان مغربی تہذیب اور کمیونزم کے رتھ کھینچنے والے قلیوں میں شریک ہونے کے بجائے پوری خود اعتمادی کے ساتھ دنیا کے سامنے نظامِ خلافتِ راشدہ کا علم لہراتا پھر رہا ہوتا۔

آج ہمیں نبی اکرمؐ اور آپ کے خلفائے محترم کے چلائے ہوئے نظام سے رُوگردانی کر کے اغیار کی ذہنی غلامی کے نتیجے میں جو نعمتیں دورِ حاضر نے دی ہیں، وہ ہمیں بھوک، افلاس نفرت، تشدد، آمریت جبریت، خیانت، نفاق، تفرقہ، تصادم، فحاشی، بدکاری جرمِ فساد تشکک، اضطراب، انتشار ہر جہتی خوف مایوسی اور پورے کرۂ ارضی پر مسلسل جنگیں ہیں۔ انقلابات ہیں خون ریزیاں ہیں، سازشیں ہیں، انسانی حقوق کی پامالیاں ہیں۔ نسلوں اور طبقوں کے تصادم ہیں، قوموں اور ملکوں کی تقسیمیں ہیں، بنیادی انسانی رابطوں کی تباہی ہے۔ پروپیگنڈے کے نام سے جھوٹ اور فریب کا سیلاب امڈ رہا ہے اور پیسے کے بُت کے آگے انسانی شرف و کرامت کا سر جھک رہا ہے۔

آؤ سنو! تاریخ کے ایوان میں فارُوقِ اعظم کی جگمگاتی شخصیت تمہیں پکار رہی ہے کہ اٹھو اور طاغوت کے اس عالمگیر طلسم کو پاش پاش کر دو جس نے تمہارے دل و دماغ کو مسخ کر دیا ہے۔ ابھرو! اور اس منحوس مگر نظر فریب تہذیب کے خلاف بغاوت کر دو جو نظریاتِ باطل کے اصنام کو عقلیت کے بہروپ تانے میں مرغوب کن فلسفوں کے زرق

---

[1] لکھتے لکھتے دل میں یہ خواہش بھی آئی کہ کاش کہ اس مجوزہ مہم کا پہلا معرکہ صاحبِ ضیائے حرم سر کر ڈالیں محترمی پیر محمد کرم شاہ مدظلہٗ ہر لحاظ سے اس مقام پر ہیں کہ فاروقِ اعظم اکیڈیمی کی تاسیس کر ڈالیں۔ آغاز چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو لیکن اگر حرکت شروع ہو جائے تو معاملہ ایک لٹو کی طرح ہوگا کہ نیچے باریک نوک ہوتی ہے اور اوپر پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے (ن ص)

برق لباس پہنا کر علوم کے اسٹیج پر لاتی ہے اور جس کا منتہا تخریبِ انسانیت کے سوا کچھ نہیں

میں از خود وارفتگی کے عالم میں تمہید کے ظرف سے کچھ زیادہ لکھ گیا ہوں اب میں اس فقرے پر بات ختم کرتا ہوں کہ

ہماری دنیا ایک فاروقِ اعظم کا انتظار کر رہی ہے۔

اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں

ہم کسی بھی مسلم حکمراں کے کام کی جانچ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک یہ متعین نہ ہو کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

مشہور آیت سامنے آتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔۔۔۔۔ (الحج ۔ ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں غلبہ عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے۔ زکوۃ دیں گے معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔

اس آیت سے اسلامی ریاست کی چند ذمہ داریاں واضح ہیں۔ جو اس کے حکام اور عوام پر مجموعی طور پر عاید ہوتی ہیں۔

(۱) اقامتِ صلوٰۃ ایتائے زکوٰۃ اور دیگر عبادات کا باقاعدہ انتظام و انصرام

(۲) نظام زکوٰۃ میں یہ اشارہ از خود مضمر ہے کہ اہل حاجت کی معاشی کفالت کے لیے دولتمند طبقے سے مال لیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ فقر و افلاس اور بیماریوں اور مصائب میں مبتلا معاشرہ اقامت صلوٰۃ، اقامتِ عدل اور اقامتِ جہاد کے فرائض بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔

(۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے رہنمائی ملتی ہے کہ خدا کی شریعت کے لیے جو کچھ معروف ہے اسے قائم کرنے اور جو کچھ منکر ہے اسے روکنے کے لیے تعلیم، تبلیغ

احتساب، قانونی قوت، عدالتی نظام، انتظامیہ اور اخلاقی ماحول سے کام لیا جائے گا۔

(۴) کسی خطے میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو عمل میں لانے کے لیے اوّلین ضرورت اسے دشمنوں کی مداخلت سے محفوظ کرنے کے لیے دفاعی انتظامات اور سرگرمی جہاد کی ہے بلکہ تمکین فی الارض کا مژدہ آیت متذکرہ کے رُو سے دیا ہی ان لوگوں کو جا رہا ہے جنہیں وعدہ نصرت کے ساتھ دشمنوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن الجوزی میں التمکین فی الارض کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے۔

"نصرتھم علی عدوھم" یعنی خدا کی طرف سے دشمن کے خلاف ان کی مدد وہ چیز ہے جو غلبہ دلا سکتی ہے[1]

(۵) یہ تمام کام جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ عقائد، عبادات اخلاق اور دیگر ضروری اُمور اور فنون کی تعلیم دیئے بغیر ہو ہی نہیں سکتے لہٰذا سب سے بڑا معروف بجائے خود اسلامی نظامِ تعلیم ہے جسے قائم کرنا لازم ہے۔

اگرچہ اس ایک آیت سے ضروری اشارات مِل جاتے ہیں۔ مگر قرآن اور حدیث دونوں میں نہایت وسیع طور پر اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں اور یہ ساری ذمہ داریاں دورِ فاروقی میں بوجہ احسن پوری ہوئیں۔

فلاحِ عامّہ اور مُسلم حکّام

ہم اپنے خاص موضوع کی طرف جانے سے پہلے اسلامی ریاست کی تمام ذمہ داریوں کو ایک جامع اصطلاح "فلاحِ عامہ" میں سمیٹ دیتے ہیں۔ اسلامی فلاح کا مقام پانے کے لیے معاشرے میں علم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لیے ہر فرمانروا کو آخرت میں سخت باز پرس سے گزرنا ہوگا۔ جیسا کہ رسولِ صادق و مصدوق

---

[1] ملاحظہ ہو زاد المیسر طبع ۶۵ء ج ۵ ص ۴۴۷

نے فرمایا۔ من یکونُ امیراً فانہُ من اطول النّاس حساباً واغلظہ عذاباً۔۔۔۔ الخ جو شخص حکمران ہو اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہوگا اور وہ سب سے زیادہ سخت عذاب کے خطرے میں مُبتلا ہوگا[1] انہی چیزوں کے لیے مناصب کو امانت قرار دیا گیا جیسا کہ حضور نے حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابن حجیرۃ الشیخ سے طلب امارت کے جواب میں فرمایا "انّھا امانۃٌ الخ یہ عہدے تو امانت ہیں[2] انہی مقاصد کے لیے حاکم پر لازم کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کا خیر خواہ ہو اور ان کے مسائل حل کرنے کے لیے سخت محنت کرے ورنہ وعید سنائی گئی کہ جنت میں داخلہ نہ ہو سکے گا[3] انہی اغراض کے تحت حضورؐ نے خدا سے حکام کے بارے میں دعا کی کہ جو بھی صاحبِ امر میری اُمت کے لوگوں کو مشقت میں ڈالے تو بھی اس کو مشقت میں ڈال اور جو صاحبِ امر ان سے اچھا سلوک کرے تو بھی اس سے اچھا سلوک کر[4] نیز یہ کہ جس کسی کو اللہ کسی درجے میں مسلمانوں پر اختیار عطا کرے پھر وہ ان کی حاجات وضروریات اور ان کی معاشی غربت کو (حل کرنے کے بجائے) سامنے لانے میں رکاوٹیں حائل کرے تو اسے اللہ تو بھی قیامت کے دن اس کی حاجات وضروریات اور تہی دستی کے آگے رکاوٹیں حائل کر دے (یعنی ان پر توجہ نہ فرما اور ان کو حل نہ کر)[5]

کفالتِ عامّہ

ہماری اردو اصطلاح کفالتِ عامّہ کے بالمقابل عربی زبان میں کام کرنے والے مُسلم مفکرین نے التکافل الاجتماعی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

---

[1] کنز العمال ج ۵۔ ح ۲۵۰۵ (خ م)
[2] کتاب الاموال۔ از ابو عبید قاسم بن سلام نمبر پیراگراف ۶، ۷ ص ۴ [3] ریاض الصالحین باب ۸۷ فی امر ولاۃ الامور بامر فق برعایا روایت ابی یعلی معقل بن یسار (متفق علیہ)
[4] کتاب مذکورہ، باب ۷۸، روایت حضرت عائشہ نمبر روایت ۵۲ (مسلم)
[5] ایضاً، روایت ابو مریم ازدی۔ نمبر روایت ۵۶ (ابو داؤد وترمذی)

کفالتِ عامہ کے نظامِ عمل کی بنیادیں خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھیں سائلوں اور محتاجوں کو بیت المال سے عطیات دیے، خمس اور فئی اور زکوٰۃ کی رقوم سے مسلمانوں کے قرض اور خونبہا ادا کیے اہلِ افلاس کے نکاح کرائیے اور کبھی کبھی تو بیت المال خالی ہونے کی صورت میں اہلِ حاجت کو ذاتی طور پر مال حاصل کر کے دیا۔

پھر قاعدہ کلیہ یہ وضع کر دیا کہ۔

مَن ترک مالاً فلاٰھلہٖ وَمَن ترکَ دَیناً اَو ضیاعاً فاِلیّ وَعَلیّ۔

"جو کوئی مال چھوڑ کر دنیا سے اٹھے، تو وہ مال اس کے اہل وعیال کا حق ہے اور جو شخص قرض چھوڑ جائے یا اہل وعیال (ایسے حال میں ہو کہ ان کی کفالت کا سامان نہ ہوں) تو وہ میرے حصے میں ہیں اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے"[2]

یہ فرمان دو باتوں پر صریحاً دلالت کرتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر زندگی میں ناکافی معیشت کی وجہ سے کوئی شخص مقروض ہو گیا تو چونکہ ریاست پر اس کی کمیٔ معاش کو پورا کرنے کی ذمہ داری تھی لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے جو قرض لیا ہو وہ ریاست ادا کرے گی دوسرے یہ کہ کسی شخص کے پسماندگان اگر ذریعۂ کفالت نہ رکھتے ہوں تو ان کی کفالت کرنا حکومت پر لازم ہے اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ معاشی محرومی جہاں پائی جائے گی اس کی تلافی کرنا مسلمانوں کے اجتماعی نظام پر لازم ہو گا۔

حضورؐ پاک ہی کے فرمودات اور اسوۂ مبارکہ کی روشنی میں مستحقینِ زکوٰۃ پر اپنی بحثوں کے دوران میں فقہاء نے (فقراء ومساکین کے علاوہ) غارمین کی تعریف کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ہر زندہ مسلمان کا قرض بھی بیت المال سے ادا ہونا چاہیے۔

مذہب امام ابوحنیفہ کے مطابق غارم وہ شخص ہے جس پر قرض ہو اور وہ قرض کے

---

[2] ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ج ۸، ص ۱۸۵

علاوہ کوئی زائد نصاب مال نہ رکھتا ہو[1]

ابو جعفر و قتادہ سے طبری نے روایت لیتے ہوئے لکھا ہے کہ غارم ایسا مقروض ہے جو بلا اسراف کیسے زیر بار ہوا ہو۔ سو حاکم پر لازم ہے کہ ایسے لوگوں کے حساب بیت المال سے ادا کرے[2]۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد غارمین میں دو قسم کے مقروضوں کو شامل کرتے ہیں۔

ایک وہ جو جائز ذاتی ضروریات کی وجہ سے مقروض ہوئے ہوں۔ مثلاً نفقہ یا لباس حاصل کرنے کے لیے شادی کرنے کے لیے بیماری کے علاج کے لیے، مکان کی تعمیر کے لیے اثاث البیت مہیا کرنے کے لیے اولاد کو بیاہنے کے لیے یا کسی اور مصرف میں غلطی سے سر آ پڑنے والے نقصان کو پورا کرنے کے لیے۔ اس قسم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا مال سیلاب میں بہ جائے یا آگ میں جل جائے یا ایسے افراد جن پر عیال کی ذمہ داری ہو اور اسے پورا کرنے کے لیے مال نہ ہو[3] یہ لوگ جن کے احوال حوادث کا شکار ہو جائیں۔ ان کے لیے احمد و مسلم نے قبیصہ بن المخارق کی روایت سے یہ فرمان نبوت بیان کیا ہے کہ جس شخص کا مال کسی آفت میں تباہ ہو جائے اس کے لیے جائز ہے کہ وہ صاحب حکومت سے زکوٰۃ میں سے اپنا حق طلب کرے یہاں تک کہ وہ معاشی طور پر خوش حال ہو جائے[4]

دوسری قسم کے مقروض مستحق امداد ہیں جو اجتماعی بہبود یا جذبات عالیہ کے سلسلے میں مقروض ہو جائیں جیسے لڑنے والے قبیلوں میں صلح کرانے کے لیے مال خرچ کیا جائے یا فریقین کی طرف سے کوئی ذمہ داری لے لی جائے، کوئی یتیم خانہ یا ہسپتال یا مدرسہ قائم کیا گیا ہو

---

[1] ملاحظہ ہو۔ فقہ الزکوٰۃ۔ از علامہ یوسف القرضاوی ج ۲ ص ۶۲۲

[2] تفسیر الطبری، ج ۱۴، ص ۳۲۸ (بحوالہ فقہ الزکوٰۃ)

[3] ملاحظہ ہو فقہ الزکوٰۃ علامہ یوسف القرضاوی۔ ج ۲، ص ۶۲۳

[4] حوالہ ایضاً ۵

یا مسجد بنائی گئی ہو اور اس سلسلے میں کوئی شخص مقروض ہو جائے[1]

اُوپر کی ذکر کردہ وہ تمام چیزیں جن کے مصارف پورے کرنے کے لیے آدمی مقروض ہو جاتا ہے۔

(غذا لباس، مکان، علاج، نکاح وغیرہ) اور ایسے قرضوں کا حساب چکانا بیت المال کے ذمے آتا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں یہ سمجھنا چاہیے۔ کہ اگر پہلے ہی سے کمزور معیشت والے لوگوں میں ان کی فراہمی کا انتظام کر دیا جائے تو شریعت کا تقاضا زیادہ آسانی سے پورا ہو سکتا ہے اور مقروضیت کی چکی میں لوگوں کو پسنے سے بچایا جا سکتا ہے۔

یہی نقطۂ نظر تھا خلفائے راشدین بخصوصاً حضرت عمرؓ کا اور اسی کا احیاء حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کیا اور ہمارے اماماِن فکر و تحقیق نے بھی نصوص سے یہی نتیجہ نکالا ہے۔

دورِ جدید کے ایک صالح الفکر عالم کی رائے میں خلاصہ اس کا یہ ہے کہ۔

"اسلام تقاضا کرتا ہے کہ اس کے متوسلین میں سے ہر فرد معاشی کفایت کے ساتھ خوف سے مامون ہو کر زندگی گزارے تاکہ وہ خشوع و احسان کے ساتھ اللہ کی عبادت سرانجام دے سکے[2]

معاشی کفالت کے سلسلے میں مزید صراحت یوں کی گئی ہے کہ

"قانونِ اسلامی اُن تمام لوگوں کی کفالت کا اہتمام کرتا ہے جو اس کی ریاست کے سائے میں رہتے ہوں — خواہ وہ مُسلم ہوں یا غیر مُسلم — معاش سے یکساں طور پر اکٹھے مستفید ہوں، اور لباس، مسکن حاصل کرنے کے علاوہ علاج اور تعلیم کے جو ذرائع میسر ہوں ان سے بہرہ مند ہوں"[3]

انسانوں کی طرف سے جو ذمہ داریاں مُسلم حکمران پر عاید ہوتی ہیں وہ تو جو ہیں، سو ہیں

---

[1] ایضاً ص ۴۲۰

[2] ملاحظہ ہو: فقہ الزکوٰۃ از علامہ یوسف القرضاوی ج ۲ - ص ۹۰۶

[3] ایضاً

حضرت عمرؓ کا شعور و احساس تو یہاں تک پہنچتا ہے کہ

"دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچّہ بھی اگر ہلاک ہو جائے تو مجھے ڈر آتا ہے کہ اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا"۔[۳]

کفالتِ عامہ کی اس ذمہ داری کا احساس حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی شخصیت سے یوں منعکس ہوتا ہے۔

"میری گردن میں اُمتِ محمدی کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے ننگے، بھوکے بیمار، مسافر مظلوم، قیدی، بچے، بوڑھے کم حیثیت، عیالدار، غرض دنیا بھر کا بوجھ میرے سر آن پڑا ہے اب ڈر رہا ہوں کہ کہیں قیامت میں مجھ سے جواب بن نہ آئے"۔[۱]

حضرت عمرؓ اور کفالتِ عامّہ

یہ تو واضح ہو ہی چکا ہے کہ ہماری کفالتِ عامہّ کی بحث میں اگرچہ ہم اقتصادی پہلو کو اہمیت دے رہے ہیں مگر درحقیقت اس میں اُمتِ محمدّیہ کی تمام ضروریات کو پورا کرنا اور اس کے تمام مسائل کو حل کرنا شامل ہے۔ ایمانی ضروریات و مسائل اخلاقی ضروریات و مسائل تعلیمی ضروریات و مسائل، جسمانی ضروریات و مسائل عدل اور اس کے ضروریات و مسائل سبھی اس اصطلاح کے تحت آتے ہیں اور یہ اصطلاح تقریباً فلاحِ عامہّ کی ہم معنی ہے۔

چنانچہ اگر آپ اُمتِ محمدّیہ کی ضروریات پُوری کرنے اور اس کی مشکلات کو حل کرنے کی ان گوناگوں مساعی اور مجاہدات کو دیکھیں جن سے سیرتِ فاروقی بھری پڑی ہے تو پھر صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ کفالتِ عامہ کے تقاضے کتنے وسیع ہیں۔

کبھی وہ فاقہ زدہ کنبے کے لیے رات کے وقت اپنی پیٹھ پر غذائی سامان کا بورا اٹھائے

---

[۳] کنزالعمال ج ۵ - ح ۱۲۵۱۲ (خ م)

[۱] تاریخ الخلفاء، از علامہ جلال الدین سیوطی (اردو ترجمہ مطبوعہ صدیقی کشمیری بازار لاہور) ص ۱۲۸ نیز ملاحظہ ہو کتاب الخراج، امام ابویوسف اُردو ترجمہ ڈاکٹر عباداللہ صدیقی پیرا نمبر ص ۱۴۰ -

لیے جا رہے ہیں۔ کبھی وہ مدینہ کے نواح میں خیمہ زن مسافروں کا خود پہرہ دے رہے ہیں کبھی وہ ایک بدو عورت کو مرحلۂ زچگی میں مدد دینے کے لیے اپنی زوجہ محترمہ کو لے کر شہر سے باہر پہنچتے ہیں۔ کبھی رات کو گشت کرتے ہوئے ایک نوجوان عورت کے اشعار سُن کر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ مسلمان مجاہدین کو زیادہ مدّت تک گھر سے الگ نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہر چار ماہ بعد رخصت پر آنا چاہیے۔ کبھی وہ قلم دوات لے کر مجاہدین کے گھروں کے چکر لگاتے ہیں اور ایک ایک دروازے پر جا کر اہلِ خانہ کو پکارتے ہیں۔ کہ آؤ اپنے آدمیوں کے نام خط لکھوالو، سرکاری ہرکارہ میدان جنگ کی طرف جا رہا ہے۔ ریاض النظرہ کے حوالے سے شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء ج ۲، ص ۱۲۵) میں لکھا ہے کہ جب حضرت فاروق کے پاس عراق سے مال آتا یا خُمس آتا تو آپ بنی ہاشم میں جس قدر بے نکاح لوگ ہوتے ان کے نکاح کرا دیتے

اور جس قدر بے خادم ہوتے اُنہیں خادم دیتے۔ علامہ طنطاوی زمانہ قحط کے متعلق بنی نضیر کے مالک بن اوس کی روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان کے قبیلے کو خوراک کے علاوہ سواریاں بھی فراہم کرتے اور مردوں کے لیے کفن کا انتظام کرتے۔

تعلیم مفت! انصاف مفت

کفالتِ عامہ کا جو تصورِ اسلام نے دیا ہے اس کے تحت دورِ نبوت و خلافت ہی میں نہیں، بلکہ بعد کے ادوار میں بھی تعلیم اور انصاف کے لیے کبھی کوئی فیس نہیں لی گئی آج کے دَور میں شہریوں کی آمدنی کا خاصا بڑا حصّہ بچوں کی تعلیم اور حصول انصاف کی مدوں میں کھپ جاتا ہے لیکن صحیح اسلامی نظام کے تحت یہ ضروریات بیت المال کی طرف سے گویا ہر شہری کے لیے "بیمہ شدہ" تھیں۔

اِس معلوم عام حقیقت کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام بنیادی طور پر ایک تعلیمی تحریک ہے اور علم حق کو خدا کے زیادہ سے زیادہ بندوں تک پہنچانا سلسلۂ نبوت کا اساسی فریضہ رہا ہے، نیز اسلامی حکومت اور اس کے تمام متوسلین کے سر شہادت علی الناس اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری بہ طورِ مشن اور نصب العین کے ڈالی گئی ہے اسی طرح عدل کا قیام بھی اسلامی

حکومت اور اس کے حصہ داروں کا مشنری فریضہ ہے۔ کیونکہ تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد لیقوم الناس بالقسط ہے۔

تعلیم و انصاف کی مفت بہم رسانی کا جو نظام حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے چلایا اور جسے سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے فروغ دیا اسی کو حضرت عمرؓ نے مزید توسیع دی اس معاملے میں کسی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ محض شرط پوری کرنے کے لیے ایک آدھ حوالہ درج کیا جا رہا ہے۔ گورنروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں نے انہیں (یعنی شہروں کے ماتحت حکام) صرف اس لیے بھیجا کہ وہ لوگوں کو (۱) دین سکھائیں (۲) ان کے عطیات ان میں تقسیم کریں اور (۳) ان کے درمیان معاملات کا تصفیہ کریں" [1]

ان مختصر الفاظ میں تعلیم، انصاف اور تقسیم عطیات کے تینوں بڑے کاموں کا ذکر آ گیا جو افسرانِ حکومت کے ذمے تھے۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل بہت جگہ ملے گی۔

کفالت عامہ کے تحت علاج کا مسئلہ بھی آتا ہے، مگر اُس دور میں علاج کے منظم ادارات نہیں تھے۔ اس لیے یہ معاملہ حاجت مندوں کی عمومی اعانت میں شامل تھا۔ بعد کے فقہاء و مفکرین نے البتہ علاج کو کفالتِ عامہ کے ایک مستقل شعبے کے طور پر لیا ہے۔ استناد کے لیے قارئین کے متعلق ائمۂ اربعہ کے مختصر اقوال ہم فقہ الزکوٰۃ (ج ۲ ص ۶۲۳) کے حوالے سے اُوپر درج کر چکے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا نظام وظائف

عوامی معاشی بہبود کے سلسلے میں جو کام دورِ رسالتِ مآبؐ اور دورِ صدیقی سے جاری

---

[1] ملاحظہ ہو: عمر بن خطاب۔ علامہ طنطاوی (اردو ترجمہ از عبدالصمد صارم) ص ۳۹۳
نیز ملاحظہ ہو اسلام کا نظامِ محاصل (اردو ترجمہ کتاب الخراج۔ امام ابو یوسف) ص ۱۲۳۔

تھا اسے حضرت عمرؓ نے پوری طرح منظم کر دیا۔ یہ نظام وظائف اس کے علاوہ ہے جو کچھ کہ مساکین وفقراء اور اہل حاجت کے لیے اموالِ زکوٰۃ میں سے متفرق طور پر خرچ کیا جاتا تھا۔ خلیفہ ثانی کے دور میں اموالِ فئے میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ لہٰذا جمہور مسلمین میں اس کی تقسیم کے مسئلے پر غور کیا گیا اس بارے میں دو اُصولی باتیں سامنے رکھنی ضروری ہیں ایک یہ کہ

"قسم ہے خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس بیت المال میں ہر شخص کا حق ہے"[1]

دُوسری یہ کہ۔

"عطیات (یا وظائف) ملازمین کی تنخواہوں کی مانند نہ تھے، نہ صدقہ وخیرات کی مانند، نہ از قسم منت واحسان۔ یہ ایک طرح سے اجتماعی اقتصادیات و مالیات کے ضامن تھے۔ جن کی بنیاد بیت المال میں ہر شخص کا حق تسلیم کرنے پر تھی"[2]

حضرت ابوبکرؓ کے دَور میں بحرین کے اموالِ فئے کو تقسیم کرنے کی ایک اہم نظیر جس کی روایت کتاب الخراج میں اُبوتیجح سے لی گئی ہے، یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ نے اعلان کرایا، کہ جس کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (مال کا، کوئی وعدہ کیا ہو وُہ میرے پاس آئے چنانچہ جابر بن عبداللہؓ آئے اور انہوں نے حضور کے وعدے کے مطابق مال لیا۔ باقی تمام مال مسلمانوں کے درمیان بہ حصّہ برابر تقسیم کر دیا گیا۔ چنانچہ ہر مرد، عورت، حُر اور مملوک کو ۹½ درہم ملے۔ کتاب الخراج (اُردو ترجمہ ص ۲۰۱) میں یہ مقدار ۷½ درہم درج ہے اگلے سال زیادہ مال آیا اور فی کس ۲۰ درہم ملے[3]

حضرت عمرؓ کے دَور میں جلولا کا مالِ غنیمت لایا گیا تو اُسے صحن مسجد میں ڈالا گیا۔ یاقوت وجواہر کا ڈھیر لگ گیا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور عبداللہ بن ارقم ساری رات پہرہ دیتے رہے۔ صبح حضرت عمرؓ نے مشورے سے طے کیا کہ لپ بھر بھر کر تقسیم کیا جائے۔ یہ

---

[1] حضرت عمرؓ کا ارشاد بحوالہ عمر بن خطاب، علامہ طنطاوی (اُردو ترجمہ از عبدالصمد صارم) ص ۱۲۹۔

[2] ملاحظہ ہو عمر بن خطاب، علامہ طنطاوی (اُردو ترجمہ) ص ۱۲۳ [3] ملاحظہ ہو: ازالۃ الخفاء حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (اُردو ترجمہ شائع کردہ محمد سعید اینڈ سنز) ج ۲، ص ۱۱۲، ۱۱۳

باقاعدہ نظام قائم ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

بعد میں ۲۰ھ جب اموال بہت بڑی مقدار میں آئے تو حضرت عمرؓ نے مجلسِ مشاورت طلب کر کے اِس کے سامنے معاملہ رکھا کہ "میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دوں"۔

حضرت علیؓ کا مشورہ یہ تھا کہ سالانہ عطیات دینے کے بجائے جب مال آئے ساتھ کے ساتھ نمٹایا جائے حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ مال بہت ہے اور اگر ٹھیک طرح شمار نہ کیا گیا تو گڑ بڑ ہو گی۔ اس موقعہ پر ولید بن ہشام بن مغیرہ نے اپنے مشاہداتِ شام کی روشنی میں تجویز رکھی، فہرستیں بنائی جائیں اور باقاعدہ دفتر مرتب ہو۔ حضرت عمرؓ کو یہ تجویز پسند آئی اور آپ نے عقیل بن ابی طالب مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کو بلایا جو اہلِ قریش کے نسب دار اور منشی رہ چکے تھے۔ انہیں حکم دیا کہ تمام لوگوں کے نام خانہ بخانہ لکھ لو[۱]

تقسیم وظائف کے فاروقی نظام میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔

ایک یہ کہ آپ نے فہرست کی ترتیب کے لیے یہ ہدایت دی کہ "نبی علیہ السلام کے خاندانوں سے ابتدا کرو، اور پھر ان کے قریبیوں میں جو زیادہ قریب ہوں ان کے نام لکھو، اور عمرؓ کو وہیں رکھو جہاں اللہ نے اسے رکھا ہے[۲]

اس فہرست کے مطابق سب سے پہلا نمبر حضرت عباسؓ کا تھا پھر حضرت علیؓ کا اور سب سے آخری ہیں بنو عدی بن کعب جو حضرت عمرؓ کا قبیلہ تھا[۳]

دوسری یہ کہ آپ نے صدیقی دور کی مساویانہ تقسیم کے بجائے مختلف لوگوں کے مراتب حسبِ ذیل اصول پر مقرر کیے۔

"جن لوگوں نے رسول اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی ہے۔ انہیں ان لوگوں کے مساوی

---

[۱] ملاحظہ ہو عمر بن خطاب، علامہ طنطاوی (اُردو ترجمہ) ص ۱۲۳

[۲] ملاحظہ ہو۔ الیضاً ص ۱۲۳، ۱۲۴

[۳] ملاحظہ ہو اسلام کا نظامِ محاصل (اُردو ترجمہ کتاب الخراج) ص ۲۰۵

قرار نہیں دیا جا سکتا جنہوں نے آپ کے ساتھ مل کر جنگ کی ہے"[1]

اسی ضمن میں یہ امر بے حد اہم ہے کہ رسول اللہ کی قرابت کو آپ نے وجہ ترجیح قرار دے کر بنو ہاشم اور اہل بیت کی جیسی خدمت کی وہ بہت سی افسانہ طرازیوں کی ٹھوس نفی ہے۔

مزید تفصیل سے چند وجوہ ترجیح اس ارشاد میں آتے ہیں کہ کسی کا مرتبہ کتاب اللہ اور صحبت رسول اللہ کے لحاظ سے کیا ہے، قدامت و سبقت اسلام کے لحاظ سے کیا ہے، خدمت اسلام اور اسلام کے لیے مصیبت اٹھانے اور قربانیاں دینے کے لحاظ سے کیا ہے اور یہ کہ اسلام کی کسی شخص کی خدمات کی ضرورت کہاں تک ہے[2]؟ انہی ترجیحات کے ساتھ ایک وجہ کثرت عیال بھی مذکور ہے۔ ساتھ ہی دو عزائم بھی آپ نے ظاہر کیے۔

ایک یہ کہ اگر میں زندہ رہا تو جبل صنعاء کے چرواہوں کو ان کے حصے پہنچائے جائیں گے قبل اس کے کہ اپنے حصے طلب کرتے آئیں۔

دوسرے یہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو پچھلے لوگوں کو اگلوں سے ملا دوں گا۔ یہاں تک کہ وظائف میں سب مساوی ہو جائیں گے[3]

اب وہ فہرست درج کی جاتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس کو کس مقدار میں وظیفہ دیا گیا۔

بنو ہاشم کے ہر فرد کے لیے

۵ ہزار درہم سالانہ

حضرت عباسؓ کے لیے

۱۲ ہزار " "

ہر بدوی کے لیے

۵ " " "

---

[1] ملاحظہ ہو۔ اسلام کا نظام محاصل (اردو ترجمہ کتاب الخراج) ص ۲۰۲

[2] ملاحظہ ہو: ازالۃ الخفاء حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (اردو ترجمہ) ج ۲۔ ص ۱۱۴

[3] حوالہ ایضاً

ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کے لیے

۱۲ ہزار درہم سالانہ [1]

ہر انصاری کے لیے: ۴ " " "

مہاجرینِ حبشہ میں سے ہر ایک کے لیے

۴ " " "

اسامہ بن زید ۴ " " "

عبداللہ بن عمر (فرزند جنابِ فاروق)

۳ ہزار درہم سالانہ

ازواجِ مہاجرین و انصار فی خاتون

۲ ہزار ۶ سو درہم سالانہ

عمر بن ابی سلمہ ۴ سو درہم سالانہ

باقی اہلِ مکہ کا فی کس

۸ سو درہم سالانہ

نصر بن انس ۲ ہزار درہم سالانہ [2]

مزید تفصیل یہ ہے کہ شرکائے جنگِ بدر کے لیے ۵ ہزار، ہجرتِ حبشہ، جنگِ اُحد اور غزوۂ حدیبیہ کے شرکاء کے لیے ۴ ہزار، فتحِ مکہ سے پہلے ہجرت کرنے والوں کے لیے ۴ ہزار فرزندانِ اہلِ بدر اور فتحِ مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کے لیے ۲ ہزار درہم مقرر کیے گیے قرأتِ قرآن اور جہاد کے کارناموں میں نمایاں اصحاب کو بھی ترجیح حاصل تھی باقی سب لوگ ایک ہی

---

[1] ازواجِ مطہرات کے متعلق مختلف روایات ملانے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب کے لیے برابر برابر کر دیا گیا (ل ص)

[2] حوالہ ایضاً (ص ۱۱۴، ۱۱۵) نیز ملاحظہ ہو عمر بن خطاب از علامہ طنطاوی (اُردو ترجمہ) ص ۱۲۹-۱۳۰

درجے میں تھے۔

جو مسلمان بیرونی علاقوں سے آ کر مدینے میں آباد ہو گئے ان کو ۲۵ درہم فی کس، اہل یمن و شام و عراق کے بنو قیس کے ہر فرد کو ۲ سو سے ۲ ہزار درہم تک۔ جنگ قادسیہ و شام کے اکابر کو ۲ ہزار فی کس اور ان میں سے خصوصی بہادری دکھانے والوں کو ۳ ہزار فی کس دیے۔ ان جنگوں کے بعد والے مسلمانوں کے لیے فی کس ایک ہزار، ان سے بعد والوں کے ۵ سو۔ ان سے بعد والوں کے لیے ۳ سو ان سے بعد والوں کے لیے ۲½ سو، پھر آخری درجے میں فی کس دو سو دیے اور یہ اہل ہجر و اہل عباد کے لوگ تھے۔

حضرت صفیہ بن عبد المطلب کے لیے ۶ ہزار اسماء بنت عمیس، ام کلثوم بنت عقبہ اور ام عبد اللہ بن مسعود کے لیے ہزار درہم سالانہ مقرر فرمائے۔

ہر چھوٹے بچے کے لیے ۱۰۰ درہم، بالغ ہونے پر ۲۰۰ درہم مقرر ہوئے اور پوری جوانی کے مرحلے میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ دوسری روایت میں بلوغ کا وظیفہ ۵، ۶ سو درہم مذکور ہے۔

اہل بدر کے فرزندوں کو ۲، ۲ ہزار ملتے تھے، مگر امام حسنؓ و حسینؓ کو خصوصی وظیفہ ۵ ہزار درہم دیا جاتا۔

جن عجمیوں کے نام اہل وظائف میں ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔ دہقان نہر شاہ، ابن نخیرجان خالد و جمیل (پسران بسبھری)، بسطام بن زسی، مزارع بابل و فطرنیہ، رفیل دہقان عادل، ہرمزان اور حفینہ عبادی۔ ان کے لیے ہزار ہزار درہم مقرر کیے بعض روایات میں ہے کہ ہرمزان کو ۲ ہزار روپے تھے۔ رفیل جب اسلام لایا تو اس کا وظیفہ ۲ ہزار کر دیا گیا[1]

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مقدار وظائف بڑا تحقیق طلب موضوع ہے۔ ایک تو باتیں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ دوسرے درہم کے حساب میں کہیں یکایک دینار کا ذکر آ جاتا ہے تیسرے وظائف کہیں بلا صراحت ششماہی بیان کیے گئے ہیں، کہیں سہ ماہی پس غلطی کا خاصا امکان ہے

---

[1] ملاحظہ ہو عمر بن الخطاب۔ علامہ طنطاوی (اردو ترجمہ) ص ۱۲۶ تا ۱۳۰

اپنی سی کوشش کر لی۔ اگر فرصت کی کمی اور مضمون کی ضخامت بڑھنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو احادیث وسیر کی اصل کتب کو مدارِ تحقیق بنا کر تمام وظائف کی چھان بین کرتا۔

اس ذکر کا خاتمہ ہم ہشام الکلبی کے ان الفاظ پر کرتے ہیں کہ

"میں نے عمر بن الخطاب کو بنو خزاعہ کا رجسٹر اٹھائے ہوئے پھرتے دیکھا۔ وہ قدید میں پہنچے اور ہر کنواری اور شادی شدہ عورت کے ہاتھ پر اس کا عطیہ رکھا پھر وہاں سے آپ عسفان پہنچے ایسا ہی کیا۔ دم وفات تک یہی معمول رہا"[1]

یہ ہے اسلامی حکومت کی طرف سے عوام کی معاشی بہبود کے لیے ٹھوس خدمت کا وہ کارنامہ جس کی مثال دنیا کا کوئی نظام پیش نہ کر سکا اس تاریخی مثال ہی کا پرتو برطانیہ اور دوسرے ممالک کا اختیار کردہ وہ محدود نوعیت کا نظامِ کفالت و وظائف ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے کچلے ہوئے غربا کو بغاوت اور انارکزم یا کمیونزم میں مبتلا ہونے سے روکنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔

غیر مسلموں کے لیے وظائف

غیر مسلموں کی کفالت کے بارے میں مفسّرین، محدثین اور فقہاء کے ہاں بڑی فکر افروز بحثیں ہیں۔ اس سوال پر بھی بڑا مواد موجود ہے کہ مستحقین زکوٰۃ میں فقراء اور مساکین کی جو صف ہے کیا اس میں غیر مسلم رعایا بھی شامل ہے یا نہیں؟ زکوٰۃ کی بحث میں تو اختلاف ہے مگر محتاج و معذور ذمی کا حق حکومت پر واجب ہونا مسلم ہے۔ اس کے لیے بڑی واضح عملی نظیر بھی حضرت عمرؓ کے ہاں سے ملتی ہے۔ عمر بن نافع نے بہ روایت ابو بکر (ابن ابی قحافہ نہیں) بیان کیا کہ

"عمر بن الخطاب کا گزر کسی دروازے کے سامنے سے ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ آپ

---

[1] حوالہ ما سبق ص ۱۲۸

نے پیچھے سے اس کے جسم کو ٹھونکا اور پوچھا۔ تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں یہودی ہوں آپ نے پوچھا۔ کس چیز نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا؟ اس نے جواب دیا۔ میں بڑھاپے، حاجت مندی اور جزیہ کے باعث بھیک مانگ رہا ہوں...... عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور گھر میں لا کر اسے کچھ دیا پھر آپ نے بیت المال کے خازن کو بلوایا اور ان سے کہا اس کا، اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو۔ کیونکہ یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ان کی جوانی میں ہم ان سے (جزیہ وصول کر کے) کھائیں اور بڑھاپا آئے تو انہیں بے سہارا چھوڑ دیں[1]

بیت المال کے خازن کو خیال رکھنے کا حکم دینے کا مطلب واضح ہے کہ ان کی معاشی مدد کی جائے۔ بعض کتب میں صراحت ہے کہ وظیفہ جاری کیا گیا۔

نیز اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ کوئی ذمی اس قدر مقروض ہے کہ قرض اس کے پورے مال پر حاوی ہے تو اس کا جزیہ معاف کر دیتے[2]

روزینے بہ شکل رسد

سالانہ نقد وظائف تقسیم کرنے کے علاوہ حضرت عمرؓ کی حکومت کی ایک خدمت یہ تھی کہ غرباء میں سامان خوراک تقسیم کیا جاتا۔

اعمش بہ واسطہ ابن اسحٰق حارثہ بن مضرب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ سوال اٹھایا کہ ایک غریب آدمی کے لیے کتنا آٹا یا غلہ کافی ہوتا ہے۔ آپ نے ایک جریب آٹا جو سات قفیز کے برابر ہوتا ہے (ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی تحقیق کے مطابق ایک جریب آج کے ۲ من ۲۶ ۱/۴ سیر سے قدرے زائد ہے) پکوایا۔ اس کی روٹی پکوا

---

[1] ملاحظہ ہو اسلام کا نظام محاصل اردو ترجمہ کتاب الخراج، ص ۲۸۹ - ۲۹۰

[2] ملاحظہ ہو عمر بن خطاب، از علامہ طنطاوی (اردو ترجمہ) ص ۱۳۹

کر ۲۰ مسکینوں کو بلا کر پیٹ بھر کر کھلایا۔ رات میں پھر ایسا ہی کیا چنانچہ اس تجربے کی بنا پر ایک غریب فرد کے لیے مہینہ میں دو جریب غلہ مقرر کر دیا[۲]

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک خاص جگہ بنائی جسے "دار الدقیق" کہا جاتا تھا۔ اس اسٹور میں ہر وقت آٹا، ستو، کھجور، روغن زیتون اور دوسری اشیاء موجود رہتیں اس سرکاری سٹور سے اہل حاجت کی مدد بھی کی جاتی اور مہمانوں کی تواضع بھی[۱]

مسافرانِ مکہ و مدینہ کیلئے انتظام

سب سے زیادہ آمد و رفت مکہ اور مدینہ کے درمیان تھی۔ چنانچہ اس بڑی شاہراہ پر مسافروں کی خدمت اور مدد کا خصوصی اہتمام تھا۔ یوں بھی ابن السبیل کا جو استحقاق بیت المال پر ہے اس کی رُو سے دوسری جگہوں پر بھی اس طرح کے انتظامات کا ہونا ممکن ہے مگر ہم اتنی تفصیلی تحقیق میں نہیں جا سکتے۔ ایک واضح نظیر کافی ہے۔

(طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۲۸۳ - طبع بیروت) میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے مکہ اور مدینہ کو ملانے والی شاہراہ پر یہ انتظام کیا کہ مسافروں کو جو ضرورت لاحق ہو (یعنی کھانے، پینے اور آرام کے سلسلے میں) اسے پورا کیا جا سکے اور وہ پانی کے ایک چشمے سے دوسرے چشمے تک سواری سے پہنچ سکیں[۲]

تمام ماتحت امراء و حکام کے لیے حکم بھی تھا اور ایک علمی روایت کے طور پر سب کا یہ معمول بھی تھا کہ وہ باہر سے آنے والوں کی مہمانداری سرکاری خرچ پر کرتے اور ان کے

---

[۲] ملاحظہ ہو۔ اسلام کا نظامِ محاصل۔ ص ۲۱۳ - ۲۱۴

[۱] ملاحظہ ہو فقہ الزکوٰۃ۔ علامہ یوسف القرضاوی ج ۲ ص ۷۴ - ۷۵

[۲] ملاحظہ ہو فقہ الزکوٰۃ علامہ یوسف القرضاوی ج ۲ - ۷۵

لیے بعض عمال وحکام کے معاوضوں میں اس مصرف کے لیے ایک حصّہ مقرّر کرنے کی صراحت کتابوں میں ہے۔

کفالت عامہ بہ زمانہ قحط

تاریخ کے دفتر میں دنیا کے دو ایسے بڑے قحط مذکور ہیں جن کی زد سے عوام کو بچانے کے لیے خدا پرستانہ نظام عدل ورحمت نے اپنی برکات دکھائیں ایک قحط کا مقابلہ توخدا کے پیغمبر حضرت یوسفؑ نے الہامی بصیرت کے ساتھ کیا اور دوسرا قحط وہ ہے جس سے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا ایک امتی عہدہ برآ ہوا۔

تباہی اور مصیبت کے مواقع کسی حکمران کے ایمان وکردار کو جانچنے اس کی حکمت وبصیرت اور اس کی محبتِ عوام کو جانچنے کے لیے بہترین کسوٹی ہوتے ہیں۔

۱۸ھ کا واقعہ ہے کہ مدینہ وحجاز میں سخت قحط پڑا جو نو ماہ تک جاری رہا۔ قحط اتنا شدید تھا کہ مویشی ہلاک ہوگئے اور انسانی اموات بھی ہوئیں۔ بھوک کے مارے ہوئے جنگلی جانور بھی انسانوں کے پاس آجاتے۔ لوگ کبھی بکری ذبح کرتے تو اس کے شدید دبلے پن کی وجہ سے کھانہ سکتے۔ ہڈیوں کا سفوف بنا کر کھا گئے اور چوہوں کے بل کھود کھود کر غذا حاصل کرتے[1]

حضرت عمرؓ نے قحط سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حسبِ ذیل تدابیر اختیار کیں۔

(۱) جو کچھ بیت المال میں تھا، فقراء ومساکین میں تقسیم کردیا۔

(۲) غلّے کے تاجروں کو غلّے کا ذخیرہ کرنے سے روک دیا۔

(۳) دیار وامصار کے عمال وحکام کو فرمان صادر کیا کہ جس قدر غلہ حاصل ہوسکے۔ خرید کر مدینہ روانہ کریں۔

(۴) اپنے اُوپر پابندی لگالی کہ جب تک قحط دور نہ ہو، گوشت، روغنِ زیتون اور دودھ

---

[1] ملاحظہ ہو عمر بن خطاب۔ از علامہ طنطاوی (اُردو ترجمہ) ص ۱۴۱

استعمال نہیں کریں گے[1]

ان تدابیر کے علاوہ خدا کے حضور خود رو رو کر توبہ کرتے اور تمام مسلمانوں کو تلقین کرتے کہ وہ خدا کی اِس گرفت پر رجوع الی اللہ کریں، استغفار کریں، ترک گناہ کریں اور قحط سے نجات کی دعا کریں۔

بیرونی علاقوں سے سامانِ خوراک منگوانے کے لیے جو خطوط لکھے، ان میں سے ایک (بنام عمرو بن العاص) بہ طورِ نمونہ درج ہے جس سے حضرت عمرؓ کے دلی اضطراب کا اظہار ہوتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من جانب عبداللہ عمر امیر المومنین بہ طرف عاصی ابن العاصی (یہ الفاظ حد سے زیادہ بے تکلفی کے آئینہ دار ہیں) سلام علیک۔ کیا تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو مرتے دیکھ سکتا ہے۔ درآنحالیکہ تو اور تیرا ساتھی زندہ ہیں۔ فریاد! فریاد! فریاد!

اب ذرا حضرت عمروؓ بن العاص کا جواب بھی ملاحظہ ہو

"امداد پہنچ رہی ہے، انتظار کیجیے میں آپ کی طرف اونٹوں کا اتنا بڑا قافلہ بھیج رہا ہوں کہ جس کا پہلا اونٹ آپ کے پاس ہوگا اور آخری میرے پاس[1]"۔

حضرت عمرو بن العاص نے ہزار اونٹ آٹے سے لدے ہوئے بیس جہاز آٹے اور تیل کے اور ۵ سو پوشاکیں بھیجیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح شام سے چار ہزار بارِ شتر غلہ لائے سعد بن ابی وقاص نے تین ہزار اونٹ آٹے سے لدے، ۳ ہزار پوشاکیں بھیجیں، نیز دوسرا مکتوب ملنے پر مزید ۲، ہزار اونٹ آٹے سے لدے ہوئے بھجوائے[2]

حضرت عمروؓ بن العاص کے اونٹ جب پہنچے تو امیر المومنین نے زبیر العوام سے کہا ان کا

---

[1] ملاحظہ ہو ازالۃ الخفاء۔ از حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (اُردو ترجمہ) ج ۲، ص ۱۱۱

[1] ملاحظہ ہو (عمر بن خطاب) (اُردو ترجمہ) ص ۱۴۱-۱۴۲

[2] بحوالہ ماسبق ص ۱۴۵

نجد میں جاکر استقبال کرو۔ انہوں نے بیماری کا عذر کیا حضرت طلحہؓ بھی نہ مانے، پھر حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کو روانہ کیا جو اپنا لایا ہوا سامانِ امداد (چار ہزار بار شتر) تقسیم کرنے کے لیے ساتھ لے گئے۔ پھر حکم دیا کہ نجد کے ہر گھرانے کو آٹا دو جتنا ہمیں دو گے جو شخص سامانِ رسد اٹھا نہ سکے اسے اونٹ سمیت مال دے دو اور ہر ایک کو دو کپڑے دو۔ انہیں کہو کہ اونٹوں کو ذبح کرکے گوشت کھائیں، چربی محفوظ رکھیں کھالوں کے جوتے بنائیں[1]

جب حضرت عمروؓ بن العاص کے اونٹ ملکِ شام سے نکل آئے تو انہوں نے آس پاس کے دیہات میں جاکر اُونٹ ذبح کرنے اور آٹا اور کپڑے تقسیم کرنے کا کام شروع کر دیا جو سامانِ رسد جہازوں سے آیا تھا اس پر دُوسرے آدمی کو مامور کیا گیا تھا جس نے تہامہ میں رسد پہنچائی[2]

عوام کو رسد رسانی کی مہم میں حضرت عمرؓ بنفس نفیس مشقت اٹھا کر کام کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ چشم دید نقشہ بیان کرتے ہیں کہ قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ اپنی پشت پر ۲ جریب غلّہ (اور جریب کے بیان کردہ وزن کے لحاظ سے یہ مقدار درست نہیں معلوم ہوتی) اور ہاتھ میں تیل کا برتن اٹھائے اسلم کو ساتھ لیے، قبیلہ قبیلہ پھرتے تھے یہ دیکھ کر حضرت ابوہریرہؓ بھی امدادی کام میں لگ گئے[3]

حضرت ابوہریرہؓ امدادی کام کی اسی مہم کے سلسلے میں بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ صرار پہنچے تو دیکھا کہ بنی محارب کے بیس گھرانوں کے آدمی چلے آرہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کا حال معلوم کرنے کے بعد اپنی چادر اتاری اور کھانا تیار کرنے اور کھلانے کا کام شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ شکم سیر ہو گئے۔ اسلم کے ذریعے اونٹ منگوا کر ان کی سواری کا انتظام کیا اور انہیں جبانہ پہنچا دیا۔ انہیں کپڑے بھی پہنائے[1]

---

[1] بحوالہ ماسبق، صفحہ ۱۴۲-۱۴۳

[2] " "، صفحہ ۱۴۳ [3] بحوالہ ماسبق، صفحہ ۱۴۳

[1] بحوالہ ماسبق، صفحہ ۱۴۴

مالک بن اوس (بنو نضیر) زمانہ قحط کا ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ میرے قبیلے میں تشریف لائے جو قریباً سو گھروں پر مشتمل تھا۔ یہاں فروکش ہو کر آپ ہر آنے والے کو کھانا کھلاتے ورنہ اس کے گھر آٹا، سالن اور چھوہارے بھیجتے۔ میری قوم کے لیے ماہ بہ ماہ راشن روانہ فرمایا۔ مریضوں کی عیادت کرتے مردوں کو کفن دیتے۔ قحط کے خاتمے پر باہر سے آئے ہوئے کمزور آدمیوں کو سواری کے جانور دیے تاکہ وطن واپس پہنچ جائیں[1]

قحط کے زمانے میں قحط زدگان کی کثیر تعداد مدینے کے گرد آکر جمع ہو گئی۔ بدو لوگ درۂ کوہ سے لے کر رابتج بنو حارثہ، بنو عبدالاشہل، بقیع اور بنو قریظہ تک فروکش تھے۔ ایک گروہ بنی سلمہ کی طرف تھا۔ حضرت عمرؓ نے کچھ لوگوں کو ان قحط زدگان میں کھانا تقسیم کرنے کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ اور ان سے ہر رات کی رپورٹیں سنتے اسلم کا بیان ہے کہ ایک رات اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ دیکھو تو ہمارے ہاں سے کتنے آدمیوں نے کھانا کھایا ہے؟ لوگوں نے شمار کیا تو خود آکر کھانا کھانے والے سات ہزار مرد تھے عورتوں، بچوں اور مریضوں کی تعداد ملا کر میزان ۴۰ ہزار تک پہنچی کچھ دنوں کے گنتی کی گئی تو آکر کھانا کھانے والے دس ہزار مرد تھے اور جن لوگوں کے لیے کھانا جائے قیام پر بھجوایا جاتا ان کی تعداد ۵۰ ہزار تھی۔

ان لوگوں کے لیے کھانا پکوانے میں جناب فاروقؓ بہ نفسِ نفیس شریک ہوتے بڑی بڑی ہانڈیوں میں کھانا تیار کراتے[2]

اگرچہ یہ بے حد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں رعایا کی محبت میں اپنی جس طرح نفس کشی کی ہے۔ اس کے سبق آموز واقعات سامنے لائے جائیں نیز آپ نے خدا سے توبہ کرنے اور دعائیں مانگنے میں جو بے چینی دکھائی ہے اس کی جھلک دکھائی جائے لیکن مضمون اس حد سے پہلے ہی بڑھتا جا رہا ہے جو میرے سامنے تھی۔

---

[1] عمر بن خطاب۔ از علامہ طنطاوی بحوالہ (اردو ترجمہ) ص ۱۴۵

[2] ایضاً ص ۱۴۶-۱۴۷

کفالت عامہ اور حفاظت بیت المال

اس موضوع پر تفصیلات دیے بغیر ایک مختصر نوٹ لکھ رہا ہوں۔ کفالت عامہ کی یہ ذمہ داریاں وہی حکومت پوری کرسکتی ہے جس میں بیت المال کی امانت عظیمہ کے تحفظ کے کڑے انتظامات ہوں اس حفظِ امانت کے لازمی تقاضے یہ ہیں کہ۔

(۱) حکومت کا سربراہ انتہائی سادہ زندگی بسر کرنے والا ہو۔ اور بیت المال سے اپنی ذات کے لیے ایسا کم سے کم معاوضہ لے جس میں معتدل طور پر اس کی گزر بسر ہو سکے۔

(۲) حکومت کا سربراہ اپنے خاندان اور قرابت داروں کی ہر ایسی کوشش میں مزاحم ہو جس کا مقصد حکومت کے اختیار یا بیت المال سے فائدہ اٹھانا ہو۔

(۳) وہ ماتحت حکام و عمال کے لیے مناسب تنخواہیں یا وظائف مقرر کرنے کے بعد انہیں ایسے ضابطوں میں کسے اور ان کی کڑی نگرانی اور احتساب کرے کہ وہ نہ تو مسرفانہ طرز زندگی اختیار کریں اور نہ اقتدار یا بیت المال سے کوئی ناجائز ذاتی فائدہ اٹھائیں۔

(۴) وہ اس کا بھی اہتمام کرے کہ عوام میں مسرفانہ طریقے رائج نہ ہوں۔

اگر ان اشارات کی تفصیل دینا ممکن ہوتا تو حضرت عمر کے اعلانات و احکام اور عملی واقعات کو سامنے لاکر دکھاتا کہ کس سختی سے انہوں نے بیت مال کی امانت کو اپنی ذات سے، اپنے خاندان سے اور اپنے عمال و حکام کے تصرفات سے محفوظ رکھا یہ اہتمام اگر نہ ہوتا تو پھر اس پیمانے پر عوام کی معاشی بہبود کا سروسامان کرنا ہرگز ممکن نہ ہوتا جس کا خاکہ اوپر دیا گیا ہے۔

کلمۂ آخر

یہ ہے بیان تاریخ اسلام کی اس عظیم ہستی کا جسے فیروز کے خنجر نے جام شہادت پلایا۔ یہ تھے جناب فاروق جنہوں نے اسوۂ نبوت اور مسلک صدیقی رضی اللہ عنہ کے مطابق پوری شان درویشی کے ساتھ حکومت کی، اسلام کو فروغ دیا، مسلمانوں کی قوت بڑھائی اور فلاحِ عامہ کے تقاضے وسیع پیمانے پر پورے کیے۔ جنہوں نے امتِ محمدیہ کو حسنۃً فی الاخرۃ سے بہرہ مند

ہونے کے قابل بھی بنایا اور حسنۃ فی الدنیا سے بھی مالا مال کیا جنہوں نے ایمانوں کو بھی جلا دی، اخلاق کی بھی آبیاری کی، لوگوں کی آزادیٔ ضمیر اور ان کے مساویانہ حقوق کا تحفظ کیا، انہیں اپنے مستحکم نظام قضا کے ذریعے ظلم اور جرم سے امن دلایا۔ معرکہ ہائے جہاد کے ذریعے انہیں بیرونی طاقتوں کے حملوں کے خوف سے نجات دلائی اور ان کی معاشی کفالت کا انتظام کیا۔

اگر فیروز آج ہمارے سامنے آجائے تو ہم اسے کہیں کہ خنجر کے بجائے دلیل سے یہ بتاؤ کہ مومن عمرؓ، صدیق عمرؓ، مہاجر عمرؓ، غازی عمرؓ، شہید عمرؓ، عالم عمرؓ، مفسر عمرؓ، فقیہہ عمرؓ، عادل عمرؓ، منتظم عمرؓ اور مدبر عمرؓ، کمانڈر عمرؓ اور درویش و عبادت گزار عمرؓ کی سیرت اور کارنامے میں کہاں کوئی رخنہ ہے؟ —— اور کیا دنیا کی تمام قوموں کی تواریخ میں تم اس سے بہتر تو کیا اس جیسی کوئی مثال برآمد کر کے دکھا سکتے ہو؟ اگر نہیں تو پھر اندھے تعصب اور مجنونانہ نفرت کا یہ خنجر پھینک کر خدا کے سامنے اور انسانیت کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کرو کہ تم نے انسانیت کے ایک بہترین خادم پر ظلم کیا ہے۔

فاروقِ اعظمؓ کا نظم و نسق

تحریر: راجہ حامد مختار

علوم انسانی مادیت اور روحانیت کے ابدی چکر میں گرفتار رہے ہیں۔ مشاہدات اور تجربات پر مبنی نظریات نے ہبوطِ آدم سے لے کر آج کے جدلیاتی نظام حیات تک عالم انسانی کو ایک اضطراری اور ہیجانی کیفیت میں مبتلا رکھا ہے نت نئے شگوفے پھوٹتے ہیں اور ہر خود غلط فرد ہر روز نئے گل کھلاتے ہیں دو عالمگیر جنگوں کی تباہی و غارت گری کے باوجود دنیا آج بھی ایک نئے تصادم کی آتشگیر فضا میں دم لے رہی ہے ان تمام نزاعات کی جڑ جوع شکم ہے مادیت نے ہمیں دو متضاد نظام ہائے زر دیئے ہیں ایک کا مظہر امریکہ کا راس المالی یا سرمایہ دارانہ نظام زر ہے تو دوسری جانب روس کا اشتمالی نظامِ زر ہے طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ان دونوں کے پس پشت صیہونی دماغ ہے اگر امریکہ کی وال سٹریٹ پر یہودیوں کا تسلط ہے۔ تو اشتمالی نظریات کا سرچشمہ کارل مارکس کا یہودی دماغ ہے۔

اسلام نے ان دو متحارب نظریات کے برعکس بیت المال کا نظام زر پیش کیا ہے۔ اس بیت المالی نظامِ زر کے خدوخال سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں نمایاں ہوئے اور اس مضمون میں ان کا ایک سرسری جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے۔

دنیا میں پہلی بار عدل اجتماعی کا واضح تصور اسی بیت المالی نظام زر نے پیش کیا۔ اس نظریہ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ تمام زمین خدا کی ہے اور انسان بطور خلیفہ ذرائع پیداوار کا

امین ہے۔

ان ذرائع پیداوار پر پہلا حق مفاد عامہ کا ہے اور اگر ان کا جائز استعمال نہ ہو اور مصالح عمومی اور مفاد عامہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو حکومت کو مداخلت کا حق ہے اور غیر مفید تصرف کو محروم کیا جا سکتا ہے۔

شام و عراق کے فتح ہونے کے بعد مجلس شوریٰ میں سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تقریر اس سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو فوجیوں میں تقسیم کر دوں اور بعد والوں کو اسی حالت میں چھوڑوں کہ اس میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ کیا آپ لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ اس کی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور اس طبقہ میں ایک نسل کے بعد دوسری نسل کے پاس منتقل ہو جائے اگر ایسا ہو جائے تو بیوگان اور ناداروں کی کفالت کہاں سے ہو۔

یہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک فرمان درج کرنا بھی باعث دلچسپی ہو گا۔ فرمایا

"اوسعوا الناس فی بیوتھم و اطعموا عیالھم"

لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے کنبہ کے لیے طعام کا اہتمام کرو۔ بالفاظ دیگر یہ سوشل سیکورٹی کا پہلا چارٹر ہے جو ریاست اسلامیہ کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔

سیّدنا فاروق کے رائج کردہ نظام بیت المال پر دو متضاد اعتراضات وارد کیے گئے ہیں ایک طرف تو مشہور یہودی مستشرق ڈاکٹر لیوی (LEVY)، یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ایام کساد بازاری کے لیے پس انداز کرنے کا تصوّر اس نظام میں موجود نہ تھا تو دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ سنت رسول اور سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت کے طرز عمل کے برخلاف بیت المال میں مال جمع کر کے رکھا جانے لگا۔

پہلے اعتراض کا جواب سیّدنا فاروق کی تقریر کے اقتباس بالا سے مل جاتا ہے۔ خالصہ (سرکاری) کی اراضی تقسیم نہ کر کے اس کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف فوج کے ہمنوا تھے کہ مفتوحہ علاقوں کی اراضی ان میں تقسیم ہو اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو نہایت

کر رکھی تھی۔ مگر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآنی استدلال کے ساتھ مستقبل کی ضروریات کو مقدم رکھا اور آئندہ نسلوں کا حق باقی رکھا۔

دوسرے اعتراض کا واضح جواب یہ ہے کہ بیت المال میں اتنی رقوم آنے لگی تھیں کہ تمام مسلمانوں کی کفالت کی ذمہ داری لے لی گئی تھی اور بقول طٰہٰ حسین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس اجتماعی نظام کے موجد ہیں۔ جس کی رو سے حکومت کے خزانے کو تمام لوگوں کی معاش کی ضمانت دینا پڑتی ہے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہر مسلمان کو کم از کم چار ہزار درہم ملیں تاکہ وہ ایک ہزار سواری کے لیے ایک ہزار سامان حرب کے لیے ایک ہزار اہل و عیال کے لیے اور ایک ہزار اپنے لیے مختص کر سکے۔ کتاب الخراج میں درج ہے کہ گو حضرت نے پہلے السابقون الاولون کے اصول سبقت اسلام اور فضیلت کی بناء پر فرق جائز رکھا مگر آخر میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی رائے کو مفید سمجھا اور فرمایا۔

اگر میں آئندہ سال ان وظائف کے دنوں میں زندہ رہ گیا تو یقیناً السابقون الاولون اور بعد میں آنے والوں کو سب کھلا دوں گا اور عطیہ اور وظیفہ برابر کر دوں گا (کتاب الخراج) الکامل ابن الاثیر میں ہے کہ جب حضرت نے وظائف مقرر کیے تو کسی شخص نے کہا کہ اے امیر المومنین آپ بیت المال میں کسی ناگہانی حادثہ کے لیے مال جمع رکھا کریں اس پر انہوں نے فرمایا کہ یہ وہ لفظ ہے جو شیطان نے تمہاری زبان سے نکلوایا ہے اللہ مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھے یہ میرے بعد کے لوگوں کے لیے فتنہ و فساد کا باعث بن سکتا ہے بلکہ ہمیں چاہیے کہ تم ان کے لیے وہی تیاری کرو جس کا اللہ اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے یعنی ہمیں چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، یہی وہ ساز و سامان ہے جس کی بدولت وہ اس حالت پر پہنچے ہیں جو تم دیکھ رہے ہو جب مال تمہاری دینداری کی قیمت بن جائے گا۔ اس وقت تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

ان ابتدائی وضاحتوں کے بعد اب اصل مضمون کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جو دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلا حصہ نظام زر، ذرائع آمدن، اخراجات، انتظامات اور اس سلسلے میں عہد فاروقی کی گئی اصلاحات پر مشتمل ہے دوسرے حصہ میں خلیفہ اور ان کے عاملین کے طرز عمل

دیانت، امانت اور کفایت شعاری کا تذکرہ ہے۔

حصّہ اوّل

نظامِ مال

جیسا کہ مجملاً بیان کیا جا چکا ہے، بیت المال کی آمدنی اور اس کے مصارف کے اصولوں کو اسلامی نظامِ حکومت میں متعین کر دیا گیا ہے۔ البتہ ان کی تفصیلات اور اصول کے ماتحت جزئیات کے انطباق کا کام خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں تھا حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بیت المال کا تصوّر تو موجود تھا مگر عملی طور پر قیام کی ضرورت لاحق نہ ہوئی تھی کیونکہ ذرائع اور ضروریات کے درمیان باہمی توازن تھا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک مکان بیت المال کے طور پر مختص ہوا، مگر ہمیشہ بند ہی رہا کیونکہ مال آتے ہی تقسیم ہو جاتا رہا۔ ۱۵ھ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحرین کے عامل کی حیثیت سے پانچ لاکھ درہم لائے مجلس شوریٰ سے استصواب رائے ہوا۔ ولید بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رائے دی کہ شام کی حکومت کی طرح خزانہ اور دفتر دو جدا جدا محکمے ہوں۔ چنانچہ عبداللہ بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ خزانہ کے افسر مقرر ہوئے اور عبدالرحمان بن عبدالقاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انگشتری بردار حضرت معیقب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نائب مقرر ہوئے ویسے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تعمیرات کے معاملہ میں کفایت برتتے تھے مگر بیت المال کے لیے مستحکم اور شاندار عمارات بنوائیں۔ صوبہ جات اور اضلاع کے خزانوں میں وہاں کے مصارف کے مطابق رقم رکھی جاتی تھی سال کے اختتام پر فاضل رقوم صدر خزانہ میں بھجوا دی جاتی تھیں۔ ان رقوم کا اندازہ مورخ یعقوبی کے اس بیان سے لگائیے کہ صرف دارالخلافہ کی تنخواہوں اور وظائف کی رقم تین کروڑ سالانہ تھی۔

آمدنی کے ذرائع

بیت المال میں آمدنی کے بڑے ذرائع مندرجہ ذیل تھے۔

(الف) غنائم (ب) زمین کا لگان یا محصول جو مفتوحہ اراضی کے غیر مسلم کاشتکار معاہدہ کی روسے ادا کرتے تھے (ج) جزیہ

مذکورہ تین ذرائع کی ذیل میں مزید تقسیم یوں ہوتی تھی۔

۱۔ عشر ۲۔ خراج ۳۔ جزیہ ۴۔ زکوٰۃ ۵ صدقات ۶ فئی ۷۔ خمسین ۸۔ ضرائب ۹۔ کراء الارض ۱۰۔ عشور ۱۱۔ وقف ۱۲۔ اموال فاضلہ

اخراجات کی مدات میں رفاہ عامہ، وظائف، انفرادی، تعلیمی، فوجی، مصارف شمانیہ شعبہ حکومت کے مصارف شامل تھے۔

اعداد و شمار (STATISTICS) معاشی مسائل کے عادلانہ توازن کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فاروق اعظم کے زمانہ میں توسیع مملکت ہو گئی تو منجملہ دیگر مہمات امور کے اس کی جانب بھی توجہ کی گئی اور اعداد و شمار کو خاص اہمیت و حیثیت دے کر خلافت کے مختلف مسائل میں ان سے مدد لی گئی صحابہ کی مشاورت سے عطایا وظائف کے سلسلے میں مردم شماری کے رجسٹر قبائل اور منازل امکانات کے لحاظ سے مرتب کرائے اس دفتر یا سیکرٹیٹ کے لیے قریش کے تین ممتاز آدمی جو علم میں خصوصی درک رکھتے تھے یعنی حضرات عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم، تدوین دیوان اور تنظیم دفتر پر مامور ہوئے دفتر نے جب آپ کے قبیلہ بنی عدی کو بنی ہاشم اور بنی تیم (سے پہلے) رکھا تو آپ نے اس ترتیب کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا۔

"بخدا میں تو اس ترتیب پر بہت خوش ہوتا مگر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اس کے قبیلے کے لوگوں کا نام وہاں ہونا چاہیے جس کا اللہ تعالیٰ نے انہیں مستحق بنایا ہے یعنی جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جتنا قریب ہوگا اسے اوّلیت و تقدیم حاصل ہوگی۔

اسی اصول کے پیش نظر اعزاء رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حق دیگر بنی ہاشم پر فائق رکھا گیا پھر تقدیم ایمان کا لحاظ رکھا گیا۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل ترجیحات قائم ہوئیں۔

(۱) جو لوگ فتح مکہ سے قبل ہجرت کر گئے تھے ان کے لیے بلا تخصیص غلام و حُر فی کس تین ہزار درہم۔

(۲) مجاہدین بدر کے لیے پانچ ہزار درہم فی کس

(۳) مہاجرین حبشہ وشاملین احد کے لیے چار ہزار درہم فی کس

(۴) مجاہدین اولین اور غازیانِ بدر کے بیٹوں کو جو معرکہ میں حاضر تھے، تین ہزار درہم فی کس۔

امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ وامام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پانچ پانچ ہزار

اسامہ بن زید کے جب چار ہزار درہم مقرر ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عمر نے اعتراض کیا۔ جواب دیا کہ وہ آنحضرت کی نظروں میں تم سے زیادہ محبوب تھے اور ان کے والد تمہارے والد سے زیادہ مقبول تھے۔

کم سے کم تین سو درہم کی رقم دی گئی، البتہ بچوں کے لیے ایک سو درہم مقرر فرمایا۔ پہلے شرط تھی کہ یہ رقم دودھ چھڑانے کے بعد مل سکے گی مگر جب دیکھا کہ لوگ جلد ہی دودھ چھڑانے لگ گئے ہیں تو ہر مسلمان بچہ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اسی زمرہ میں لاوارث بچے اور بیوہ خواتین کو مستحق امداد سمجھا گیا۔

خرامؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ بنی خزاعہ کا رجسٹر ہاتھ میں لیے جاتے ہیں اور قدید میں اپنے ہاتھ سے عطایا تقسیم کر رہے ہیں حتیٰ کہ ایک عورت کنواری اور بیوہ ان کے شمار سے باہر نہ تھی اور اپنا حق حاصل کر رہی تھی اسی طرح عسفان میں جاکر انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور وفات تک ہر سال یہی کرتے رہے۔ (بحوالہ طبری)

اسی طرح فتوح البلدان میں لکھا ہے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ہاتھ میں پیمانہ لیے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ میں رجسٹر لیے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے کہ میں نے ہر مسلمان کے لیے ماہانہ گیہوں اور زیتون اور سرکہ مقرر کر دیا ہے اور یہ غلاموں کے لیے بھی ہے اس معاملہ میں بے حد احتیاط برتتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے دور کی فراوانی دراصل ایک عظیم آزمائش ہے۔ ابن جوزی نے سیرۃ العمرین میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، موذنوں، اماموں اور معلموں کو ماہانہ وظائف دیا

کرتے تھے۔ اسی طرح کتاب الاموال سے منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعض عاملین کو قرآن سیکھنے والوں کے وظیفہ مقرر کرنے کے لیے لکھا۔

اس چشمۂ فیض سے مستحق غیر مسلم افراد کو بھی محروم نہ رکھا گیا تھا بحوالہ کتاب الخراج آپ نے ایک نابینے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھ کر پوچھا کہ اسے کس چیز نے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے؟ اس نے جزیہ، معاشی ضرورت اور ضعف عمری کا عذر پیش کیا۔ اسے ساتھ لے جاکر جو کچھ گھر میں موجود تھا دے دیا اور پھر بیت المال سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔

سیّدنا فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک جامع نظام اراضی رائج کیا۔ بنیادی اصول یہ تھا کہ لگان زمین کی حیثیت سے زائد نہ عائد ہو جائے عراق سے خراج آنے پر کوفہ اور بصرہ سے دس دس آدمیوں کے وفود طلب فرماتے اور چار مرتبہ قسمیں دلوا کر شہادت لیتے کہ جو کچھ وصول کیا گیا ہے بغیر کسی ظلم کے رضا و رغبت وصول کیا گیا ہے۔ اس میں نہ کسی مسلمان پر ظلم ہوا ہے اور نہ کسی معاہد (ذمی) پر کتاب الخراج)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن حنیف سے عراق کی پیمائش کرائی قابل زراعت زمین کا رقبہ تین کروڑ ساٹھ جریب قرار پایا۔

شاہی جاگیریں، آتشکدوں کے اوقاف، لاوارث، معذور اور باغیوں کی جائیدادیں، شاہراہوں اور ڈاک کے مصارف کی اراضی اور جنگل خالصہ قرار پائے۔

مفتوحہ ممالک کی اراضی پر رومی، فارسی، تاجداروں کا غاصبانہ قبضہ تھا۔ یہ اراضی نہ ان کو وراثت میں ملی تھیں نہ وہ خود کاشت کار تھے نہ حقیقی مالک تھے۔ نئی اصلاحات نے اصل کاشت کاروں کو ان جابر حاکموں کے مظالم سے آزاد کیا اور ان املاک پر ان کا تصرف تسلیم کیا گو اصولی طور پر یہ وضاحت کر دی گئی کہ اصل حق ملکیت حکومت کا ہے اگر انہوں نے اراضی کا استعمال اس طرح کیا جس سے مصالح عمومی اور مفاد عامہ کو نقصان پہنچنے کا اندلیشہ ہو تو حکومت کو مداخلت کا حق ہوگا اور انہیں غیر مفید تصرّف سے محروم کر دیا جائے گا (شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفا خلافت الخلفاء (حصّہ دوم)

بلال بن حارث مزنی کو حضور سرور کائنات نے وسیع رقبہ بطور جاگیر عنایت فرمایا تھا وہ من خلافت الخلفاء (حصہ دوم)

رقبہ کو کاشت میں لانے سے معذور رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں فرمایا کہ رقبہ اس لیے دیا گیا تھا کہ کام میں لاؤ اور فائدہ اٹھاؤ مگر چونکہ تم ایسا نہیں کر پائے لہٰذا بقدر ضرورت رکھ لو اور باقی واپس کر دو تاکہ حاجت مندوں میں تقسیم ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح بنجر زمین کے متعلق اذنِ عام تھا کہ جو آباد کرے اس کا مالک ہو جائے گا۔ البتہ اگر تین سال تک مزروعہ نہ بنایا تو قبضہ سے فراغت ہو جائے گی۔

عراق کی اراضی کا جو لگان عائد کیا گیا وہ پیمانۂ ذیل کے مطابق تھا۔

۱۔ گیہوں۔ فی جریب (برابر سوا دو بیگھہ خام یا پون بیگھہ پختہ) دو درہم (برابر آٹھ آنے)

۲۔	جو	ایک درہم
۳۔	نیشکر	چھ درہم
۴۔	روئی	پانچ درہم
۵۔	انگور	دس درہم
۶۔	کھجور	دس درہم
۷۔	تل	آٹھ درہم
۸۔	ترکاری	تین درہم

عمدہ زمینوں اور بہتر پیداوار کی صورت میں گیہوں پر کہیں چار درہم فی جریب اور جو پر دو درہم بھی عائد کیے گئے۔

اس طرح صرف عراق سے آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ درہم کی سالانہ آمدنی تھی جو بعد میں اتنی کبھی نہ ہوئی انہی سطور پر مصر کے لگان میں بھی ترمیم و اصلاح کی گئی اور امور ذیل کا خیال رکھا گیا۔

ا۔ لگان نقد یا پیداوار کی صورت میں مگر لگان دہندہ کی سہولت مقدم۔

ب۔ تشخیص اوسط چند سالہ کی بناء پر نہیں بلکہ زمین کی حیثیت کے مطابق طرفین کی رضامندی سے

ج۔ بندوبست اراضی بھی کاشتکاران کی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔

د۔ لگان کے علاوہ کچھ وصول کرنا ظلم قرار دیا گیا۔

یہاں پر یہ تصریح ضروری ہے کہ ذمیوں کے لگان کے مقابلہ میں مسلمان کاشتکاروں کو عشر دینا پڑتا تھا عشر خراج سے زیادہ گراں محصول تھا اور اس کی شرح میں لچک ممکن نہ تھی یہ سالانہ کی بجائے ہر فصل پر عائد ہوتا تھا خراج خلیفہ کی صوابدید پر معاف ہو سکتا تھا عشر کی صورت میں یہ اسانی مہیا نہ تھی مال درآمد پر محصول بھی اسی وقت اور اسی پیمانہ سے نافذ کیا گیا جب نصاریٰ و یہود کے ممالک نے مسلمان تاجروں سے اسی قسم کا مطالبہ کیا فرق اتنا تھا کہ حضرت نے پھل ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنٰے رکھے اور محصول سامان تجارت پر صرف سال میں ایک مرتبہ روا رکھا۔

جزیہ افراد ذیل پر سے ساقط قرار دیا۔ عورت، کمسن بچے، محتاج جن میں معذور، اپاہج، نابینا شامل تھے۔ راہب پادری

جزیہ ادا کرنے والوں کے مواشی اور پیداوار زکوٰۃ و عشر سے مستثنیٰ تھے کتاب الخراج کے مطابق تحصیلدار چار شہادتیں پیش کرتے کہ بخدا یہ رقم ٹھیک ہے اور اس کے وصول کرنے میں کسی مسلم یا ذمی پر ظلم نہیں کیا گیا سرکاری محاصل میں حرام اور نجس اشیاء کی وصولی ممنوع قرار دی چنانچہ عقبہ بن فرقد عامل آذربائیجان نے جب چالیس درہم جو ذمیوں نے شراب بیچ کر جمع کیے تھے بیت المال میں بھجوائے تو معزول کر دیے گئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نظام بیت المال کے سلسلے میں جو جدتیں کیں ان کی تفصیل کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے البتہ مجملاً چند ایک کا تذکرہ ضروری ہے۔

۱۔ آپ نے اوقاف کی بنیاد رکھی اور اپنی ارضِ خیبر کی جاگیر اللہ کے نام وقف کر دی۔

۲۔ نہریں جاری کیں جس سے محاصل میں اضافہ ہوا۔ صرف مصر میں اس کام پر ایک لاکھ بیس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ جن کے مصارف بیت المال سے دیئے جاتے تھے۔

۳۔ عدل اجتماعی سوشل سیکورٹی (SOCIAL SECURITY) کا بنیادی تصور پیش کیا اور عوام کی ضروریات کا بندوبست حکومت کی ذمہ داری قرار دیا۔ اسی سلسلے میں عام الرمادہ میں جو اقدامات کیے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

و۔ بیت المال کا تمام اثاثہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا

ب۔ ساہوکاروں سے غلہ کی کھتیاں کھلوا کر فروخت شروع کرا دی۔

ج۔ ممالک محروسہ کے عاملوں کے لیے اجناس کی فراہمی کا حکم صادر فرمایا۔
د۔ کمیونٹی کچن (COMMUNITY KITCHEN) عوامی مطبخ جاری کیے اور بنفس نفیس اس کی نگرانی فرمائی سرخ آندھیوں کے مہینہ میں ہزاروں اشخاص نے سرکاری بٹنے والی ثرید سے استفادہ کیا۔ حاجت مندوں کے لیے صلائے عام تھی۔

۴۔ حکومت فارس کی طرز پہ دار الضرب قائم کیا۔ بعض سکوں پر الحمد للہ اور بعض پر محمد رسول اللہ نقش کروایا۔

مقریزی نے کتاب النقود الاسلامیہ میں تصریح کی ہے کہ حضرت پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے چاندی سونے کی سادہ ڈلیوں کو مدور سکوں میں تبدیل کیا علامہ ماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں بیان کیا ہے کہ ایران میں بغلی آٹھ دانگ طبری چار دانگ تھا حضرت نے دونوں کی اوسط نکال کر اسلامی درہم چھ دانگ کا مقرر فرمایا۔

۶۔ زمینداری اور ملکیت زمین کے جابرانہ قوانین کو منسوخ فرما دیا۔ اصلی باشندوں کو صرف کاشتکاری کا حقدار نہیں ٹھہرایا بلکہ زمین کے ساتھ کاشتکار کی منتقلی کا آمرانہ نظام بھی کالعدم قرار دیا۔

۷۔ بندوبست مالگزاری میں ذمیوں سے بھی مشاورت کی گئی چنانچہ عراق سے ان کی نمائندگی کے لیے دو رئیس مع مترجمین طلب فرمائے۔

۸۔ افتادہ زمینوں کی آبادکاری پر ملکیت کے حقوق دیئے گئے البتہ اگر تین سال تک استفادہ نہ کر سکے تو حقوق ملکیت واپس لیے جا سکتے تھے۔

۹۔ عساکر اسلام کی وجہ سے اگر کسی اراضی یا فصل کو نقصان پہنچے تو اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا چنانچہ شام میں اسی قسم کے نقصان کا معاوضہ دس ہزار درہم دیا گیا۔

۱۰۔ مال خانہ کی چیزوں پر امتیازی نشان لگانے کی ابتداء کی تاکہ خلط ملط ہو کر خورد برد نہ ہو جائیں۔

۱۱۔ ہر پرگنہ اور ہر ضلع کا سالانہ تخمینہ لگایا جاتا اور مشاورت سے رقم باچھ کی جاتی گرجاؤں حماموں اور مہمانداری کے اخراجات نکال کر جمع تشخیص کی جاتی۔ گاؤں کے نمبردار کو بھی ایک حصہ اس رقم کا ادا کرنا ہوتا تھا۔

۱۲۔ تنخواہ بطور حق الخدمت پسندیدہ نہ سمجھی جاتی تھی اور اسے زہد و تقدس کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ مگر آپ نے سرکاری عمال کو اس قدر معقول معاوضے دیئے کہ انہیں کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے اور ناجائز ذرائع کی طرف مائل نہ ہوں۔ حضرت ابوعبیدہ کو آپ نے بڑی مشکل سے قائل کیا حضرت ہر گورنر کو اس کی ضروریات اور اس کے حالات کے مطابق مشاہرہ دیا کرتے تھے۔

۱۳۔ عمال سے وثیقہ تقرر پر چار معتبر گواہوں کے سامنے عہد لیتے کہ

ا۔ تاتاری اسپ پر سواری نہ کریں گے۔

ب۔ قمیص ولباس میں زینت سے پرہیز کریں گے۔

ج۔ چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائیں گے۔

د۔ ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند نہ ہوگا اور نہ حاجب رکھا جائے گا۔

گورنر کے تقرر سے پہلے اس کے مملوکہ سامان کی فہرست بنواتے تھے اور عہد تقرر کے بعد فہرست سے زائد مال بیت المال کے لیے لے لیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کوفہ کی ولایت کے بعد اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بحرین کی ولایت کے بعد یہی معاملہ پیش آیا۔ ہر گورنر کے ساتھ ایک متولی بیت المال مامور ہوتا تھا جو رتی رتی کا حساب لیتا تھا۔ ان ہی اصلاحات اور اقدامات کا نتیجہ تھا کہ صرف ایک سال میں خراج کی رقم آٹھ کروڑ سے بڑھ کر دس کروڑ بیس ہزار درہم ہو گئی تھی۔

حصہ دوم

متذکرہ بالا انقلابی اصلاحات کا نفاذ صرف اسی وقت ممکن تھا جب نافذ کرنے والا خود فی الارض خلیفہ ہونے کی صلاحیتیں رکھتا ہو اور امانت اور دیانت کے اس بلند معیار پر پورا اترتا ہو جس کو دیکھ کر مہاتما گاندھی جیسا کٹر ہندو کہنے پر مجبور ہو جائے۔

"Simplicity is not the monoply of congressites. I am not going to mention the names of Rama and Krishna. They were not historical personalities. I am compell de to mention the names of Abu-bakar and Umar. The ough they were masters of a vast empire, yet they lived the life of paupers"

(young India,August37)

سادگی کانگرسیوں کی اجارہ داری نہیں ہے۔ میں رام اور کرشن کا تذکرہ نہیں کروں گا کہ وہ تاریخی نہیں بلکہ اساطیری حیثیت رکھتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام لینے پر مجبور ہوں کہ ایک وسیع مملکت کے کارفرما ہونے کے باوجود انہوں نے فقیرانہ بوریہ نشین اپنی زندگیاں بسر کیں۔

سیدنا عمرؓ کی زندگی امانت و درویشی کی ایک روشن ترین مثال ہے۔ آپ کا فرمان تھا کہ اُمت کی دولت اسی طرح میری نگرانی میں رہے گی جیسے یتیموں کا مال جس کا ناجائز طور پر کھانا مطلقاً حرام ہے۔ بمصداق سورۃ النساء ترجمہ۔

جو شخص آسودہ حال ہو اس کو ایسے مال سے قطعی طور پر پرہیز رکھنا چاہیئے اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر یعنی بقدر خدمت کچھ لے لے"۔

اپنے دورِ خلافت کی ابتداء میں مجلس مشاورت برپا کی اور استصواب رائے کیا۔ کہ خلیفہ کے لیے بیت المال سے کس قدر لینا حلال ہے بالآخر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے مشورہ کے مطابق آپ نے فرمایا۔

" مجھ کو تمہارے مال و بیت المال میں اتنا ہی حق ہے جس قدر یتیم کے ولی کو اس کے مال میں اگر میں رفاہیت میں ہوں گا تو کچھ نہیں لوں گا اور اگر حاجت مند ہوں گا تو دستور کے مطابق کھانے کے لیے لوں گا۔"

چنانچہ آپ اپنے کنبہ کو اوسط درجہ کے لوگوں کا کھانا کھلاتے اپنے پہننے کے لیے ایک

ایک جوڑا گرمی، سردی کے لیے لیتے مگر جب تک یہ پارچات بالکل چیتھڑے نہ ہو جاتے پیوند لگاتے رہتے۔ حتیٰ کہ ببول کے کانٹوں کو بھی پیراہن خلافت کی دریدگی رفو کرنے کا شرف حاصل کرتے

قحط کے ایام میں آپ نے اپنے لیے وہ آسائشیں بھی حرام کر رکھی تھیں جو متوسط طبقہ کو میسر تھیں مثلاً گوشت اسی وقت کھاتے جب نادار لوگوں کے لیے کوئی بھیڑ یا بکری ذبح ہوتی تھی ان ایام میں آپ نے جس طرح حجاز، نجد اور تہامہ کے لوگوں ——— کا بھوک اور مصیبت میں ہر طرح کا ساتھ دیا ہے اور اس میں شرکت کی ہے اس کی ہمیں عالمی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

گھی اپنے لیے تقریباً حرام کر لیا تھا اور زیتون پر گزارہ کرنے لگے تھے۔ جب مستقل استعمال سے تکلیف پہنچی تو پکوانا شروع کیا تاکہ حدت کم ہو مگر اس پر مروڑ پیدا ہونے لگے اور قر قر کی آواز پیدا ہونے لگی تو شکم پر ہاتھ مار کر فرمایا۔

"اے شکم کچھ بھی ہو تمہیں یہی کھانا پڑے گا اور یہ چیز اس وقت تک جاری رہے گی جب تک لوگ اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔

یہ سخت گیری اہل و عیال پر بھی عائد فرما رکھی تھی اس عادل امین نے باہمی معاونت کا یہ اصول زریں وضع کیا کہ ہم اس دور میں صرف اتنا کھائیں گے جتنا بیت المال سے عام سے عام مسلمانوں کے لیے مل سکتا ہے اور جب بیت المال میں اس کی بھی سکت نہیں رہ جائے گی تو ہم ہر ہر گھر پر ایک دوسرے گھر کی ذمہ داری ڈال دیں گے کہ لوگوں کو جو کچھ میسر آئے بانٹ کر کھائیں، بنیادی طور پر حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ عوام کی ضروریات زندگی کا بندوبست کرے۔ ایک جگہ فرمایا۔

" اگر مجھے پہلے سے اندازہ ہوتا تو میں دولت مندوں کی ضروریات سے زائد مال و زر کو ضبط کر کے مفلوک الحال مہاجرین میں تقسیم کر دیتا "۔

اپنے جسم اطہر کو کبھی نرم اور ملائم کپڑے سے مس نہیں کیا، بارہ بارہ پیوند کا کرتہ پھٹا عمامہ اور پھٹی جوتیاں اسی صورت میں قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے ملاقات کرتے حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خلافت کے حوالہ سے اور حفظ مراتب کے

پیش نظر جب طرزِ معاشرت تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تو فرمایا
آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو بھول گیئں۔ ان کے پاس تو ایک ہی کپڑا اوڑھنے اور بچھانے کو تھا۔ کنز العمال میں درج ہے کہ ایک دفعہ گزی کا کرتہ دھونے اور پیوند لگانے کے لیے دیا جب اس کے ساتھ ایک نرم کپڑے کا کرتہ پیش کیا گیا تو کمال استغنا سے واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے کرتے میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔
اسی طرح جب ربیع بن زیاد حارثی نے مرتبہ کے لحاظ سے بہتر طرز کی رہائش کی ترغیب دی تو فرمایا میں قوم کا امین ہوں، امانت میں خیانت کب جائز ہے۔ حفص بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب امیر المومنین کے سادہ کھانے کی طرف اشارہ کیا تو فرمایا کہ اگر قیامت کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی لذیذ کھاتے اور دنیاوی عیش و عشرت کا دلدادہ ہوتا۔
عقبہ بن فرقد کے گلے میں دربارِ خلافت کی سوکھی روٹی نہ اترتے دیکھ کر یہی کہا کہ تم دنیاوی عیش و آرام کی ترغیب دیتے ہو۔ کیا میدہ سب مسلمانوں کو مل سکتا ہے۔
ایک مرتبہ بطور تواضع ام المومنین حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سالن میں زیتون کا تیل ڈال کر پیش کیا تو فرمایا ایک برتن میں دو دو سالن مرتے دم تک نہ کھاؤں گا۔
اسی طرح یزید بن ابی سفیان حاکم شام کی دعوت میں نفیس کھانوں سے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا کہ اگر تم رسولِ خدا کی روش سے ہٹ جاؤ گے تو سیدھی راہ سے کٹ جاؤ گے۔
دوسری جگہ فرمایا کہ میں انواع و اقسام کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکتا ہوں مگر میرے پیش نظر قرآن حکیم کا یہ قول ہے۔
"تم لوگ ان دنیاوی زندگیوں میں اس درجہ نعمتوں میں مگن ہو گئے ہو کہ تمہاری نیکیاں زائل ہو گیئں ہیں۔
عراق کی مہم میں دونوں صاحبزادے عبداللہ اور عبیداللہ شریک تھے۔ واپسی پر بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری نے مرکزی بیت المال کی کچھ رقم حوالہ کر دی اور مشورہ دیا کہ فلاں جنس خرید لیجیے۔ منافع ہوگا۔
مدینہ جا کر اصل رقم بیت المال میں داخل کرا دیجیے۔ چنانچہ خاصا منافع ملا۔ مگر حضرت

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منافع بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ ہر لشکری کو یہ رعایت نہیں ملی تھی۔ بعد میں اس اعتراض پر کہ خسارہ و اتلاف کی صورت میں اصل رقم بہر حال واپس کرنا ہوتی۔ مضاربت کی شرط پر منافع نصف نصف کرنے کا حکم ہوا۔

امہات المومنین کے لیے نو طباق تھے جن میں میوہ اور ماکولات پیش کی جاتی تھیں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حصہ آخر میں لگتا تاکہ کمی واقع ہو تو انہیں کے حصہ میں ہو۔

آپ کی ازواج میں سے حضرت ام کلثوم نے تحفۃً کچھ عطر قیصر روم کے حرم کے لیے بھجوایا۔ وہاں سے شیشوں میں جواہرات بھر کر واپس ہوئے مگر آپ نے جواہرات یہ کہہ کر داخل بیت المال کرا دیئے کہ قاصد سرکاری تھا۔ البتہ عطر کی قیمت بطور معاوضہ دلوا دی۔ اپنی ذات کے علاج کے لیے شہد کی ضرورت ہوئی تو مسجد نبوی میں جا کر لوگوں سے اجازت طلب کی۔ بحرین سے مال غنیمت میں مشک و عنبر آئے تو تقسیم کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو عطریات کے اوزان میں دستگاہ رکھتا ہو۔ زوجہ محترمہ عاتکہ بنت زید نے آمادگی ظاہر فرمائی۔

تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے خوف ہے تمہاری انگلیوں سے جو کچھ لگ جائے گا۔ وہ جسم پر لگاؤ گی اور اس طرح عام مسلمانوں سے زائد حصہ ہمارے پاس آ جائے گا۔ اپنے وسیع کنبہ کے لیے صرف دو درہم روزانہ لیتے تھے (بحوالہ اسد الغابہ) حج کے ایام میں جب اسی درہم صرف ہوئے تو اسے اسراف تصور فرمایا۔ حضرت امام حسن کا بیان ہے کہ ایک جمعہ کے روز خطبہ دیتے وقت انہوں نے حضرت کے تہہ بند پر بارہ پیوند لگے پائے۔

(موطا امام مالک)

آپ نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو کبھی ملکی عہدے نہیں دیئے عمال اور حکام کے تحفے واپس کرتے اور اس سختی سے چشم نمائی فرماتے کہ پھر جرأت نہ ہوتی تھی۔ ابو موسیٰ اشعری نے آپ کی زوجہ عاتکہ بنت زید کو نفیس چادر بھجوائی تو بحوالہ نزہت الابرار اپنے پاس بلوا کر فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح جب ابو موسیٰ اشعری نے بیت المال میں صرف ایک درہم پا کر آپ کے صاحبزادے

کو دیا۔ تو آپ نے واپس بیت المال میں داخل کر دیا۔ اور ابو موسیٰ کو فرمایا کہ افسوس کہ تم کو مدینہ میں آل عمرؓ کے سوا اور کوئی کمزور نظر نہ آیا۔ تم چاہتے ہو کہ روزِ قیامت تمام اُمتِ محمدیہ کا مطالبہ میری گردن پر ہو (کنز العمال)

صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ نے اونٹ فروخت کیا چونکہ وہ سرکاری چراگاہ میں چر کر فربہ ہوا تھا۔ راس المال کے علاوہ باقی رقم داخل بیت المال کرا دی۔

ایک مرتبہ شام کو مال بھجوانا تھا۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رقم عاریتاً مانگی۔ انہوں نے فرمایا بیت المال سے قرض لے لیجیے۔ فرمایا بیت المال سے نہیں لوں گا۔ اگر ادائیگی سے پہلے مر جاؤں تو میرے ورثاء سے مطالبہ نہ ہو گا اور بار میرے سر رہ جائے گا۔ ایسے شخص سے لینا چاہتا ہوں جو میرے متروکہ سے لینے پر مجبور رہو (طبقات ابن سعد)

آپ نے آٹھ ہزار درہم قرضہ چھوڑا مگر وصیت کے مطابق ایک ہفتہ کے اندر ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رقم ادا کر کے رسید لے لی۔ یہ دراصل تمام ان رقوم کا مجموعہ تھی جو آپ نے اپنے اہلِ خانہ کی کفالت کے لیے بیت المال سے وقتاً فوقتاً لی تھیں اور اس میں بھتہ تنخواہ سبھی کچھ شامل تھے۔

آپ کا قول ہے جسے حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ اکثر دہراتے رہتے تھے کہ۔

"میری خواہش ہے کہ جب میں دنیا سے نکلوں تو میرا اور دنیا کا حساب صاف رہے اور میں اس دنیا سے صرف صالح عنصر قبول کروں اس کی نجاستیں اور کثافتیں اِسی کے لیے چھوڑ دوں"

کردار و عمل کی یہی بنیادیں ہیں جن پر ایک صالح اور صحت مند معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور دیانت و امانت کی ایسی ہی روائیتیں ہیں جو آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ ایک نازک دور ہے۔ اور اس لمحہ فکریہ میں ہمیں اغیار کا یہ طعنہ رد کرنا ہے اور ثابت کرنا ہے کہ اسلامی نظام زرمحض نظریوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک نہایت عملی اور قابلِ اعتماد لائحہ حیات ہے۔ فاروقؓ اعظم نے جو نقش قدم

چھوڑے ہیں اور اسلامی عدل و مساوات کے جو سنگ میل قائم کیے ہیں رہتی دنیا تک ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اسلام کی دعوت عمل کو اقوام عالم کے باہمی مناقشات اور اقتصادی ناہمواریوں کے لیے بطور تریاق استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خداوند تعالیٰ ہمیں توفیق ارزانی فرمائے کہ ہم مارکس و لینن کے نظریات کو حرز جان بنانے کی بجائے خاک مدینہ و نجف کو اپنی آنکھوں کے لیے سرمہ بنائیں۔ وما علینا الا البلاغ المبین

حضرت ضیاء الامت
مدظلہ العالی
پیر محمد کرم شاہ (الازہری)
کی سرپرستی اور براہِ راست نگرانی میں
سرگرم عمل
دارالعلوم تاجدار مدینہ
شہاب پورہ اگوکی روڈ سیالکوٹ
منجانب
صوفی محمد سرفراز (مہتمم) حافظ محمد نیاز (پرنسپل)

دورِ فاروقی میں حقوقِ انسانی

تحریر: جسٹس بی. زیڈ کیکاؤس

عدلِ فاروقی ضرب المثل ہو چکا ہے قانون کی زبان میں عدل کے معنی یہ ہیں ۔ کہ انسانوں کو اُن کے جائز حقوق تمام و کمال پہنچا دیئے جاویں۔

یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جو حقوق انسانوں کو حضرت عمرؓ کے عہد میں حاصل ہوئے وہ آج تک کسی اور کے عہد میں حاصل نہیں ہوئے (دیگر خلفائے راشدین اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے قطعِ نظر ہے کہ اُن سے تقابل مقصود نہیں ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آج کل کے جمہوری ممالک کے آئین انسانوں کو بہت بنیادی حقوق عطا کرتے ہیں لیکن آئین میں حقوق کا تعین کرنے سے حقوق حاصل تو نہیں ہو جاتے ! یہ بھی لازم ہے کہ حقوق کا عملی نفاذ بھی ہو ۔ مثال کے طور پر ہر آئین انسانوں کو جان و مال کا تحفظ دیتا ہے ۔ لیکن کتنے انسان قتل ہوتے ہیں اور کتنے لوٹے جاتے ہیں جن کے مجرموں کو کوئی سزا نہیں ملتی اور مظلوم کی داد رسی نہیں ہوتی ۔

یہ امتیاز حضرت عمرؓ کے عہدِ حکومت کو ہی حاصل ہے کہ آپ نے نہ صرف انسانوں کے جائز حقوق تسلیم کیے بلکہ عملی طور پر اُن کا نفاذ ہُوا ۔ حضرت عمرؓ کی ۱۰ رسالہ حکومت میں شاید ایک واقعہ بھی ایسا نہ ہُوا ہوگا کہ کسی کے ساتھ ظلم ہُوا ہو اور اس کی حق رسی نہ کی گئی ہو ۔ اور مجرم کو اپنے جرم کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑا ہو ۔ عدلِ فاروقی کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ ہر حقدار نے اپنا حق پا لیا اس نقطۂ نگاہ سے تاریخ کا کوئی عہدِ حکومت نہیں جو عہدِ فاروقی کے مقابلہ میں

پیش کیا جا سکتا ہو۔

چونکہ حضرت عمرؓ کی سلطنت، اسلامی سلطنت کی ایک اعلیٰ مثال تھی یہ تو ظاہر ہے۔ کہ جو حقوق اسلام انسانوں کو عطا کرتا ہے وہ سب اُن کو اس سلطنت میں حاصل تھے۔ زیرِ نظر مضمون کا مقصد اُن تمام حقوق کی وضاحت نہیں جو اسلام انسانوں کو عطا کرتا ہے۔ اس مضمون کا مقصد عہدِ فاروقی کی خصوصیات کا بیان کرنا ہے تاکہ معلوم ہو کہ عہد فاروقی نے حقوقِ انسانی کے متعلق کیا احسان مسلمانوں پہ اور انسانوں پر کیا ہے لہٰذا میں اُن حقوق کا ذکر کروں گا جن کے متعلق اس عہد کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ میں اُن واقعات کا حوالہ دوں گا جو اُن حقوق کو ثابت کرتے ہیں اور پھر پاکستان کے حالات سے اُن کا موازنہ کروں گا۔

افرادِ معاشرہ کا حقِ محاسبہ

پہلا اہم حق جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وُہ افرادِ معاشرہ کا حقِ محاسبہ ہے یعنی اربابِ اقتدار کے اعمال کی کڑی نگرانی کا حق کہ آیا وہ قانون و انصاف کے مطابق عمل کرتے ہیں یا نہیں۔
اس ضمن میں میں اس مشہور واقعہ کا ذکر کرتا ہوں کہ جب ایک بدوی نے حضرت عمرؓ کے کرتے کی لمبائی پر اعتراض کیا تھا۔

جب حضرت عمرؓ مجلس کو خطاب کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک بدوی اٹھا اور کہا لاسمع ولاطاعۃ! یعنی نہ سنتا ہوں نہ اطاعت کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے استفسار کیا کہ کیوں؟ تو بدوی نے جواب دیا کہ یمن سے جو چادریں آئی تھیں ان میں سے سب کے حصے میں ایک ایک چادر آئی تھی آپ نے اسی چادر سے اپنا کرتہ بنوایا ہے لیکن آپ لمبے آدمی ہیں ایک چادر سے آپ کا کرتہ نہ بن سکتا تھا۔ آپ نے اپنے حصے سے زائد لیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا "میرا بیٹا اس کا جواب دے گا" حضرت عبداللہ بن عمرؓ اٹھے اور کہا چونکہ میرے والد کا کرتہ ایک چادر سے نہ بنتا تھا، اس لیے میں نے اُن کو اپنی چادر میں سے ٹکڑا دیا اور اس طرح اُن کا کرتہ پورا ہو گیا۔

بدوی اٹھا اور کہا : الآنَ اسمع و اطیع یعنی اب سُنتا ہوں اور اطاعت کرتا ہوں۔

اس مختصر سے واقعہ سے اس وقت کے معاشرے کا نقشہ انسان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے یہ بدوی ایک معاشرے کا معمولی فرد ہے نہ دولت والا نہ علم والا، نہ کوئی خاص امتیاز رکھنے والا۔ لیکن یہ اپنے خلیفہ پر دو گرہ کپڑے کے متعلق اعتراض کرتے ہیں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا اور خلیفہ بھی وہ کہ مدینہ میں اور دمشق میں لوگ اس کا نام سُن کر کانپتے ہیں کہ پتہ نہیں کیا حکم دے گا پھر دیکھیے کہ جب بدوی نے اعتراض کیا تو حضرت عمرؓ کی پیشانی پر ذرا بل نہ آیا حالانکہ اعتراض بھی غلط تھا اور تھا بھی دو گرہ کپڑے کے متعلق۔

نہ انہوں نے یہ کہا کہ تو نے پہلے سے ہی کیوں کہہ دیا ہے کہ نہ سُنتا ہوں، نہ اطاعت کرتا ہوں جب تجھے ابھی معلوم ہی نہیں کہ الزام درست ہے یا غلط بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنا فرض سمجھا کہ بدوی کی تسلی کی جائے کہ خلیفہ کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں کی گئی اور پھر آپ یہ بھی دیکھیے کہ جب وضاحت کر دی گئی تو بدوی نے فوراً کہا۔ اب سُنتا بھی ہوں۔ اطاعت بھی کرتا ہوں یعنی ذاتی عنصر اس اعتراض کے دوران بالکل غائب ہے۔ نہ حضرت عمرؓ اس اعتراض کو اپنی ذات پر حملہ خیال کرتے ہیں۔ نہ بدوی کو احساس ہے کہ وہ کوئی ذاتی حملہ کر رہا ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ انصاف ہو اور جب اس کی تسلی ہو گئی کہ انصاف ہو رہا ہے تو فوراً اطاعت قبول کر لیتا ہے۔

سُبحان اللہ۔ کیا شاندار معاشرہ ہو اگر حاکم حضرت عمرؓ جیسا ہو اور محکوم بدوی جیسا ہو!

اب میں اس واقعے کا اندازہ قانون کے نقطۂ نگاہ سے کروں گا کہ کون کون سا حق اس سے ثابت ہُوا۔

(الف) اولاً اس سے ثابت ہُوا کہ معاشرہ کے ہر فرد کا وہ امیر ہو کہ غریب جاہل ہو کہ عالم چھوٹا ہو کہ بڑا، یہ حق ہے کہ خلیفۂ وقت کے عمل پر اعتراض کر سکے کہ اس کا عمل قانون و انصاف کے مطابق نہیں ہے۔

(ب) اگر اعتراض مال سے تعلق رکھتا ہے تو مال کا بے اہمیت ہونا اس حق پہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

(ج) یہ ضروری نہیں کہ معترض کے پاس ثبوت موجود ہو کہ فی الواقع خلیفہ کا عمل غلط ہے۔

نہ یہ ضروری ہے کہ وہ دعوے کرے کہ فی الواقع خلیفہ کسی ناجائز فعل کا مرتکب ہُوا ہے۔
یہ کافی ہے کہ واقعات سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا عمل درست ہے یا نادرست اور ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ اس کی وضاحت کی جائے۔

(د) عام حالات میں معترض کا حق ہے کہ جب تک وضاحت نہ ہو وہ خلیفہ کی اطاعت کا پابند نہیں۔

یہ ہے اِس حق محاسبہ کی تفصیل جو اسلامی معاشرے کے ہر فرد کو خلیفۂ وقت کے خلاف حاصل ہے اور خلیفۂ وقت کے خلاف ایسا حق موجود ہو تو ظاہر ہے کہ عمالِ حکومت کے خلاف بھی ایسا حق موجود ہوگا اور واقعہ یوں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اعلان کیا ہوا تھا کہ جس کی کوئی شکایت کسی عامل کے خلاف ہو اس کی حق رسی کی جائے گی۔

جب کوئی ایسی شکایت ہوتی تھی تو حضرت عمرؓ عامل کو اپنے پاس بلواتے تھے۔ کھُلی مجلس میں شکایت کنندہ کو عامل پر سوال کرنے کا موقعہ دیتے تھے اور شکایت درست ہوتی تھی تو عامل کو سزا دیتے تھے۔

اب میں بیان کروں گا کہ افرادِ معاشرہ کے حقِ محاسبہ کی پاکستان میں کیا صورت ہے۔

حضرت عمرؓ پر تو دو گرہ کپڑا زائد لینے کا اعتراض کیا جا سکتا تھا۔ لیکن پاکستان میں اگر کوئی صاحبِ اقتدار سرکاری خزانہ سے ایک ارب یا زائد روپیہ لے لے تو کسی شہری کو کوئی حق اعتراض کا حاصل نہیں ہے۔ یعنی پاکستان کا شہری کوئی قانونی چارہ جوئی اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔

پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے ماتحت اربابِ اختیار کے عمل کے خلاف اس بنا پر چارہ جوئی تو ہو سکتی ہے کہ عمل خلافِ قانون ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ درخواست دہندہ ایسا انسان ہو جس کو نقصان پہنچا ہو اور نقصان کی تعریف یہ ہے کہ وہ ذاتی نقصان ہو خزانہ کا روپیہ اگر کوئی حاصل کر لیتا ہے تو یہ کسی فردِ معاشرہ کا ذاتی نقصان نہیں ہے اس لیے

کسی فردِ معاشرہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت دعوئے (جس کو عام طور پر (رِٹ WRIT) کہا جاتا ہے) دائر کرے۔ مفادِ عامہ کا نقصان کسی فردِ معاشرہ کا ذاتی نقصان نہیں ہے لہٰذا محض اس بنا پر دعوئے دائر نہیں ہو سکتا کہ مفادِ عامہ کو نقصان پہنچا ہے۔

سرکاری خزانہ میں جو روپیہ موجود ہے۔ وہ ٹیکس دہندگان نے دیا ہے لیکن ٹیکس دہندہ کو بھی کوئی حق نہیں کہ وہ سرکاری خزانے کے متعلق چارہ جوئی کرے۔

حضرت عمرؓ کو اپنے علاج کے لیے ایک دفعہ شہد کی ضرورت پڑی اور شہد بیت المال میں موجود تھا۔ تو اُنہوں نے مجلس کو خطاب کر کے فرمایا کہ شہد آپ لوگوں کا ہے۔ اگر اجازت دیں تو میں اپنے علاج کے لیے اس میں سے لوں گا اور لوگوں نے اجازت دی تو حضرت عمرؓ نے شہد استعمال کیا۔

یہ تو صورت سرکاری خزانہ بیت المال کے متعلق رہا یہ سوال کہ کیا پاکستان میں کسی صاحبِ اقتدار سے کوئی باز پرس کی جا سکتی ہے کہ اس نے اپنے اختیارات کو خلافِ قانون طریق سے کیوں استعمال کیا ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے آئین کے آرٹیکل ۲۴۸ کے مطابق نہ پریذیڈنٹ سے نہ کسی گورنر سے نہ کسی وزیر سے چاہے وہ مرکز کا وزیر ہو یا صوبہ کا کوئی باز پرس ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنے اختیارات کو خلافِ قانون یا ناجائز یا ظالمانہ طریق سے کیوں استعمال کیا ؟ اگر وہ کسی مثل پر یہ بھی لکھ دے کہ میں حکم اس لیے صادر کر رہا ہوں کہ فردِ متعلقہ میرا عزیز ہے یا میری پارٹی کا ہے یا میری سفارش لایا ہے یا میرا اس میں ذاتی فائدہ ہے تو بھی اس سے کوئی عدالت کوئی باز پرس نہیں کر سکتی۔

آرٹیکل ۲۴۸ کے الفاظ ایسے ہیں کہ اگر ایک صاحبِ اقتدار کہہ دے کہ میں یہ حکم فلاں قانون کے تحت صادر کر رہا ہوں تو باوجودیکہ وہ حکم بالکل خلافِ قانون ہو وہ صاحبِ اقتدار کسی عدالت کے سامنے جوابدہی کا ذمہ دار نہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو حکم اس نے صادر کیا ہے۔ وہ جائز ہو جائے گا ایسا قانون تو کوئی نافذ کیا ہی نہیں جا سکتا کہ ایک شخص جو بھی کرے وہ جائز ہو گا اس کا نام قانون نہیں قانون تو پابندی کا نام ہے اور یہ کہنا کہ ایک انسان کسی قانون کا پابند نہیں ہے ——— لہٰذا پاکستان کا صاحبِ اقتدار اگر کوئی

خلافِ قانون حکم صادر کرے تو وہ حکم تو ناجائز قرار دے دیا جائے گا بشرطیکہ شکایت کنندہ کا کوئی ذاتی نقصان اس حکم سے ہو، لیکن صاحبِ اقتدار سے کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی کہ تو نے ایسا ناجائز حکم کیوں صادر کیا؟ چاہے وہ صریحاً ناجائز ہو، یا ظالمانہ ہو یا اپنے ذاتی مفاد سے متاثر ہو کر جاری کیا گیا ہو۔

یہ تو صورت ہے اصحابِ اقتدار کی تمام محاسبہ سے آزادی کی، اگر وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کریں۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا قانون اصحابِ اقتدار کو جرائم کے متعلق بھی تحفظ دیتا ہے۔ یعنی اگر وہ کوئی جرم کریں تو کیا اُن سے مواخذہ ہو سکتا ہے؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک صدر اور گورنر صاحبان کا تعلق ہے وہ تمام فوجداری قوانین سے بالاتر ہیں وہ کوئی بھی جرم کریں یہاں تک کہ اگر وہ قتل بھی کر دیں تو ان سے باز پرس نہیں ہو سکتی وہ کسی عدالت کے روبرو پیش ہی نہیں ہو سکتے۔ اُن کے خلاف کوئی فوجداری مقدمہ دائر ہی نہیں کیا جا سکتا اور اگر اُن کے صدر یا گورنر مقرر ہونے سے پہلے کوئی فوجداری مقدمہ اُن کے خلاف دائر ہو چکا ہو تو وہ مقدمہ جاری نہیں رہ سکتا؟

اس مرحلہ پر مجھ کو جنگِ یرموک کا واقعہ یاد آتا ہے۔ رُومیوں سے صلح کی گفتگو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ رومیوں نے کہا ہمارے بادشاہ سے مت لڑو وہ بڑا شان والا بڑے اختیار والا ہے حضرت معاذ بن جبل رضؓ نے کہا تمہارا بادشاہ ایسا ہو گا۔ ہمارا بادشاہ تو ہم میں سے ایک ہے۔ اگر وہ چوری کرے تو ہم اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ اگر وہ زنا کرے تو ہم اس کو سنگسار کر دیں اور جب ہم اس کے پاس کوئی حاجت لے کر جاتے ہیں تو وہ ہماری بات سُنتا ہے۔

اور ہماری تاریخ بھری پڑی ہے اُن واقعات سے کہ ہمارے خلفاء اور بادشاہ قاضی کے روبرو پیش ہوئے اور جوابدہی کی۔ حضرت عمرؓ خود پیش ہوئے۔ حضرت علیؓ پیش ہوئے۔ سُلطان مراد، سُلطان محمد تغلق وغیرہ بادشاہ بھی پیش ہوئے اسلام نے کبھی کسی سے اس وجہ سے رعایت نہیں کی کہ وہ بادشاہ ہے اسلام نے کسی انسان کو

کوئی رعایت جوابدہی کے بارے میں اس کے منصب کی وجہ سے نہیں دی۔
اب باقی رہا سوال عمالِ حکومت کا کہ وہ کس حد تک اپنے اعمال کے متعلق جوابدہ ہیں تو اُن کی صورت یہ ہے کہ ان کے خلاف کوئی فوجداری مقدمہ کسی ایسے جُرم کے متعلق نہیں چلایا جا سکتا جو جرم انہوں نے اپنے اختیارات کے استعمال کے دوران میں کیا ہو۔ جب تک کہ حکومت ایسا مقدمہ دائر کرنے کی اجازت نہ دے۔ اگر عمالِ حکومت میں سے کوئی ایک بالکل ناجائز حکم صادر کر دے جس سے بہت نقصان کسی شہری کا ہو تو حکم منسوخ ہو سکتا ہے لیکن جو جُرم اس عامل نے اپنے ناجائز حکم کے ذریعہ کیا ہو، اس کے لیے اس سے باز پرس نہیں کی جا سکتی جب تک حکومت ایسا کرنے پر رضامند نہ ہو۔ مختصر یہ کہ افرادِ معاشرہ کو کوئی حقِ محاسبہ اس نوعیت کے جرائم کے لیے نہیں۔
ہمارے ملک میں جو بدعنوانی اور رشوت انتظامیہ میں ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو قانون حقِ محاسبہ نہیں دیتا۔ اگر صحیح اسلامی حقِ محاسبہ افرادِ معاشرہ کو دیا جائے تو بہت جلد اصلاح انتظامیہ میں ہو سکتی ہے۔

۲۔ انسانی برابری

دُوسرا اہم حق جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انسانی برابری کا حق ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ قانون کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں ایک جیسے حالات میں سب انسانوں سے ایک جیسا سلوک کیا جائے گا اور کہ کوئی انسان اپنی نسل، ذات، خاندانی شرافت، اقتدار، معاشرے میں اعلیٰ مقام وغیرہ کی بنا پر ترجیحی سلوک کا حق دار نہیں ہو سکتا۔
اسلام کے عروج سے قبل انسانی برابری کا حق یورپ کی تینوں تہذیبوں یعنی یونانی رومن اور عیسائی تہذیبوں میں مفقود تھا۔ یونان کے باشندے چار طبقات میں تقسیم تھے۔ جن کے حقوق بالکل مختلف تھے۔ یہی حال رومن تہذیب کا تھا۔ ایک طبقہ تو غلاموں کا تھا جن کو شیروں کے آگے ڈال کر یونان و روم کے مہذب انسان تماشا دیکھتے تھے۔ عیسائی تہذیب نے بھی غلامی کے رواج کو قبول کر لیا تھا خود پوپ نے اپنے ہاتھ کے پروانے دیے۔

جن میں غلام بنانے کو جائز قبول کیا گیا تھا۔

عیسائی بادشاہوں کو عام انسانوں سے بالاتر حقوق حاصل تھے۔ اسلام نے آکر تمام انسانوں کو یکسر برابر کر دیا۔ غزوہ خندق کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مٹی کی ٹوکری اپنے سر پر اٹھائی اور جب مسلمانوں نے اعتراض کیا تو فرمایا کہ کیا میں تمہارا بادشاہ بن کر بیٹھا رہوں گا۔

جب ایک بڑے گھرانے کی عورت پر چوری کا الزام ثابت ہوا اور لوگ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید کو حضور کے پاس سفارشی بنا کر لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پہلی امتیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ امیر جرم کرتا تو اس کو چھوڑ دیتی تھیں اور غریب جرم کرے تو سزا دیتی تھیں۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

انسانی برابری کی جو مثالیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں قائم ہوئیں۔ تاریخ کا طالبعلم اُن کو اچھی طرح جانتا ہے۔ برابری کا جو حق عہد فاروقی میں قائم ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بطور فریق قاضی کے پاس پیش ہوئے تو قاضی تعظیم کے لیے اٹھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ تو کیسے انصاف کرے گا تو نے تو شروع میں ہی غلطی کر دی میں اور میرا مخالف تیرے سامنے برابر ہیں اور تجھ کو دونوں سے برابری کا سلوک کرنا چاہیے۔

غلاموں کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہوا تھا کہ ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو اور ان سے بہت اچھا سلوک کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوری پابندی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی کی۔ چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ یروشلم تشریف لے گئے تو آپ اور آپ کا غلام باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور جب یروشلم پہنچے تو اُونٹ پر غلام تھا اور آپ نے مہار پکڑی ہوئی تھی۔

عہد فاروقی میں حق برابری کی سب سے نمایاں مثالیں مجرموں کی سزا سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے بیٹے نے نبیذ پی اور اُن پر نشہ طاری ہو گیا وہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص گورنر مصر کے پاس گئے کہ اُن پر حد جاری کر دیں۔ حضرت عمرو بن العاص نے اُن کو جھڑک کر نکال دیا۔ اس پر عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بولے اگر آپ نے مجھ پر حد جاری نہ کی تو جب میں والد کے پاس جاؤں گا۔ تو یہ بات اُن سے کہوں گا! اس پر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص ڈر

گئے اور عبدالرحمٰن پر حد جاری کر دی لیکن تازیانے بند کمرے میں اپنے گھر میں لگائے اور سر بھی بند کمرے میں مونڈا۔

شراب پینے کی سزا تازیانے اور سر مونڈنا تھی حضرت عمرؓ کو علم ہوگیا کہ حد بند کمرے میں لگائی گئی ہے (حضرت عمرؓ کا حکم تھا۔ کہ ایسی حد لوگوں کے سامنے لگائی جاوے) اور انہوں نے بڑا سخت خط حضرت عمرو بن العاصؓ کو لکھا۔

ابن عاص مجھے تمہاری جرات اور بدعہدی پر حیرت ہے اور میں تمہیں معزول کر کے چھوڑوں گا۔ تم نے عبدالرحمٰن کو اپنے گھر میں تازیانے لگائے اور وہیں اس کا سر مونڈا حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ کام میری مرضی کے خلاف کر رہے ہو۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے تھا۔ جو تم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہو لیکن تم نے خیال کیا وہ امیرالمومنین کا بیٹا ہے حالانکہ تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق وصول کرنے میں رعایت و نرمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے اسی وقت اسے ایک اونی قبا پہناؤ اور کاٹھی پر بٹھا کر فوراً میرے پاس بھیج دو کہ وہ اپنی بدکرداری کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے عبدالرحمٰنؓ کو اونی قبا پہنا کر حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق سوار کرا کے بھیج دیا۔ جب عمرؓ کے حکم کے مطابق سوار کرا کے بھیج دیا، جب عبدالرحمٰنؓ اپنے والد کے پاس پہنچے تو سخت تکلیف میں تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ان کی سفارش بھی کی کہ حد تو لگ چکی ہے لیکن حضرت عمرؓ نے دوبارہ حد لگوائی ——— عبدالرحمٰن کہتے جاتے تھے "میں بیمار ہوں۔ آپ مجھے قتل کر رہے ہیں" حد لگنے کے بعد وہ زیادہ بیمار ہو گئے اور فوت ہو گئے۔

دوسرا اسی قسم کا ایک واقعہ بھی حضرت عمروؓ بن العاص سے تعلق رکھتا ہے حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے محمدؓ نے ایک قبطی کو تازیانے مارے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے "لے میں بڑوں کی اولاد ہوں!

حضرت عمروؓ بن العاص نے قبطی کو قید کرا دیا کہ مبادا وہ حضرت عمرؓ سے جا کر شکایت

رسے۔ لیکن آخر اس کو رہا تو کرنا تھا وہ رہا ہُوا تو سیدھا مدینہ پہنچا اور حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص اور محمدؓ دونوں کو مصر سے مدینہ بلوایا اور مجلسِ قصاص طلب کر لی جب دونوں باپ بیٹے مجلسِ قصاص میں پیش ہوئے تو حضرت عمرؓ نے باآواز بلند فرمایا قبطی کہاں ہے لے یہ درہ اور بڑوں کی اولاد کو مار۔ رر قبطی نے محمد کو دُرّے مارنے شروع کر دیے حتیٰ کہ وہ بے دُم ہو گئے قبطی کہے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے۔

"مار بڑوں کی اولاد کو! جب قبطی دُرّہ حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا تو آپ نے فرمایا عمروؓ کی چندیا پر بھی مار! خدا کی قسم اس کا بیٹا تجھے ہرگز نہ مارتا اگر اسے باپ کا گھمنڈ نہ ہوتا،" لیکن قبطی نے کہا "امیر المومنین۔ جس نے مجھے مارا تھا۔ میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔ حضرت عمرؓ نے غضبناک لہجے میں حضرت عمرو بن العاص سے کہا، عمرو تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

تیسرا واقعہ جس کا ذکر میں اس سلسلے میں کروں گا جبلہ بن ایہم سے تعلق رکھتا ہے جو غسان کا امیر تھا وہ عیسائی تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کے عزیز و اقارب بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے مسلمان ہونے کی اطلاع حضرت عمرؓ تک پہنچائی اور حاضر ہونے کی درخواست کی اجازت ملنے پر وہ بڑی شان و شوکت سے اپنے پانچ سو رشتہ داروں سمیت مدینہ آیا۔ اس نے شاہی تاج پہنا ہوا تھا۔

حضرت عمرؓ نے اس کے استقبال کا حکم دیا تھا اور لوگوں نے مدینہ سے باہر جا کر اس کا استقبال کیا جب کہ اس کے ساتھ دو سو سوار ہتھیار لگے ریشمی لباس میں ملبوس تھے حضرت عمرؓ کے پاس وہ پہنچا تو انہوں نے اس کو خوش آمدید کہا اور اپنے پہلو میں جگہ دی۔

کچھ عرصہ بعد وہ حضرت عمرؓ کے ہمراہ مکّہ حج کے لیے گیا وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، تو ایک بدوی کا پاؤں اس کے تہ بند پر پڑا جبلہ کو سخت غصہ آیا اور اس نے بدوی کی ناک پر مکّہ مار دیا۔ بدوی شکایت لے کر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے جبلہ کو بلا کر واقعہ دریافت کیا تو جبلہ نے تصدیق کر دی اس پر حضرت عمرؓ نے کہا چونکہ تم نے اقرار کر لیا ہے اس لیے

یا تو بدوی کو منالو ورنہ تمہیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

جبلہ نے یہ سُن کر ناگواری کے لہجہ میں کہا

یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ ایک معمولی آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اسلام نے تمہیں اور اُسے ایک جگہ جمع کر دیا ہے سوائے پرہیزگاری کے تم کسی چیز میں اس پر فضیلت نہیں پا سکتے۔

جبلہ نے کہا! امیرالمومنین! میں نے تو سمجھا تھا کہ مجھے اسلام میں جاہلیت سے زیادہ عزت دی جائے گی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اگر تم اس کو نہیں مناؤ گے تو میں تم کو سزا دوں گا!

جبلہ نے حضرت عمرؓ سے غور کرنے کے لیے ایک رات کی مہلت مانگی اور رات کو وہ اپنے ساتھیوں سمیت مکہ سے نکل گیا۔ اس نے سیدھا قسطنطنیہ کا رُخ کیا اور ہرقل کے پاس پہنچا پھر عیسائی ہو گیا اور ہرقل نے اس کو جاگیر بخشی اور بڑا اچھا سلوک کیا۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح انسانی برابری کو قائم رکھنے کے لیے حضرت عمرؓ نے ظاہری نفع و نقصان کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اگر جبلہ کی سزا کسی طرح سے ٹل جاتی تو وہ مسلمان ہی رہتا اور حضرت عمرؓ کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ نومسلم کہیں واپس عیسائی نہ ہو جائے لیکن انہوں نے شریعت کے مطابق عمل کیا۔

اب آپ ذرا اپنے معاشرے کا جائزہ لیجیے کہ یہاں انسانی برابری کا کیا حال ہے۔ حقِ محاسبہ پر تبصرے کے دوران میں میں بتا چکا ہوں کہ پاکستان میں کچھ انسان تو ایسے ہیں جو تمام فوجداری مواخذہ سے بالاتر ہیں۔ اُن پر نہ کوئی الزام کسی عدالت میں لگایا جا سکتا ہے، نہ کوئی وارنٹ گرفتاری ان کا جاری ہو سکتا ہے۔ وہ قتل کر دیں تو بھی اُن سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ قتل کیوں کیا ہے؟ اور پھر بھی ہمارا آئین یہ کہتا ہے کہ اس مملکت کا دینِ اسلام ہے۔ اصل میں آئین کا یہ کہنا کہ اس مملکت کا دینِ اسلام ہے۔ دین کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ آج تک پاکستان نے ایک حکم بھی قرآن وسنت کا نافذ نہیں کیا اور اس وقت کے آئین

کے مطابق آٹھ سال کے قریب یا زائد تو قرآن و سنت معطل ہی ہو چکے ہیں۔ بعد میں دیکھا جائے گا کہ اُن میں جو کچھ درج ہے۔ اس کو کس حد تک قانون کی شکل دینی چاہیے!

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برابری جیسے اُصول کو پاکستان میں نافذ کرنے میں کیا رکاوٹ ہے سوائے اس کے کہ ہم غیر اسلامی جھُوٹی شانیں قائم کرنا چاہتے ہیں اور سیاسی مجرموں کو تحفظ دینا چاہتے ہیں بیشک اس دنیا میں تو ان مجرموں کو کسی نے نہ پوچھا لیکن کیا قیامت کے روز بھی ان کو کوئی تحفظ حاصل ہوگا۔ افسوس ہے کہ اُس دین کے پیرو جس کا امتیاز اور فخر یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو اس طرح برابر کر دیا جس طرح وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے روبرو پیش ہوں گے۔ اب خود کا فرانہ اصولوں کو اپنا رہے ہیں۔

قانون نے جس قدر تحفظ پاکستان کے اربابِ اختیار کو دیا۔ اس نے انسانی برابری کا خاتمہ کر دیا لیکن سوال ایک معاشرے میں صرف قانون کا نہیں ہوتا۔ معاشرے کے عمل کا ہوتا ہے اگر قانون برابری کے حق کو تلف نہ کرتا تو بھی پاکستان میں مساوات کا حال بہت بُرا ہوتا۔ کیا اس ملک میں جو سلوک عملی طور پر انسانوں سے کیا جاتا ہے وہ برابری کا ہے؟ اس معاشرہ کا ایک فرد جو خود صاحبِ اختیار ہے یا انتظامیہ میں اثر و رسُوخ رکھتا ہے۔ چاہے وہ اثر و رسوخ رشوت کی وجہ سے ہو، یا سفارش کی وجہ سے یا کسی اور ایسی ہی وجہ سے۔ اس کا کسی جُرم سے جو اُس نے کیا ہے سزا پا جانا ایک امر محال ہے۔

بہت جرم ہمارے سامنے اس معاشرہ میں ہوتے جن کا ارتکاب کرنے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہاں اس غریب آدمی کا کوئی پرسانِ حال نہیں جو کوئی اثر و رسُوخ نہیں رکھتا اور اس کے خلاف تو نہ صرف سچا بلکہ جھوٹا مقدمہ بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔

پاکستان کی تمام آبادی عوام و خواص میں منقسم ہے۔ عوام وہ ہیں جن کے ساتھ بغیر کسی امتیاز کے سلوک ہوتا ہے اور خواص وہ ہیں جو یا تو خُود کوئی امتیاز رکھتے ہیں یا کوئی صاحبِ اختیار اُن کی پشت پناہی کرتا ہے۔ عوام پر ہر قسم کا مواخذہ ہو سکتا ہے لیکن خواص پر مواخذہ محال ہے۔

چونکہ اسلامی طریقِ زندگی سے ہم بہت دُور ہو گئے ہم کو یاد ہی نہیں کہ اسلامی مساوات

کس طرح کی ہوتی ہے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی مواخذہ سے بالاتر نہ تھے۔ لیکن اپنے طور پر ہمارا صدر یا گورنر (نعوذ باللہ) اُن سے زیادہ مقام معاشرے میں رکھتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روز نماز کے لیے صفیں سیدھی کر رہے تھے کہ آپ کی چھڑی ایک صحابی کے پیٹ پر لگی۔ اس نے کہا حضورؐ میں بدلہ لوں گا حضورؐ نے فوراً اپنا پیٹ آگے کر دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس صحابی کا کوئی ارادہ بدلہ لینے کا تھا ہی نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میری بیٹی فاطمہؓ اگر چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ سیدہ فاطمہؓ سے بڑھ کر کس کا رتبہ حضورؐ کی امت میں ہے۔

قرآن پاک نے کیا کوئی بڑے عہدہ داروں کو تحفظ دیا ہے؟ اگر نہیں دیا تو ایسے لوگوں کو تحفظ دے کر ہم قرآن کا انکار نہیں کر رہے؟ لیکن اس ذکر سے تو فائدہ ہی کچھ نہیں ہم نے ایک بھی حکم قرآن کا نافذ نہیں کیا اور قرآن پاک تو کہتا ہے کہ من لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون۔ ترجمہ جو قرآن کے احکام کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہ کافر ہیں)

میں یاد لاتا ہوں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے رومیوں سے صلح کے دوران کیا کہا تھا ہمارا بادشاہ ہم میں سے ایک ہے وہ چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ زنا کرے تو اس کو بھی سنگسار کر دیں۔

اسلامی برابری اس دن ملک میں آئے گی جب ایک غریب آدمی کا کام بھی سرکاری دفتر میں اسی طرح ہوگا جس طرح صدرِ مملکت کا ہوتا ہے۔ جب سربراہ مملکت کو مسجد میں جا کر پچھلی صف میں جگہ ملے گی جب مٹی کا تیل یا ڈالڈا لینے کے لیے سربراہِ مملکت اور گورنر کے نمائندہ کو بھی جا کر لائن میں کھڑا ہونا پڑے گا جب کسی محفل میں کوئی بڑا آدمی جائے تو کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ کھڑے نہ ہوا کرو) جب دفتر کے اوقات کے بعد افسر اور ماتحت دوستوں کی طرح برابری کی سطح پر باتیں کریں گے۔

۲۔ قانون کی بالادستی

مغربی جمہوریت کی روح قانون کی بالادستی ہے۔ یہ دو بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔

(۱) کہ جو قانون کسی ملک میں رائج ہے وہ انصاف کے اصولوں کے مطابق ہے۔
(۲) کہ فی الواقع ملک میں قانون کی پابندی ہوتی ہے۔ قانون کی بالادستی آمریت کی ضد ہے جمہوریت کے تو یہ معنے ہیں کہ قانون کی پابندی ہر حال میں ہو گی کہ حاکم قانون ہے نہ کہ کوئی فرد۔ دورِ آمریت کے معنی یہ ہیں کہ سربراہِ مملکت اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے قانون کا کچھ لحاظ نہیں کرتا اپنے اختیارات کو ذاتی یا جماعتی اغراض کے لیے بے دھڑک استعمال کرتا ہے۔ مخالفت کو برداشت نہیں کرتا اور مخالفوں کو ناجائز طریقوں سے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے ویسے ہر آمر یہی کہتا ہے کہ وہ بڑا جمہوریت نواز ہے لیکن یہ محض پراپگنڈا ہوتا ہے دراصل وہ جمہوریت کا قائل ہی نہیں ہوتا۔

قانون کی بالادستی خود کوئی علیحدہ حق نہیں ہے بلکہ ملک کی سیاسی کیفیت ہے جس میں انسانی حقوق کا احترام کیا جاتا ہے اور تمام حقوق انصاف کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں میں نے حقِ محاسبہ اور انسانی برابری پر بحث کے دوران میں جو کچھ کہا اس سے ظاہر ہو چکا ہے کہ حضرت عمرؓ کس قدر قانون کے پابند تھے انہوں نے نہ کسی انسان کی خاطر نہ اپنے کسی مقصد کی خاطر کبھی قانون سے ذرہ برابر انحراف کیا۔ اپنا مقصد تو اُن کا کوئی تھا ہی نہیں اُن کا مقصد تو محض شریعت کا نفاذ اور افرادِ معاشرہ کی بہبود تھی جب بھی کوئی حکم اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنے آئے وہ فوراً سر جھکانے والے تھے۔

ایک دفعہ کسی نے اطلاع دی کہ فلاں مکان میں کچھ اشخاص شراب پی رہے ہیں۔ آپ تشریف لے گئے اور چھپ کر دیکھا کہ واقعی شراب پی جا رہی تھی۔ آپ نے صبح ایک شراب پینے والے کو بلایا اور اس سے باز پرس کی تو اس نے کہا۔

"کیا پروردگار نے تم کو تجسس سے منع نہیں کیا؟ چونکہ فی الواقع قرآن پاک میں تجسس منع ہے۔ حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے اور اس کو کچھ نہ کہا۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ بہت تھکے ہوئے تھے۔ تو ایک بدوی کوئی فریاد لے کر آ گیا۔ آپ کو ناگوار گزرا تو اس کو ایک کوڑا مار دیا۔ وہ خاموشی سے چلا گیا ابھی سامنے ہی تھا کہ حضرت کو خیال آیا کہ انہوں نے زیادتی ——— کر دی ہے۔ اس کے پیچھے بھاگے اس کی خوشامد

کی ۔ کوڑا اس کے سامنے رکھا اور کہا کہ مجھے مار وہ بیچارا کیسے مارتا۔ آخر اس نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ میں نے آپ کو معاف کیا۔

میں اس مرحلہ پر یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ قانون کی بالادستی تو مغربی جمہوریت کی اصطلاح ہے۔ اسلامی معاشرے میں ہم اللہ کی حکومت چاہتے ہیں۔ تعریف ہی اسلامی معاشرے کی یہ ہے کہ اس میں اللہ کی حکومت ہو۔ یعنی قرآن وسنت نافذ ہوں اور قرآن و سنت کے علاوہ جو احکام صادر ہوں اور قرآن وسنت کی روشنی میں اور ایک مومن کے قلب کے مطابق ہوں۔

موجودہ پاکستان میں اسلامی معاشرہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں جب سے پاکستان بنا عوام کے ڈر سے اربابِ اختیار یہ اعلان تو کرتے رہے کہ قرآن وسنت نافذ ہو گا لیکن ان کے کسی عمل سے ظاہر نہیں ہوتا کہ قرآن وسنت کو نافذ کرنے کا فی الواقع کبھی ارادہ ان کا تھا میں بتا چکا ہوں کہ موجودہ آئین کے مطابق شاید آٹھ نو سال تک کوئی غور قرآن وسنت پر ہو ہی جائے۔

جہاں تک ہمارے معاشرے میں قانون کی بالادستی کا تعلق ہے میں بہت کچھ اُوپر کہہ آیا ہوں یہاں مجرم کو سزا نہیں ملتی اور راستباز انسان کے لیے زندگی بڑی مشکل ہے یہاں تو قانون کی بالادستی کی ضد ہے عام طور پر انسان دوسرے کا حق کھانا چاہتا ہے اور ایسا کرکے بہت خوش ہوتا ہے۔

۴۔ روزی کا حق

اسلام معاشرے کے ہر فرد کو روزی کا حق دیتا ہے۔ اسلامی نظام پر کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں یہی لکھا ہو گا۔ کوئی چار سال ہوئے میں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جو پاکستان ٹائمز میں چھپا تھا اس میں میں نے اسلامی معاشرے میں روزی کے حق پہ پوری بحث کی تھی۔ اور میں نے ایک آرٹیکل کے الفاظ تجویز کیے تھے۔ جس کے ذریعہ یہ حق ہمارے آئین میں درج کر دیا جانا چاہیے۔

پاکستان ٹائمز نے اس پر اداریہ لکھا تھا۔ جس میں لکھا گیا تھا کہ افرادِ معاشرہ کا یہ حق آئین میں تسلیم کیا جانا چاہیئے موجودہ آئین کی تیاری کے وقت بھی حزبِ اقتدار کو کہا گیا تھا۔ کہ افرادِ معاشرہ کو ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا فرض حکومت کا ہے اور اس کو آئین میں درج کرنا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ قیاس کیا جا سکتا تھا۔ کسی نے اس استدعا پر غور نہیں کیا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تھا۔ کہ ایک شہر میں اگر ایک آدمی بھی بھوکا رہ جائے تو پروردگارِ عالم اس شہر کی حفاظت کا ذمہ ترک کر دیتا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔

کہ اگر میری مملکت میں ایک کتّا بھی بھوکا رہ گیا تو مجھ سے مواخذہ ہو گا۔ انہوں نے تمام افرادِ معاشرہ کے وظائف مقرر کیے ہوئے تھے۔ ایک رجسٹر تھا جس میں سب کے نام درج تھے شروع میں حضرت عمرؓ شیر خوار بچے کا وظیفہ نہ لگاتے تھے۔ جب تک وہ ماں کا دودھ پیتا رہے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ماؤں نے اپنے بچّوں کا دودھ جلدی چھڑانا شروع کر دیا اس پر حضرت عمرؓ نے شیر خوار بچّوں کا بھی وظیفہ مقرر کر دیا۔

بڑی ضرورتیں انسان کی ہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان۔ کیا ہمارے ملک میں اناج اور دیگر خوراک اس قدر بھی پیدا نہیں کی جا سکتی کہ جو سب کے لیے کافی ہو۔ کپڑا کیا اس قدر ہماری ملوں میں نہیں بن سکتا جو سب پاکستانیوں کے لیے کافی ہو مکان کیا ہم سب افرادِ معاشرہ کے لیے نہیں بنا سکتے۔ مکان کوئی باہر سے تو درآمد نہیں کیے جائیں گے۔ ہم خود ہی بنائیں گے تو پھر یہ روٹی کپڑا اور مکان کی ضروریات ہر فردِ معاشرہ کی کیوں پوری نہیں ہو سکتیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ضروریاتِ زندگی کا لوگوں کو پہنچانا کوئی مشکل بات نہیں۔ جو دقت ہے وُہ یہ ہے کہ تقسیمِ دولت کا طریقہ غلط ہے۔ اور فضول خرچی بہت ہے ہم غریب ہیں لیکن خرچ اس طرح کرتے ہیں گویا یہ کوئی بڑا امیر ملک ہے۔

یہ تھیں خصوصیات حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کے عہدِ سلطنت کی انسانی حقوق کے نقطہ نگاہ سے اپنے معاشرہ سے مقابلہ کیجیئے۔ تو وہ گویا بہشت تھا اور یہ دوزخ ہے

عہد فاروقی میں ہر فرد معاشرہ کو اس کے جائز حقوق ملتے تھے اور ہمارے معاشرے کا امتیاز یہ ہے کہ یہاں ہر وقت حقوق تلف ہو رہے ہیں اب آپ پوچھیں گے کہ ہمارے معاشرے میں اصلاح ہو سکتی ہے کہ ہم عہد فاروقی کے کہیں قریب ہی پہنچ جائیں؟ ہاں کوئی سربراہ مملکت آئے جو ایسا ہی اللہ کا خوف رکھنے والا ہو ایسا ہی جمہوری قلب رکھتا ہو جیسی کہ کیفیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور اگر پاکستان کی لادین سیاست اسی راستہ پر چلے گی۔ جو اس نے اختیار کیا ہوا ہے یعنی خود غرضی کا راستہ۔ تو اللہ ہی اس ملک کا حافظ ہے اور سیاست کا رنگ تبھی بدل سکتا جب تک ہمارے قلب نہ بدل جائیں۔

ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو محض مادی اسباب کی تلاش سے کبھی وہ زوال ختم نہیں ہو سکتا۔ پروردگار نے فرمایا۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم

ترجمہ:۔ اللہ تبارک وتعالےٰ کسی قوم کی حالت تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنا قلب تبدیل نہ کرے۔

اب ہم جو اپنے قلب کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہے تو گویا ہم قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیت کو (نعوذ باللہ) جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان کے مسلمانوں کا اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا بس ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ اللہ کی اطاعت قبول کر لیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو مادی اسباب کے متعلق وہ ہم کو بتائے گا کہ ہم کیا کریں اور وہ خود بھی تصرف مادی اسباب میں کرے گا جس سے ہمارے سب کام سدھر جائیں گے اور اگر ہم نے باوجود اس کے کہ ہم کافی عذاب سے دوچار ہو چکے ہیں اب بھی اللہ تعالےٰ کی اطاعت قبول نہ کی تو پھر مزید عذاب آئے گا اور اللہ تبارک وتعالےٰ کو ہی معلوم ہے کہ وہ کس قدر سخت ہو گا۔

وما علینا الا البلاغ المبین

علومِ اسلامیہ علومِ جدیدہ کی معیاری تعلیم
اور اعلیٰ اخلاقی و روحانی تربیت کا گہوارہ
دارُالعُلوم
الفاروق
گوھد پور - سیالکوٹ
منجانب
حافظ محمد خان چشتی
فاضل بھیرہ شریف

دورِ فاروقی میں صیغہ عدالت

تحریر: ثناء الحق

حضرت رسولِ اکرمؐ سے قبل اور بعثت کے وقت دنیا میں کئی عظیم سلطنتیں قائم تھیں ان میں فصلِ قضا کا کام بھی ہوتا تھا اور مختلف قوموں اور سلطنتوں نے اپنے لیے قوانین وضع کیے تھے۔ چنانچہ سلطنتِ کلدانیہ کے دورِ اوّل کے عظیم فرمانروا حمورابی کا قانون جو اس نے تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح میں مرتب کر کے پتھر کی ایک بڑی سِل پر کندہ کرایا تھا اب محکمہ آثارِ قدیمہ کی بدولت منظرِ عام پر آگیا ہے۔ یہودیوں کے یہاں بھی قانونِ عدالت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں یونان کے مقنن سولن نے اپنے ملک کے لیے قانون بنایا اور قانون سازی کا باوا آدم کہلایا۔ ۴۵۱ ق م میں سلطنتِ روما کی طرف سے چند آدمی یونان بھیجے گئے تاکہ وہ وہاں قانون کی تعلیم حاصل کریں اور سلطنتِ روما کے لیے ایک مستقل قانون بنائیں یہ لوگ یونان گئے۔ وہاں قانون کا مطالعہ کیا اور واپس آکر انہوں نے سلطنتِ روما کے لیے ایک دستور العمل مرتب کیا جو بارہ اصولوں پر مشتمل ہے یہ اصول دوازدہ گانہ قواعد کہلاتے ہیں۔ رومیوں کو اپنے ان قواعد پر اتنا ناز تھا کہ ان کا عظیم مفکر مدبّر اور خطیب سسرو (۱۰۶ تا ۴۳ ق م) نہایت فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ

"یہ قوانین اور قاعدے تمام فلسفیوں کی تصنیفات سے بڑھ کر ہیں"

یہ تمام قواعد سیسہ کی تختی پر کندہ کیے گئے اور سلطنت روما میں اسی پر عمل درآمد ہوتا رہا یہ دوازدہ گانہ قواعد ذیل میں درج ہیں۔

(۱) جب تم عدالت میں طلب کیے جاؤ تو فوراً فریق مقدمہ کے ساتھ حاضر ہو۔
(۲) اگر مدعا علیہ انکار کرے تو تم گواہ پیش کرو تاکہ وہ جبراً حاضر کیا جائے۔
(۳) مدعا علیہ بھاگنا چاہے تو تم اس کو پکڑ سکتے ہو۔
(۴) مدعا علیہ بیمار ہو یا بوڑھا ہو تو تم اس کے لیے سواری دو ورنہ اس کے لیے حاضری کے لیے جبر نہیں کیا جاسکتا۔
(۵) مُدعا علیہ ضامن پیش کرے تو تم اس کو چھوڑ دو۔
(۶) دولت مند کا ضامن دولت مند ہونا چاہیئے۔
(۷) جج کو فریقین کے اتفاق سے فیصلہ کرنا چاہیئے۔
(۸) جج صبح سے دوپہر تک مقدمہ سُنے گا۔
(۹) فیصلہ دوپہر کے بعد فریقین کی حاضری میں ہوگا۔
(۱۰) مغرب کے بعد عدالت بند رہے گی۔
(۱۱) فریقین اگر ثالث پیش کرنا چاہیں تو ان کو ضامن دینا ہوگا۔
(۱۲) جو شخص گواہ نہیں پیش کر سکتا مدعا علیہ کے دروازے پر دعوے کو پکار کر کہے۔

ہندوستان اور ایران میں بھی ان قوموں کے اپنے قوانین عدالت تھے۔ اور ان پر کسی نہ کسی حد تک عمل بھی ہوتا تھا۔ اگرچہ بعض قوموں میں مُدعی اور مدعا علیہ کے رتبہ اور رسُوخ کے مطابق ان قوانین میں تحریف اور رد و بدل بھی ہو جاتا تھا جس کی طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں واضح طور پر اشارہ فرمایا ہے۔

"پرانی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ وہ افراد کے لیے قانون بدل دیتی تھیں خبردار تم ایسا نہ کرنا ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا"

دیگر امُور کے علاوہ پرانی قوموں کے قوانین عدالت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایک مدت تک صیغۂ عدالت اور انتظامی صیغے الگ الگ نہیں تھے۔ ان میں تفریق کافی عرصہ کے

بعد ہوئی۔ عدلیہ انتظامیہ کے ماتحت ہونے کے سبب عدل و انصاف بہت کم ہوتا تھا لیکن اس قباحت کو اقوامِ جدیدہ نے بہت دیر میں سمجھا۔

آغازِ اسلام کے بعد کچھ عرصہ تک مسلمانوں میں بھی یہ نظام اسی طرح چلا۔ عہدِ رسالت، خلافتِ صدیقی اور خلافتِ فاروقی کے ابتدائی دور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس کی اہم وجوہ یہ ہیں کہ اس مبارک عہد میں زندگی اور معاشرہ کا ہر شعبہ نہایت سادہ حالت میں تھا اور فتوحات کا سلسلہ جاری ہونے کی وجہ سے ملکی تقسیم اور محکموں کا قیام باقاعدگی سے عمل میں نہیں آیا تھا لیکن جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہد کو شروع ہوئے کئی سال ہو گئے اور فتوحات کا دائرہ وسیع ہو کر سلطنتِ اسلامیہ دُور دراز کے ملکوں تک پھیل گئی تو اس سلطنت کو کئی صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور صُوبے ضلعوں میں بانٹ دیے گئے والیوں کے اختیارات وسیع کر دیے گئے اور انتظام کی بنیادیں پوری طرح مستحکم ہو گئیں اُس وقت حضرت عمرؓ نے ضروری سمجھا کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا جائے چنانچہ آپ نے صوبوں اور ضلعوں میں بڑی اور چھوٹی عدالتیں قائم کر کے اُن کے لیے باصلاحیت افراد کو قاضی مقرر کیا۔ یہ کام حضرت فاروقِ اعظم کی اولیات میں شمار کیا جاتا ہے۔

صیغۂ عدالت قائم کرنے کے ساتھ ہی آپ نے قضا کے اُصول و آئین سے متعلق ایک فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کی جو نقل حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بھیجی گئی وہ تاریخوں نے محفوظ کر کے ہم تک پہنچائی ہے مضمون یہ ہے۔

"خدا کی حمد کے بعد واضح ہو کہ قضا ایک عظیم اور ضروری فرض ہے۔ اسے بڑے اہتمام اور غور و خوض سے ادا کرنا۔ اپنے سامنے اپنے انصاف میں سب لوگوں کو برابر رکھنا۔ خبردار کوئی کمزور انصاف سے مایوس نہ ہونے پائے اور کسی زوردار اور بڑے آدمی کو تمہاری رو رعایت کی ذرا بھی اُمید نہ ہونی چاہیے بغیر ان دو خوبیوں کے سلطنت خدا کی لعنت ہے بارِ ثبوت دعویٰ کرنے والے کے ذمہ ہے اور جو شخص منکر ہو اس کے لیے قسم ہے فریقین اگر باہم صلح کر لیں تو اچھا ہے بشرطیکہ اس سے حلال حرام اور حرام حلال نہ ہونے پائے کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کر دیا ہے اور آج

اگر تمہیں اُس کی تجویز میں کوئی غلطی نظر آئے تو مقتضائے انصاف یہ ہے کہ اپنی تجویز کی ترمیم میں ذرا بھی نہ شرمانا کیونکہ دنیا والوں کے آگے ذلت اٹھا لینا بہتر ہے اس لیے خدا کے سامنے نامنصف کہلاؤ جس مسئلہ میں تمہیں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کی بابت تمہیں کوئی حکم نہ ملے تو اس پر بار بار غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر خیال دوڑاؤ، پھر اپنے قیاس کو لگاؤ۔ اگر کوئی شخص ثبوت پیش کرنا چاہے تو اس کی پیشی کے لیے مناسب میعاد مقرر کر دیا کرو۔ اگر وہ ثبوت دے دے تو اس کا حق دلایا کرو۔ ورنہ مقدمہ خارج کر دینا چاہیئے سب مسلمانوں کو ثقہ سمجھنا چاہیے سوائے اُن لوگوں کے جنھیں حد کی سزا میں دُرّے لگائے گئے ہوں یا جن کی نسبت ثابت ہو کہ انہوں نے عدالت میں کبھی جھوٹی گواہی دی ہو یا ولد اور وراثت میں مشکوک ہوں۔"

یہ فرمان کس قدر مختصر مگر کتنا جامع ہے اس کے مضمون پر غور کیجیئے تو پتہ چلے گا۔ کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ اس فرمان کا تجزیہ کرنے سے متعلق حسب ذیل احکام مرتب ہوتے ہیں۔

(۱) قاضی جب اپنی مسند پر بیٹھ جائے تو اُسے اپنے پرائے چھوٹے بڑے اور زبردست و کمزور کا خیال ترک کر کے سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہیئے۔

(۲) بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہے۔

(۳) مدعا علیہ اگر کوئی ثبوت یا شہادت فراہم نہیں کر سکتا تو اس سے قسم لی جائے۔

(۴) فریقین باہم صلح کر لیں تو قاضی کو چاہیے کہ اُسے تسلیم کرے بشرطیکہ وہ خلافِ قانون نہ ہو۔ یعنی اس میں حلال و حرام کی تمیز کرنا ضروری ہے۔

(۵) فیصلہ ہو جانے کے بعد اگر قاضی کو معلوم ہو جائے کہ وہ فیصلہ غلط تھا تو وہ اس پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے۔

(۶) مقدمہ کی پیشی کی تاریخ مقرر ہونی چاہیئے۔

(۷) تاریخ معینہ پر اگر مدعا علیہ حاضر نہیں ہو گا تو مقدمہ یک طرفہ فیصل ہو گا۔ اور

اگر مدعی حاضر نہ ہوگا اور مدعا علیہ کو اس کے دعوے سے انکار ہوگا تو مقدمہ عدم پیروی میں خارج کیا جائے گا۔

(۸) ہر مسلمان کی شہادت قبول کی جانی چاہیے لیکن جو شخص سزا پاچکا ہو یا جس کا جھوٹی گواہی دینا ثابت ہو وہ قابلِ شہادت نہیں ہے۔

ان احکام کا مقابلہ سلطنت روما کے قابلِ فخر و ناز دوازدہ گانہ قواعد سے کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ آدمیوں کا یہ فخر و ناز کس قدر نامعقول اور مضحکہ خیز ہے۔ پہلے ہی قاعدہ کو لیجیے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ "جب تم عدالت میں طلب کیے جاؤ تو فوراً فریق مقدمہ کے ساتھ حاضر ہو۔ ایک صاحب نے اس پر یہ دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔

تاکہ راستہ میں لٹھ چل جائے اور دوسرا مقدمہ اس کی شاخ فوجداری میں چلے۔

دُوسرا قاعدہ ملاحظہ ہو" مدعا علیہ بھاگنا چاہے تو تم اُسے پکڑ سکتے ہو۔

کس قدر احمقانہ بات ہے ظاہر ہے کہ اگر مدعی اتنا زور آور ہوتا تو عدالت کا دروازہ کیوں کھٹکھٹاتا۔

ساتواں قاعدہ ان سے بھی زیادہ مہمل ہے ارشاد ہوتا ہے جج کو فریقین کے اتفاق سے فیصلہ کرنا چاہیے۔

اس کا مفہوم اگر وہی ہے جو بظاہر سمجھ میں آرہا ہے تو اس کو قانون بنانے والوں کے خبط پر محمول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے اگر فریقین کا کسی فیصلہ پر اتفاق ہو جاتا تو عدالت میں کیوں آتے پھر یہ کہ اگر فریقین کا کسی فیصلہ پر اتفاق نہ ہو سکے جس کے امکانات نہایت قوی ہیں تو جج صاحب کونسی راہ اختیار کریں اس ضابطہ یا قاعدہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی۔

بارہ قاعدہ میں سے تین کی کمزوری کی طرف تو یہ اشارہ کر دیا گیا ہے باقی نو قاعدے بھی ایسے ہی بودے اور لایعنی ہیں۔

ان کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ کے فرمان سے ترتیب دیے ہوئے احکام کو دیکھیے ان میں سے ہر ایک کس قدر معقول اور واضح ہے پہلا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

ارشاد کی تفسیر ہے۔

"پرانی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ وہ افراد کے لیے قانون کو بدل دیتی تھیں خبردار تم ایسا نہ کرنا ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا"

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے ہادی کے اِس ارشاد کی تعمیل میں قاضی کو سب سے پہلی ہدایت یہی کی کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور ہر فرد پر ایک ہی قانون لاگو ہوگا خواہ وہ فرد امیر ہو خواہ غریب، خواہ یگانہ ہو خواہ بیگانہ۔

سلطنت روما کے دوازدہ گانہ قاعدوں میں سے ساتویں قاعدہ کے مقابلہ میں فاروق اعظم کا یہ حکم کس قدر وزنی اور معقول ہے ہر شخص اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "فریقین باہم صلح کرلیں تو قاضی کو چاہیے کہ اسے تسلیم کرے بشرطیکہ یہ امر خلافِ قانون نہ ہو۔ یعنی حلال و حرام کی تمیز ہر حالت میں کرنا ہوگی۔

اسی طرح ہر حکم کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ فصلِ خصومات میں پورا عدل و انصاف تین باتوں پر منحصر ہے۔

(۱) قانون عمدہ اور مکمل ہونا چاہیے تاکہ صحیح فیصلے ہو سکیں۔

(۲) قابل اور متدین حکام منتخب کیے جائیں تاکہ وہ بغیر کسی رُو رعایت کے فیصلے دے سکیں۔

(۳) وہ تمام اصول اور طریقے برتے جائیں جن کی وجہ سے رشوت اور دیگر ناجائز وسائل کا سدِ باب ہو اور فصلِ خصومات میں کسی طرح کی رُو رعایت نہ ہو سکے۔

ان سہ گانہ اُمور پر اس اصول کا اضافہ کیا جائے تو انصاف کے حصول میں مزید سہولت پیدا ہو جائے۔

آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی تعداد کافی رکھی جائے۔

دورِ فاروقی میں ان چاروں باتوں کا پورا پورا خیال رکھا گیا اور ان کا مناسب انتظام کیا گیا۔

۱۔ مکمل قانون

اسلام کا اصلی قانون قرآن مجید ہے اسی پر دورِ فاروقی میں عمل ہوا۔ جزئیات کے لیے حدیث اجماع اور قیاس سے مدد لی گئی حضرت عمرؓ نے قضاۃ کو اِن باتوں پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی چنانچہ کوفہ کے قاضی شریح کو ایک فرمان بھیجا جس کا مضمون یہ تھا۔

مقدمات میں قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث سے اور اگر حدیث میں بھی مخصوص طور پر کوئی واضح حکم نہ ہو تو اجماع (کثرت رائے) سے اور اگر اس طرح بھی ممکن نہ ہو سکے تو اپنے اجتہاد سے کام لے کر فیصلہ کر دو"

اس فرمان کے علاوہ حضرت عمرؓ حکام عدالت کو وقتاً فوقتاً مشکل اور اہم مسائل سے متعلق فتوے لکھ کر بھیجتے رہتے تھے۔

۲۔ قضاۃ کا انتخاب

قضاۃ کے انتخاب میں حضرت عمرؓ نے بڑی احتیاط اور دانائی سے کام لیا اور جن لوگوں کو عدل و انصاف کے معاملہ میں بہتر سمجھا اُن کو صوبائی عدالتوں کے لیے منتخب کیا چنانچہ دارالخلافہ کے لیے حضرت زید بن ثابت کا انتخاب کیا یہ صحابی رسول ہونے کے علاوہ کاتب وحی بھی رہ چکے تھے۔ سُریانی اور عبرانی زبانوں کے ماہر تھے۔ فرائض کے مسائل اُن سے بڑھ کر پورے عرب میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ بصرہ کے لیے حضرت کعب بن سوار لازدی کو منتخب کیا وہ بڑے معاملہ فہم اور نکتہ شناس تھے چنانچہ مشہور تابعی امام محمد بن سیرین نے اُن کے بہت سے فیصلے اور احکام نقل کیے ہیں۔ فلسطین میں حضرت عبادہ بن الصامت کو قاضی بنایا گیا ان کی جلالت شان اس سے ظاہر ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں اُن کو تمام قرآن حفظ تھا اور اسی لیے بارگاہ رسالت سے اصحاب صُفہ کی تعلیم اُن کو سپرد کی گئی تھی۔ کوفہ میں اوّل حضرت عبداللہ بن مسعود کو جو فقہ حنفی کے

موزش اول ہی میں قاضی بنایا گیا۔ سنہ ۱۹ھ میں اُن کی جگہ قاضی شریح مقرر کیے گئے اُن کی ذہانت اور معاملہ فہمی بھی ضرب المثل تھی۔ چنانچہ حضرت علیؓ ان کو اقضی العرب " کہا کرتے تھے ان کے علاوہ دیگر حضرات جو اس عہدے کے لیے منتخب کیے گئے اُن میں قابلِ ذکر جمیل بن معمر الجمی ابو مریم الحنفی، سلمان ربیعۃ الباہلی، عبدالرحمٰن بن ربیعہ، ابو قرۃ الکندی، عمران بن الحصین ہیں ان کے فضائل رجال کی کتابوں میں درج ہیں۔

اگرچہ قاضی صوبہ یا ضلع کے حاکم کے ماتحت ہوتا تھا۔ اور ان کو قاضی مقرر کرنے کے پورے اختیارات تھے لیکن بطورِ احتیاط اکثر و بیشتر قاضی حضرت عمرؓ خود مقرر کرتے تھے۔ جن لوگوں کا انتخاب کرنا ہوتا اوّل ان کی شہرت دیکھی جاتی تھی۔ اس کے بعد اکثر ان کا عملی امتحان لیا جاتا تھا۔ قاضی شریح کے انتخاب کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی شخص سے ایک گھوڑا خریدنا چاہا مگر شرط یہ رکھی کہ پسند آئے گا تو خریدا جائے گا ورنہ نہیں۔ امتحان کے لیے وہ گھوڑا ایک سوار کو دیا گیا۔ اتفاق سے گھوڑا سواری میں چوٹ کھا کر داغی ہو گیا حضرت عمرؓ نے یہ نقص ہو جانے کی وجہ سے اُسے واپس کرنا چاہا لیکن گھوڑے کے مالک نے واپس لینے سے انکار کر دیا معاملہ قاضی شریح کے سامنے لے جایا گیا انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی ہوتی تو گھوڑا واپس کیا جا سکتا تھا۔ اب واپس نہیں ہو سکتا۔ حضرت عمرؓ کو یہ فیصلہ بہت پسند آیا اور انہوں نے فوراً شریح کو کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا۔

ذاتی قابلیت، ذہانت اور معاملہ فہمی کے علاوہ حضرت عمرؓ قاضی کے لیے رُعب و داب کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ تقرر کے وقت خود بھی اس کا خیال رکھتے اور والیوں اور ضلع کے حاکموں کو بھی اس کی ہدایت کرتے رہتے۔ آپ نے دیگر ہدایات کے ساتھ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو یہ بھی لکھا کہ جو شخص با اثر اور صاحبِ عظمت نہ ہو۔ اُس کو قاضی نہ مقرر کیا جائے۔

رشوت سے محفوظ رکھنے کے وسائل

ناجائز طریقوں کا سدِباب کرنے اور مقدمات کے فیصلوں میں عدل و انصاف کو کام میں لانے کے لیے دیگر احتیاطوں کے علاوہ دو اہم اُصول مقرر کیے۔

اوّل یہ کہ تنخواہیں بیش قرار مقرر کیں تاکہ بالائی آمدنی کی ضرورت نہ ہو اور رشوت ستانی کے دروازے بند ہو جائیں۔

دوم یہ کہ جو شخص مالدار اور معزز نہ ہوتا وہ قاضی مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اِن کے علاوہ کسی قاضی کو تجارت اور اپنا ذاتی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی تعداد

دورِ فاروقی میں آبادی کے لحاظ سے قاضیوں کی تعداد کافی تھی۔ صوبوں کے علاوہ ہر ضلع میں بھی ایک قاضی ہوتا تھا اور چونکہ مسلمانوں ہی کے مقدمات اُن کے سامنے جاتے تھے۔ اِس لیے ان عدالتوں پر کام کا بوجھ زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ قاضیوں کے سامنے بہت کم مقدمات پیش ہوتے تھے، لہٰذا اُن کے فیصلوں میں تاخیر نہیں ہوتی تھی غیر مسلموں کو اجازت تھی کہ وہ اپنے مقدمات کا فیصلہ اپنے مذہب اور رسوم و رواج کے مطابق خود کر لیں۔

ماہرینِ فن کی شہادت

یہ بات حضرت عمرؓ کے اجتہادات میں سے ایک ہے انہوں نے یہ نادر قانون بنایا کہ جو مقدمہ کسی مخصوص فن سے متعلق ہو اس میں خاص اس فن کے ماہر کی شہادت اور رائے لی جائے اس سلسلہ میں دورِ فاروقی کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے۔

ایک شاعر حطیہ نے زبرقان بن بدر کی ہجو میں ایک شعر کہا دورِ فاروقی میں کسی کی ہجو کرنا جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ لہذا زبرقان نے حضرت عمر کے ہاں مقدمہ دائر

کیا۔ لیکن شعر اس انداز سے کہا گیا تھا کہ اُس سے صاف طور پر ہجو ظاہر نہیں ہوتی تھی چونکہ یہ معاملہ فنِ شعر سے متعلق تھا۔ اِس لیے حضرت عمرؓ نے مداحِ رسول حضرت حسان بن ثابت کو جو شاعری میں بلند پایہ رکھتے تھے بلایا اور اُن کی رائے طلب کی۔ اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

اِنصاف کا ارزاں اور آسان ہونا

حضرت عمرؓ نے اس چیز پر خاص توجہ کی کہ ہر شخص کو آسانی سے عدالت میں پہنچنے کا موقعہ ملے اور اِنصاف کے حصُول میں کوئی دِقت پیش نہ آئے۔ آج کل کی مہذب دنیا میں اکثر لوگ عدالتوں میں جاتے ہوئے اِسی لیے ڈرتے ہیں کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں روپے کے ذریعہ اپنی راہ ہموار کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی مفصل خصُومات میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ ان وقتوں کو دیکھتے ہوئے دادخواہ اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں کہ دعویٰ سے باز رہیں۔ اور عدالتوں کے چکر میں نہ پڑیں حضرت عمرؓ نے اپنے یہاں کوئی کورٹ فیس نہیں رکھی اور قاضیوں کو حکم تھا کہ وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کریں۔

عدالت کی عمارتیں

حضرت عمرؓ کو چونکہ عوام کی سہولت مدِ نظر تھی اِس لیے آپ نے عدالت کے لیے الگ عمارتیں نہیں بنوائی تھیں بلکہ اُن کے زمانہ میں عدالتیں، مسجدوں ہی میں لگتی تھیں تاکہ وہاں جانے میں کسی کو کوئی تامل نہ ہو اور غریب سے غریب اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی وہاں پہنچ کر اپنا دعویٰ پیش کر سکے اور بغیر کسی خرچ اخراجات کے انصاف حاصل کر سکے۔ قضاۃ کو خلیفۃ المومنین کی جانب سے ہدایت تھی کہ کتنا ہی غریب اور مفلس شخص مقدمہ کا فریق بن کر آئے وہ اس سے نرمی اور کشادہ روئی سے پیش آئیں تاکہ اُسے اپنا مدعا ظاہر کرنے میں مطلق ہچکچاہٹ نہ ہو۔

قانون سے واقفیت

آج کل یہ فقرا اکثر سننے میں آتا ہے کہ "قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے" لیکن اس کے باوجود عوام کو قانون سے آگاہ کرنے کا کوئی موثر ذرلیعہ نہیں ہے۔ عہدِ فاروقی میں اس کے لیے محکمہ افتا قائم تھا۔ اس میں لائق اور عمدہ قانون داں یعنی فقیہہ رکھے جاتے تھے جن کا فرض تھا کہ بڑی تحقیق اور تدقیق سے ہر مسئلہ کو بتائیں اور جو چاہے اُن سے پوچھے نہ بتانا یا غلط بتانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ جو چاہتا قانون سے واقف ہو سکتا تھا۔ اس وقت قانون سے ناواقفیت کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا تھا اور نہ کوئی عدم واقفیت کا عذر کرتا تھا۔

حضرت عمرؓ کی عدالت کے فیصلے دوسروں کیلئے نظیر بنتے تھے

حضرت عمرؓ خود بھی مقدمات سنتے۔ اور اُن کے فیصلے دیتے۔ یہ فیصلے دوسری عدالتوں کے لیے نظائر کا کام دیتے تھے۔ یہاں عدلِ فاروقی کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) ایک قبطی نے مصر سے مدینہ آکر دربارِ خلافت میں شکایت کی کہ مجھے گورنر کے لڑکے نے مارا ہے۔ آپ نے مارنے کی وجہ پوچھی اس نے بتایا کہ عمروؓ بن العاص نے گھڑدوڑ کرائی۔ میں نے بھی اس میں حصہ لینا چاہا میرے گھوڑے کو دیکھ کر اُن کے صاحبزادے محمد نے کہا کہ یہ گھوڑا میرا ہے"۔ جب میں نے جواب دیا کہ "گھوڑا تمہارا نہیں میرا ہے" تو وہ مجھے یہ کہہ کر کوڑے سے مارنے لگے کہ میں شریف کا بیٹا ہوں، تو اپنی زبان درازی کا یہ بدلا لے! فاروق اعظمؓ نے یہ سنا تو آپ نے فوراً حضرت عمرو بن العاصؓ کو مع ان کے فرزند کے دربارِ خلافت میں طلب کیا اور جب وہ آگئے تو آپ نے فوراً دادخواہ کو وہ کوڑا دے کر کہا۔ تم اس شریف کے بیٹے کو مارو اس قبطی نے تامل کیا لیکن جب آپ نے تین بار حکم دیا تو اس قبطی نے فاروقی درہ لے کر گورنر کے روبرو اُن کے صاحبزادے محمد کو مارنا شروع کر دیا اور گورنر کھڑے دیکھتے رہے۔ مگر زبان سے اُف تک نہ کر سکے۔

(۲) ایک دن حضرت عمرؓ بازار سے گزر رہے تھے۔ وہاں آپ نے ایک شخص کو کسی عورت سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا اور اُس پر بد اخلاقی کا شبہ کر کے اس کو دھمکایا۔ اس نے کہا امیرالمومنین یہ میری بیوی ہے۔

یہ سن کر آپ نے اس کو چھوڑ دیا لیکن آپ کے دل میں ایک طرح کی خلش رہی اس کا ذکر آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے کیا اور اپنی بے جا مداخلت پر تاسف کا اظہار بھی کیا۔

چونکہ آپ نے لوگوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر کوئی شخص تہمت کی جگہ پر کھڑا ہو اور کوئی دوسرا آدمی اس پر بدظنی کا اظہار کرے تو اُسے بُرا نہ ماننا چاہیئے۔ اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ آپ لوگوں کو ادب سکھاتے ہیں اگر اس میں غلطی ہو گئی تو کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس جواب سے کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ آپ سیدھے اس شخص کے پاس گئے۔ درہ اُس کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ اپنا بدلہ لے لے۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ہاتھ باندھ کر کہا "امیرالمؤمنین میں ہی غلطی پر تھا آپ نے مجھے جو تنبیہ فرمائی وہ عین مناسب تھی!

(۳) ایک دفعہ ایک یہودی اور ایک مسلمان کا مقدمہ عدالتِ فاروقی میں پیش ہوا۔ آپ نے تحقیق کے بعد فیصلہ یہودی کے حق میں دے دیا۔ وہی سچا تھا یہودی آپ کی تعریف کرتا ہوا چلا گیا اور کہنے لگا واللہ! یہ شخص بے نظیر ہے کیونکہ اس نے میری توقع کے خلاف مسلمان کو ناکام واپس کیا۔

(۴) ایک شخص نے اپنے بڑھاپے کو چھپانے کے لیے خضاب لگا لیا تھا اور خود کو جوان بنا کر ایک نوعمر لڑکی سے شادی کر لی تھی جب زوجہ کے متعلقین کو پتہ چلا تو انہوں نے دہائی مچائی آپ نے اُس کا خضاب دھلوایا دیکھا تو وہ شخص پیر فرتوت نکلا۔ آپ نے دھوکا دہی کے الزام میں اُس کے کوڑے لگوائے۔

(۵) ایک مرتبہ قتل کے ایک مقدمہ میں آپ نے قاتل کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ مقتول

کے بعض ورثاء نے معافی دے دی۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے مشورہ کر کے باقی متعلقین کو دیت دلوا کر اُسے چھوڑ دیا۔

(۶) ایک مجنون عورت کو آپ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مجنون نابالغ اور خفتہ شخص پر شرعاً تعزیر واجب نہیں ہے۔ آپ نے حضرت علیؓ کا شکریہ ادا کیا اور حکم منسوخ کر دیا۔

دیارِ مغرب میں
تبلیغِ دین، تربیتِ مسلمین
اور اسلامی اقدار
کے فروغ کیلئے
سرگرمِ عمل
غوثیہ مسلم سوسائٹی (رجسٹرڈ) اوسلو ناروے
فون:
22687014

تحریر: قاضی عبدالنبی کوکب

فاروقِ اعظمؓ اور عمال کی تربیّت

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ریاست کی دیگر عظیم ذمہ داریوں کے ساتھ، اُمت مسلمہ کی ترتیب و تہذیب کے فریضے کی اہمیت کو بھی پوری شدت کے ساتھ محسوس کر لیا تھا غالباً عہد فاروقی کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ یہی تھا کہ آپ نے اُمت کے اخلاق و اعمال کو اسلام کی تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ رکھا آپ نے اسلامی تہذیب کے اصول و فروع کو قوم کے سامنے نکھار کر پیش کیا، اُن کی حکیمانہ، واضح اور درست تشریح پیش کی۔ اپنی زندگی اور اپنے دَور کے عمالِ حکومت کی زندگیوں کو تہذیبِ اسلام کے معیاروں پر انتہائی سختی کے ساتھ پرکھا اور پرکھنے کا یہ عمل مسلسل جاری رکھا۔ عوام ہوں کہ خواص، دونوں طبقات کے اعمال و اخلاق اور معاشرت ملّی کے سانچوں میں کسی کمی، کسی کجی یا کسی جھول کو ہرگز برداشت نہ کیا اس کے نتیجہ میں یہ عظیم کامیابی حاصل ہوئی کہ اسلام جس تہذیب و معاشرت کو دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے نہ صرف اس کا ایک درست اور قابلِ عمل خاکہ انسانیت کے سامنے آگیا۔ بلکہ بیسیوں اقوام اور کروڑوں نفوس پر مشتمل عظیم اُمتِ مسلمہ اور لاکھوں مربع میل پر پھیلی ہوئی وسیع و عریض اسلامی سلطنت، اسلامی تہذیب و تربیت کی کامیاب ترین صحیح عملی تفسیر بنا کر دکھا دی گئی۔

غور کیا جائے تو تاریخ اقوام و ملل میں یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔

اس عظیم تعمیری کارنامے کی انجام دہی کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس موثر ترین ذریعہ یہ تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے اپنی شخصی زندگی اور اس کے بعد اپنے کارکنانِ حکومت کی شخصی زندگیوں کی کامل نگرانی کی۔ عمال حکومت کی تہذیبی نگرانی میں پوری شدت اور احتیاط برت کے، ان خواص کی زندگیوں کو عامۃ الناس کے لیے تہذیب و تربیت کا عمدہ نمونہ بنا دیا گیا۔ فاروق اعظمؓ اس اصول پر یقین رکھتے تھے کہ حکمرانوں کے بگاڑ سے قوم بگڑتی ہے۔ اور حکمرانوں کے سنور جانے سے قوم سنور جاتی ہے آپ فرمایا کرتے تھے۔

ان الناس لم یزالوا مستقیمین ما استقامت لھم ائمتھم و ھداتھم

(اگر قائدین صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں تو عام لوگ راہِ راست سے کبھی نہیں ہٹتے)

اس سلسلے میں آپ کا تصور یہ تھا کہ اگر حکومت کا کوئی بھی کارکن کسی شخص پر ظلم کرے اور اس ظلم سے مطلع ہو کر بھی سربراہ اعلیٰ اصلاحِ احوال کے لیے کوئی اقدام نہ کرے تو گویا اس ظلم کا مرتکب خود سربراہ ہوگا چنانچہ آپ نے فرمایا۔

ایّما عاملٍ لی ظلم احدًا فبلغتنی مظلمتہٗ فلم اغیرھا فانا ظلمتہٗ[2]

(میری حکومت کے جس کارکن نے بھی کسی عام آدمی پر ظلم کیا اور اس ظلم کی اطلاع مجھ تک پہنچی، پھر اگر میں اس کی اصلاح نہ کروں تو اس ظلم کا مرتکب خود میں قرار پاؤں گا)

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے کارکنانِ ریاست اور حکومت کی ساری مشینری میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کا بنیادی مقصد ہی نیکی کو قائم کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے قوم کے سامنے ایک خطبۂ عام میں آپ نے ارشاد فرمایا۔

---

[1] مجلہ الہلال (مصر، نومبر ۱۹۲۷ء عدد خاص (فاروق نمبر) ص ۱۲

[2] حوالہ سابق

لوگو! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں عمال حکومت اِس لیے مقرر نہیں کرتا کہ وہ تمہیں توہین آمیز سزائیں دیں اور تمہاری دولت پر قابض ہو جائیں بلکہ میں اُنہیں اِس مقصد کے لیے متعین کرتا ہوں کہ وہ تمہیں تمہارے دین اور تمہاری تہذیب کی تعلیم دیں تمہارے معاملات کے برحق فیصلے کریں اور انصاف کے ساتھ نظم حکومت چلائیں سو جس شخص کے ساتھ اس کے برعکس برتاؤ کیا جائے وہ اس کی اطلاع مجھ تک پہنچائے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں عمر کی جان ہے میں اُس عامل (گورنر) سے ضرور قصاص لوں گا۔[۱]

اِس خطبے میں اِن الفاظ کو دوبارہ پڑھا جائے۔

میں اُنہیں (عمال حکومت کو) اس مقصد کے لیے متعین کرتا ہوں کہ وہ تمہیں تمہارے دین اور تمہاری تہذیب کی تعلیم دیں"!

اس جملے کے اصل عربی الفاظ یہ ہیں۔

"یعلموکم دینکم وسنتکم"

سنت کا معنی ہے طریقہ، یعنی طریق حیات، عربی زبان میں یہ لفظ کسی قوم کے تہذیبی و معاشرتی نظام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال مبارکہ کو بھی سُنت کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اعمال و افعالِ نبوی، پوری اُمت کے لیے طریق حیات اور تہذیبی نظام کی حیثیت رکھتے ہیں مذکورہ بالا خطبۂ فاروقی میں دین اور سُنت کے الفاظ سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک عمال حکومت کی بنیادی ذمہ داری اقامت دین و اشاعت سُنت تھی۔ اِسی لیے آپ چاہتے تھے کہ عاملوں اور گورنروں کی ذاتی زندگیاں بھی دین و سُنت کے سانچوں میں ڈھلی ہوں۔ اپنی ایک دوسری تقریر میں حضرت عمرؓ نے ذاتِ خداوندی کو گواہ بناتے ہوئے فرمایا۔

"اے میرے مالک علاقوں کے گورنروں پر میں تجھے گواہ بناتا ہوں میں

---

[۱] مجلہ مذکورہ، ص ۲۵

نے انہیں اس مقصد کے لیے مقرر کیا ہے کہ وہ عوام کو دین کی حقیقت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھائیں اور اُن میں عدل قائم کریں"۔ [4]

اپنے ایک گورنر کے نام خط تحریر کرتے ہوئے اُسے فرائض منصبی یوں سمجھائے۔

"میں نے تجھے لوگوں پر محض اس لیے مقرر کیا ہے کہ تو اُن کے ساتھ مل کر نماز قائم کرے اُن کے معاملات میں برحق فیصلے کرے۔ اور اُن میں مال کی تقسیم درست طریقے سے کرے سو اگر تُو نے یہی کچھ کر کے دکھایا تو میں اور تُو دونوں بھائی ہیں اور اگر اس کے خلاف طریقہ اختیار کر لیا تو پھر میرے اور تیرے مابین حُدودِ الٰہی کا معاملہ ہوگا" [5]

حضرت ابوموسیٰ اشعری صحابہ کرام میں ایک نامور شخصیت تھے وہ بھی عہد فاروقی کے گورنروں میں شامل تھے۔ کسی موقع پر حضرت عمرؓ نے انہیں ایک مفصل خط تحریر فرمایا۔ سیرت نگاروں نے اِس مکتوب کو ایک شاہکار فرمان قرار دیا ہے جس میں اخلاقی اور انتظامی، ہر دو طبقوں کی ہدایات کا حسین امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔ اِس مکتوب کی بعض ہدایات یہ ہیں۔

"جب تیرے سامنے دو قسم کے کام رونما ہو جائیں، ایک میں اللہ کی خوشنودی ہو اور دُوسرے میں محض دُنیا کی، تو اللہ کی خوشنودی والے کام کو ترجیح دینا، کیونکہ دنیا بہرحال فنا پذیر ہے لیکن آخرت کو دوام ہے فاسق و فاجر لوگوں کو بے قابو نہ چھوڑ دینا، اُن کے جتھے مجتمع نہ ہونے دینا اور اُن پر گرفت کرتے رہنا"۔ [6]

عُمال حکومت کی تربیت اور نگرانی کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کے پیش نظر ایک اصول یہ تھا کہ آپ گورنروں کے مال و دولت اور عیش و تنعم کی کیفیت کا احتساب کرتے رہتے تھے جب کسی شخص کو کسی علاقے کا گورنر مقرر فرماتے تو اُس سے حسب ذیل باتوں کا عہد لیتے۔

---

[4] مجلہ مذکورہ ص ۳۶

[5] مجلہ مذکورہ ص ۳۵

[6] مجلہ مذکورہ ص ۳۶

(۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا۔
(۲) باریک لباس نہیں پہنے گا۔
(۳) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔
(۴) دروازے پر حاجب و دربان نہ رکھے گا۔ بلکہ اہلِ حاجت کے لیے دروازہ کھلا رکھنا ہوگا۔[۷]

اس کے ساتھ ہی گورنر مقرر کیے جانے والے شخص کے ذاتی مال و اسباب کی فہرست تیار کر کے محفوظ کر لی جاتی اور بعد میں جس گورنر کے مال و دولت میں اضافے کی اطلاع موصول ہوتی تو اس کا فالتو سرمایہ بیت المال کے حق میں ضبط کر لیا جاتا۔[۸]

تاریخ طبری میں درج ہونے والی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار خالد بن صعق نے اپنے بعض اشعار کے ذریعے سے حضرت عمرؓ کو اطلاع پہنچائی کہ کارکنانِ حکومت کا ایک حصّہ ناجائز نوعیت کی، زراندوزی میں مُبتلا ہو رہا ہے تو آپ نے احتسابی جائزہ لیا اور عمال کے سرمائے تقسیم کر کے بیت المال میں داخل کر لیے۔[۹]

عتبہ بن ابی سفیان ایک علاقے کے گورنر مقرر کئے گئے کچھ عرصے کے بعد اُن کے مال و دولت میں حیرت انگیز ترقی دیکھنے میں آئی۔ فاروق اعظمؓ نے یہ حالات معلوم کر کے اُن سے باز پُرس کی اور فرمایا۔

من این لک ھذا یا عتبۃ ؟
اے عتبہ! یہ سرمایہ کہاں سے آگیا ؟
انہوں نے جواب دیا:
مال خرجت بہ و تاجرت فیہ ۔

---

[۷] معین الدین ندوی خلفائے راشدین اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۸ (حوالہ طبری)
[۸] حوالہ سابق
[۹] حوالہ سابق

"کچھ مال میں اپنے گھر سے لے کر گیا تھا اور اس کے بعد میں نے تجارت کے ذریعے مال جمع کیا ہے"۔

حضرت عمرؓ نے یہ گفتگو سُن کر ارشاد فرمایا۔

بعثتک والیاً ولم ابعثک تاجراً ان التجارة والولایة لا تتفقان اجعل ھٰذا المال فی بیت مال المسلمین"

"میں نے تمہیں عامل حکومت بنا کر بھیجا تھا، تاجر بنا کر نہیں بھیجا تھا تجارت اور گورنری جمع نہیں ہوسکتیں۔ یہ سب فالتو سرمایہ بیت المال میں داخل کر دو"۔

اس نوعیت کے دوسرے متعدد واقعات بھی پیش آئے اور ایسے تمام واقعات میں حضرت عمرؓ اسی اصول پر کار فرما رہے کہ ملازمت کے دوران میں کسی عامل حکومت کے لیے یہ اجازت نہ ہو گی کہ وہ تجارتی سرگرمیاں بھی جاری رکھے یہ ایک نہایت درست اور نہایت ضروری اصول تھا۔ اگر کارکنانِ حکومت ملازمتِ قومی کے ساتھ ساتھ اپنا ذاتی کاروبار تجارت بھی چلاتے رہیں تو اس سے متعدد خرابیاں جنم لیتی ہیں۔

(۱) حکومت کا عہدے دار اگر تجارتی معاملات انجام دے گا تو اسے اپنے منصب کے پیشِ نظر کئی طرح کی رعائتیں اور منفعتیں حاصل ہوں گی اور یہ منصبِ قومی کا سراسر غلط استعمال ہے۔

(۲) کاروباری مصروفیات کے باعث، عُمال حکومت کی توجہ، صلاحیت کار اور اوقات کا ایک بڑا حصہ ذاتی مفاد میں صرف ہونے لگے گا حالانکہ یہ سب کچھ ریاست کے مفاد میں خرچ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ریاست انہیں کامل معاوضہ ادا کرتی ہے۔

(۳) مال و دولت کی بہتات سے آرام طلبی جاہ پسندی اور ذاتی اقتدار پسندی کے جراثیم پیدا ہونے لگتے ہیں اور دولت کے ذریعے، اعمال اپنا سیاسی اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔

(۴) اگر حکومت کے مناصب، جلب زر اور عیش کوشی کا وسیلہ بنا دیئے جائیں۔ تو پھر حکومت کی جملہ مشینری، زراندوزوں اور سرمایہ داروں سے بھرپور ہو کر رہ جائے گی۔

عہد فاروقی کے عمال حکومت کو اس بات کی اجازت بھی نہیں دی جاتی تھی کہ وہ اپنی ذاتی رہائش کے لیے عالی شان محلات تعمیر کرائیں اور اقتدار و حکومت کا طمطراق لوگوں کو دکھاتے پھریں مورخین نے حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ کسی طرف کو جاتے ہوئے راستے میں آپ نے دیکھا کہ ایک نہایت بلند و بالا عمارت از حد قیمتی سامان سے تیار کی جا رہی ہے حضرت عمرؓ کے دریافت کرنے پر جواب ملا کہ یہ عمارت بحرین کے گورنر کے لیے تعمیر کی جا رہی ہے یہ سنا تو آپ چیخ اُٹھے اور فرمایا۔

"اللہ اکبر! واقعی یہ دولت دُنیا اپنا سر اٹھائے بغیر نہیں رہتی یہ سب اسباب بیت المال میں جمع کرو"!

ایسی تمام پابندیوں کے پس منظر میں فاروق اعظمؓ کا یہ تربیتی نقطہ نظر ہی کار فرما تھا کہ حکمرانی کی مسندوں پر بیٹھنے والا طبقہ مالِ دنیا سمیٹنے میں منہمک ہو کر نہ رہ جائے اور عیش و تنعم کی زندگی اختیار کر کے پوری قوم کے بگاڑ کا باعث نہ بن جائے ایک گورنر کی طرف خط لکھتے ہوئے آپ نے یہ نقطہ نظر ان الفاظ میں واضح فرما دیا۔

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی پوشاک، خوراک اور سواریاں اس شان کی ہوتی جا رہی ہیں کہ جیسی عام مسلمانوں کو نصیب نہیں ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو میں نہیں سمجھتا ہوں کہ اے اللہ کے بندے تم اس چوپائے کی طرح نہ ہو جاؤ جو کسی سرسبز وادی میں پہنچ کر اس قدر چرتا ہے کہ اسی کی گرانی سے مر جاتا ہے اور یہ حقیقت یاد رکھو کہ جب حاکم ٹیڑھا چلتا ہے تو اس کی رعایا بھی ٹیڑھی چلتی ہے پس سب سے بڑا بدبخت وہ ہے جس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی بدبخت ہو جائیں۔"

اُمت اسلامیہ کی تہذیب و تعمیر کے مقصدِ عظیم کے لیے حضرت عمرؓ کو حکومت کی مشینری سے کام لینے میں جو کامیابی نصیب ہوئی اس کا اصل باعث یہ تھا کہ آپ کی اپنی زندگی عوام اور خواص سب کے سامنے ایک کھلی کتاب تھی جس کا ہر ورق اسلامی اخلاق و اوصاف کے اُن گرانقدر نقوش سے مزین تھا جن کی جھلکیاں آپ اپنی قوم میں منعکس کرنا چاہتے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ اسلام کی اخلاقی و تہذیبی قدروں کی تلقین و اشاعت کا سب سے مؤثر ذریعہ اور سب سے بڑا سرچشمہ

اس دور میں آپ کی اپنی ذات میں مضمر تھا۔ زہد و تقویٰ کے بہت سے طالب حضرت عمرؓ کے قریب رہنے کے متمنی ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت مسورؓ بن مخرمہ نے فرمایا تھا۔

"ہم اس غرض سے حضرت عمرؓ کے ساتھ رہتے کہ پرہیزگاری اور تقویٰ سیکھ جائیں"

المسعودی نے حضرت عمرؓ کے اخلاق و اوصاف عالیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کے فیضانِ صحبت کا خاص اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ کی سیرت کے پاکیزہ اثرات آپ کے افسروں، عہدہ داروں اور کارکنانِ حکومت میں عام پھیل گئے تھے۔ اور پھر اس مصنف نے حضرت سلمان فارسیؓ حضرت ابوعبیدہ اور حضرت سعدؓ جیسے اصحاب کی زندگیوں کی مثالیں پیش کی ہیں جن میں خلیفۃ المومنین کے اوصاف طیبہ کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ رضی اللہؓ عنہم وارضاھم عنّاہ

فاروق اعظم کی مردم شناسی

تحریر:۔ڈاکٹر محمد طفیل

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ نہایت ذہین، معاملہ فہم، بہادر، صاف گو اور حق و صداقت کی خاطر انتہائی اقدام کرنے والے انسان تھے۔ ان کی ذکاوت، دانشمندی اور انسان شناسی عربوں میں ضرب المثل تھی۔ بنیادی طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تاجر تھے۔ کاروبار تجارت اور تجارتی سفروں نے آپ کو خودداری، بلند حوصلگی اور معاملہ فہمی کی لازوال قوت عطا کی۔

اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے سے پہلے ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تمام عرب میں معروف ہو چکے تھے اور قریش نے ان کی قابلیت کے پیش نظر انہیں سفارت کے اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا تھا۔ چنانچہ عرب قبائل میں جب بھی کوئی پیچیدگی یا نزاع پیدا ہوتا تو نوجوان عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کو ہی سفیر بنا کر بھیجا جاتا۔ اور الاستیعاب میں تحریر ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے غیر معمولی فہم، تدبر، تجربے اور انسان شناسی کی بناء پر عقدہ حل کر دیتے اور کامیاب سفیر شمار ہوتے تھے۔

حضرت عمرؓ بعثت نبوی کے چھٹے سال مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے تاریخ اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جو خوش نصیب اصحاب اس وقت تک اسلام کی دولت حاصل کر چکے تھے وہ نہ تو اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کر سکتے تھے' نہ ہی اعلانیہ طور پر مذہبی فرائض ادا کر پاتے تھے اور نہ ہی بیت اللہ میں نماز پڑھنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے مشرکین کے اجتماع میں اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا۔ کعبہ میں جاکر مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کی۔ جس کے صلے میں دربار رسالت سے "فاروق" کا لقب عطا ہوا۔

حضرت عمرؓ ۱۳ ہجری میں مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ مقرر ہوئے اور آپ ۲۳ ہجری کے اختتام پر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اس طرح آپ قریبا" دس سال منصب خلافت پر فائز رہے۔ اس مختصر عرصہ میں خلیفہ ثانی نے اپنی معاملہ فہمی' جرات' دلیری' حوصلہ مندی اور مردم شناسی سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت تقویت بہم پہنچائی۔ آپ کے دس سالہ عہد خلافت میں عراق' ایران' شام' فلسطین اور مصر کے وسیع علاقے فتح ہو کر اسلامی خلافت کے زیر نگیں ہوئے۔ ان فتوحات میں نہ کسی باشندے پر ظلم کیا گیا' نہ درختوں اور کھیتوں تک کو تباہ کیا گیا اور نہ ہی بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ ان عظیم فتوحات کے پیچھے مسلمانوں کے سپہ سالار اعظم اور خلیفہ وقت کی حکمت عملی اور اسلامی خلافت کی روح کارفرما تھی۔ جس نے دنیا کی عظیم سلطنتوں فارس و روم کو مسلمانوں کے سامنے سرنگوں کر دیا۔

اسلامی ریاست کو وسعت دینے اور ایک عظیم ریاست کو چلانے کے لئے ایک بڑی انتظامیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح فوجی نظم و نسق چلانے' جہاد کی منصوبہ بندی کرنے' دشمنوں سے معرکہ آرائی نیز مفتوحہ علاقوں میں امن و امان قائم کرنے کے لئے بہت سے افراد کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالبا" سیدنا عمر فاروق

ﷺ اس بارے میں سب سے زیادہ زیرک، مردم شناس اور معاملہ فہم واقع ہوئے۔ یہ ان کی مردم شناسی ہی تھی جس کی بدولت ریاست، صوبوں اور اضلاع کا نظم و نسق نہایت عمدگی سے چلتا رہا۔ دشمنوں کے ساتھ پیش آنے والے معرکوں میں بھی مسلمان افواج کامیابیوں سے ہم کنار ہوتی رہیں کیونکہ سیدنا فاروق اعظم ﷺ جس شخص کو کسی کام کا اہل تصور کرتے وہی کام اس کے سپرد کرتے تھے۔

مورخین نے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ تحریر کی ہے کہ عہد فاروقی میں بڑے بڑے عہدوں کا انتخاب مجلس شوریٰ میں ہوتا تھا۔ انتخاب کا طریق کار یہ تھا کہ خلیفہ ثانی کسی اہل، لائق، راست باز، متدین اور متقی شخص کا نام پیش کرتے کیونکہ حضرت عمر ﷺ کو قدرت نے جوہر شناسی کا مادہ ودیعت کر رکھا تھا اور ان کا انتخاب اسی مردم شناسی کا رہین منت ہوتا تھا اور اس انتخاب میں کوئی اور جذبہ کارفرما نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے مجلس شوریٰ کے ارکان ان کے حسن انتخاب کو نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے بلکہ اسی شخص کے تقرر پر اتفاق رائے کر لیتے تھے۔ چنانچہ نہاوند کی عظیم الشان مہم کے لئے حضرت نعمان بن مقرن ﷺ کا انتخاب اسی طریقہ سے عمل میں آیا تھا۔ جو مسلمانوں کی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

کوئی فرمانروا کتنا ہی بیدار مغز، کوئی قانون کتنا ہی جامع اور مکمل اور باشندے کتنے ہی مطیع اور فرماں بردار ہوں، نظام مملکت صحیح بنیادوں پر رواں دواں نہیں ہوتا۔ کیونکہ ریاست کا کاروبار ارکان حکومت ہی چلاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ملکی عہدے دار اہل، باصلاحیت، لائق، راست باز اور متدین ہوں اور اپنے اپنے میدان کار میں علمی، عملی اور فنی معلومات سے لیس اور فہم و فراست سے سرشار ہوں۔ جن کے انتخاب کے لئے سیدنا عمر فاروق ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی کا جوہر عطا کر رکھا تھا۔ اس بارے میں علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

"حضرت عمر ﷺ نے اس باب میں جس نکتہ رسی اور تدبیرو سیاست سے کام لیا، انصاف یہ ہے کہ تاریخ عالم کے ہزاروں ورق الٹ کر بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس مرحلے پر اس بات سے بڑی مدد ملی کہ ان کی طبیعت شروع سے جوہر شناس واقع ہوئی تھی کہ جس شخص میں جس قسم کی قابلیت ہوتی وہ اس کی تہہ کو پہنچ جاتے تھے۔ اس کے ساتھ انہوں نے ملک کے تمام آدمیوں سے واقفیت بہم پہنچا لی تھی۔ یہی بات تھی کہ انہوں نے جس شخص کو جو کام دیا اس کے انجام دینے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی آدمی نہیں مل سکتا تھا۔"

علامہ شبلی نعمانی کی اس بلند پایہ رائے کی روشنی میں عہد فاروقی اور خلیفہ ثانی کی بھرپور زندگی کا جائزہ لیا جائے تو تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں محفوظ ہیں جو حضرت عمر فاروق ﷺ کی مردم شناسی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

عہد فاروقی میں اسلامی ریاست میں چار افراد ایسے تھے جو فن سیاست اور تدبیر عمل میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضرت فاروق اعظم ﷺ نے ان چاروں کی صلاحیتوں سے اسلام اور اسلامی ریاست کی ترقی کے لئے بھرپور استفادہ کیا۔ چنانچہ حضرت امیر معاویہ ﷺ کو شام کا گورنر مقرر کیا گیا۔ شام میں انہوں نے نہ صرف امن و امان قائم کیا بلکہ شامیوں کو اسلامی پرچم تلے جمع رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

حضرت عمرو ابن العاص ﷺ کو مصر کی مشکل مہم کے لئے اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ مصر کو فتح کرنے کا سہرا انہیں کے سر ہے اور وہ مصر کے گورنر بھی مقرر ہوئے۔ چنانچہ مصر میں ان کا عہد آج بھی امن و ترقی کی عمدہ علامت شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہ کی صلاحیتوں سے بھی سیاسی امور میں استفادہ کیا گیا۔

حضرت زیادہ بن سمیہ رضی اللہ عنہ عہد فاروقی میں سولہ سالہ نوجوان تھے' اس لئے انہیں قیادت سپرد نہیں کی گئی تھی لیکن ان کی صلاحیتوں اور تدبر سے فائدہ اٹھانے کے لئے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ والیء بصرہ کو لکھا گیا کہ کاروبار حکومت میں انہیں مشیر کا درجہ عطا کیا جائے۔

حضرت عمرو بن معدی کرب اور طلیحہ بن خالد کو فن حرب میں مہارت حاصل تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو عراق کی فتوحات پر مامور فرمایا اور انہیں وہاں کے سپہ سالار نعمان بن مقرن کے ماتحت رکھا۔ تاکہ ان دونوں کی حربی مہارت اور نعمان بن مقرن کی قوت کارکردگی مل کر مسلمانوں کو کامیاب بنائیں۔ لیکن ان دونوں میں قائدانہ صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ اس لئے حضرت نعمان بن مقرن کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ ان دونوں کو کسی شعبے کی افسری (قیادت) نہ دی جائے کیونکہ ہر شخص اپنا فن ہی خوب جانتا ہے اور وہ دیگر امور میں کمزور ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ ایک نامور صحابی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک جواب طلب تحریر پیش ہوئی تو حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس تحریر کا جواب لکھا' جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت پسند فرمایا۔ خلیفہ ثانی حضرت عبداللہ بن ارقم کی اس خوبی سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن ارقم کو صوبہ کا میر منشی (CHEIF SECRETARY) مقرر کیا اور وہ اپنے دور کے کامیاب میر منشی ثابت ہوئے۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بلند پایہ صحابی اور زہد و تقویٰ میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ لیکن نظام مملکت اور سیاست مدن سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ البتہ وہ عوام میں بہت مقبول تھے۔ اعیان حکومت اور ارکان مجلس شوریٰ بھی انہیں

حکومت کے اعلیٰ عہدے پر مقرر کرنا چاہتے تھے۔ مردم شناس خلیفہ نے حضرت عمار بن یاسر کو کوفہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ لیکن وہ کوفہ کا نظم و نسق نہ چلا سکے۔ اس لئے انہیں معزول کرنا پڑا۔ اس طرح حضرت عمرؓ نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بلند پایہ مردم شناس تھے اور ان کی رائے درست تھی کہ حضرت عمار بن یاسرؓ نظام حکومت چلانے کے اہل نہیں۔

یہی وہ افراد ہیں جنہیں حضرت عمرؓ نے کاروبار سلطنت میں شریک کیا اور اپنی مردم شناسی کے ذریعے ان باصلاحیت افراد سے امت مسلمہ کو فائدہ پہنچایا اور ان افراد کے ذریعے اسلامی ریاست کے مقصد کو آگے بڑھانے میں بہت مدد ملی۔ ان کے علاوہ بھی حضرت فاروق اعظمؓ کی مردم شناسی کے کئی واقعات صفحات تاریخ میں محفوظ ہیں۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ خود بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بدو کو پہاڑ سے اترتے ہوئے دیکھا‘ تو میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اس شخص کا بیٹا فوت ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے مرنے والے بیٹے کا مرثیہ لکھا ہے اگر تم لوگ فرمائش کرو گے تو وہ تمہیں یہ مرثیہ سنا دے گا۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے اس بدو سے حال دریافت کیا تو اس نے اپنے بیٹے کے مرنے‘ اسے بطور امانت دفن کرنے اور اپنے بیٹے کی موت پر مرثیہ لکھنے کا اعتراف کیا اور کہا:

"امیر المومنین آپ کو کیسے پتہ چلا‘ میں نے تو ابھی تک اسے کسی کو بھی نہیں سنایا اور نہ زبان پر لایا"۔

پھر اس نے آٹھ اشعار پر مشتمل مرثیہ سنایا۔ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کی مردم شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ انسانوں کی چال اور چہرہ دیکھ کر ان کی کیفیت جان لیتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی مردم شناسی کا ایک اور واقعہ ملاحظہ کیجئے کہ ایک

دن آپ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک خوبصورت شخص آپ کے سامنے سے گزرا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ اگر میرا خیال غلط نہیں تو یہ شخص اپنے جاہلی مذہب پر قائم ہے یا یہ شخص کافر تھا۔ آپ نے حاضرین سے کہا کہ اس شخص کو بلا لائیں۔ جب وہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اپنی رائے دہرائی۔ جس کے جواب میں وہ شخص کہنے لگا۔

"آپ جیسا مسلمان میں نے کوئی نہیں دیکھا"۔ خلیفتہ المسلمین نے دریافت کیا کہ تم قسم کھا کر بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اس پر اس شخص نے سب کے سامنے اعتراف کیا کہ "میں کافر تھا"۔ یہ واقعہ حضرت عمر کی مردم شناسی اور فہم و فراست کی زندہ دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک اثر نقل کیا ہے کہ میں نے جب کبھی حضرت عمرؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "میرا یہ خیال ہے" تو وہ بات اسی طرح ثابت ہو گئی جس طرح حضرت عمرؓ نے خیال ظاہر کیا تھا۔

حضرت عمرؓ نہ صرف اعلیٰ درجے کے مردم شناس تھے، بلکہ آپ انسانی نفسیات سے بھی بخوبی آگاہ تھے اور وہ انسانوں کی تربیت عمدہ طریقے سے کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ اس اصول پر کاربند تھے۔

"ان الناس لم یزالوا مستقیمین ما استقامت لهم ائمهم وهداتهم"

(کہ اگر قائدین صراط مستقیم پر گامزن رہیں تو عام لوگ راہ راست سے کبھی نہیں ہٹ سکتے)۔

سیدنا فاروق اعظم انسانی نفسیات کے اس اصول سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ "**الناس علی دین سلوکھم**" کہ عوام اپنے آقاؤں کی پیروی کرتے ہیں اس لئے آپ نے حکام اور عمال کی تربیت پر خصوصی توجہ دی چنانچہ جب آپ گورنر مقرر

کرتے تو انہیں یہ ہدایات دیتے کہ وہ

(1) ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہو گا۔ (2) باریک لباس نہیں پہنے گا۔ (3) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا (4) دروازے پر دربان نہیں رکھے گا (5) اور اہل حاجت کے لئے دروازے کھلے رکھے گا۔ یہ شرائط گورنر کے تقرر نامے میں درج ہوتی تھیں اور مجمع عام میں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔ نیز آپ تقرر کے وقت ہر عامل کے مال و اسباب کی فہرست بنا لیتے اور عامل کی بودوباش کی کڑی نگرانی کرتے تھے تاکہ وہ عیش و عشرت میں مست ہو کر عوام کو بھول نہ جائے اور ان کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے۔

ہماری گفتگو سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو قدرت نے مردم شناسی کا ملکہ عطا کر رکھا تھا اور وہ انسانی نفسیات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اس لئے آپ نے کاروبار مملکت چلانے کے لئے ذمہ داریاں ایسے افراد کے سپرد کیں جو ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ہر طرح سے اہل تھے۔ ایسا کر کے آپ نے ایک طرف اپنی فراست مومنانہ اور مردم شناسی کی قوت کو اسلام کی عظمت اور سربلندی کے لئے استعمال کیا اور دوسری جانب "**ان اللہ یامرکم ان تئودوا الامانات الی اھلھا**" کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کو سونپو)۔ کے حکم پر عمل کیا جس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت کو استحکام بخشا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا شمار عالمی سطح کے صف اول کے مدبر اور مردم شناس افراد میں ہونے لگا۔ رضی اللہ عنھم و رضواعنہ

اگر ہم آج کی سیاسی خرابیوں اور ریاستی مشکلات کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہم ذمہ داریاں ایسے افراد کو نہیں سونپتے جو ان کے اہل ہوتے ہیں بلکہ ذاتی مصلحتوں' اقربانوازی' اجتماعی مفاد اور بعض اوقات سماجی دباؤ کا شکار ہو کر ہم ایسے افراد کو منصب اور عہدے سونپ دیتے ہیں جو متعلقہ عہدوں کے فرائض بجالانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

ریاستی مشکلات اور سماجی بگاڑ میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قائم کردہ معیار کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ "حق بحق دار رسید" کے اصول پر عمل ہو، خیر کی قوتوں کو فروغ ملے، ریاست ترقی کرے اور سماجی امن و انصاف کا دور دورہ ہو۔

اردو صحافت میں
اسلامی نظریات کی ترویج واشاعت اور روحانی
اقدار کے فروغ کے لیے
فقرِ غیور اور عشقِ خود آگاہ کے نقیب
ماہنامہ
ضیائے حرم
لاہور
کردار باعثِ صد تحسین و ستائش ہے
افتخار علی چشتی
(فاضل بھیرہ شریف) انگلینڈ

عہدِ فاروقیؓ میں نظامِ تعلیم

تحریر: ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وہ خلیفہ رسول ہیں جن کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر فاروق ہوتے۔ ایک دوسرے موقعہ پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی کلمۂ شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر دکھایا اور ارشاد فرمایا کہ عمرؓ اور علیؓ کی مثال ایسی ہے جیسے میری یہ دو انگلیاں جو ایک دوسرے سے جُدا نہیں۔

قبل اس کے کہ ہم اس عظیم ہستی کے اس عظیم کارنامہ کے بیان کی سعادت حاصل کریں جس کا تعلق تعلیم و تربیت سے ہے ہم دو امور کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنے کی اجازت چاہیں گے۔

(۱) ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ مادی ترقی اور اس سے وابستہ تہذیب و تمدن کی بلند ترین منزلوں میں ہے اور آج جب تعلیم اور نظام تعلیم و تربیت کا ذکر آتا ہے تو ہمارے ذہن میں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ایک جال بچھ جاتا ہے بڑے بڑے کتب خانوں، پیشہ ورانہ تعلیم کے ادارے اور عام تعلیمی مرکز نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں اور ہم اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ دیکھیں تعلیم و تربیت کے کس موضوع پر گفتگو اپنا رُخ اختیار کرتی ہے لیکن حضرت عمر فاروق اور ان سے قبل حضرت ابوبکرؓ صدیق اور خود سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام تعلیم و تربیت کے

پہلے ہم دورِ حاضر سے نکل کر آج سے تقریباً چودہ سو سال کے قبل کے دور کا تصور کریں اور نہ بھولیں کہ یہ وقت تھا کہ عربوں کی اکثریت صحرا میں زندگی بسر کرتی تھی۔ جزیرہ نمائے عرب میں نہ نہریں تھیں اور نہ سال بہ سال کی موسمی بارشیں جو زمین کو سرسبز و شاداب کریں جہاں پانی تھا وہاں آبادی یا شہر تھا باقی ریت کے ٹیلے تھے لوگوں کے رہنے سہنے کا قبائلی انداز تھا اور ان کا اثاثہ نمدے کے خیمے اور چند مویشی جن کو لیے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ لکھنے پڑھنے سے ان کو دُور کا واسطہ نہ تھا، شہری زندگی میں نسب نامے اور شاعری کے چرچے تھے اور بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پوری عرب قوم کو بیک وقت اور کم وقت میں ایک راہِ ہدایت پر لاتا تھا اور دُنیا کے عظیم ترین معلم کی حیثیت سے نہ صرف ان کے اخلاق کی آراستگی کا کام انتہائی قلیل وقت میں انجام دینا تھا بلکہ ان کو اس علم سے آراستہ کر دینا تھا جو ہر جہل کے مقابلہ میں مینارِ نور ثابت ہو اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامیابی کی شاہراہ پر گامزن کر دے۔ ساتھ ہی حضور علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم کے پیشِ نظر ایسی ہستیاں بھی پیدا کرنا تھیں جو اپنے قلوب کی پاکیزگی، زہد و تقویٰ نیتوں کی وسعت، قول و عمل کی مطابقت اور سرفروشانہ جدوجہد میں اپنی مثال آپ ہوں۔ اور جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہر زمانے میں لوگوں کے لیے راہ نما ثابت ہوں۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ، اسی راہ کے شہسوار ہیں۔

(۲) دوسری یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ خلفائے راشدین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ صحبت سے پائی ہوئی تعلیم ہی کو عام کیا اور اس کے اصولوں میں سرِ مو فرق نہ آنے دیا، یقیناً انہوں نے اس تعلیم کے خد و خال کو اجاگر کیا اور اس کے نظام میں وقت اور ماحول کے اعتبار سے کچھ تبدیلیاں بھی کیں لیکن بقول ہیکل یہ اس چوکھٹے سے باہر نہ نکلیں جو قرآنِ حکیم نے روحانی اور تمدنی زندگی کے لیے بنایا تھا اور جس کی ترجمانی خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔
ان حقائق کے تحت آیئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کریں۔

کسی تعلیم اور نظام کا جائزہ لینے کے ضروری ہے کہ ان اجزاء ترکیبی پر نظر ڈالی جائے جن سے تعلیم عبارت ہے۔ ان میں چار اہم ہیں۔

(۱) مقصدِ تعلیم

(۲) معلم

(۳) نصاب اور (۴) عمارتیں جنہیں آج اسکول، درسگاہ یا مراکز سے تعبیر کیا جاتا ہے ان میں بھی مقصدِ تعلیم اور معلم کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نظامِ تعلیم و تربیت کا جائزہ انہی اہم اجزاء کے تحت لینا ہوگا۔

۱۔ مقصدِ تعلیم

خلفائے راشدین کے پیش نظر وہی مقاصدِ حیات اور مقاصد تعلیم رہے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیماتِ ربانی کے مقاصد تھے اور یہ بزرگ ہستیاں خود بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں اس طرح ڈھل گئیں کہ قرآن ان کی فکر، اور ان کی زندگی حضورؐ کے فرمودات و عمل کا مرقع بن گئی اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی تعلیم کا پہلا مقصد توحید کے ایسے پرستار تیار کرنا تھا جو شمع نبوت کے پروانے ہوں، جو حق کے جویا ہوں حق کے لیے زندگی بسر کرنے یا جان بحق ہو جانے کو اپنا سرمایۂ امتیاز تصور کریں۔ جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اُلفت و محبت کے رشتہ میں منسلک ہوں لیکن ظلم و کفر کے مقابلہ میں وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوں عجز و عاجزی جن کا شعار ہو اور تعمیلِ ارشاد خداوندی جن کا مسلک ہو، جن کے چہرے پر نورِ علم و معرفت کے آثار نمایاں ہوں اور جن کے حسنِ عمل سے خالقِ کائنات راضی ہو، دُنیا اور اس کی دولت جن کے قدموں کے نیچے ہو اور آخرت کی ابدی بہاریں جن کی منتظر ہوں۔ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ علم اور علم کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

مولانا سلیمان ندوی نے بڑی اچھی بات کہی کہ وہ تمام ہستیاں جو علم کے مقاصد کو متعین اور اس کے نظام کو رائج کرتی ہیں دو حصّوں میں منقسم ہیں ایک انبیاء علیہم

السلام اور ان کے متبعین کی جماعت ہی تمیز خوش و ناخوش امتیاز حق و باطل کے لیے اللہ تعالے کے بتائے ہوئے قوانین کو اپناتی اور رائج کرتی ہے دوسری جماعت وہ ہے جو تعلیم کے مقاصد کا تعین اپنی عقل و دانائی پر کرتی ہے ہر چند وہ بھی چند اخلاقی باتوں کو اپناتی ہے لیکن ضرورت کے تحت اس کے اہم اجزاء کو ترک کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ درحقیقت ایک کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح ہوتی ہے اور دوسرے کے سامنے صرف دنیا اور اس کی لذات۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ایک کے پیش نظر علم کی دو قسمیں ہیں، الہامی اور اکتسابی اور دوسرے گروہ کے سامنے صرف ایک یعنی اکتسابی۔ چونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو پروردگار عالم نے خاتم النبیین کی حیثیت سے مبعوث فرمایا تھا اس لیے آپ کے ذمہ تربیت اخلاق یعنی تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کے ساتھ علم و حکمت سے بھی انسانیت کو آشنا کرنا اور علم کی برتری پر قوموں کی برتری کے راز کو آشکارا کرنا تھا اور الہامی اور اکتسابی دونوں علوم سے استفادے کی تعلیم دینا تھا۔ تاکہ ان کی دُنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔

یہی مقاصد خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کے سامنے تھے۔ لیکن مختلف فتنوں نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد پیدا ہوئے۔ صدیق اکبرؓ کو اتنا وقت نہ دیا کہ تعلیم و تنظیم کے کام کو آگے بڑھاتے لیکن انہوں نے بڑی خدمت یہ کی کہ دین متین کو جس انداز اور جس تقدس سے خواجۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو دیا تھا انہوں نے ہر فتنہ کا مقابلہ کر کے اسی تقدس سے اُسے حضرت عمر فاروق کو سونپ دیا اور اس طرح ایک جامع ترقی اور تنظیم کے پروگرام کے لیے راہیں ہموار کر دیں اور یہ خدمت انہوں نے دو سال کی مختصر مدت میں انجام دی۔

بالعموم مورخین نے فاروق اعظمؓ کے مختلف کارناموں کو اہمیت دی ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو سب تنظیمات کا اصل سرچشمہ تعلیم ہی تھا جس کے بغیر نہ عدالتوں کا قیام ممکن تھا نہ فوجی اور لشکری انتظامات اور نہ محکمہ پرچہ نویسی یعنی محکمۂ اطلاعات

وغیرہ دراصل فاروقِ اعظمؓ کے پیشِ نظر وہی "بامعنی اور بامقصد تعلیم" تھی جو انہیں اُن کے آقا حضورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی تھی جس کے تحت انہیں اچھے اخلاق کی تعلیم کے ساتھ لوگوں کی ان استعداد اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانا تھا جو قدرت نے ان لوگوں کو ودیعت کی تھیں، خواہ یہ عالمانہ ہوں، یا پیشہ ورانہ اور پھر ان سب کو ایک مفید فردِ اُمت بنانا تھا۔

مُعلّم

نظامِ تعلیم کا دُوسرا اہم جُزو معلّم ہے۔ یہ معلم ہی کی شخصیت ہوتی ہے جو کتاب کے الفاظ میں ایک حرارت پیدا کرتی ہے اور اذہان میں ان کے قبول کرنے، ان سے استفادہ کرنے کی صلاحیتیں بیدار کر دیتی ہے۔

یہ فیضانِ نبوت ہی تھا جس نے ایک مختصر عرصہ میں صحابہ کرام کی ایک ایسی اُولوالعزم جماعت پیدا کر دی کہ عہدِ فاروقی میں معلمین کی کمی محسوس نہ ہوئی اور علم کو عام کرنے پر زیادہ زور دیا جا سکا۔

یہاں بھی ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ جب بھی دورِ نبوت یا خلفائے راشدین کی علمی سرگرمیوں کا ذکر آتا ہے تو مورخین اسے مذہبی تعلیم کے تحت بیان کرتے ہیں اور دورِ حاضر کے اذہان اسے عام تعلیم سے ایک الگ چیز تصوّر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے قبل مذہب اور زندگی کے درمیان ایک خلیج حائل رہی جس کو پُر کرنے اور دینی اور دُنیوی علوم کے فرق کو مٹانے کے لیے اسلام آیا۔ اسلام نے حق و باطل میں فرق کیا نہ کہ علوم میں۔ جو فکر بھی حق کے مٹانے کے لیے سرگرمِ عمل ہوئی اس کو باطل قرار دیا اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ انسان کی برتری کا راز محض علم میں نہیں بلکہ اس بات میں ہے کہ وہ علم سے حاصل کی ہوئی قوت کو کس مقصد کے لیے صرف کرتا ہے اور اسی مقصد کے تحت اسلام نے مختلف علوم و فنون کو اس طرح اپنایا کہ وہ انسان کی مجموعی فلاح و بہبود میں معاون ہوئے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ عربی زبان میں علم اور استاد کے لیے دو الگ الگ الفاظ نہیں بلکہ معلم خود علم سے مشتق ہے تاکہ معلم کے لفظ ہی سے علم کی وسعتیں اور رفعتیں دونوں ذہن میں آئیں۔ یہ شرف صرف سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے کہ خود اللہ تعالےٰ نے ان کو معلم بنایا اور نہ صرف ان کو تمام علوم سے جو انسانیت کیلئے باعثِ فلاح ہو سکتے تھے سب کا چشمہ بنایا بلکہ لوح وقلم کے علم وحکم سے بھی آگاہی بخشی پھر اس آغوشِ نبوت سے جن صحابہ کرام کی تعلیم ہوئی انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صلاحیتوں کے مطابق علم ومعرفت سے مشرف فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس درسگاہِ نبوت کے طالب علموں میں اگر ایک جانب خود خلفائے راشدین جیسی جامع صفات ہستیاں شامل ہیں تو دوسری جانب طلحہؓ زبیر، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم جیسے اربابِ رائے اور مدبر۔ ان میں کہیں ابو عبیدہؓ خالد بن ولیدؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص جیسے سپہ سالار تھے تو کہیں ابو ذرؓ اور صفہ کی ایک کثیر جماعت میں اساتذہ کی وہ قطار تھی جنہوں نے علم کو حاصل کرنے اور عام کرنے کا حق ادا کیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اپنے تعلیمی پروگرام کو عام کرنے کے لیے اساتذہ کی وہ جماعت نصیب تھی جو علوم کی جامعیت سے آگاہ تھے۔ یہ تمام معلمین نصاب کے بنیادی اجزاء پر پورے طور پر حاوی تھے اور اپنی اپنی صلاحیتوں اور مذاقِ طبیعت کے مطابق کسی ایک فن یا علم کی ایک شاخ کی تعلیم میں خصوصی مہارت کے حامل تھے۔ ان میں مفسر بھی تھے۔ محدث بھی، فقیہہ بھی، ادیب بھی شاعر بھی، شہسوار بھی۔

ان استادوں میں وہ سب خوبیاں تھیں جو ہر زمانے میں معلمین کا طرہ امتیاز رہی ہیں۔ ان کی زندگی سادہ، ان کا علم حاضر، ان کی شخصیت ایک جاذبیت کی حامل تھی اور ان کا علم حاضر، ان کی شخصیت ایک جاذبیت کی حامل تھی اور ان کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ یہ ایمان وعمل کے پتلے، قرآنِ حکیم کی چلتی پھرتی تصویریں تھیں ایک جامعیت کی حامل لیکن اپنے فن میں منفرد۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان معزز ہستیوں سے حکومت کی تنظیم و تشکیل اور تعلیم و تربیت میں پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ان کی استعداد کے تحت ان کو کاموں پر مامور فرمایا۔

(۱) ان معلمین کی ایک بڑی جماعت کو چھوٹے بچوں کو قرآن پڑھانے اور لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے کام سپرد ہوا اور فاروق اعظمؓ نے ان کی ضروریات کے پیش نظر ان کی تنخواہیں بھی پندرہ پندرہ درہم ماہوار مقرر فرمائیں۔

(۲) جہاں طلباء کی تعداد زیادہ ہوتی وہاں دس دس طالب علموں کے لیے ایک ایک قاری مقرر ہوتا اور جو طالب علم قرآن ختم کر لیتے اور لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے انہیں ایک معلم جسے "معلم اعلیٰ" کہہ سکتے ہیں تعلیم دیتا اور اس کے حلقہ درس میں بیک وقت سو سو طلباء شامل ہوتے۔ ان کے علاوہ صحابہ میں سے پانچ بزرگ صحابہ تھے جن میں سے تین معاذ بن جبل، عبادہ بن صامت اور ابو الدرداؓ کو حضرت عمرؓ نے مختلف مقامات پر تعلیم قرآن کے لیے بھیجا۔ جہاں انہوں نے کثیر تعداد میں لوگوں کو درس دیا۔

(۳) ان ابتدائی اور ثانوی قسم کی تعلیم کے علاوہ جید علماء اور فقہاء کے ارد گرد کثیر تعداد میں طالبان علم و معرفت جمع رہتے اور اکثر بڑے بڑے صحابہ مسجد کے صحن میں بیٹھتے اور متعدد مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ لیث بن سعد کا بیان ہے کہ ابو درداءؓ جب مسجد سے آتے تو ان کے ساتھ لوگوں کا اس درجہ ہجوم ہوتا جیسے بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ سب لوگ اُن سے مسائل دریافت کرتے۔

(۴) چونکہ اسلام سے قبل بھی گو لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ لیکن نسب دانی، شاعری شہسواری، شمشیر زنی اور نیزہ بازی عام تھی اور ہر قبیلہ اس کی تربیت اپنی اولاد کو دینا ضروری سمجھتا تھا۔ حضرت عمر فاروق نے سوائے نسب دانی کے جملہ اوقات کی ہمت افزائی فرمائی اور ان کی حفاظت کو فرد و ملت کے لیے ضروری قرار دیا یہی نہیں بلکہ انہوں نے قبیلوں میں معلمین کی کثیر تعداد بھیج کر ان کی جبری تعلیم بھی شروع کر دی تاکہ ان کی استعداد غلط رخ اختیار نہ کرے۔

(۵) معلمین کی اس عام جماعت کے علاوہ جو براہِ راست تعلیم و تربیت دینے میں مصروف تھی، حضرت فاروق اعظم کی نظر انتخاب لشکروں کی سرداری کے لیے بھی انہیں لوگوں پر پڑتی جو اپنی فنی صلاحیتوں کے ساتھ علمی صلاحیتوں کے بھی حامل ہوتے تاکہ تعلیم کی افادیت سے سپاہی بھی محروم نہ رہیں۔

(۶) یہی انداز عدلیہ اور عاملین کے انتخاب میں تھا کہ وہ پہلے قوم کے معلم تھے اور پھر قاضی باعمل اور یہ اس لیے تھا کہ علم عام ہو اور صرف درسگاہوں تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

(۷) ان سب سے بلند ایک مجلس شوریٰ تھی جسے مجلس تحقیق بھی کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ فاروق اعظمؓ کے سامنے نئے نئے مسائل آتے تھے جن کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں کرنا ہوتا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصول "اجتہاد" سے کام لینا ہوتا لہٰذا یہ کام خود فاروق اعظم کی زیر نگرانی ہوتا لہٰذا یہ کام خود فاروق اعظم کی زیر نگرانی ہوتا اور علمی مسائل پر چند صحابہ کرام جن میں حضرت عثمان غنی، علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہٗ جیسی ہستیاں شامل ہوتیں تبادلہ خیال فرماتے بعض فقہی معاملات میں ازواج مطہرات سے بھی رجوع کیا جاتا۔

غرض عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تعلیم کو عام کرنے میں جس حد تک بھی معلمین اور جیّد صحابہ کرام سے استفادہ ممکن تھا کیا اور علم کی وسعتوں اور رفعتوں کو عام فرمایا۔

نصاب

مقصدِ تعلیم اور معلمین کے بعد نظام تعلیم کی تیسری اہم چیز نصاب یا نصابی کتب ہوتی ہیں لیکن ایسے دور میں جہاں لکھنا پڑھنا بھی لوگوں کو نہ آتا ہو، درسی کتب زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتیں اور جب ایک جامع زندگی کے خدوخال نمایاں کرنا ہوں تو اس کے لیے کم از کم کتب اور زیادہ سے زیادہ براہ راست زبانی تعلیم و تربیت پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بچپن کا زمانہ جبکہ بچہ کی پہلی تعلیم گاہ مدرسہ نہیں بلکہ آغوشِ

مادر ہوتی ہے - اور پھر جب وہ چار سال کا ہوتا ہے

تو رفتہ رفتہ اُسے کتاب و قلم سے آشنا کیا جاتا ہے عرب کا یہ دور جس کو مشکل سے تمدنی زندگی میں چودہ سال سے زائد نہ ہوئے تھے - اس کے لیے نصابی کتب کی تدوین قبل از وقت تھی - بایں ہمہ ایک جامع اور بنیادی کتاب کی تدوین اور تعلیم ضروری تھی - یہ خود قرآنِ حکیم تھا جسے الکتاب کہا گیا - جو تمام علوم ظاہری اور باطنی کا سرچشمہ ہے - جس سے نہ صرف اہلِ عرب بلکہ دیگر اقوام بھی اپنے اپنے زمانہ میں استفادہ کرنے پر مجبور ہوئیں خواہ انہوں نے اس کا اعتراف کیا یا نہ کیا -

حضرت فاروقِ اعظم نے اِس قرآنِ حکیم کی تدوین اور اشاعت پر بہت زور دیا بقول مولانا شبلی نعمانی -

"قرآن مجید کا جمع کرنا، ترتیب دینا صحیح نسخہ لکھ کر محفوظ کرنا اور تمام ممالک میں اس کو رواج دینا جو کچھ ہُوا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اہتمام اور توجہ سے ہُوا -"

اس پر مولانا شبلی اور دیگر مورخین نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس لیے اس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے فاروقِ اعظم کا قرآن حکیم کو مرتب اور عام کرنا تعلیمی نقطۂ نظر اور بالخصوص نصابی نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے -

حضرت عمرؓ فاروق کے ذہنِ رسا اور فہمِ دین نے ان کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا تھا کہ یوں تو تمام قرآن مجید ہی دین کا ستون ہے لیکن اگر اس کے کچھ اجزاء بھی لوگوں کو پڑھا دیے جائیں اور ان کو بنیادی تعلیم کے اہم نکات سے آشنا کر دیا جائے تب بھی قوم کی تربیت ہو سکتی ہے - اس لیے انہوں نے چند اہم سُورتوں کا انتخاب فرمایا - سُورۂ بقرہ نساء، مائدہ، حج اور نورؔ اور حکم دیا کہ سب لوگ اس قدر قرآن ضرور پڑھیں کیونکہ ان میں اجمالاً تمام احکام و فرائض آ جاتے ہیں، پھر عمال کو حکم تھا کہ جو لوگ قرآن مجید سیکھیں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں اور پھر جب بعد میں اس کی ضرورت نہ رہی اور قرآن کی تعلیم کا شوق عام ہو گیا تو اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا - اسی طرح فوج میں بھی اس درسی کتاب کو عام

کرنے کے لیے مختلف تدابیر سے کام لیا گیا۔

واضح رہے کہ قرآنِ حکیم کی تعلیم کے ساتھ نصاب میں ادب اور عربیت کی تعلیم کو ضروری قرار دیا گیا تاکہ لوگ صحت کے ساتھ قرآن اور عربی زبان پڑھ سکیں اور بول سکیں۔

عربی اَدب کے ساتھ لغت کی تعلیم بھی نصاب میں شامل کی گئی اور یہ حکم دیا گیا کہ جب تک کوئی شخص عربی لُغت کا عالم نہ ہو وہ قرآن نہ پڑھائے اس سے ایک طرف قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھانے والوں کی تعداد بڑھی تو دُوسری جانب ادب، زبان اور لُغتِ عربی سے لوگ خوب آگاہ ہوئے جو آئندہ چل کر دیگر علوم کے حصول میں ان کی معاون ثابت ہوئی۔

قرآن حکیم اور چند مختصر درسی کُتُب کے علاوہ خود فاروقِ اعظم کی مجلسِ شوریٰ سے جن تحقیقی، علمی، اور فقہی مسائل کو منظرِ عام پر لانا مقصود ہوتا ان کی کاپیاں تمام عمال معلمّین اور فوج کے سپہ سالاروں کو بھیجی جاتیں تاکہ اہم مسائل میں اتحادِ فکر رہے۔

چُونکہ ادب اور زبان کے حصول کا شوق ذوقِ شعر و شاعری سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اچھے اشعار اور ادیبانہ کلام داخلِ نصاب کیا گیا۔

واضح رہے کہ تعلیم سوائے قرآنِ حکیم کے بالعموم زبانی ہوتی اس لیے ہر معلم دراصل خود ایک کتاب تھا اور معلم اور عمالوں ہی پر کیا موقوف دراصل فاروقِ اعظمؓ کی تنظیم نے تمام ملک ہی کو رفتہ رفتہ اپنی تعلیمات کا آئینہ دار بنایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے کسی دَور کے متعلق اگر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور عملی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا تو یہی دورِ فاروقی ہے۔ ورنہ کہیں ارتداد کے فتنے اٹھے اور کہیں نفاق کے۔

نصاب کے سلسلہ میں ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، نے فنی تعلیم کی اہمیت کو خود عمل پیرا ہو کر نمایاں کیا۔ وہ ایک اچھے شہسوار تھے اور جب گھوڑے پر بیٹھتے تو اس طرح جم کر بیٹھتے گویا اس کا جزوِ بدن ہو گئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے عملاً اس ——— کی تلقین فرمائی کہ جب تم کسی سواری پر ہو تو تمہیں اس پر قابو پانے اور

قابو میں رکھنے کی پوری صلاحیت ہونا چاہیے۔ یہی حال ان کا نیزہ بازی اور شمشیر زنی کی مہارت کا تھا۔

عمارتیں

نظامِ تعلیم کے عناصرِ اربعہ میں عمارتوں کا آخری نمبر ہے۔ ان عمارتوں کو بالعموم درسگاہ کہا جاتا ہے لیکن جس طرح تعلیم کے لیے ضروری عمارتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ اسی طرح عمارتوں پر بے جا صرف تعلیمی ضروریات میں حارج بھی ہوتا ہے اور حائل بھی۔

فاروقِ اعظم کے زمانہ کی عام سادگی و وسعت افادیت اور جامعیت اس جزو میں بھی نمایاں ہے۔

اسلام کا پہلا جامعہ، مسجد نبوی تھا جہاں اس کے ایک جانب صفہ کی درسگاہ تھی جس پر معلمین تربیت پاتے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے بھی حضور سرورِ کائنات کے اس درس گاہ کا نمونہ تھا جو عبادت گاہ بھی تھی اور درس گاہ بھی اور ذکر و اذکار اور تبلیغِ دین کا مرکز بھی۔ حضرت فاروقِ اعظم نے بھی کثرت سے مسجدیں تعمیر کرائیں۔ بڑے شہروں میں جامعہ مسجد تعمیر ہوئی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کے زمانہ میں چار ہزار مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں جو مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں ان میں بھی توسیع کی گئی جس میں حرم محترم اور خود مسجدِ نبوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان تمام مساجد میں طلباء کی کثیر تعداد تعلیم پاتی۔ جہاں درس قرآن کا سلسلہ بھی تھا، حفظِ قرآن کا بھی اور ان میں لکھنے پڑھنے کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اگر ایک معمولی سے تخمینہ کے مطابق صرف سو طلباء فی مسجد کا اوسط رکھا جائے تو چار لاکھ افراد کے تعلیم کے لیے عمارات موجود تھیں اور ہم نے دیکھا اکثر مساجد میں نہ صرف درسِ قرآن ہوتا بلکہ محققین، مفسرین اور فقہا کے گرد کثیر مجمع جمع ہوتا۔ گویا یہ مسجدیں ابتدائی مدرسہ بھی تھے اور اوقات کے فرق کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کا مرکز بھی۔

البتہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے

کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اتباع میں خلفائے راشدین اور صحابہ کرام نے علم کو وہ تقدس عطا کیا تھا کہ ہر مسجد درسگاہ بن گئی جن مسلمان سلاطین نے یہ محسوس کیا کہ علوم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے تحت علم کا یہ تقدس مسجدوں میں قائم نہیں رکھا جا سکتا تو انہوں نے درسگاہوں کو مسجدوں سے الگ کر دیا اور ایسا کرنا ضروری تھا ہم نے یہ لکھنا اس لیے ضروری سمجھا کہ آج جب مسجدوں کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنے کا خیال عام ہو رہا ہے ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ پہلے ہم کو اپنی تعلیم گاہوں میں وہ تقدس و اخلاص پیدا کرنا ہے۔

جو مسجدوں کے شایانِ شان ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے تعلیمی اداروں کے ہنگامے مسجد کے تقدس کو بھی ختم نہ کر دیں جہاں اللہ رب العزت کا نورِ معرفت جگمگاتا رہا ہے اور صبح و شام اس کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ مسجدیں تو بہرحال درس و تدریس کے لیے استعمال ہوتیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ فاروقِ اعظم نے اپنی تمام مملکت کی زمین کو لوگوں کے لیے عبادت گاہ اور درس گاہ بنا دیا تھا۔ وسیع میدانوں میں بعض جگہ جمعہ اور عیدین کے خطبے لوگوں کے فکر و عمل کی صلاحیتیں بیدار کرتے۔ اسی طرح فوجی چھاؤنیوں میں سپاہیوں کے مجمعے کھلے میدانوں میں ہوتے جہاں تعلیمات اور لشکروں کو عام ہدایات کا اہتمام ہوتا۔

ان عمارتوں کے ذکر کے ساتھ ہمیں وہ مقدس گھر بھی نہ بھولنا چاہئیں جو ازواج مطہرات کے پر عظمت لیکن سادہ مسکن تھے، اور جو خواتین کے لیے علم و عرفان کے مرکز تھے۔ اور جن کی اتباع میں بے شمار گھروں میں خواتین نے عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔

مختصراً

یوں سمجھ لیجیے کہ فاروقِ اعظم رض نے تفصیل کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں ان تعلیماتِ ربانی کو عام کیا جن کا مقصد دورِ حاضر کی زبان میں فرد کی روحانی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو بیدار کرنا، شخصیت کی تشکیل، زندگی کی ہر منزل کے لیے تحفظ کی فراہمی اور اجتماعی بہبود

کا احساس بدرجۂ اتم پیدا کرنا تھا اور یہی وہ نظامِ تعلیم تھا جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں شروع ہو کر عہدِ فاروقی میں عروجِ کمال کو پہنچا۔ جس نے تقریباً بیس سال کی مختصر مدت میں جزیرہ نما عرب میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ نظامِ تعلیم و تربیت نے عرب قوم کو یہ قوت بخشی کہ وہ سکون و اطمینان کے ساتھ ہر حوادث کا مقابلہ کر سکی اس نے عربوں کے جذبۂ خودداری کو ایک نیا رُخ دیا۔ اور ان میں اپنی قوت کا شعور بیدار کر دیا اور ان کے اس یقین میں پختگی پیدا کی جس پیغام کے وہ حامل تھے۔

اسی تعلیم نے موت کا شعور ان کے قلب سے سلب کر کے حیاتِ جاودانی کی راہ دکھادی۔

انسانیت آج بھی ایسے ہی نظامِ تعلیم کی منتظر ہے جو عہدِ فاروقی کی رُوحِ تعلیم کو اپنا کر ظلم کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے اسے نکالے اور علم کی اس روشنی کی طرف لائے جو فلاحِ دارین کی ضامن ہو۔

تحریر: ملک خدا بخش بُچّہ

فاروق اعظمؓ کا زرعی نظام

عہدِ فاروقی اسلامی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مبدأ فیض سے اُن کی ذات میں انسانی صفات کچھ اس طرح ودیعت ہوگئی تھیں کہ یہ اندازہ کرنا بڑا دشوار ہے کہ کونسی صفت اُن میں زیادہ نمایاں تھی اور کونسی کم

ہیکل نے بالکل صحیح کہا ہے کہ جب کسی ایسے زُہد کا ذکر آتا ہے جو دنیا کی تمام نعمتیں میسر آسکنے کے باوجود اختیار کیا جائے تو حضرت عمرؓ کا زُہد کا ذکر آتا ہے جب کبھی ایسے عدل وانصاف کا ذکر آتا ہے جس میں کسی لوث اور غرض کا شائبہ تک نہ ہو تو حضرت عمرؓ کے عدل وانصاف کا تذکرہ ہوتا ہے جب کبھی دل کی وہ پاکیزگی بیان کی جاتی ہے جو اپنے پرائے میں تمیز کرنا جانتی نہ ہو تو حضرت عمرؓ کے دل کی پاکیزگی بیان کی جاتی ہے یہی نہیں سپہ سالاری میں آپ سالارِ اعظم فقیہوں میں فقیہہِ اکبر اور مجتہدوں میں سرِفہرست نظر آتے ہیں۔ نیکی و بدی میں فرق کرنے پر تو آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فاروق اعظم کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو، مثلاً معیشت ہو یا معاشرت، سیاست ہو یا تجارت، اخلاقیات ہو یا زراعت ہر ایک میں آپ کو گہری بصیرت حاصل تھی۔

زیرِ نظر مضمون میں اُن اقدامات اور انتظامات کا مختصر جائزہ لینے کی سعی کی جائیگی جو آپ کے عہد میں زراعت سے متعلقہ امور یعنی زمینوں کی آباد کاری پیمائش، آبپاشی، اور کاشتکاروں کی اصلاح و فلاح کے لیے عمل میں لائے گئے۔

کھیتی باڑی

جغرافیائی حیثیت اور آب و ہوا کے لحاظ سے عربوں میں کھیتی باڑی بہت کم کی جاتی تھی ملک کا بیشتر حصہ وسیع ریگستان تھا جس میں کچھ کچھ نخلستان تھے جو ایسے دکھائی دیتے جیسے سفید آسمان پر کہیں کہیں سبز ستارے ٹمٹما رہے ہوں۔

نخلستانوں میں گھاس اور چارہ ہوتا تھا اور اس سے وہ بھیڑ بکریاں پالتے تھے یہی اُن کا مال تھا اور اسی مال پر اُن میں لڑائیاں ہوتیں تھیں اور پھوٹ پڑتی تھی۔ عربی زبان میں بھیڑ بکریوں کو غنم کہتے ہیں اِسی لیے جنگ میں لوٹ کے مال کو مالِ غنیمت کہا جاتا تھا۔

اجتماعی طور پر عرب قوم کھیتی باڑی سے ناآشنا تھی اِس کا سب سے بڑا پیشہ گلہ بانی تھا یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ اُس نے اِس قوم کو گلہ بانی سے جہاں بانی کا فریضہ سونپ دیا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عربوں کی زراعت سے وابستگی ہی نہیں تھی تو دلچسپی کس طرح پیدا ہوتی اِس لیے کسی زرعی نظام کے اُبھرنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔

عربوں کی زراعت سے دلچسپی کا آغاز اس وقت ہوا جب حضرت عمرؓ کے دور میں عراق اور مصر و شام کی وسیع و عریض زرخیز زمینیں عربوں کے قبضے میں آئیں اور اپنے ساتھ وسائل لائیں اور عربوں کی توجہ اُنکی طرف مبذول ہوئی حضرت عمرؓ نے زراعت کے کچھ مروجہ طریقوں کو بہتر بنایا اور بعض نئے اقدامات کئے جو زرعی ترقی کے لیے بڑے دور رس نتائج کے حامل ثابت ہوئے۔

زمینوں کی تقسیم

عراق کی فتح کے بعد سب سے پہلے زمینوں کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا حضرت عمرؓ اِن زمینوں کو خراجی قرار دے کر اُن کے اصل مالکوں کے پاس رہنے دینا چاہتے تھے۔ جبکہ بعض صحابہ کرامؓ جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ انہیں مالِ غنیمت قرار دیکر اُن کی تقسیم کے حامی تھے۔ جلد ہی مسئلہ میں شدت پیدا ہوگئی اور وہ نزاعی صورت اختیار کر گیا۔ آخر کار مجلس شوریٰ کا اجلاس بلانا پڑا۔ فریقین نے اپنے مؤقف

میں دلائل و براہین پیش کیے۔ آخر میں حضرت عمرؓ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔
یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں ان زمینوں کو آپ ہی لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد والوں کو ایسی حالت میں چھوڑوں کہ اُن کا اِس میں کچھ نہ ہو۔ کیا آپ لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اُن کی آمدنی ایک محدود طبقے تک سمٹ کر رہ جائے۔ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی۔ بیواؤں اور حاجت مندوں کی کفالت کس مال سے ہو گی۔ مجھے اِس کا بھی اندیشہ ہے کہ بعض لوگ پانی کے لیے بھی فساد کر دیں گے۔
اس تقریر کے بعد حضرت عمرؓ کے موقف کی تائید ہو گئی اور مجلسِ شوریٰ نے آپؓ کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔
دراصل حضرت عمرؓ ایسا اس لیے چاہتے تھے کہ زمینوں کی تقسیم سے اصل مالکوں کی حق تلفی نہ ہو۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا۔ کہ عرب کھیتی باڑی کے طریقوں سے اور اصولوں سے اچھی طرح آشنا نہیں اگر زمین فوجیوں میں تقسیم کر دی گئی تو اس سے پیداوار بھی متاثر ہو گی بہر حال اُن کی رائے تسلیم کر لی گئی اور یہ مسئلہ بخیر و خوبی سے حل ہو گیا۔
حضرت عمرؓ کے اس موقف سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ پہلی اسلام کی وسیع النظری یعنی وُہ کسی حقدار کو اُس کے حق سے محروم نہیں کرتا۔ دوسری زراعت کی اہمیت و افادیت کی حضرت عمرؓ کی نظر میں وقعت، آپ نے زرعی پیداوار میں کمی پیدا ہو جاتے کے احتمال کو قبول نہ کیا۔

خراج کا طریقہ

عراق چونکہ قدیم ترین زرعی خطوں میں سے ایک ہے۔ لہٰذا یہاں مختلف اوقات میں لگان کے مختلف نظام نافذ ہوتے رہے اِس وقت مالگزاری کا جو طریقہ رائج تھا وُہ قباد نے نافذ کیا تھا جس کے تحت ہر قسم کی شکایت پر ایک خاص شرح سے لگان وصول کیا جاتا تھا۔ نوشیروان نے اِس میں اتنی ترمیم کی تھی کہ یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ لگان کی شرح اصل پیداوار کے نصف سے ہرگز بڑھنے نہ پائے۔

حضرت عمرؓ نے لگان کے ضوابط و قواعد کو منصفانہ بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ زمینوں کی پیمائش اور جائزہ کا حکم دیا تاکہ کسی کی برداشت سے زیادہ ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ اسی کام کے لیے آپؓ نے دو معزز اصحابؓ کو مقرر کیا پیمائش کا پیمانہ خود اپنے دستِ مبارک سے بنا کر دیا۔

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ اُن دونوں اصحابؓ نے پیمائش کا کام اس صحت اور تحقیق سے کیا جیسے کپڑا ناپا جاتا ہے۔ پیمائش کے بعد کچھ زمین تو رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کر دی گئی اور اُن کے حقوق کو بعینہٖ بحال رکھا اور خراج کا طریقہ رائج کیا جو عرب کی تاریخ میں ایک اضافہ تھا۔

افتادہ زمینوں پر کاشت

آپ نے زمینوں کی پیمائش اور خراج کے لیے نئے طریقے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ زرعی پیداوار میں اضافہ کے لیے افتادہ اور غیر آباد زمینوں کو زیر کاشت لانے کی طرف بھی توجہ کی اُس ضمن میں قدم یہ اٹھایا کہ حکم عام جاری کر دیا کہ جو شخص افتادہ یا غیر آباد زمینوں کو زیرِ کاشت لائے گا۔ وہ اس کی ملکیت قرار پائیں گی۔ لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرما دی کہ اگر کوئی شخص ان زمینوں کو اپنے تصرف میں لانے کے بعد تین سال کے اندر اندر آباد کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو حقِ ملکیت سے محروم رہیگا۔ بنجر زمینوں کو آباد کرنے اور نئی زمینوں کو زیرِ کاشت لانے کے لیے یہ ایک انقلابی قدم تھا جس سے زرعی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہُوا اور دیکھتے ہی دیکھتے بنجر اور غیر آباد زمینیں سرسبز و شاداب کھیتوں میں تبدیل ہو گئیں۔

نہروں کی کھدائی

زراعت میں پانی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کھیتی باڑی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بارانی علاقوں میں تو کاشت کار کی محنت کا تمام تر انحصار بارانِ رحمت

پر ہوتا ہے۔ اگر وقت پر مینہ برس جائے تو جنگل میں منگل ہو جاتا ہے۔ ورنہ لہلہاتی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں اور سرمایہ و محنت دونوں کا ضیاع ہوتا ہے۔

آپ سے قبل چشموں اور بارشوں سے تالابوں اور جوہڑوں میں جمع شدہ پانی سے کاشت کاری میں استفادہ کیا جاتا تھا۔ آپ نے بہتر آب پاشی کی ضرورت کا احساس کیا اور اس کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے نہریں کھدوائیں۔ چنانچہ پہلی نہر آپؓ کے حکم سے دریائے دجلہ سے بصرہ تک نکالی گئی اس سے علاقہ میں پانی کی فراوانی ہو گئی۔

اس کے بعد دریائے نیل کو بحیرہ قلزم سے ملانے کے لیے ۶۹ میل لمبی نہر کھودی گئی۔ یہ نہر امیر المومنینؓ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس سے غلہ کی آمد میں بھی آسانی پیدا ہو گئی علاوہ ازیں آپ کے زمانے میں دریائے دجلہ سے دو اور نہریں بھی نکالی گئیں۔

انجینیرنگ کے یہ کام آپؓ کے شاندار کارنامے ہیں۔ آج کے سائنسی دور میں بھی نہری آبپاشی کاشت کاری کے لیے بڑی مفید اور اہم تسلیم کی جاتی ہے۔

مشاورت

اسلام نے باہمی امور میں مشاورت کا حکم دیا اس لیے حضرت عمرؓ زرعی اصلاحات میں بھی زراعت سے متعلقین اور ماہرین دونوں سے مشورہ کرتے تھے۔ اور اُن کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ جب آپؓ نے عراق میں بندوبست اراضی کرنا چاہا تو پہلے اپنے عمال کو لکھا کہ عراق سے اس بارے میں جاننے والے دو سربرآوردہ افراد بھیجے جائیں تاکہ اُن سے مشورہ کر سکوں۔ اس طرح مصر کے گورنر کو لکھا کہ مالگزاری اور لگان وغیرہ کے سلسلے میں سابقہ حکام سے مشورہ کریں، مزید تسلی کے لیے خود وہاں سے ایک قبطی کو جو واقف کار تھا، بلایا اور اُس سے مشورہ کیا۔ آپ مشوروں کے بعد حالات اور ضروریات دونوں کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ فرماتے جو سب کے لیے فائدہ مند اور قابلِ قبول ہوتا تھا۔

کاشتکاروں کی فلاح و اصلاح

آپ کو کاشتکاروں کی فلاح و اصلاح کا بڑا خیال تھا کاشتکاروں کی خوشحالی کا آپ کو اس قدر احساس تھا کہ زرعی آلات اور دوسری مطلوبہ اشیاء مثلاً بیج وغیرہ تک کے لیے باقاعدہ امداد دی جاتی اگر آفاتِ سماوی کسی اور وجہ سے کاشتکار کی فصل تباہ ہو جاتی تو آپؓ سرکاری خزانے سے اس کی تلافی فرما دیتے۔ ایک بار ایک کاشت کار نے آپ سے شکایت کی کہ شام میں اُس کی فصلوں کو فوجوں کی نقل وحرکت سے نقصان پہنچا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اُسے سرکاری خزانہ سے فوراً دس ہزار درہم بطور ہرجانہ ادا کیے۔ آپ خراج کی وصولی میں ہمیشہ کاشتکار کی مجبوری کو ملحوظ رکھتے اور نرمی برتنے کی تلقین فرماتے اِس بات کا خاص اہتمام کرتے کہ کسی کاشتکار سے اس کی بساط سے بڑھ کر لگان وصول نہ کیا جائے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ اِس بات کی تصدیق کے لیے کہ خراج کی وصولی کے لیے کاشتکاروں پر سختی تو روا نہیں رکھی جا رہی یا مقررہ لگان سے زیادہ رقم تو وصول نہیں کی جاتی۔ آپؓ ہر سال خراج کی رقم پہنچنے پر کوفہ اور بصرہ سے دس دس ثقہ آدمی طلب فرماتے اور اُن سے حلفیہ بیان لیتے کہ یہ لگان کسی مسلمان یا ذمی پر سختی کر کے تو نہیں وصول کیا گیا۔

جب ہر طرح سے اطمینان ہو جاتا تو خراج کی رقم بیت المال میں جمع کرتے۔ کتاب الاحوال میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ شام کے والی سعید بن عامر کو لگان کی رقم بھیجنے میں تاخیر ہو گئی آپؓ نے اُنہیں بلایا اور تاخیر کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے جواب دیا کہ لگان کی وصولی کے سلسلہ میں آپ کے دو احکام ہیں ایک یہ کہ چار دینار سے زیادہ نہ وصول کیا جائے دوسرے کاشتکار کی آمدنی اور سہولت کو مدِنظر رکھا جائے۔ ان اصولوں کی پابندی کی وجہ سے وصولی میں تاخیر ہوئی ہے یہ سُن کر آپؓ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں تمہیں زندگی بھر اِس عہدہ سے معزول نہیں کروں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ بہت بڑے جوہر شناس تھے آپؓ نے بہت پہلے اس راز کو پا لیا تھا کہ مطمئن اور خوشحال کاشت کار ہی زرعی ترقی کا موجب بن سکتے ہیں۔ کاشت کار صرف اُسی صورت میں آسودہ اور مطمئن ہو سکتا ہے کہ اُسے اُس کی محنت کا پورا حاصل ملے اور زمین سے اُس کا دلی اور جذباتی تعلق گہرا ہو۔ سید امیر علی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سپرٹ آف اسلام" میں حضرت عمرؓ کی ترقی کے

بارے میں مساعی کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

"حضرت عمرؓ نے زرعی خوشحالی کو فروغ دینے کی خاطر جو اقدامات کئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہیں لوگوں کی فلاح اور اُن کے مفادات کو ترقی دینے کا کتنا خیال تھا۔ زمین پر جو لگان لگایا گیا وہ معقول اور منصفانہ بنا پر مقرر کیا گیا تھا۔ مملکت کے ہر حصّے میں نہریں کھدوائی گیئں"۔

جاگیرداری کے زمانے سے جو محاصل کاشت کاروں کے لیے عذابِ جان بنے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب منسوخ کر دیئے گئے چنانچہ صدیوں کا بوجھ اُن کے سروں پر سے اُتر گیا۔

یہاں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عرب قوم کو زراعت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ کیونکہ اُن کی معیشت کا انحصار زراعت کے بجائے دوسرے عوامل پر تھا۔ پھر حضرت عمرؓ کا دور بڑا ہنگامہ خیز تھا۔

نئی قوم تشکیل پا رہی تھی۔ جنگ و پیکار کا سلسلہ گرم تھا اور قیصر و کسریٰ کی طاقتوں سے نبرد آزمائی ہو رہی تھی مگر آپ نے اِس جنگی اور ہنگامی صورت حال اور زرعی اصولوں اور طریقوں سے ناآشنائی کے باوجود زرعی ترقی کے لیے جو اقدامات کیے اُن پر حیرت ہوتی ہے۔

اس سے ایک طرف آپ کی زراعت سے گہری دل چسپی اور دوسری طرف زراعت کی افادیت کا ثبوت ملتا ہے پھر اطمینان کی بات یہ ہے کہ اُن کے اقدامات اتنے نتیجہ خیز اور دُور رس ثابت ہوئے۔

کہ اُن کی اہمیت آج بھی اُسی طرح تسلیم کی جاتی ہے حضرت عمرؓ نے اسلام کے ازلی و ابدی اُصولوں کی بناء پر اسلامی زرعی نظام کی تشکیل کی نہایت ہی قابلِ قدر اور موثر ابتداء کی۔ اگر یہی اُصول ہماری رہنمائی کرتے رہتے تو اسلامی ملکوں میں زرعی ترقی بتدریج جاری رہتی۔

لیکن ہوا یہ کہ خلفائے راشدین کے بعد مختلف ملکوں میں اور مختلف زمانوں میں اسلامی زرعی نظام نے کچھ اور ہی شکل اختیار کر لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی ممالک زراعت کے میدان میں پیچھے رہ گئے۔

تحریر: ڈاکٹر انور اقبال قریشی

فاروقِ اعظمؓ کی معاشی اصلاحات

حضرت عمرؓ کا کردار اور اُن کا دورِ حکومت اسلام کی تاریخ کی مشہور تابناک مثال ہے۔

ایک طرف حضرت عمرؓ کا وہ جاہ و جلال کہ دنیا کے بڑے بڑے حکمران اُن کا نام سن کر ہی کانپتے تھے۔ دوسری طرف اُن کی ذاتی زندگی یہ تھی کہ کپڑوں میں پیوند تک لگے ہوتے تھے۔ اُن کے عدل و انصاف کی داستانیں مشہور و معروف ہیں۔ ایک غریب بڑھیا تک برسرِ دربار اُن کا دامن پکڑ کر انصاف کا تقاضا اور آپ کے فیصلے پر تنقید و تبصرہ کر سکتی تھی۔

آپ کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر کئی کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اِس مختصر مضمون میں میں آپ کی چند اہم معاشی اصلاحات کا تذکرہ کروں گا، جس کے دنیا میں بہت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

حضرت عمرؓ کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب دنیا پر جاگیرداری نظام مسلط تھا۔ جاگیرداری نظام کی بنیاد یہ تھی۔ کہ جنگ کے وقت جاگیرداروں کو حسبِ مرتبہ فوجی دستے مہیا کرنے پڑتے تھے۔ لہٰذا فتوحات سے جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا۔ اس میں اُن کا حصّہ نمایاں ہوتا تھا اور اس طرزِ تقسیم سے ان کی دولت اور زمین کی وسعت بڑھتی جاتی تھی۔

دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں تو بڑے جاگیردار بادشاہوں تک کو خاطر نہ لاتے

تھے اور یہی طریق بہت سی سیاسی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی راہیں کھول دیتا تھا۔
یہ وہ زمانہ تھا جب باضابطہ تنخواہ دار فوج کا دنیا کے کسی حصّے میں کوئی وجود تو کیا تصوّر تک موجود نہ تھا۔

عام لوگ جو جنگ میں بطور سپاہی حصّہ لیتے تھے اُن کو مال غنیمت سے حصّہ ملتا تھا اور اگر فتوحات بڑے پیمانے پر ہوں تو مفتوحہ ممالک کی زمینوں سے بھی انہیں حصّہ ملتا تھا جس پر وہ قابض ہو کر وہیں آباد ہو جایا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جس سرعت سے فتوحات مسلمانوں کو حاصل ہوئیں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی دُور رس نگاہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر فتوحات جاری رہیں اور زمانے کے دستور کے مطابق مفتوحہ زمینیں مسلمان سپاہیوں میں منقسم ہوتی رہیں تو وہ وقت جلد آجائے گا جب سب مسلمان نئے ملکوں میں اپنی زمینوں پر آباد ہو جائیں گے اور عرب مجاہدین کا وجود ختم ہو جائے گا۔

یہ حضرت عمرؓ کی ہی ذات بابرکات تھی اور یہ دنیا کی تاریخ میں پہلے بزرگ تھے جنہوں نے باضابطہ تنخواہ دار مستقل فوج کی بنا ڈالی۔ سپاہیوں اور فوجی افسروں کو خزانہ عامرہ سے باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔

میں نے بہت عرصہ ہوا ایک مقالہ انگریزی زبان میں لکھا تھا جس کا عنوان تھا۔ "اسلام میں قانون کا تصور" اس مقالے کا لب لباب یہ ہے کہ اسلام میں قانون حالات و واقعات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ قرآن کریم کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ محض لفظی اور معنوی معنوں سے کام نہیں چل سکتا اور یہ اسلام اور قرآن کی روح کو نہ سمجھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم محض رسم و رواج اور فرسودہ نظام عمل کا شکار ہو چکے ہیں۔

اُس مضمون میں میں نے بتایا تھا کہ قرآن میں زکاۃ پر جا بجا مسلسل و متواتر زور دیا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جانوروں پر زکاۃ کے احکام نافذ کئے اور اس پر عمل درآمد کیا۔

زکاۃ کی رُوح اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے اس وقت عرب کے حالات کے پیشِ نظر بڑی دولت جانور ہی تھے۔ لہٰذا جانوروں پر زکاۃ کا حکم سب سے پہلے عمل میں آیا۔

حضرت عمرؓ کی دوررس نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا۔

اگر اسلام کی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنا ہے تو پھر لشکرِ اسلام کو کسان بننے سے روکنے کی فوری ضرورت ہے۔

چنانچہ آپ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ مفتوحہ ممالک میں فاتح فوج کو زمین نہیں ملے گی بلکہ سابق زمیندار اور کاشت کار حسبِ دستور اپنی زمینوں پر قابض رہیں گے اور حسبِ دستور اپنی زمین کا لگان جس کے لیے عربی میں لفظ خراج استعمال ہوا ہے وہ حکومت کو ادا کریں گے۔

زمانۂ قدیم سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ زمینوں کا اصلی مالک ہمیشہ بادشاہ ہوتا تھا اور زمینوں پر لوگ نسل در نسل قابض رہتے تھے۔ بشرطیکہ وہ مقررہ لگان یا حکومت کو اس کا حق ملکیت ادا کرتے رہیں یہ طریق تمام دنیا میں رائج تھا۔

اسلام میں زمین کا مالک اللہ تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے۔ اور اس پر تسلط خلیفۂ وقت کا تسلیم ہوا ہے اور خلیفۂ وقت جسے اب (STATE) ریاست یا حکومت کا تصور دے دیا گیا ہے۔ وہ اُس کا مالک ہے لہٰذا افراد کا اس پر کوئی حق نہیں۔

زمین کو قومیانے والے اشتراکی یہ دلیل اپنے جواز میں پیش کرتے ہیں حالانکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام کے واقعات سراسر اس کے خلاف ہیں۔

حضرت عمرؓ نے زمین کو ان معنوں میں قومی ملکیت میں نہیں لیا تھا جن معنوں میں اشتراکین اور اُس نوع کے اُن کے حواری اور درباری پیش کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں مقررہ لگان ادا کرنے پر سابقہ مالک زمین پر قابض رہتے تھے۔ اور اُن کے حقوق رہن و بیع اور ملکیت کے سابقہ حقوق قائم رہتے تھے۔ وہ سالانہ صرف حکومت کا مقررہ خراج ادا کرتے تھے۔ جسے ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے زمانے میں اور پھر انگریزوں نے بھی سابق طریق پر عمل درآمد کرتے ہوئے لگان کا نام دیا۔

صورت حال کو اس طرح بہترین طریق پر سمجھا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے دور میں زمین کے مالکوں کو صرف رقبہ کے حقوق حاصل ہوتے تھے۔ تحت الرقبہ کے حقوق کی مالک حکومت ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی زمین میں رقبہ کے تحت کوئی خزانہ، سونا، چاندی ہیرا یا دوسری کوئی ایسی چیز نکل آئے تو اُس پر قبضہ حکومت کا ہوتا تھا۔ زمیندار کا نہیں۔ مسلمانوں کے عہد میں تحت رقبہ حقوق صرف اُن زمینوں پر مالکان کو حاصل تھے جو غیر مفتوحہ عربستان کے علاقوں میں تھیں۔ ان زمینوں کو ملک زمین کہا جاتا تھا۔ یہ زمین صرف وہ ہیں جو عربی پانی سے سیراب ہوتی تھیں۔ باقی تمام جگہ کو صرف رقبہ کے حقوق حاصل تھے اور یہی دستور دنیا بھر میں اب تک رائج ہے۔

حضرت عمرؓ کی حکمت عملی نے ایک طرف تو دنیا میں پہلی مرتبہ باضابطہ تنخواہ دار فوج کی بنیاد ڈالی اور دوسری طرف مفتوحہ ممالک کی زمینوں پر ان کے پہلے مالکان کے حقوق باقی رکھ کر فتوحات جاری رکھنے کی آسانیاں اور مواقع فراہم کیے کیونکہ جب مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو پتہ چلا کہ اسلام اُن کی اندرونی زندگی اور حقوق میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ بشرطیکہ وہ اُس کی (OVERLORD SHIP) یا سیاسی بالادستی قبول کرلیں اور خراج ادا کرتے رہیں اس کے معاوضے میں اسلامی حکومت ان کی سلامتی اور حفاظت کا ذمہ لیتی تھی اور وہاں امن و امان قائم رکھتی تھی اور ان کو کسی بیرونی حملہ سے بچانے کی ذمہ دار تھی، تو اکثر و بیشتر ممالک کے عوام مسلمانوں کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔

جہاں جنگ کی صورت پیش آتی اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہوتی تو مال غنیمت حاصل ہوتا وہ حکومت کے خزانے میں داخل کر دیا جاتا۔

چنانچہ اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں خزانہ عامرہ یا بیت المال نے قابل رشک ترقی کی۔ بعض مفتوحہ علاقے اس قدر امیر تھے۔ اور اُن سے اس قدر مال و دولت حاصل ہوتا تھا کہ اس کی مقدار کا اندازہ لگانا دشوار ہو جاتا۔

ایک یورپی مصنف لکھتا ہے کہ بحرین کی فتح کے بعد جب فاتح فوجی جرنیل نے شام کے وقت حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر مال غنیمت کی مقدار بتائی تو وہ اس قدر حیرت انگیز طور

پر زیادہ بھی کہ اُس کا آسانی سے تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس پر یقین نہ آتا تھا۔ آپ نے اُس سے دوبارہ اور سہ بارہ سوال کیا اور اُس جرنیل نے وہی مقدار بتائی۔

حضرت عمرؓ نے سمجھا کہ یہ شخص دور دراز کے سفر کی وجہ سے بدحواس ہو گیا ہے اس کے حواس بجا معلوم نہیں ہوتے جو اس قدر مبالغہ آمیز گفتگو کرتا ہے۔ لہٰذا آپ نے حکم صادر فرمایا کہ اسے رات بھر آرام کرنے دو۔ صبح اُس سے بات چیت کریں گے۔ دوسری صبح بھی اس نے وہی رقم بتائی اور گنتی کرنے پر اتنی ہی نکلی۔

مفتوحہ علاقوں سے آمدنی کی اس قدر ریل پیل ہوئی کہ اسلامی خزانہ یا بیت المال بھرپور ہو گیا، اُدھر حضرت عمرؓ کی اپنی زندگی اس قدر سادہ تھی کہ تاریخ عالم میں شاید ہی اس کی مثال ملے انہوں نے ایسی ہی سادہ زندگی بسر کرنے کے لیے ممالک عربیہ کے گورنروں کو بھی تحریری تلقین کی۔

جب حاکم وقت خود سادہ زندگی بسر کرے تو دوسروں پر اس کا اثر ہونا بھی لازم ہے کاش اس سے ہمارے حکمران سبق حاصل کریں۔

اس ثروت کی وجہ سے حضرت عمرؓ کا دوسرا معاشی تابناک کارنامہ ویل فیرائیٹ یا ایک ایسا رفاہی معاشرہ قائم کرنا تھا جس سے ہر ضرورت مند کو گزر اوقات کے لیے حکومت کی طرف سے وظیفہ جاری کیا جاتا تھا اس کی مثال باوجود اس قدر ترقی یافتہ ہونے کے موجودہ مغربی ممالک میں بھی نہیں ملتی۔

یہاں میں ایک اور نازک مسئلے کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں حضرت عمرؓ کے زمانے میں خوش حالی کا یہ عالم تھا کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ حکومت نے لوگوں کے نام کثیر تعداد میں وظیفے لگا رکھے تھے۔ کہ دنیا کا کوئی ملک ایسی درخشاں مرفہ الحالی کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

آخر میں اس امر کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک ناقابل فراموش اور دنیا کی تاریخ میں پہلا کارنامہ تھا کہ ملک بھر میں باقاعدہ طور پر مردم شماری کا طریق رائج ہوا۔ اور آبادی کے صحیح اور مستند اعداد و شمار تیار ہوئے جس سے لوگوں کی مالی حالت کا پتہ چلتا تھا اور غریب طبقہ کی فلاح و بہبود کی ذمہ دار حکومت ہی تھی۔

پائیداری، آرام
سکون اور
اعتماد کا نشان
عثمان فین
فون: 33-523532
رابطہ کیلئے:
عثمان فین (لوہے) گجرات
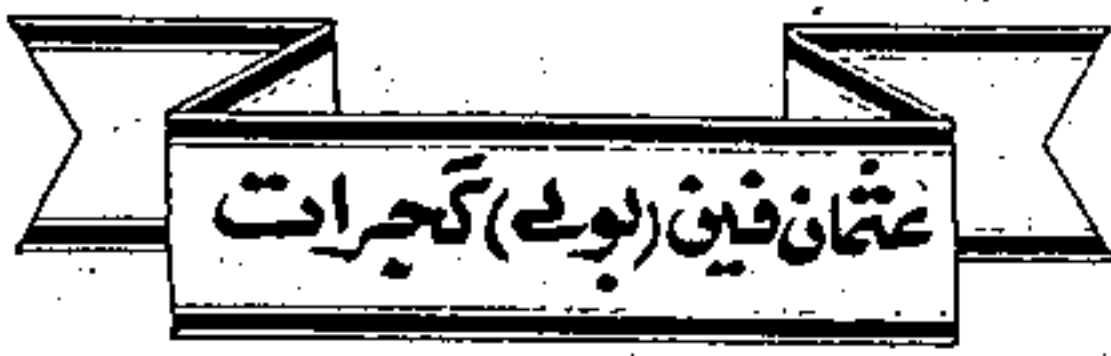
فاروقِ اعظمؓ کی داخلہ حکمتِ عملی

تحریر: پروفیسر رحیم بخش شاہین

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ) کے وقت اسلامی حکومت کا رقبہ تقریباً نو لاکھ ستائیس ہزار (۹,۲۷,۰۰۰) مربع میل تھا حضرت ابوبکر صدیق نے تعین زکوٰۃ اور مرتدین کی زبردست رکاوٹوں کے باوجود صرف سوا دو سال کی مختصر مدت میں اس رقبہ کو تقریباً بارہ لاکھ دو ہزار ایک سو چونسٹھ (۱۲,۰۲,۱۶۴) مربع میل تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد عہدِ فاروقی میں اسلامی مملکت تقریباً پچیس لاکھ گیارہ ہزار چھ سو پینسٹھ (۲۵,۱۱,۶۶۵) مربع میل کے رقبے پر پھیل گئی اس کا مطلب یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں تقریباً تین سو اکاون (۳۵۱) مربع میل روزانہ کا اضافہ ہوتا رہا۔

ان فتوحات کی حدود شمال میں بحر خزر کے مغربی کنارے کے ساتھ مقام دربند سے تقریباً سو میل آگے شمال میں (کوہ قاف کے آگے تک) جنوب میں عدن اور اس کے جنوب میں واقع جزائر تک، مشرق میں پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں مکران تک (اور بقول بلاذری مقام تھانہ تک جو آج کل صوبہ بمبئی میں شمار کیا جاتا ہے) اور مغرب میں لیبیا کے شہر طرابلس

المغرب تک پھیلی ہوئی تھیں اس پورے خطہ ارض میں آج کل تقریباً بائیس حکومتیں قائم ہیں فتوحات کی اس کثرت کو دیکھئے اور دوسری طرف حیران کن امر یہ ہے کہ مقابلے میں روم و ایران ایسی شاندار حکومتیں تھیں جن کی دھاک پوری دنیا پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ مسلمانوں پر عددی فوجی، معاشی لحاظ سے فوقیت رکھتی تھیں۔ مسلمانوں کے پاس نہ تو فوجوں کے ٹڈی دل تھے۔ نہ ہتھیاروں کی فراوانی تھی، نہ تربیت یافتہ سپہ سالار تھے۔ اور نہ دولت کی کثرت تھی۔ پھر جنگ کے معاملے میں مسلمان افواج طرح طرح کی اخلاقی حدود کی پابند تھیں اس کے باوجود نہ کہیں باغ اور کھیتیاں ویران ہوئیں، نہ آبادیوں میں آگ لگائی گئی۔ نہ کسی بچے، بوڑھے عورت یا نہتے دشمن پر کسی مجاہد نے ہاتھ اٹھایا۔ نہ کہیں بازار لوٹے گئے، نہ کاشتکاروں سے کھیت چھینے گئے۔ نہ کاریگروں سے کارخانے ہتھیائے گئے۔ زمانۂ جنگ میں دشمن ملک کے غیر باشندوں کو بے خانماں ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مورخین نے فاروق اعظمؓ کو سکندرِ اعظم سے بڑا فاتح قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں سکندر اعظم ہو یا کوئی اور فاتح یا سپہ سالار حضرت عمرؓ سے اُس کو کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔

ایک سوال

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں فتوحات کی یہ کثرت کیونکر ممکن ہوئی اور اس معاملے میں حضرت عمرؓ دنیا بھر کے فاتحوں اور کشورکشاؤں سے گوئے سبقت کیونکر لے گئے؟ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عدیم المثال کامیابی کا حقیقی سبب وہ نظریہ حیات تھا جس پر حضرت عمر فاروق یقین محکم رکھتے تھے۔ اور جسے اسلام کہا جاتا ہے یہی وہ نظریہ تھا جس نے مختصر سی مدت میں سرزمین عرب میں انقلاب عظیم برپا کر کے رکھ دیا تھا۔

سرچشمۂ قوت

اس نظریہ حیات کا مرکز و محور عقیدہ توحید ہے جس کی رو سے انسانی زندگی ایک کل کی حیثیت رکھتی ہے اس میں دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی تفریق بے معنی قرار پاتی ہے۔

باقی ہے، یہ عقیدہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس پر ایمان لانے والے اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر دیں اور اپنی پوری زندگی کو خدا کی مرضی کے مطابق لیں اس عقیدہ کی رُو سے نوعِ انسانی ایک برادری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس برادری میں رنگ و نسل، زبان و وطن اور زر و حال کی بنیاد پر امتیازات فضول ہیں۔ انسانی عظمت قانون خداوندی کی پیروی میں مضمر ہے، اسلام کی نظر میں فرمانروائی اور حکمرانی صرف خدا کا حق ہے اس لیے بندگی اور اطاعت کے لائق وہی ذات ہے۔ اسلام انسان کو غیر اللہ کی غلامی کی زنجیروں سے نجات دلا کر ایک خدا کا بندہ بناتا ہے اس نظریہ کے ماننے والے جب مل جل کر ایک ریاست قائم کریں گے تو اس میں بھی اللہ کے عطا کئے ہوئے قانون کو نافذ کرنے کی جدوجہد کریں گے۔

اس قانون میں ترمیم و تنسیخ کا حق کسی فرد یا گروہ کو حاصل نہیں اور اسلامی ریاست کے منتظم افراد کی اطاعت بھی صرف قانون خداوندی کے مطابق ہوگی۔ جہاں ان لوگوں نے خدا کے قانون سے اعراض و انحراف کیا، مسلمانوں پر سے ان کی اطاعت کی ذمہ داری از خود ساقط ہو جائے گی

اسلامی ریاست کا مقصد صرف یہ نہیں ہوگا کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے۔ ان کی آزادی کی حفاظت کرے۔ مملکت کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھے۔ بلکہ اس کا اصل مدعا اسلام کے عدل اجتماعی پر مبنی نظام زندگی کو قائم کرنا ہے اس کا مقصد بدی کی تمام شکلوں کو مٹانا اور نیکی کی تمام صورتوں کو قائم کرنا ہوگا۔ یہی وہ نظام تھا۔ جو جزیرۃ العرب میں محسنِ انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا اور جس کے استحکام کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں، اور یہی وہ نظام حیات تھا جو اپنے جلو میں فتوحات کا یہ عظیم الشان سلسلہ لے کر آیا۔ اور جس نے ریگزار عرب کے بدوؤں کو ایک تمدن آفرین قوت کی حیثیت سے متعارف کرایا۔

مستشرقین کی قیاس آرائی

متعصب مستشرقین کی طرف سے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اہل عرب نے روم و ایران

سے کسب فیض کیا تب جا کر وہ سیاست و تمدن کا قصر رفیع تعمیر کرنے کے قابل ہو سکے کاش وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے کہ جس قوم کے پاس خدا کی کتاب کی واضح آیات اس کے رسول مکرم کا اسوہ حسنہ موجود ہو اُسے کسی دوسرے نظام زندگی لائحہ عمل اور نمونہ کی ضرورت کیونکر پیش آسکتی ہے۔ قرآن و سنت کی بنیاد پر قائم ہونے والا نظام بھی صورت میں کسی دوسرے نظام سے مماثل نہیں ہو سکتا۔ اہل مدینہ نے روم و ایران میں رائج ظالمانہ نظاموں کا چربہ نہیں اتارا ان نظاموں کی زمام کار جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ تو خود روشنی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ خود اہل عرب بھی قبل از اسلام ایک دوسرے نظام جبر کی چکی میں پس رہے تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عمرؓ قبل از اسلام امور حکمرانی سے واقف تھے اور ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کو قریش میں بلند سیاسی مقام حاصل تھا اس لیے وہ اتنی بڑی سلطنت کی نگرانی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے لیکن میرے خیال میں اگر عمرؓ کو اسلام کی نعمت حاصل نہ ہوتی تو عمرؓ ایک ماہر نساب نڈر اور بے باک شخص، صائب الرائے سردار تومند پہلوان تجربہ کار جنگجو، دانشمند، سفیر اور جادو بیان خطیب ہوتے وہ استے بڑے فاتح اور اتنی بڑی سلطنت کے ایک کامیاب حکمران ہرگز ثابت نہ ہو سکتے لیکن حضورؐ کی نگاہ کرم کا فیض تھا۔ اور آپ کی نورانی تربیت کا اثر تھا کہ عمرؓ بن خطاب تاریخ عالم میں فاروق اعظم کی حیثیت سے روشناس ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے عہد رسالت اور عہد صدیقی میں ہر مشکل مرحلے میں اسلام اور مسلمانوں کی بے نظیر خدمات سرانجام دیں۔

آپ نے دونوں صاحبوں کی مصاحبت میں رہ کر حکمرانی اور جہانداری کے وہ اصول سیکھے جن سے دنیا بھر کے شہنشاہ ناواقف تھے اس لیے جب زمام اقتدار ان کے ہاتھ آئی تو انہوں نے بے مثال حکمت و تدبر اور بے نظیر جرات و استقامت سے اسلامی ریاست کی وحدت تنظیم اور اس کے استحکام کا کارنامہ سرانجام دیا۔

ایک اہم خطبہ

مسند آرائے خلافت ہونے کے بعد عمر فاروق نے منبر پر چڑھ کر جو خطبہ دیا وہ آب زر

سے لکھے جانے کے قابل ہے اس کا ایک ایک جملہ آداب جہانداری کا صحیفہ نظر آتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔

"مجھے معلوم ہے کہ لوگ میری سختی سے ڈرتے اور میری درشتی سے لرزہ براندام رہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عمر اس وقت بھی ہم پر سختی کرتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہمارے سروں پر تھا پھر اس وقت بھی ہم سے سختی کے ساتھ پیش آتا رہا جب ہمارے اور اس کے درمیان حضرت ابوبکرؓ حائل تھے لیکن اب کیا ہوگا؟ جب کہ تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں جو کوئی بھی ایسی باتیں کہتا ہے وہ ٹھیک ہی کہتا ہے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع وفرمانبردار اور ادنیٰ چاکر تھا۔ اور رحمت و رافت میں کوئی بھی حضورؐ کو نہیں پہنچ سکتا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے" وہ مومنوں کے لیے راحت و رحمت کا سرچشمہ ہیں" بارگاہ رسالت میں میری حیثیت ایک برہنہ شمشیر کی سی تھی جب حضور چاہتے، مجھے نیام میں فرمالیتے اور جب چاہتے اذن کارعطا فرما دیتے۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسی طرح رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یاد فرمایا۔ حضورؐ آخری وقت تک مجھ سے خوش رہے اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس سعادت پر مجھے فخر ہے۔"

اس کے بعد مسلمانوں کی زمام کار ابوبکر صدیقؓ کے سپرد کی گئی جن کے تحمل، کرم اور نرمی سے انکار ناممکن ہے اور میں ان کا بھی اطاعت کیش اور مددگار رفیق رہا۔ اپنی سختی کو ان کی نرمی میں سمو دیتا تھا۔ میں ایک شمشیر برہنہ تھا جسے وہ نیام میں کر لیتے تھے۔ یا اپنا کام کرنے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔

میں اسی طرح ان کے ساتھ بھی رہا۔ یہاں تک کہ اللہ ذوالجلال نے انہیں ہم سے جدا کر دیا۔ وہ دم واپسیں تک مجھ سے خوش رہے اور اے لوگو! اب تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے شانوں پر رکھ دی گئی ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ سختی اب نرمی میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے بدستور

قائم ہے جو مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأت ایمانی رکھتے ہیں۔ سو ان کے لیے میں سب سے زیادہ نرم ہوں اگر کوئی کسی پر ظلم یا کسی کے ساتھ زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اُسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر نہ ٹکا دوں اور دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں نہ رکھ دوں تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔"

"لوگو مجھ پر تمہارے چند حقوق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور اس مال غنیمت میں سے جو اللہ تعالیٰ تمہیں عطا کرے۔ کوئی چیز ناحق نہ لوں۔ مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہارے عطیات و وظائف میں اضافہ اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کر دوں اور مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں تمہیں گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں اور جب تم جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہداری کروں۔"

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو۔ مجھ سے درگزر کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ۔ نیکی کے احکامات کی تعمیل کرانے اور برائی سے روکنے میں میری مدد کرو اور تمہاری جو خدمات اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرو میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں۔

اس خطبہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت اور رفاقت پر بے حد فخر ہے اور آپ نے اس بات کا بھی اعلان کر دیا۔ کہ مملکت کی بنیادی حکمتِ عملی میں سرمو فرق نہیں آئے گا۔ اس حکمت عملی کے ضروری اصول و نکات حسبِ ذیل ہیں۔

شورائی نظام

عمر فاروق کی حکومت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اہل ایمان کی حکومت "خلافت" ہے یہ حکومت قانونِ خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کر سکتی ہے جس کا ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کا طریق کار یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا تو اس بات کا جائزہ لیتے تھے۔ کہ اس میں کتاب اللہ کا فیصلہ کیا ہے؟ اگر وہاں کوئی حکم نہ ملتا تو اس بات کی کوشش کرتے کہ حضور کی سنت سے رہنمائی حاصل ہو جائے اگر سنتِ رسول اللہ میں بھی کوئی حکم نہ ملتا تھا تو قوم کے سرکردہ اور نیک لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کرتے تھے۔ اور مشورے کی روشنی میں فیصلہ کرتے تھے، حضرت عمرؓ کا شعار بھی یہی تھا۔ آپ کے عہد میں اہلِ شوریٰ کو پوری آزادی تھی کہ وہ اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کریں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی اس پالیسی کو ایک مجلس مشاورت کی افتتاحی تقریر میں یوں بیان فرمایا۔

"میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لیے تکلیف دی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے۔ اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی وہ لوگ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے میں نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔"

مولانا شبلی نعمانی کے بقول "مجلس شوریٰ کا انعقاد اور اہل الرائے کی مشورت استحسان و تبرع کے طور پر نہ تھی بلکہ حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرما دیا تھا۔ کہ مشورے کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے فوج کی تنخواہ دفتر کی ترتیب، عمال کے تقرر وغیرہ اہم مسائل پہلے پہل مشورے کے لیے مجلس شوریٰ میں پیش فرمائے اور اس کے فیصلے کے مطابق آپ نے ضروری اقدامات کیے۔

قانون کی بالاتری

اس حکومت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ حضرت عمرؓ قانون کی بالاتری پر گہرا یقین رکھتے تھے۔ قانون کی نگاہ میں وہ اپنی ذات اور اسلامی حکومت کے ایک عام شہری کو مساوی قرار دیتے تھے خواہ وہ شہری مسلمان ہو یا غیر مسلم ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اور حضرت اُبی بن کعب کے درمیان ایک معاملے میں اختلاف واقع ہو گیا۔ دونوں حضرات نے زیدؓ بن ثابت کو حکم بنایا۔ فریقین زیدؓ کے پاس حاضر ہوئے تو زیدؓ نے اٹھ کر حضرت عمرؓ کو اپنی جگہ بٹھانا چاہا مگر حضرت عمرؓ نے یہ گوارا نہ فرمایا اور فریق مخالف حضرت ابی کے ساتھ بیٹھے پھر حضرت اُبی نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور حضرت عمرؓ نے دعوے سے انکار کیا۔ قاعدہ کے مطابق حضرت زید کو حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہیے تھی۔ مگر انہوں نے قسم لینے میں تامّل کیا حضرت عمر نے از خود قسم کھائی اور اس مجلس کے خاتمے پر کہا" زید قاضی ہونے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک کہ عمرؓ اور ایک عام مسلمان ان کے نزدیک برابر نہ ہو۔

جبلہ بن الایہم غسانی شام کا مشہور رئیس مسلمان ہو گیا حج کے موقعہ پر طواف کعبہ میں اس کی چادر کا ایک گوشہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا۔ جبلہ نے طیش میں آکر اس غریب کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا۔ اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ غصہ کی حالت میں حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اس آدمی کے گستاخانہ رویے کی شکایت کی۔ آپ نے کہا۔ تم نے جو کچھ کیا اس کی سزا پائی۔ وہ حیران ہوا اور کہنے لگا۔ ہم اس مرتبہ کے لوگ ہیں کہ کوئی ہماری شان میں گستاخی کرے تو اُسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عمر نے جواب دیا،

جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا" اس نے کہا۔ اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں بلند و پست کی کچھ تمیز نہیں تو میں اسلام سے باز آیا۔ غرض وہ چھپ کر قسطنطنیہ چلا گیا لیکن حضرت عمرؓ نے قانون کی بالاتری کے تصور کو ذرا ٹھیس نہ لگنے دی۔

حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے محمد نے ایک قبطی کو تازیانے مارے اور ساتھ ہی کہا۔

لے میں بڑوں کی اولاد ہوں" حضرت عمرو بن العاص نے قبطی کو قید کر دیا کہ کہیں وہ حضرت عمرؓ سے جاکر شکایت نہ کر دے لیکن جب وہ رہا ہوا تو سیدھا مدینہ پہنچا اور حضرت عمر سے شکایت کی آپ نے فوراً حضرت عمرو بن العاص اور ان کے فرزند کو مصر سے مدینہ بلوایا اور مجلس قصاص طلب کی جب دونوں باپ بیٹے سامنے آئے تو آپ نے بلند آواز سے کہا۔ قبطی کہاں ہے؟ جب وہ آگے آیا تو آپ نے اُسے کہا۔ لے یہ درہ اور بڑوں کی اولاد کو مار" قبطی نے محمد کو درے مارنے شروع کئے وہ درے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمر کہتے جاتے تھے "مار بڑوں کی اولاد کو" جب قبطی حضرت عمرؓ کو درہ واپس کرنے لگا تو آپ نے فرمایا "عمرو کی چندیا پر بھی مار! خدا کی قسم اس کا بیٹا تجھے ہرگز نہ مارتا اگر اسے باپ کا گھمنڈ نہ ہوتا لیکن قبطی نے کہا۔

امیر المومنین! جس نے مجھے مارا تھا میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔ حضرت عمرؓ نے غضب ناک لہجے میں کہا "عمروؓ! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا ہے ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا۔

حضرت عمرؓ کو عدل و انصاف اور قانون کی بالاتری قائم کرنے کی اس قدر فکر تھی کہ آپ جب قاضی مقرر کرتے تو اُسے تفصیل سے اس کی ذمہ داریوں کے علاوہ عدل کے تقاضوں سے آگاہ فرماتے تھے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ان چند اکابر صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے کتاب و سنت کا علم حاصل کیا تھا حضرت عمرؓ کے زمانے میں بصرہ کی قضاء کا منصب بھی ان کے سپرد تھا اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے انہیں جو خط لکھا وہ دستور ریاست اور فیصلہ جات میں فصل الخطاب کے درجہ پر تسلیم کیا جاتا ہے یہ خط "کتاب سیاست وقضایا دطریق حکومت" کے نام سے بھی مشہور ہے آپ نے لکھا کہ:۔

پیش آمدہ مقدمات میں صحیح فیصلہ قرآن کا مقرر کردہ فرض اور سنت نبوی کا قابل تمسک فریضہ ہے اس طریق سے کہ:۔

(۱) دوران سماعت میں مقدمہ پر خوب غور کرو۔

(۲) جو فیصلہ نافذ نہ ہو پائے اس کا حکم بے معنی ہے۔

(۳) اہل مقدمہ میں برسر اجلاس کسی گروہ یا فرد کے ساتھ امتیازات مت رکھو جس سے مقتدر گروہ یا فرد تم سے اپنے بارے میں رعایت کا متوقع ہو جائے اور کم درجہ فرد یا فریق تمہاری طرف سے بے انصافی کا خوف دل میں بٹھائے۔

(۴) مدعی سے اس کے دعویٰ پر شہادت طلب کرو۔

(۵) اور مدعی کے انکار شہادت پر مدعا علیہ سے حلف لو۔

(۶) عدالت میں مسلمان اہل معاملہ کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنا جائز ہے مگر صلح میں جائز اور ناجائز کا امتیاز برقرار رہے۔

نظر ثانی

(۷) ہر ایک فیصلہ (تجویز) پر بعد میں نظر ثانی جائز ہے۔ اس لیے کہ صداقت ازلی ہے۔ اس کے خلاف قائم رہنے سے اس کی طرف رجوع بہتر ہے۔

(۸) ایسے مقدمات بھی پیش آسکتے ہیں جن میں فی الوقت کتاب و سنت سے رہبری نہ ہو سکے۔

(ا) ان مقدمات کے لیے دوسرے نظائر سے مدد حاصل کرو۔

(ب) یا قیاس و اجتہاد سے کام لو۔

(۹) مدعی اپنا ثبوت یا گواہ پیش کرنے کے لیے تاریخ مہلت کی درخواست کرے تو اسے یہ موقع دیا جائے۔

(۱۰) اس کے بعد اگر وہ لیت و لعل کرے تو اس کے خلاف فیصلہ نافذ کر دو۔ اس طرح ظلم و ستم کے داغ مٹ جائیں گے۔ اور فریقین کے لیے فیصلہ پر اعتراض کا راستہ بند ہو جائیگا۔

(۱۱) شہادت میں ہر ایک برابر ہے مندرجہ ذیل افراد کے سوا کہ گواہ

(ا) سزا یافتہ ہو۔

(ب) پیشہ ور (گواہ) نہ ہو۔

(ج) ایسا موالی (غلام) نہ ہو جو اپنی غلامی کی نسبت اصل آقا کے سوا دوسروں سے

کرتا ہو (گویا وہ کاذب ہے)

(د) نہ وہ آزاد جو اپنی خاندانی نسبت اور خاندان یا فرد سے کرے (گویا وہ کاذب ہے)

یاد رہے کہ انسان کوئی فریب کیوں نہ کرے۔ خدا تعالیٰ حقیقت سے آگاہ اور انسانوں سے در پردہ برائیوں کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہے اگرچہ مقدمات کا فیصلہ ظاہری شہادت ہی پر موقوف ہوتا ہے۔

دوران سماعت میں عدالت کا رویہ

(۱۲) زنہار عدالت میں اہل معاملہ کے ساتھ ترش روئی سے پیش آؤ یا ان کا بیان سننے سے گھبرا جاؤ یا کسی فرد کے ساتھ سخت کلامی کرو۔

حاکم اگر برسر اجلاس انصاف و صداقت قائم کرنے کی کوشش کرے تو خدا کا انعام اور عوام میں اچھی شہرت حاصل کر سکتا ہے۔

بیت المال

بیت المال کو حضرت عمرؓ خدا اور عوام کی امانت سمجھتے تھے۔ اس میں قانون کے خلاف کچھ آنے اور اس میں سے قانون کے خلاف کچھ خرچ ہونے کو ہرگز جائز نہ رکھتے تھے۔ شخصی حکومت اور خلافت کے درمیان یہی بنیادی فرق تھا۔ کہ بادشاہ قومی خزانے کو ذاتی خزانے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں جبکہ خلیفہ اسے ایک مقدس امانت تصور کرتے ہوئے حق کے مطابق اس پر تصرف کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسیؓ سے پوچھا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر آپ مسلمانوں کی زمین سے ایک درہم بھی حق کے خلاف لیں یا حق کے خلاف خرچ کریں تو آپ بادشاہ ہیں نہ کہ خلیفہ۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنی مجلس میں کہا "خدا کی قسم! میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ اگر میں بادشاہ ہو گیا ہوں تو یہ بڑی سخت بات ہے۔

ہے۔ اس پر ایک صاحب نے کہا۔ اے امیر المومنین ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا وہ کیا؟ انہوں نے کہا "خلیفہ! کچھ نہیں لیتا مگر حق کے ساتھ اور کچھ خرچ نہیں کرتا مگر حق کے ساتھ آپ خدا کے فضل سے ایسے ہی ہیں۔ رہا بادشاہ تو وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے ایک سے بے جا وصول کرتا ہے اور دوسرے کو بے جا عطا کرتا ہے"

حضرت عمرؓ نے اپنی ایک تقریر میں بیت المال میں خلیفہ کے حق کی وضاحت یوں فرمائی۔

"میرے لیے اللہ کے مال میں سے اس کے سوا کچھ حلال نہیں ہے کہ ایک جوڑا کپڑا گرمی کے لیے اور ایک جوڑا جاڑے کے لیے اور قریش کے ایک اوسط آدمی کے برابر معاش اپنے گھر والوں کے لیے لوں پھر میں بس ایک آدمی ہوں مسلمانوں میں سے"

ایک اور تقریر میں فرمایا:۔

میں اس مال کے معاملے میں تین باتوں کے سوا کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا حق کے ساتھ لیا جائے حق کے مطابق دیا جائے اور باطل سے اس کو روکا جائے میرا تعلق تمہارے اس مال کے ساتھ وہی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے اگر میں محتاج نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا اور اگر محتاج ہوں تو معروف طریقے پر کھاؤں گا۔

ایک دفعہ بیمار پڑے لوگوں نے شہد تجویز کیا۔ بیت المال میں شہد موجود تھا۔ لیکن بلا اجازت نہیں لے سکتے تھے۔ مسجد نبوی میں جا کر لوگوں سے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ خزانہ عامرہ پر خلیفۂ وقت کو اتنا اختیار بھی نہیں۔

ایک مرتبہ مال غنیمت آیا۔ حضرت حفصہؓ (بنت حضرت عمرؓ) کو خبر ہوئی وہ حضرت عمرؓ کے پاس آئیں اور کہا امیر المومنین! اس میں سے میرا حق مجھ کو عنایت کیجیے کیونکہ میں ذوی القربیٰ میں سے ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا! تیرا حق میرے خاص مال میں سے ہے لیکن یہ غنیمت کا مال ہے وہ بیچاری واپس چلی گئیں۔

آزادیٔ رائے

حضرت عمرؓ نے عوام کو تنقید اور اظہار رائے کی کامل آزادی دے رکھی تھی۔ آپ نے اپنے اور عوام کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل نہ رہنے دی، آپ اہل حل وعقد سے مشورہ کرتے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے اس کے علاوہ ہر روز پانچ وقت نماز باجماعت میں، ہر ہفتے جمعہ کے اجتماع میں، ہر سال عیدین میں اور حج کے موقع پر آپ قوم سے ملتے تھے۔ آپ کی رہائش عوام کے درمیان تھی اور مکان پر کسی حاجب و دربان کے بغیر ہر شخص ان سے مل سکتا تھا۔ آپ بازاروں اور گلیوں میں کسی حفاظتی دستے کے بغیر آزادانہ طور پر عوام کے درمیان گھومتے پھرتے تھے۔ اور ہر موقع پر ہر شخص آپ پر تنقید کر سکتا تھا۔ آپ نے لوگوں کو تنقید کی کس قدر آزادی دے رکھی تھی؟

اس کی مثالوں سے کتابیں بھری پڑی۔ ایک موقع پر حضرت سلمانؓ نے ان سے محاسبہ کیا کہ سب کے حصے میں مال غنیمت سے حاصل ہونے والی ایک ایک چادر آئی ہے۔ آپ نے دو چادریں کیسے لے لیں؟ حضرت عمرؓ نے اسی وقت اپنے بیٹے عبداللہ کی شہادت پیش کی کہ دوسری چادر انہوں نے اپنے والد کو مستعار دے دی ہے۔

ایک دفعہ آپ نے لوگوں سے پوچھا "اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کر لوں تو تم کیا کرو گے؟ حضرت بشر بن سعد نے کہا۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کر دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، تب تو تم کام کے لوگ ہو۔

نظام احتساب

کسی مملکت کی داخلہ پالیسی کے کامیاب ہونے کا انحصار بڑی حد تک ان سرکاری کارکنوں کی صلاحیت اور کردار پر بھی ہے جو نظم مملکت کو چلاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ اس معاملے میں خاص طور پر احتیاط برتتے تھے۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ جب کسی شخص کو کوئی منصب عطا فرماتے اس کو ایک فرمان عطا کرتے جس میں اس کی تقرری، اختیارات اور فرائض کا ذکر ہوتا تھا اس

کے ساتھ بعض مہاجرین وانصار کی گواہی ثبت کی جاتی یہ عہدیدار جس مقام پر جاتا تمام لوگوں کو جمع کر کے یہ فرمان سناتا۔ جس کی وجہ سے لوگ اس کے اختیارات کی حد سے آگاہ ہو جاتے اور اگر وہ اپنے اختیارات کی حد سے آگاہ ہو جاتے اور اگر وہ اپنے اختیارات کی حد سے آگے قدم بڑھاتا تو لوگ اس کا محاسبہ کرتے۔

حضرت عمرؓ نے جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کا صوبہ دار مقرر کیا تو آپ نے باشندگان بصرہ کو خط کے ذریعے اس تقرری کی یوں اطلاع دی۔

میں نے ابوموسیٰ کو تم پر صوبہ دار مقرر کیا ہے اور انہیں ان امور پر پابند کر دیا ہے کہ:۔

(۱) کمزوروں کی دادرسی

(۲) تمہارے دشمنوں سے مقابلہ

(۳) تمہاری تکلیفوں میں کفالت

(۴) اموال غنیمت کی نگرانی اور تقسیم۔

(۵) اور تم سب لوگوں کی صحیح راہنمائی۔

اس سلسلے میں دوسرا مکتوب وہ ہے جو آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی رہنمائی کے لیے تحریر کیا۔

(۱) واضح ہو کہ عوام اپنے بادشاہ سے دور رہتے ہیں۔ خدا کی پناہ اگر میں اور آپ ایسی کورانہ روش اور کینہ توزی پر گامزن ہوں (جس سے عوام ہم سے دور رہیں)

(۲) روزمرہ عدالت کیجیے اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے ہو۔

(۳) اگر بیک وقت دو ایسے امر ہوں کہ ایک میں عاقبت اور دوسرے میں دنیا کا سود و بہبود ہے تو عاقبت کو ترجیح دیجیے۔ دنیا فانی ہے اور عاقبت کو دوام حاصل ہے۔

(۴) بدکردار لوگوں پر پوری نگرانی رکھیے۔

(۵) مسلمان مریضوں کی عیادت میں کوتاہی نہ کیجیے۔

(۶) ان کے جنازہ میں شرکت کیجیے۔

(۷) عوام کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھیے اور ان کے معاملات میں ذاتی طور پر بھی دلچسپی لیتے رہیے آپ بھی تو ان ہی میں سے ایک فرد ہیں۔ البتہ ان کے مقابلہ میں آپ کی ذمہ داری کہیں زیادہ ہے۔

(۸) اے ابو موسیٰ! مجھے آپ اور آپ کے اہل بیت کی عوام کے مقابلہ میں خوش لباسی پر تکلف کھانوں اور اعلیٰ سواری کی اطلاع ملی ہے۔ اس سے بچتے رہیے۔ کہ مویشی کی مانند ہری ہری دوب سے پیٹ بھرتے رہنا خود کو فربہ بنانا ہے اور فربہی کا نتیجہ آخر میں برُا ہوتا ہے۔

(۹) حاکم کی کج روی کے اثر سے رعیت بھی اسی قسم کی ہو جاتی ہے۔ بدبخت ہے وہ حاکم جس کی وجہ سے عوام بدبخت ہو جائیں۔

عمر فاروقؓ جب کسی عامل مقرر کرتے تو اس سے عہد لیتے تھے کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا۔ باریک کپڑے نہ پہنے گا۔ چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا۔ دروازے پر دربان نہ رکھے گا اور اہلِ حاجت کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا۔

ہر عاملوں کے مال اور اسباب اور آمدنی پر بھی کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ اگرچہ سلطنت بہت وسیع تھی اور ذرائع آمدورفت تیز رفتار نہ تھے پھر بھی آپ اپنی مملکت کے گوشے گوشے کی پل پل کی خبر سے آگاہ رہتے تھے۔ اور آپ کو جونہی کسی عامل کے انحراف کی خبر ملتی۔ آپ فوراً تحقیقات شروع کر دیتے اور پھر ان کی گرفت سے کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بچ نہیں سکتی تھی اس سلسلہ میں حضرت محمد بن مسلمہؓ آپ کے احکامات کی بجاآوری کے لیے ہمہ تن مستعد رہتے تھے۔

اگر عہدیداروں کے انتخاب تقرر اور احتساب کے معاملے میں غفلت برتی جاتی تو اس عادلانہ نظام کا قیام ممکن ہی نہیں تھا۔ جو حضرت عمرؓ کے پیش نظر تھا۔ اسلامی حکومت کے عمال کے بنیادی فرائض کیا ہیں؟ فاروق اعظم نے ایک موقع پر عمال سے مخاطب ہو کر ان فرائض کی تصریح یوں کی۔

میں تم لوگوں کو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے عامل مقرر نہیں کرتا کہ تم ان کے بالوں اور کھالوں کے مالک بن جاؤ۔ بلکہ میں اس لیے تمہیں مقرر کرتا ہوں کہ تم نماز قائم کرو۔ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور عدل کے ساتھ ان کے حقوق تقسیم کرو۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے برسرِ عام اعلان کیا کہ میں نے اپنے عاملوں کو اس لیے مقرر نہیں کیا کہ وہ تم لوگوں کو پیٹیں اور تمہارے مال چھینیں بلکہ اس لیے مقرر کیا ہے کہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں جس شخص کے ساتھ اس کے خلاف عمل کیا گیا ہو وہ میرے پاس شکایت لائے خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا اس پر حضرت عمرو بن العاص گورنر مصر نے کہا۔ اگر کوئی شخص مسلمانوں کا والی ہو اور تادیب کی غرض سے کسی کو مارے تو کیا آپ اس کا بدلہ لیں گے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا" ہاں خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ لیتے ہوئے دیکھا ہے۔"

ایک دفعہ حج کے موقع پر حضرت عمرؓ نے تمام صوبیداروں کو طلب کیا اور مجمع عام میں کھڑے ہو کر کہا کہ ان لوگوں کے خلاف جس شخص کو کسی ظلم کی شکایت ہو وہ پیش کرے۔ پورے مجمع میں صرف ایک شخص اٹھا اور اس نے حضرت عمروؓ بن العاص کی شکایت کی کہ انہوں نے ناروا طور پر مجھے سو کوڑے لگوائے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اٹھو اور ان سے بدلہ لے لو عمرو بن العاص نے احتجاج کیا کہ آپ صوبہ داروں پر یہ دروازہ نہ کھولیں۔ مگر آپؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے آپ سے بدلہ لیتے دیکھا ہے۔ اے شخص اٹھ اور اپنا بدلہ لے لے۔ آخر کار حضرت عمرو بن العاص کو ہر کوڑے کے بدلے دو اشرفیاں دے کر جان چھڑانا پڑی۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بازار میں گشت کر رہے تھے۔ کہ ایک شخص نے کہا عمر کیا عاملوں کے لیے چند قواعد مقرر کرنے سے تم عذاب الٰہی سے بچ جاؤ گے تم کو یہ خبر ہے کہ عیاضؓ بن غنم جو مصر کا والی ہے، باریک کپڑے پہنتا ہے اور اس کے دروازے پر دربان مقرر ہے حضرت عمرؓ نے اسی حال میں انہیں مدینہ طلب کر لیا۔ اور باریک کپڑے کا کرتہ اتار کر کمبل کا کرتہ پہنایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں لے جا کر چراؤ۔ عیاض متامل ہوئے تو آپ نے فرمایا تجھے

اس سے عار کیوں ہے تیرے باپ کا نام غنم اسی لیے پڑا تھا کہ وہ بکریاں چراتا تھا عیاض نے دل سے توبہ کی اور جب تک وہ زندہ رہے۔ اپنے فرائض نہایت خوبی سے سرانجام دیتے رہے۔

رواداری

عمر فاروق کی حکمت عملی کا ایک پہلو آپ کی غیر مسلموں سے رواداری سے متعلق تھا۔ اسلامی ریاست میں مقیم غیر مسلم رعایا کے حقوق بالکل ایسے ہی قرار دیئے گئے جیسے کہ مسلمان رعایا کے تھے۔ مذہبی امور میں ان کو پوری آزادی دی گئی ان کی عزت و آبرو کا احترام کیا گیا۔ اسلامی قانون میں ذمی کی جان بھی اتنی ہی محترم تھی جتنی مسلمان کی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں غیر مسلموں سے جتنے معاہدے ہوئے ان سب میں انہیں تمام بنیادی حقوق کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔ آپ نے اس بات کا بطور خاص خیال رکھا کہ معاہدے کی کسی شق کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ آپ نے باشندگان ایلیا (بیت المقدس) کو مقام جابیہ پر امان دی۔ امان نامہ میں بیت المقدس کے علاوہ اس کی نواحی بستیوں کے لیے ایک ہی تحریر" امان نامہ لد" پر اکتفا فرمایا اس امان نامہ کی دفعات حسب ذیل تھیں۔

(۱) ان کے اموال، جانوں، عبادت گاہوں، صلیب، مریض و توانا۔ ہر ایک شے سے ہرگز تعرض نہ کیا جائے گا۔

(۲) گرجوں کے لیے رعایت یہ ہے کہ نہ وہ مسمار کئے جائیں گے نہ ان کا مرتبہ کم کیا جائے گا نہ ان کے اندر اور باہر سے کوئی چیز دور کی جائے گی۔ ان کی صلیب کے طول و عرض اور نقش و نگار سے بھی کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔

(۳) یہ مراعات ان کے ساتھ ان کے بھلے برے دونوں قسم کے حلیفوں کے لیے بھی ہیں۔

(۴) ان کے اموال بھی دخل اندازی سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(۵) ان کے دینی اعمال سے بھی مواخذہ نہ ہو گا۔

(۶) ان سے بلاوجہ پرستش ہو گی نہ ضرر رسانی ہو گی۔

(۷) اور ایلیا میں ان کے جوار میں کسی یہودی کو بھی آباد نہ کیا جائے گا۔

اس تحریر پر اللہ، اس کے رسول مکرم، خلفاء اور مومنین سب کی ضمانت ہے بشرطیکہ وہ طے شدہ جزیہ ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں جزیہ اصل میں وہ معمولی سی رقم تھی جو غیر مسلموں کی حفاظت کے بدلے ان سے لی جاتی تھی۔ اسی بنا پر غیر مسلم فوجی خدمات سے بھی مستثنیٰ تھے۔ یہ رقم زکوٰۃ سے بہت کم تھی اس کے باوجود آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ جزیہ کی وصولی کے سلسلہ میں سختی نہ کی جائے۔ شام کے سفر میں آپ نے دیکھا کہ آپ کے عامل جزیہ وصول کرنے کے لیے غیر مسلموں کو سزا دے رہے ہیں تو آپ نے فرمایا۔ ان کو تکلیف نہ دو۔ اگر تم انہیں عذاب دوگے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے گا۔

آپ جزیہ کی رقم اس وقت تک بیت المال میں داخل نہ فرماتے جب تک آپ کو یقین نہ ہو جائے کہ اس کی وصولی میں سختی نہیں کی گئی۔ آپ اس سلسلے میں اس قدر فکرمند تھے کہ ایک دفعہ آپ نے ایک ضعیف العمر آدمی کو بھیک مانگتے دیکھا۔ آپ نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ جزیہ ادا کرنے کے لیے بھیک مانگ رہا ہوں اس پر آپ نے نہ صرف اس کا جزیہ معاف کر دیا بلکہ اس کے لیے وظیفہ مقرر کرکے افسر خزانہ کو لکھا۔

خدا کی قسم! یہ ہرگز انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو رسوا کریں۔

جزیہ کی وصولی میں ایک اور احتیاط کی جاتی تھی۔ اگر کہیں جزیہ کی وصولی کے بعد مسلمانوں کو مفتوحہ علاقہ خالی کرنا پڑا تو جزیہ کی رقم واپس کر دی گئی۔ مثلاً معرکہ یرموک سے پہلے اسلامی فوج نے حمص وغیرہ مفتوحہ علاقے نازک حالات کی وجہ سے خالی کر دیئے تو حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے جزیہ کی تمام رقم واپس کر دی۔ یہی وہ حسن سلوک تھا جس کی بدولت غیر مسلموں نے اپنے ہم مذہبوں کے لیے اپنے شہر کے دروازے بند کر دیئے مسلمان حکمرانوں کو اس دعا کے ساتھ روتے ہوئے رخصت کیا کہ خدا انہیں دوبارہ لائے غیر مسلموں کے بارے میں یہی وہ رویہ تھا جس نے مسلمانوں کے دشمن کیمپ میں اپنا ہمنوا عنصر یا حلقہ اثر (Lobby) پیدا کیا۔ غیر مسلموں نے اپنی ہی ہم مذہب حکومتوں کے خلاف نہایت نازک حالات میں بڑے خلوص اور دانشمندی سے مسلمان افواج کی بے مثال خدمات سرانجام دیں۔

رعایا پروری

حضرت عمرؓ کی حکمت عملی کا ایک اہم نکتہ رعایا کی خدمت اور اس کی فلاح بہبود کی مسلسل کوشش تھا۔ اس اعتبار سے عہد فاروقی کو جدید اصطلاح میں ایک فلاحی مملکت (WEL FARE STATE) کا بہترین نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔ آپ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ رعایا کا کوئی فرد اپنے آپ کو بے آسرا اور بے سہارا محسوس نہ کرے۔ کسی کو عدم تحفظ کا احساس نہ ہو، کوئی مستقبل کے بارے میں فکرمند نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے فاروق اعظم نے اپنے اعمال کو بھی سخت ہدایات دے رکھی تھیں۔ اس کے باوجود آپ مطمئن نہیں تھے۔ ہر نماز کے بعد صحن مسجد میں لوگوں کی فریاد رسی کے لیے بیٹھ جاتے راتوں کو مدینہ کی گلیوں میں عوام کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے گھومتے رہتے۔ سفر کے دوران راہ گیروں سے حالات دریافت کرتے بیرونی اضلاع سے جو سرکاری وفد یا قاصد آتے ان سے حالات معلوم کرتے۔ اس بارے میں آپ کا احساس اتنا شدید تھا۔ کہ آپ نے ایک موقع پر فرمایا۔

"دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی اگر ہلاک ہو جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا۔"

ایک مرتبہ آپ دارالخلافہ واپس آرہے تھے کہ دوران سفر راہ میں ایک خیمہ دیکھا۔ سواری سے اتر کر خیمہ کے قریب گئے ایک بڑھیا نظر آئی۔ اس سے پوچھا عمرؓ کا کچھ حال معلوم ہے؟ اس نے کہا" ہاں شام سے روانہ ہو چکا ہے لیکن خدا اس کو غارت کرے۔ آج تک مجھ کو اس کے ہاں سے ایک حبہ بھی نہیں ملا۔" حضرت عمر نے کہا" اتنی دور کا حال عمرؓ کو کیونکر معلوم ہو سکتا ہے؟ "بولی" اس کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو خلافت کیوں کرتا ہے" حضرت عمرؓ کو سخت رقت ہوئی اور بے اختیار رو پڑے۔

ایک قافلہ مدینہ میں آیا اور شہر سے باہر اتر پڑا۔ اس کی خبر گیری کے لیے آپؓ تشریف لے گئے۔ پہرہ دیتے پھرتے تھے۔ کہ ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ادھر متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ ایک شیر خوار بچہ ماں کی گود میں پڑا روتا ہے۔ ماں کو تاکید کی کہ بچے کو بہلائے جب

اس نے لیت ولعل کی تو آپ نے غصہ میں آ کر فرمایا۔ "تو بڑی بے رحم ماں ہے"۔ اس نے کہا تم کو اصل حقیقت معلوم نہیں خواہ مخواہ مجھ کو کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دیا ہے۔ کہ بچے جب تک دودھ نہ چھوڑیں۔ بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے میں اس غرض سے اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ اس وجہ سے روتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پشیمان ہو کر کہا ہائے عمرؓ! تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہو گا" اسی دن اعلان کر دیا کہ بچے جس دن پیدا ہوں اسی دن سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔"

ایک دفعہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے۔ پاس جا کر کہا" دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ اس نے کہا" جنگ موتہ میں میرا دایاں ہاتھ جاتا رہا حضرت عمرؓ کا دل بھر آیا اور اس کے برابر بیٹھ کر رو کر کہنے لگے۔ افسوس تم کو وضو کون کراتا ہو گا؟ تمہارے سر کو دھوتا ہو گا؟ تمہیں کپڑے کون پہناتا ہو گا؟ پھر ایک نوکر مقرر کر دیا اور اس کے لیے تمام ضروری چیزیں خود مہیا کر دیں۔

ملکی نظم و نسق

ان اصولوں کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ایسی مملکت جس کے پیش نظر عالمی امن عدل و انصاف کی ترویج، عوامی فلاح و بہبود، سماجی ترقی کا پروگرام ہو وہ ان اصولوں سے کسی طرح صرف نظر نہیں کر سکتی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی اصول یا نظریہ خواہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کی پشت پر سیاسی قوت نہ ہو۔ یہ سیاسی قوت ایک مرکز کا تقاضا کرتی ہے جہاں بنیادی اصولوں کے مطابق ایک اجتماعی نظام عملاً قائم کر کے دکھایا جائے جس کے نتیجے میں عوام عدل، امن اور خوشحالی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں صرف اسی صورت میں عوام اپنے نظریہ حیات اور اس پر قائم ہونے والے سیاسی و سماجی ڈھانچے کے تحفظ، بقا اور استحکام کے لیے سینہ سپر ہو سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس لیے آپ نے اپنی خارجہ سیاست کو داخلہ سیاست سے مربوط کر کے ایک عادلانہ اجتماعی نظام قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اس کے لیے

نظم ونسق کا ایک مضبوط اور مربوط ڈھانچہ ترتیب دیا۔ اس کے بعض اجزا یا شعبوں کا تعارف حسب ذیل ہے۔

مجلسِ شوریٰ

عہدِ فاروقی میں اسلامی ریاست کے تمام اہم امور کی سر انجام دہی مجلسِ شوریٰ جسے عرف عام میں پارلیمنٹ یا مجلس مشاورت کہہ سکتے ہیں مملکت کا سب سے بڑا اور ذمہ دار ادارہ تھا۔ اس میں مہاجرین و انصار کے وہ ممتاز صحابہ شامل تھے جو تدبر اور معاملہ فہمی کے علاوہ تقویٰ میں یکتائے زمانہ تھے خلیفہ دوم معاملہ کے تمام پہلو مجلسِ شوریٰ کے سامنے رکھتے تھے۔ اور آزادانہ بحث کے بعد تمام معاملات طے پاتے تھے۔

صوبائی نظام

عمر فاروق نے انتظامی سہولت کے پیشِ نظر تمام ملک کو گیارہ صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا ہر صوبے کا ایک گورنر یا صوبہ دار ہوگا۔ جسے اس وقت عامل یا والی کہا جاتا تھا بعض اوقات گورنر ہی فوجوں کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ صوبے میں میر منشی، کلکٹر، قاضی، افسر خزانہ اور پولیس افسر رکھے جاتے تھے۔ ہر صوبہ مختلف اضلاع میں بٹا ہوا تھا۔ اور ہر ضلع میں ایک کلکٹر، افسر خزانہ اور قاضی ہوتا تھا۔ ان احکام کا تقرر بڑے مشورے اور غور و فکر کے بعد کیا جاتا تھا۔ ان کے فرائض واضح تھے۔ اور ان کی سرگرمیوں کا محاسبہ ہوتا تھا۔

عدلیہ

شروع شروع میں گورنری، عدالت اور فوج کی امارت ایک ہی شخص کے پاس ہوتی تھی۔ بعد میں آپ نے انتظام میں سہولت کی غرض سے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ ایک خود مختار شعبہ کے طور پر قائم کر دیا۔ عہدِ فاروقی میں انصاف ارزاں اور سہل الحصول تھا۔ قاضی مسجد میں مقدمات کی سماعت کرتے اور بلا تاخیر فیصلے نافذ کرتے تھے۔ آپ نے قاضیوں کو حکم دے

رکھا تھا کہ وہ ہر حال میں قانون کی بالا تری قائم کریں۔ رشوت کے سدباب کے لیے آپ نے قاضیوں کی معقول تنخواہیں مقرر کیں اور ان لوگوں کو اس منصب پر مقرر کیا جاتا جو علم، تقویٰ امانت اور دیانت میں برگزیدہ ہوتے تھے۔ عدلیہ کی امداد کے لیے ایک الگ محکمہ افتا قائم کیا جس میں اعلیٰ درجے کے فقیہہ یا قانون دان رکھے جاتے تھے۔ یہ لوگ بلا معاوضہ لوگوں کو قانون سے آگاہ کرتے تھے۔

مالیات

آپ نے اسلامی معاشرے اور ریاست کی بڑھتی ہوئی مالی ضروریات اور معاشی حالت کی بہتری کے لیے بیت المال پر خاص توجہ صرف کی تاکہ تنخواہوں اور وظیفوں کی ادائیگی میں کسی قسم کا خلل پیدا نہ ہو سکے۔ مدینہ میں مرکزی بیت المال قائم کیا جس کے تحت ہر صوبے میں صوبائی بیت المال قائم کیے گئے۔ ان خزانوں میں دیانتدار افسران خزانہ مقرر کیے گئے۔ آمد و خرچ اور باقاعدہ حساب کتاب کے اصول وضع کیے گئے۔ بیت المال کی آمدنی خمس جزیہ، خراج، زکوٰۃ، عشر، نیئے، تجارتی محصولوں پر مشتمل ہوتی تھی اور خرچ میں ملازمین کی تنخواہیں، وظائف، رفاہ عامہ کے کام، قیدیوں کی کفالت دیگر دینی و ملکی ضرورتیں شامل تھیں مالیات ہی کے سلسلہ میں عمر فاروق نے عرب میں پہلی مرتبہ غیر ملکی سکے بند کر کے اپنی ٹکسالوں میں چاندی کے سکے ڈھلوانے شروع کیے۔ ان میں سے بعض پر الحمد للہ بعض پر "محمد رسول اللہ اور بعض پر لا الٰہ الا اللہ وحدہ" لکھا ہوتا تھا۔

زرعی نظام

عرب گلہ بان تھے، زراعت سے انہیں دلچسپی برائے نام تھی لیکن عہد فاروقی میں عراق مصر اور شام کی وسیع و عریض زمین قبضے میں آئی تو حضرت عمرؓ نے زرعی نظام کی اصلاح پر توجہ دی آپ نے زرعی اراضی اس بنا پر عربوں میں تقسیم نہ کیں کہ (۱) عرب زراعت پیشہ نہیں تھے (۲) فتوحات پر اثر پڑنے کا اندیشہ تھا (۳) سرحدوں کی حفاظت اور محتاجوں کی کفالت کے لیے

مال کی ضرورت تھی۔ اس لیے آپ نے زمینوں کی از سرِ نو پیمائش کرا کے انہیں خراج پر اصل کاشتکاروں کے حوالے کر دیا۔ پھر زرعی پیداوار میں اضافے کے لیے افتادہ اور غیر آباد زمینوں کو زیرِ کاشت لانے کی طرف توجہ کی۔ آب پاشی کے لیے نہریں کھدوائیں۔ کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے اور بیت المال کی ترقی و توسیع کے لیے آپ نے اور بھی مفید اقدامات کیے۔

نظامِ تعلیم

حضرت عمرؓ کے دور میں تعلیم کا مقصد اچھے مسلمان شہری پیدا کرنا تھا۔ جو قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں اس لیے اس نظامِ تعلیم میں قرآن و سنت کی تعلیم و تدریس کے علاوہ اخلاق و کردار کی تربیت پر خاص توجہ دی جاتی تھی حکومت کی طرف سے اس کام کے لیے جید قسم کے علماء مقرر کیے جاتے۔ جنہیں باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ درسگاہوں کے لیے الگ طور پر عمارتیں نہیں تھیں عام طور پر مسجدوں ہی میں تعلیم ہوتی تھی۔ عربی زبان وادب کے علاوہ فقہ، قرآت و کتابت نصاب میں شامل تھی۔ نیز فنونِ حرب وغیرہ کی عملی تعلیم کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔

رفاہِ عامہ

فاروقی دور میں اس محکمے کو خاص اہمیت حاصل تھی اس کے ذمے ملک بھر میں مسافر خانے، سڑکیں، دریاؤں پر پُل، شاہراہوں پر چوکیاں، سرائیں، پانی کے حوض اور تالاب آب پاشی کے لیے نہریں تعمیر کرنا تھا۔ دریائے دجلہ سے نہر ابوموسیٰ اور نہر معقل نکالی گئیں۔ علاوہ ازیں ۱۸ھ میں جہازوں کی آمد و رفت کے لیے دریائے نیل اور بحیرہ قلزم کو ملانے کے لیے نہر امیر المومنین کھودی گئی اس طرح انبار میں نہر سعد کھودی گئی۔ جسے بعد میں حجاج بن یوسف نے مکمل کیا۔

محکمہ ڈاک

حضرت عمرؓ نے ڈاک کے نظام کو باقاعدہ کیا۔ اسے "برید" کہا جاتا تھا۔ سرکاری مراسلات لانے اور لے جانے کے لیے تیز رفتار اونٹ اور گھوڑے مہیا کیے گئے۔

محکمہ پولیس

حضرت عمرؓ نے پہلی مرتبہ عرب میں یہ محکمہ قائم کیا اس کا نام "احداث" تھا۔ پولیس افسر کو "صاحب الاحداث" کہا جاتا تھا اس کے فرائض میں لوگوں کو کم تولنے سے روکنا شراب کی ممانعت کے حکم کی تعمیل کرانا، راستوں کی حفاظت کرنا اور جانوروں پر ظلم نہ ہونے دینا وغیرہ امور شامل تھا عادی مجرموں کو سزا دینے اور ان کے شر سے عوام کو محفوظ رکھنے کیلئے جیل خانے تعمیر کیے گئے۔

فوجی نظام

عہد فاروقی کے شروع میں باقاعدہ فوج نہیں رکھی جاتی تھی۔ لیکن دولت کی ریل پیل ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ کے مشورے سے فوج کا الگ محکمہ قائم کر دیا جہاں فوجی خدمات سرانجام دینے والے لوگوں کا ریکارڈ رکھا جانے لگا۔ آپ نے فوج کے دو حصے کیے ایک باقاعدہ جو میدان جنگ میں لڑتی اور سرحدوں کی حفاظت کرتی تھی۔ دوسری رضا کارانہ یا محفوظ فوج سب فوجیوں کو بلحاظ خدمات تنخواہ اور وظیفہ ملتا تھا۔ شہداء کے اہل وعیال کو بھی وظائف ملتے تھے۔ تنخواہ کے لحاظ سے بدری اصحاب رسولؐ کو سرفہرست رکھا گیا۔

حضرت عمرؓ نے متعدد علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کیں، فوجیوں کے لیے بارکیں اور گھوڑوں کے لیے اصطبل تعمیر کرائے، غلہ اور اجناس محفوظ کرنے کا انتظام بھی کیا فوجیوں کی صحت اور ان کی پیشہ وارانہ کارکردگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے فوجی مشقیں ہوتی

تھیں اور اس سلسلہ میں دیگر ضروری اقدامات عمل میں لائے گئے۔ فوج بھیجی جاتی تو اس کے ساتھ مخبر، خزانچی، محاسب، مترجم، قاضی، طبیب اور جراح بھی بھیجے جاتے تھے۔

اس طرح عمر فاروقؓ نے محض اپنی حکمت عملی کے بنیادی خدوخال کا اعلان ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس حکمت عملی کو بروئے کار لانے کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا نظم و نسق بھی قائم کیا اس نظم و نسق کے ڈھانچے میں انہوں نے اپنے ذاتی کردار سے روح بھی پھونک دی۔

حضرت ضیاء الامت
پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری
کی جملہ تصانیف
اور دیگر
اسلامی کتب
کا مرکز
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
داتا گنج بخش روڈ۔ الکریم مارکیٹ اردو بازار
لاہور فون: ۷۲۲۵۰۸۵
۷۲۲۱۹۵۳

فاروقِ اعظمؓ کی خارجہ پالیسی

تحریر: محمود احمد غازی

خاندانی پس منظر

ڈپلومیسی اور سفارت میں جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو مہارت، ملکہ اور بصیرت حاصل تھی۔ وہ کافی حد تک اُن کے خاندانی اثرات اور آبائی ورثہ کا نتیجہ تھی۔ مکہ کی شہری حکومت میں اُن کے خاندان بنی عدی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اور سفارت و مفاخرت کے دونوں اہم عہدے اسی خاندان کو حاصل تھے۔

یوں تو قریب قریب جزیرۂ عرب سارا ہی غیر ملکی اقتدار سے ہمیشہ محفوظ رہا لیکن خاص طور پر صوبہ حجاز کو ہمیشہ یہ فخر و شرف حاصل رہا کہ اس پر کبھی بھی کسی بیرونی اثر یا غیر ملکی اقتدار کی پرچھائیں تک نہیں پڑیں۔ متعدد ہمسایہ قوتوں کو اس پر قبضہ کرنے کی آرزو رہی اور انھوں نے اس سلسلہ میں کئی بار فوج کشی بھی کی لیکن انجام ہمیشہ ناکامی کی صورت میں ہوا اہل حجاز کے مختلف گروہ و قبائل ایک عرصہ تک ایک دوسرے سے علیحدہ لاتعلق اور نیم خانہ بدوش رہے۔ پہلے پہل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قبیلۂ قریش کے جد امجد قصی بن کلاب نے مکہ میں ایک شہری ریاست کی بناء ڈالی۔ قصیؔ نے شام میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ تہذیب و تمدن اور نظام حکومت و سیاست کے اصول اُس نے شام میں ہی سیکھے اور وطن واپس آکر ایک چھوٹی سی جمہوری شہری ریاست کی بنیاد ڈال دی۔

اِس شہری حکومت میں تقریباً ۱۵ عہدے تھے جو دس قبائل قریش میں مستقلاً منقسم تھے۔ ان عہدوں میں سے کچھ مذہبی، کچھ عدالتی اور کچھ سیاسی نوعیت کے تھے اور ہر قبیلہ ایک یا دو عہدے وراثتاً رکھتا تھا ان میں سقایہ (حجاج کے کھانے پینے کا انتظام) کے مذہبی عہدے مستقلاً خاندان بنی ہاشم کے پاس رہتے تھے ظہورِ اسلام کے وقت سقایہ کے منصب پر بنی ہاشم کی طرف سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم حضرت عباس بن عبدالمطلب فائز تھے۔ اشناق (خونبہا، مالی تاوان اور جرمانوں کا انتظام) ایک قسم کا عدالتی عہدہ تھا جو بنی تیم کے سپرد تھا۔ ظہورِ اسلام کے وقت جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس منصب پر فائز تھے فوجی عہدے تمام تر بنی مخزوم کے پاس ہوتے تھے جو مشہور مسلم فاتح اور جرنیل حضرت خالد بن ولید کا قبیلہ ہے۔ حضرت خالدؓ بھی ظہورِ اسلام کے وقت متعدد فوجی مناصب پر فائز تھے۔ سفارت اور مفاخرت کے عہدے سیاسی نوعیت کے حامل تھے اور خاندان بنی عدی کے سپرد رہتے تھے۔ آفتابِ رسالت جب طلوع ہُوا تو فاروقِ اعظم کی بھرپُور جوانی کا دَور تھا اور آپ سفارت اور مفاخرت کے دونوں عہدوں پر مامور تھے۔

دوسرے قبائل کی طرح حضرت عمرؓ کا قبیلہ بھی مدّت سے ان مناصب کا حامل چلا آتا تھا عدی جو حضرت عمرؓ کے جدِ امجد تھے۔ شعبۂ سفارت کے سربراہ تھے۔ جدید زبان میں وہ مکہ کی شہری ریاست، حکومت کے وزیرِ خارجہ تھے۔ اس لیے کہ اُس زمانہ کا منصب وزیرِ خارجہ سے ہی ملتا جلتا تھا۔ قبیلہ قریش کا جب بھی کسی دوسرے قبیلہ سے کوئی اختلاف ہوتا تھا یا کسی اور وجہ سے کسی سیاسی گفت وشنید کی ضرورت پیش آتی تھی تو عدی ہی اس کام کے لیے بھیجے جاتے تھے۔

سفارت کے علاوہ دوسرا اہم سیاسی منصب جو عدی کو حاصل تھا وہ مفاخرت ومنافرت میں ثالثی کا منصب تھا۔ عرب جاہلیہ میں رواج تھا کہ اگر دو افراد یا دو قبیلوں میں اس امر پر تکرار ہو جاتی کہ دونوں میں افضل کون ہے تو وہ ثالث کے سامنے اپنی افضلیت کو دلائل وشواہد سے ثابت کرتے تھے۔ ثالث فریقین کے دلائل سن کر پھر کسی ایک کے حق میں فیصلہ دیتا تھا۔ دلائل اور جوابی دلائل پر مشتمل یہ معرکے کبھی کبھی اس قدر طول پکڑ جاتے

کہ مہینوں جاری رہتے، معرکے جتنے شدید ہوتے ثالث کی ذمہ داری اسی قدر بڑھ جاتی ظاہر ہے کہ اس قسم کے معرکوں کا فیصلہ کرنے کے لیے نہ صرف سیاسی سوجھ بوجھ تدبر اور معاملہ فہمی درکار ہوتی تھی بلکہ فصاحت قوتِ تقریر، زورِ بیان اور زبان آوری بھی اس سلسلہ میں بعض اوقات بنیادی اہمیت اختیار کر جاتی تھی اس عہدہ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اس کو ایک نیم سیاسی نیم عدالتی عہدہ کہا جا سکتا ہے۔

عدی کے بعد یہ تمام مناصب نسلاً بعد نسلٍ ان کی اولاد میں چلتے رہے۔ حضرت عمرؓ کے دادا نفیل بن عبدالعزیٰ نے بھی اپنے اسلاف کی اعلیٰ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان کو اور ترقی دی۔ انہوں نے بہت سے اہم اور تاریخی جھگڑوں اور معرکوں کو اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور سفارتی صلاحیتوں سے نمٹا دیا۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد حضرت عبدالمطلب اور ابوسفیان کے والد حرب بن اُمیہ میں جب قریش کی سرداری اور علی الخصوص ریاستِ مکہ کی سربراہی کے مسئلہ پر مناقشت ہوئی تو اس اہم موقعہ پہ فاروقِ اعظم کے دادا نفیل ہی ثالثی کے منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے عبدالمطلب کے حق میں اپنا تاریخی فیصلہ صادر کیا۔

فاروقِ اعظمؓ کی ذاتی صلاحیتیں

نفیل کے بعد اُن کی اولاد میں جس ہستی نے اپنے خاندان کی ان دونوں صلاحیتوں کو جلا دے کر اَوجِ ثریا پہ پہنچایا وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ ہیں حضرت عمر کو قدرت سے مواقع بھی ایسے ملے کہ اُن کی یہ تمام خاندانی صلاحیتیں اور بھی چمک اٹھیں زمانہ جاہلیت میں اُن کو تجارت وسیاحت کے سلسلہ میں دنیائے قدیم کے بہت سے ممالک میں گھومنے پھرنے اور وہاں کے بادشاہوں اور حکمرانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا۔ ان سفروں اور میل ملاقاتوں نے اُن کے تجربات، سیاسی بصیرت سفارتی صلاحیتوں اور خارجی تعلقات کی مہارت میں چار چاند لگا دیے۔ فاروقِ اعظم کے ان سفروں کے بہت سے واقعات تاریخ نے محفوظ کیے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب "الفاروق" میں مشہور مؤرخ المسعودی

کی مروج الذہب کا درج ذیل حوالہ نقل کیا ہے جس سے فاروقِ اعظم کی سیاحتوں کی وسعت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ مروج الذہب میں المسعودی لکھتے ہیں۔

ولعمر بن الخطاب اخبار کثیرۃ فی اسفارہ فی الجاھلیۃ الی الشام والعراق مع کثیر من ملوک العرب والعجم، وقد اتینا علی مبسوطھا فی کتابنا اخبار الزمان والکتاب الاوسط۔

زمانہ جاہلیت میں حضرت عمرؓ کے شام اور عراق کے سفروں اور عرب وعجم کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ ان واقعات کو ہم نے اپنی کتابوں اخبار الزمان اور کتاب اوسط میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

سفارت ومفاخرت کا نسب دانی سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ اُس زمانہ کی قبائلی سیاست قبائل کے آپس کے تعلقات، افراد وقبائل میں مفاخرت اور اس طرح کے بہت سے مسائل میں نسبی کمتری اور برتری کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ علم الانساب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگوں کے موقع پر جب لوگ مبارز طلب کرتے تو اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کہ مقابلہ کرنے والا کوئی ایسا شخص ہو جو نسبی طور پر مبارزت طلب کرنے والے کے ہم پلہ ہو، نسبی اعتبار سے کم تر شخص سے لوگ میدان جنگ میں بھی مقابلہ کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ اور تو اور گھوڑوں اور اونٹوں تک کے نسب محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اور بسا اوقات اُن کے نسب کو انسانوں کے نسب کے برابر بلکہ اُن سے بڑھ کر اہمیت دی جاتی تھی۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مکہ کی شہری ریاست کے وزیرِ خارجہ کے لیے بڑا نساب ہونا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اس فن میں بھی حضرت عمرؓ کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔ نسب دانی کا فن بھی خاندانِ فاروقی میں وراثتاً چلا آتا تھا۔ شہرہ آفاق ادیب اور مورخ عثمان بن بحر الجاحظ کا بیان ہے کہ خود حضرت عمرؓ اُن کے والد خطاب اور دادا نفیل تینوں بڑے نساب تھے۔ اس لیے کہ ان سب کو اپنے اپنے وقتوں میں سفارت ومفاخرت کے منصب جلیل پر فائز ہونے کا موقعہ ملا جس کے لیے یہ علم بنیادی اہمیت رکھتا تھا خود حضرت عمرؓ نے انساب کا فن اپنے والد خطاب سے سیکھا وہ جب بھی علم الانساب پر کوئی گفتگو کرتے تو اپنے باپ

خطاب کی رائے کو حوالہ اور سند کے طور پر پیش کرتے۔
ان دونوں عہدوں کے لیے نسب دانی کے علاوہ بڑا خطیب ہونا بھی ضروری ہوتا تھا۔ فاروق اعظمؓ ان کے والد، دادا اور دوسرے خاندانی بزرگ تقریباً سبھی عرب کے بڑے بڑے خطباء تھے بلکہ فاروق اعظم کو تو تاریخ ادب عربی کے مورخین نے عربی زبان کے ممتاز ترین خطباء میں جگہ دی ہے جمہرۃ خطب العرب اور البیان والتبیین وغیرہ کتابوں میں فاروق اعظم کی بہت سی تقریریں لفظ بلفظ موجود ہیں جن میں آنجناب کی قوت تقریر اور زور خطابت کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔
فاروق اعظمؓ کی تقریریں سیاسی تقریروں کا بہترین نمونہ ہیں ان کو دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان سیاسی راہنما اور ایک مسلمان پارلیمنٹیرین کو کس قسم کی تقریریں کرنی چاہئیں۔
شامی عالم علی طنطاوی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی سیاسی لیڈر جو پارلیمانی تقریروں کا ماہر ہو اور یہ چاہے کہ کسی طرح اراکین پارلیمنٹ کو اپنا ہم خیال بنالے تو وہ حضرت عمرؓ کی ان تقریروں سے زیادہ نرم، بہتر اور عمدہ اسلوب اختیار نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نہ تو اپنی کسی تقریر میں کوئی بات خلاف واقعہ کہتے اور نہ اس طرح پیچ دار باتیں بناتے جس طرح بعض دھوکہ باز ڈپلومیٹ بنایا کرتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ دلائل، حقائق اور خلوص و دیانت کی قوت سے اپنی بات منوا لیتے فاروق اعظمؓ نے مختلف مواقع پر مجلس شوریٰ میں جو تقریریں کیں وہ اس امر کی کھلی شہادت ہیں۔
جہاں دوھیالی اعتبار سے جناب فاروقؓ کا تعلق بنی عدی سے تھا۔ جو سفارت و مفاخرت کے سیاسی اور ڈپلومیٹک مناصب کا حامل قبیلہ تھا، وہاں دوسری طرف آنجناب کا ننھیالی رشتہ بنی مخزوم سے تھا۔ یہ قبیلہ خاص طور پر فوجی صلاحیت کے لوگوں کے لیے مشہور تھا۔ اور قریش کی شہری ریاست ——— مکہ ——— میں ہر قسم کے جنگی مناصب اسی قبیلہ کے پاس ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے پرنانا مغیرہ جنگوں میں قریش کے فوجی امور کے نگران اعلیٰ ہوتے تھے وہی مختلف فوجی دستوں کا اہتمام و تنظیم کرتے، فوج کے مختلف

حصوں کے کمانڈر مقرر کرتے، پوری فوج کے سپہ سالار کا تقرر بھی وہی کرتے، کوئی اہم جنگ ہوتی تو خود ہی افواج قریش کی کمان کرتے اس اعتبار سے ان کا منصب موجودہ زمانے کے وزیر جنگ اور کمانڈر انچیف کا مجموعہ تھا۔ فاروق اعظمؓ کے یہ پرنانا مغیرہ معاملات حرب میں اس قدر ماہر اور صاحب بصیرت تھے کہ اُن کا لقب ہی صاحب الاعنہ پڑ گیا تھا عظیم مسلم فاتح اور سپہ سالار سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق بھی بنی مخزوم سے تھا اور وہ انہی مغیرہ کے پوتے تھے۔

قبولِ اسلام

ان خاندانی حالات اور اس تاریخی پس منظر میں فاروق اعظم کی سیاسی بصیرت، سفارتی مہارت اور فوجی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غالباً انہی تمام صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ سے آپ کو یہ فخر حاصل ہوا کہ خود حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہِ رب العزت میں آپ کا نام لے کر آپ کے قبولِ اسلام کی دعا کی جو مقبول ہوئی یہ فخر حضور علیہ السلام کے کسی اور صحابی کو حاصل نہیں ہوا کہ اس کا نام لے کر اُس کے ذریعہ تقویتِ اسلام اور شوکتِ اسلام کی دعا کی گئی ہو۔

فاروق اعظمؓ نے قبولِ اسلام کے ساتھ ہی اسلامی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہجرت سے قبل چونکہ اسلامی نظم حکومت و معاشرت ابھی عملاً قائم نہ ہوا تھا۔ اس لیے مکہ کی اسلامی سیاست میں حضرت عمرؓ کی سیاسی اور سفارتی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک قیادت میں اسلامی نظام حکومت عملاً قائم ہوگیا تو فاروق اعظم نے دوسرے اکابر صحابہ کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر حکومت کی حیثیت سے اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی کے کام میں حضور علیہ السلام کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر اہم موقعہ پر فاروق اعظمؓ کو ساتھ رکھتے اور مختلف پیش آمدہ معاملات میں اُن سے مشورہ فرماتے تھے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ حضور علیہ السلام

نے فاروق اعظمؓ کی کسی رائے کو مسترد فرمایا ہو۔
دینی معاملات میں فاروق اعظمؓ کی فطرت کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے سے ابا کرتی تھی جس کے کسی دُور دراز گوشے سے بھی مداہنت یا جاہلیت کے سامنے سپر اندازی کا شائبہ پیدا ہوتا ہو۔ اس کے برعکس جناب فاروق اپنی فطرت کے اعتبار سے ہر ایسے اقدام کو پسند کرتے تھے۔ جس سے دین کی شوکت اسلام کا غلبہ اہل ایمان کی برتری اور دنیا کے تمام کلموں پر اللہ کے کلمہ کی بلندی و رفعت ظاہر ہوتی ہو۔ آنجناب کی طبیعت کا یہ پہلو آپ کے بہت سے اقدامات میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ قبولِ اسلام کے فوراً بعد آپ نے جماعتِ صحابہ کو لے کر علی الاعلان کعبۃ اللہ میں نماز ادا کی اور اس طرح اللہ کے ذکر کو علیٰ رؤوس الاشہاد غیر اللہ کے ذکر سے بلند کیا۔
ہجرت کے بعد جنگِ بدر کے موقعہ پر جب حضور علیہ السلام نے جنگی قیدیوں کے بارے میں کبارِ صحابہ کی رائے طلب کی تو فاروقِ اعظم نے رائے دی کہ اسلام نے ہمارے اور ان قیدیوں کے درمیان سے سارے رشتے اور تعلقات ختم کر دیے ہیں۔ یہ لوگ جاہلی نظام کے سرغنے ہیں، اس لیے ہمیں ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیئے اور ہر شخص اپنے قریبی عزیز قیدی کو قتل کرے۔ فلاں شخص جو میرا عزیز ہے اس کو میرے حوالہ کر دیا جائے، میں اس کو قتل کر دوں گا۔ اسی طرح ہر قیدی کو اُس کے قریبی عزیز کے حوالہ کر دیا جائے تاکہ وہ اس کو قتل کر دے۔
یہی شدتِ مزاج اور جرأتِ طبع فاروقِ اعظمؓ کی خارجی سیاست میں بھی نمایاں رہی اور اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ اسلام کی برتری غیر اسلام پر اچھی طرح ظاہر ہو جائے۔ اور حکم خداوندی لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا اور لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون کا منشا بدرجۂ اتم پورا ہو جائے۔ فاروق اعظمؓ کے دورِ خلافت میں علی الخصوص اور بعد کے دور میں علی العموم خارجی سیاست اور بیرونی ممالک سے اسلامی حکومت کے تعلقات کے بارے میں جو پہلو ہر وقت سامنے رہتا تھا وہ اسلامی حکومت کے وقار اور شوکت کا پہلو تھا۔

فاروق اعظمؓ کے بہت سے واقعات سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے اس وقار اور شوکت کے لیے وہ بعض اوقات اپنی انتہائی زاہدانہ طبیعت کے خلاف بھی بعض اقدامات کی اجازت دے دیتے تھے۔ بیت المقدس کے معاہدہ پر گفتگو کرنے کے لیے جب وہ جا رہے تھے۔ اور شام سے گزر ہوا تو حدودِ شام پر گورنر شام حضرت معاویہ نے ان کا استقبال کیا۔ حضرت معاویہ نے عام اسلامی حکام کے برعکس نہایت ظاہری شان و شوکت اور آن بان کے ساتھ رہتے تھے۔

فاروق اعظمؓ نے اول اُن کی شان و شوکت کو دیکھ کر ٹوکا اور فرمایا کہ تم نے بھی یہ قیصر و کسریٰ کے طور طریقے اختیار کر لیے؟

امیر معاویہ نے جواب دیا۔" امیر المؤمنین! یہاں کے لوگ ان چیزوں کے بغیر سیدھے نہیں ہوتے۔ ان لوگوں پر اسلامی حکومت کا رعب و دبدبہ قائم کرنے کے لیے یہ سب طور طریقے ضروری ہیں۔ آپ نے اس دلیل کو قبول کر لیا اور پھر کوئی اعتراض نہ کیا لیکن جہاں تک خود آپ کی اپنی ذات کا تعلق ہے آپ ان باتوں کو دل سے ناپسند فرماتے تھے۔ یہاں سے آگے چل کر جب آپ بیت المقدس پہنچے اور مسلمان حکام نے آپ کے نہایت سادہ اور پرانے لباس اور معمولی سواری کو دیکھ کر عمدہ لباس اور بڑھیا سواری پیش کی تو انکار فرما دیا۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ اللہ نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی وجہ سے ہے اور یہی عزت ہمارے لیے کافی ہے۔

جاہلی حکومتوں پر اسلامی حکومت کی شوکت و برتری اور خلافتِ اسلامیہ کے رُعب اور وقار کی اہمیت اور اس بارہ میں صحابہ اکرام کے عام جذبات و تصورات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب بیت المقدس کے مسیحی باشندوں نے اسلامی افواج کی شمال مغربی کمان کے سربراہ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح کو شرط پیش کی کہ وہ بیت المقدس مسلمانوں کے سپرد کرنے کو تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ امیر المومنین عمرؓ بن الخطاب خود آن کر معاہدہ صلح کریں، انہی کو شہر کی کنجیاں پیش کی جائیں گی۔ مسیحیوں کی اس تجویز پر غور کرنے کے لیے حضرت عمرؓ نے شوریٰ طلب کی اور یہ مسئلہ ارکانِ شوریٰ کے سامنے رکھا۔

اس موقعہ پر بعض ارکان کی رائے تھی کہ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عزت و شوکت دنیا میں قائم فرمادی ہے اور کفر و جاہلیت کو اب یا تو دنیا سے ختم ہو جانا چاہیے یا اسلام کے ماتحت ہو کر رہنا ہے اس لیے اب مسلمان اس کے محتاج نہیں کہ ان کا امیر خود جا کر معاہدہ صلح پر دستخط کرے، ہمیں اس شرط کو مسترد کر دینا چاہیے، اس کے مسترد کرنے سے علمبردارانِ جاہلیت کی اور بھی حوصلہ شکنی ہوگی اور وہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ گو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ کے مشورہ سے بعض اہم تر فوائد و مصالح کی خاطر اس تجویز کو قبول نہ کیا لیکن اس سے عہدِ فاروقی میں عام پالیسی کے عام معاملات میں مسلمان رہنماؤں کے عام اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔

فاروقِ اعظمؓ کی اس جہریت اور اسلام کے لیے ان کی شوکت پسندی کو خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے حد پسند فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے بارہا فاروقِ اعظمؓ کی اس صفت پر اظہارِ پسندیدگی فرمایا۔

کفار نے مفاخرت و منافرت کے متعدد مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ اسلام کی طرف سے جوابدہی کے لیے حضرت عمرؓ ہی کو منتخب فرمایا۔ غزوۂ اُحد کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کے ہمراہ ایک پہاڑی پر اور ابوسفیان افواجِ کفر و شرک کے ساتھ ایک دُوسری قریبی پہاڑی پر موجود تھا تو اس نے آواز دے کر کہا۔

کیا تم میں محمدؐ ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جواب نہ دو، ابوسفیان نے پھر فرمایا جواب نہ دو۔ ابوسفیان نے تیسری مرتبہ پُوچھا کہ تم میں عمر ہیں؟ آپ نے پھر جواب دینے سے منع فرما دیا۔ تینوں مرتبہ اس طرف سے خاموشی کے بعد ابوسفیان نے کہا خدا کا شکر ہے یہ تینوں مر گئے،، یہاں حضرت عمرؓ کی طبیعت نے اُن کو خاموش نہ رہنے دیا۔ بولے۔

اے دشمنِ خدا، اللہ کا شکر ہے ہم تینوں زندہ ہیں۔ ابوسفیان کے ان مکالمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار بھی اسلامی جماعت میں فارُوقِ اعظمؓ کی حیثیت اور مرتبہ سے

پوری طرح باخبر تھے۔ اس کے بعد اہل اسلام اور اہل جاہلیت میں فخریہ مکالموں کا تبادلہ ہوا کفار کی طرف سے آنے والے ہر نعرہ کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاروقِ اعظم کو بتاتے جاتے تھے اور وہ کفار کو جواب دیتے تھے۔ ابوسفیان نے نعرہ لگایا۔ اعل ھبل ——— جاہلیتِ مکہ کا سب سے بڑا بت ——— تو اونچا رہ)

حضرت عمرؓ نے حضور علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق جواب دیا اللہ اعلی واجل (اللہ ہی سب سے برتر اور سب سے زیادہ باعزت ہے)

ابوسفیان نے کہا لنا العزی و لا عزی لکم (ہمارے پاس تو عزیٰ بھی ہے۔ اور تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں)

فاروق اعظم نے پھر حضور کی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔ اللہ مولانا و لا مولیٰ لکم (اللہ تعالیٰ ہمارا آقا و مولا ہے اور تمہارا کوئی آقا و مولا نہیں)

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد ابونعیم اصبہانی حلیۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف آپ ہی کو جواب دینے کے لیے منتخب فرمایا اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ آپ نہایت بہادر، جری اور بارعب تھے توحید کے نہایت ہی شدت سے علمبردار تھے اور دشمن کے سازوسامان اور اس کی عددی برتری کو پرکاہ کے برابر نہ سمجھتے تھے۔

فاروقِ اعظمؓ اور اسلامی سیاست، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی حیاتِ طیبہ میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں یوں تو فاروق اعظمؓ ہر موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے۔ لیکن خاص طور پہ صلح حدیبیہ کا واقعہ قابل ذکر ہے اس موقعہ پہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیاسی بالغ نظری اور سفارتی بصیرت کی درخشاں مثالیں سامنے آئیں۔

۶ھ میں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا ارادہ فرمایا اور چودہ سو صحابہ کے

ہمراہ بالکل غیر مسلح مکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ عرب کے عام دستور کے مطابق صرف تلواریں ساتھ تھیں اور وہ بھی نیاموں میں تھیں۔ قربانی کے جانور بھی قلادے پڑے ہوئے ساتھ تھے۔ مقام حدیبیہ میں پہنچ کر آپ نے قیام فرمایا۔ قریش کو بھی حضورؐ کی آمد کی اطلاع ہوئی اُن کو شبہ ہُوا کہ حضور علیہ السلام جنگ کے ارادے سے تشریف لائے ہیں لیکن جب اُن کو اپنے مخبروں کے ذریعہ معلوم ہُوا کہ مسلمانوں کے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ صرف تلواریں ہیں اور ہدی کے جانور ساتھ ہیں تو انہوں نے سوچا کہ اگر سیدھے سیدھے ٹھنڈے پیٹوں بلا روک ٹوک حضورؐ کو عمرہ کرنے کی اجازت دے دی۔

تو سارے عرب میں ہماری ہوا اکھڑ جائے گی اور کہا جائے گا کہ قریش نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ڈر سے مزاحمت نہیں کی اور یہ کہ اب مسلمانوں کی یہ حیثیت ہو گئی ہے کہ جب چاہیں بلا روک ٹوک بیت اللہ میں آسکتے ہیں ان خدشات کے پیشِ نظر کفارِ مکہ نے مسلمانوں کو عمرہ کی اجازت نہ دینے اور مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا اِدھر حضور علیہ السلام کو بھی اطلاعات مل گئیں کہ کفارِ مکہ شرارت پر آمادہ ہیں۔ آپؐ نے سفارتی سطح پر قریش سے رابطہ قائم کرکے مصالحت کی گفتگو کرنے کا ارادہ فرمایا اس اہم کام کے لیے آپ کی نگاہ انتخاب فاروقِ اعظمؓ پر پڑی اس موقعہ پر غالباً کوئی اور تو اس سعادت کے حصول کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تجویز ــــــ بلکہ حکم ــــــ کو فوراً قبول کر لیتا اور اسلامی سفیر کی حیثیت سے اُسی وقت مکہ روانہ ہو جاتا۔

لیکن فاروقِ اعظمؓ نے جن کی طبیعت میں جوش اور ہوش کا نہایت حسین توازن موجود تھا عرض کیا کہ اس سفارت پر میرا جانا قرینِ مصلحت نہیں مناسب ہو گا کہ حضرت عثمانؓ کو اس اہم کام پر بھیجا جائے۔

حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کی رائے سے کلی اتفاق کیا اور فی الفور حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیج دیا۔ دراصل فاروقِ اعظمؓ کی سیاسی بصیرت نے اس سفارت کے عمیق اثرات اور گہرے نتائج کو دُور دُور تک دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت گفتگوئے مصالحت کے سلسلے کسی ایسے شخص کا مکہ جانا مفید ہو گا۔ جس کے اعزہ و اقارب کی بڑی تعداد نہ صرف مکہ میں موجود

ہو بلکہ قریش کے اعلیٰ اور با اثر حلقوں میں بھی دخیل ہوتا کہ اُن کے اثر سے مکہ میں مسلمانوں کی لابی (LOBBY) مضبوط رہے اور خود دشمن کی اندرونی صفوں میں ایسے لوگ موجود رہیں جو اسلامی سفیر سے ہمدردی رکھنے والے ہوں اور اسلامی موقف کی حمایت کرنے کے لیے تیار ہوں تاکہ انجام کار میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہے۔

دُوسرے یہ کہ اُس وقت مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ اہل اسلام کی طرف سے گفتگو کے لیے جانے والا کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے جس کے بارے میں کفارِ مکہ کا تاثر یہ ہو کہ وہ لچک دار اور مصالحانہ طبیعت رکھتا ہے تاکہ وہ اُس سے لچک دار اور مصالحانہ انداز سے ہی گفتگو کریں۔ ان دونوں صفات پر حضرت عثمانؓ ہی پورے اُترتے تھے۔ اس کے برعکس حضرت عمرؓ کے نہ تو کوئی خاص رشتہ دار مکّے میں تھے۔ اور نہ ظاہر ہے کہ دُنیا اُن کو ایک لچک دار اور مصالحانہ طبیعت رکھنے والے فرد کی حیثیت سے جانتی تھی۔ اس سفارت پر اگر حضرت عمرؓ چلے جاتے تو ڈپلومیٹک گفتگو وہ یقیناً حضرت عثمانؓ سے بہتر کر لیتے لیکن اس سے وہ نتائج و فوائد حاصل نہ ہوتے جو بعد میں حاصل ہوئے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حضور رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جناب فاروقِ اعظم کی اس تجویز کو فوراً شرف قبولیّت بخشا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، جب اسلامی سفیر کی حیثیت سے مکہ تشریف لے گئے تو کسی نے یہ غلط خبر اُڑا دی کہ کفارِ قریش نے حضرت کو شہید کر دیا۔ یہ خبر سُن کر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو خونِ عثمانؓ کا قصاص ضرور لیا جائے گا۔ ابھی حضورؐ نے اپنے اِس ارادہ کا اعلان بھی نہ فرمایا تھا۔ کہ محض حالات کے ارتقاء سے جنابِ فاروق نے اندازہ لگا لیا کہ اب اسلامی سیاست جنگ کی متقاضی ہے اور اب جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ اسی خیال سے انہوں نے اپنے طور پر بیعت جہاد سے (جسے عام طور پر بیعتِ رضوان بھی کہا جاتا ہے جو آیت قرآنی:: لقد رضی اللّٰہ عن المؤمنین اذ یبا یعونک تحت الشجرۃ ...... سے ماخوذ ہے) قبل ہی جنگ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حدیبیہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ

کو بھیجا کہ فلاں انصاری سے جا کر گھوڑا لے آؤ۔ عبداللہ گھوڑا مانگنے اُس انصاری کی تلاش میں نکلے تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام صحابہ سے بیعتِ جہاد لے رہے ہیں۔ عبداللہ نے پہلے خود بیعت کی اور پھر جلدی سے لوٹے کہ باپ کو بتائیں کہ حضورؐ بیعتِ جہاد لے رہے ہیں۔ واپس آئے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ ہتھیار سجا رہے ہیں۔ عبداللہ نے ان کو اطلاع دی کہ حضورؐ بیعتِ جہاد لے رہے ہیں حضرت عمرؓ فوراً نکلے اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر جہاد کی بیعت کی۔

بعد میں جب معلوم ہُوا کہ شہادتِ عثمانؓ کی خبر غلط تھی تو جنگ کا امکان ختم اور مصالحت کے امکانات روشن ہوئے قریش کا ایک وفد سہیل بن عمرو کی سربراہی میں مذاکراتِ صلح کے لیے دربارِ نبوی میں حاضر ہُوا۔ اِدھر سے حضرت عمرؓ بھی اسلامی وفد کے ایک اہم رُکن کی حیثیت سے گفتگو میں شریک ہوئے۔ اُن کو اوّل اوّل معاہدہ صُلح کی بعض شرائط کے بارے میں اپنی مخصوص شدت پسندانہ افتادِ طبع کے پیشِ نظر کچھ تامل تھا۔ لیکن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ معاہدہ صُلح پر مسلمانوں کی طرف سے جن اکابر صحابہ نے دستخط کیے۔ اُن میں جناب فارُوقِ اعظمؓ بھی شامل تھے۔ دوسرے دستخط کرنے والوں میں حضرت ابوبکر صدیق، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

واقعۂ حدیبیہ کے علاوہ دوسرے تمام چھوٹے بڑے مواقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کے ہمراہ رہے بعض اوقات آنجناب کو حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا شرف بھی حاصل ہُوا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر حضورؐ کی طرف سے عورتوں سے بیعت بھی آپ ہی نے لی۔

دَورِ صدیقی میں

سفارتی معاملات اور اُمورِ خارجہ کے ان سابقہ تجربات کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کو مزید سیاسی بصیرت اور تجربہ اس وقت حاصل ہوا جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں آپ کو اسلامی حکومت کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ آپ اسلامی ریاست

کی تاریخ میں پہلے قاضی القضاۃ ہیں، ورنہ اس سے پیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خود حضرت صدیقِ اکبرؓ کے شروع عہد میں یہ منصب خود سربراہِ حکومت ہی کے پاس ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں جب اسلامی ریاست نے ترقی کی بہت سی منازل طے کرلیں، کام کا کچھ بہت اضافہ ہوگیا اور تقسیم کار کے اصول پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ خدمتِ حضرت عمرؓ کے سپرد کی گئی۔

قاضی القضاۃ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے مشیرِ خاص بھی رہے آنجناب نے اپنے مختصر عہدِ خلافت میں کوئی کام بھی فاروقِ اعظمؓ کے مشورہ اور معیت کے بغیر نہیں کیا۔

دورِ صدیقی کی اسلامی سیاست میں حضرت عمرؓ کا تعلق اس قدر گہرا اور قریبی رہا ہے کہ اس دور کی بیرونی اور اندرونی اسلامی سیاست میں حضرت عمرؓ کے کردار کی تاریخ دراصل عہدِ صدیقی ہی کی تاریخ ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب زمامِ خلافت سنبھالی تو اس وقت بین الاقوامی سیاست کے نقطۂ نظر سے صورتِ حال یہ تھی۔ کہ اسلامی حکومت پورے جزیرہ عرب کو محیط ہو چکی تھی۔ یوں تو قریب قریب سارا ہی جزیرہ عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اسلام کے زیرِ نگین ہو چکا تھا۔ لیکن حضور علیہ السلام کی رحلت کے بعد بعض مقامات پر بغاوتیں رونما ہوئیں، کچھ قبائل نے ادائیگی زکواۃ کا انکار کرکے اسلامی حکومت کے استحکام اور مسلمانوں کی ملی یکجہتی کو نقصان پہنچانا چاہا بعض دوسرے فتنہ پردازوں نے جھوٹی نبوت کی دکانیں چمکانے کی کوشش کی اور اس طرح دینِ اسلام کی ابدیت اور عالمگیریت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی۔ اس لیے جناب صدیقِ اکبر کے عہدِ خلافت کا بیشتر حصہ ان ہنگاموں کو فرو کرنے میں گزرا۔

کارکنانِ قضا و قدر نے یہ سعادت روزِ ازل سے ہی فاروقِ اعظمؓ کے مقدر میں لکھ دی تھی کہ وہ اسلام کی عالمگیریت اور دینِ حق کی ابدیت کے عملی اور سیاسی پہلو کو دنیا کے سامنے ہمیشہ کے لیے روشن کر دیں اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کے لیے

آنجناب کو دنیا کی عظیم فوجی اور سیاسی قوتوں سے پنجہ آزمائی کرنی پڑی ۔ دس سال کی طویل اور صبر آزمائی کرنی پڑی ۔ دس سال کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد آپ اس بے مثال کامیابی سے ہم کنار ہوئے جس کا آج دشمن بھی نہ صرف اعتراف کرتے ہیں بلکہ عقیدت سے سرخم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

جزیرہ عرب سے باہر اس وقت دنیا میں دو بڑی قوتیں موجود تھیں۔

(۱) شمال مغربی ایشیا، شمال مشرقی افریقہ اور جنوب مشرقی یورپ کے وسیع علاقوں پر پھیلی ہوئی عیسائیوں کی رومی سلطنت۔

(۲) ایران، عراق اور وسط ایشیا کے بعض علاقوں پر مشتمل مجوسی سلطنت ۔ یہ دونوں مملکتیں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے بالکل اسی طرح فوجی اور سیاسی رسہ کشی کرتی رہتی تھیں۔ جس طرح آج ہمارے زمانہ میں روس امریکا اور چین ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ۔ اس سلسلہ کی ایک اہم جنگ سنہ سال نبوت میں بھی ہوئی تھی۔ جس میں ابتداً رومیوں کو شکست ہوئی تھی لیکن قرآن مجید نے رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی کی جس سال جنگ بدر ہوئی اسی سال رومیوں کو فارسیوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ دونوں حکومتیں طویل عرصے سے خود جزیرہ عرب پر بھی نظریں جمائے ہوئے تھیں اور اس کو اپنے قبضہ میں کرنے کی متعدد کوششیں بھی کر چکی تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ جزیرہ عرب ایک اہم تجارتی شاہراہ شمار ہوتا تھا۔ یمن، بحرین، مسقط اور صنعاء جیسے متمدن اور ترقی یافتہ مقامات سے تجارتی قافلے قیمتی سامانِ تجارت لے کر پورے جزیرہ عرب کو عبور کرتے ہوئے شام، عراق، قسطنطنیہ اور اندرون یورپ تک جاتے تھے۔ افریقہ، مصر، طرابلس الغرب اور حبشہ جیسے مراکز علم وتہذیب کو ایشیا اور یورپ سے ملانے والا بڑا اہم راستہ جزیرہ عرب کے بالائی جنوبی حصہ سے گزرتا تھا۔ علاوہ ازیں چین، ہندوستان اور ایران سے بہت سی تجارتی شاہراہیں آکر یہاں ملتی تھیں۔ اس سے بھی بڑھ کر جزائر شرق الہند سے آنے جانے والے بحری جہاز سامان لے کر یمن اور

جدہ کی بندرگاہ پر آتے تھے جہاں سے اِس سامان کو دوسری جگہ برآمد کیا جاتا تھا۔ ان سب چیزوں کے علاوہ یہاں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا تعمیر کردہ بیت اللہ دُنیا میں وہ خدا کا پہلا گھر موجود تھا جس کو عرب کے باشندوں کے علاوہ شام و عراق میں بس جانے والے بہت سے عرب قبائل بھی اپنا دینی و روحانی مرکز مانتے تھے۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر جزیرہ عرب کو عموماً اور حجاز کو خصوصاً ایک مرکزِ اعصاب کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ جس پر قبضہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دنیائے قدیم کے تینوں براعظموں ——— ایشیا، افریقہ اور یورپ کی ایک بڑی شہ رگ قبضہ میں آجائے۔ اسی لیے اس علاقہ پر تسلّط حاصل کرنے کے لیے مذکورہ دونوں طاقتیں وقتاً فوقتاً کوششیں کرتی رہتی تھیں۔

اس صورتِ حال میں فاروقِ اعظمؓ کی خارجی سیاسی حکمتِ عملی کا بنیادی پتھر یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح جزیرہ عرب کو جہاں اب اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ان دونوں بڑی اور متحارب طاقتوں کی باہمی چپقلش اور آویزش سے دُور رکھیں۔

اس وقت تک اسلامی ریاست ترقی کی منازل ہی طے کر رہی تھی، اسلامی معاشرہ ہنوز تیزی سے تشکیل پا رہا تھا، مختلف سیاسی، معاشرتی اور معاشی ادارے ظہور پذیر ہو رہے تھے، متعدد نظامات تشکیلی دور سے گزر رہے تھے۔ ایسی صورت میں از حد ضروری تھا کہ اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ یکسوئی سے کام کرنے کا موقع ملے اور کوئی اندرونی یا بیرونی افراتفری اس اہم کام میں مخل نہ ہو اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ اسلامی ریاست ——— جزیرۂ عرب ——— کی حدود کو مضبوطہ بنا کر بیرونی مداخلت کے امکانات کو بالکلیہ مسدود کر دیا جائے اور اسلامی ریاست کی حدود سے باہر تبلیغ اسلام اور اسلامی ریاست کی حدود سے باہر تبلیغ اسلام کے کاموں میں بھی کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اس سلسلہ میں آنجناب نے جو پہلا منصوبہ ترتیب دیا۔ وہ یہ تھا کہ عراق عرب کو جو فی الحقیقت عربی الاصل آبادی پر مشتمل تھا آتش پرست ایرانیوں کے تسلط سے آزاد کرا کے وہاں اسلامی فوجوں کے مضبوط بیس کیمپ ———

(BASECAMPS) قائم کیے جائیں اور عراق عجم کو ایران اور اسلامی ریاست کے درمیان ایک قسم کی ایسی بفر ریاست (BUFFER STATE) یا زیادہ صحیح الفاظ میں بفر صوبہ (BUFFER PROVINCE) کی حیثیت دے دی جائے جو انتظامی اور فوجی لحاظ سے اسلامی حکومت کے ماتحت ہو۔

عراق و فارس سے اسلامی حکومت کی فوجی اور سیاسی کشمکش حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور حکومت میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ خسرو پرویز کے قتل کے بعد جب ایران میں افراتفری پھیلی تو مشہور مسلم جنرل حضرت مثنیٰ شیبانی نے مرکز کو تجویز پیش کی کہ اب فارس پر فوج کشی کے لیے حالات خاصے سازگار ہیں، لیکن چونکہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ (اور خود حضرت عمرؓ) کے پیش نظر ایران پر عام فوج کشی کر کے اس کو یکبارگی اسلامی حکومت میں شامل کر لینے کا منصوبہ نہ تھا۔ اس لیے آنجناب نے فارس پر عام لشکر کشی کی اس تجویز کو تو قبول نہ کیا۔

ہاں عراق عرب (عراق قدیم کا وہ حصہ جو سلطنت فارس میں شامل، عراق عجم سے ملحق اور عربوں کے ثقافتی اور تہذیبی حلقۂ اثر میں تھا) کے بعض مقامات کو اسلامی قلمرو میں شامل کر لینے کے منصوبہ کی منظوری دے دی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب مثنیٰ شیبانی کو ہی اس مہم کا قائد مقرر کیا اور خالد بن ولید کو مغربی محاذ سے منتقل کر کے مثنیٰ کی معاونت پر مامور کیا۔ خالد بن ولید کچھ عرصہ اس محاذ پر رہے اور اس کے بعد دوبارہ دارالخلافہ کے حکم سے شمال مغربی محاذ (شام) بھیج دیے گئے۔ ہنوز عراق کا مسئلہ ایک طرف نہ ہوا تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ دنیا سے تشریف لے گئے اور فاروق اعظمؓ آپ کے جانشین ہوئے۔

فاروق اعظمؓ نے زمام خلافت سنبھالتے ہی عراق کا مسئلہ فیصل کرنے کی طرف توجہ دی اور (بفر صوبہ بنانے کی) مذکورہ پالیسی کو کامیاب کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے۔

آپ کا پروگرام غالباً یہ تھا کہ کچھ عرصہ میں عراق کے لوگ اسلام قبول کر کے اسلامی معاشرہ میں ضم ہو جائیں گے تو پھر عراق کو مکمل طور پر اسلامی ریاست کا جز تصور کر کے عراقی حدود

سے آگے اِس طرح کی ایک دوسری بفر اسٹیٹ (بلکہ بفر صُوبہ) قائم کردی جائے۔ ابتدأً آپ کا منشاء یکبارگی پُورے ایران کو اسلامی قلمرو میں شامل کرنے کا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب فتح مدائن کے بعد مشرقی اسلامی کمان کے سربراہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ایرانی علاقہ میں مزید پیش قدمی کرکے ایرانیوں کو بہت دُور تک دھکیل دینا چاہا تو آپ نے اُن کو اِس اقدام سے منع کرتے ہوئے اپنے سرکاری حکم میں لکھا۔

"وددت لو اِن بین السواد والجبل سدا لا یخلصون الینا ولا نخلص الیھم! حسبنا من الریف السواد، اِنی آثرت سلامۃ المسلمین علی الانفال"

ترجمہ:۔

"میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس پہاڑ اور سواد کے علاقہ کے مابین ایک قسم کا ایسا بند قائم ہو جائے کہ نہ وہ ہماری طرف آسکیں اور
ہمیں رلیف کے علاقوں میں سے صرف سواد
کافی ہے میں مالِ غنیمت کے حصول کے مقابلہ میں مسلمانوں کی سلامتی (اور اس لیے اسلامی ریاست و معاشرت کے تحفظ و بقاء کے مسئلہ) کو زیادہ ترجیح دیتا ہوں"

لیکن بعد میں حالات کا ارتقاء کچھ اس نہج پر ہُوا کہ فارُوقِ اعظمؓ کو اِس پالیسی میں تبدیلی کرنا پڑی۔ جو کام وہ پہلے مرحلہ وار اور بالتدریج کرنا چاہتے تھے اُسے اب اُنہوں نے یکبارگی کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ خارجی حکمتِ عملی میں اس جوہری تبدیلی کے بعد پہلا سوال جو سامنے آیا وہ یہ تھا کہ مذکورہ دونوں طاقتوں میں سے پہلے کون سی طاقت سے دو دو ہاتھ کیسے جائیں؟ اُس وقت اِسلامی حکومت کے سامنے تین ممکنہ صورتیں تھیں۔

(۱) پہلے سلطنتِ روم سے نمٹتے اور سلطنتِ فارس سے سرِدست غیر متعلق رہتے اور بعد میں اُس سے دو دو ہاتھ کرتے۔

(۲) پہلے ایرانیوں کو ٹھکانے لگاتے اور پھر سلطنتِ روم سے نمٹتے۔

(۳) اللہ کا نام لے کر بیک وقت طاقتوں سے پنجہ آزمائی کرکے اُن کو اسلامی ریاست

پر نظریں لگائے رکھنے سے باز رکھتے۔

آنجناب نے تیسری اور آخری صورت اختیار کی، اس لیے کہ اس وقت کے حالات میں یہی ایک ممکنہ اور قابلِ عمل صورت تھی گو خدشات بے پناہ تھے۔ لیکن ظاہر ہے کام جس قدر اہم ہوتا ہے خطرات اسی قدر زیادہ اور بڑے ہوتے ہیں اُس وقت اگر حضرت عمرؓ کسی ایک طاقت کو نظر انداز کر کے دوسری طاقت سے اُلجھ جاتے تو سخت اندیشہ تھا کہ پہلی طاقت عقب سے مسلمانوں پر حملہ نہ کر دے اس لیے آپ نے یہی مناسب سمجھا کہ بیک وقت دونوں قوتوں کو مصروف بیکار رکھا جائے اور جنگ کا نقشہ اس طرح ترتیب دیا جائے کہ دونوں طاقتیں بیک وقت اپنی ساری ممکنہ توانائیاں میدانِ جنگ میں جھونک دینے پر مجبور ہو جائیں دوسری طرف خود مسلمانوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک پنڈولم PENDULUM کی طرح اپنی فوجوں کو شرقاً غرباً اس طرح منتقل کرتے رہے کہ ایک وقت میں اصل زور ایک محاذ پر رہے اور دوسرے محاذ پر صرف دشمن کو مصروف رکھنے اور اس کو تھکا کر (EXHAUST) کرنے کی کوشش کی جائے اور پھر اچانک تیزی کے ساتھ دوسرے محاذ سے فوجیں منتقل کر کے اِس دشمن پر کاری ضرب لگائی جائے اور پہلے کو صرف اُلجھانے اور تھکانے پر اکتفا کیا جائے۔

اس دور میں جب کہ ذرائع حمل و نقل اور وسائلِ خبر رسانی بالکل ہی ابتدائی دور میں تھے اِس پالیسی کو کامیابی سے چلانا اور انجام تک پہنچا دینا جہاں فاروق اعظمؓ کی کامیاب سیاسی و فوجی حکمتِ عملی کی نشاندھی کرتا ہے۔ وہاں اُن کے رفقائے کار، اُن کے جنرلوں اور اُن کے گورنروں کی ہوشیاری پھرتی اور پُر کاری کی بھی شہادت دیتا ہے بالخصوص خالدؓ بن ولید، ابوعبیدہؓ بن الجراح، سعد بن ابی وقاص اور عمروؓ بن العاص وغیرہم نے جس تیزی اور پھرتی سے صحراؤں، پہاڑوں اور دریاؤں کو عبور کر کے فوجیں اِدھر سے اُدھر منتقل کیں وہ نہ صرف اِسلامی تاریخ بلکہ پُوری نوعِ انسانی کی تاریخ کا ایک اہم ترین باب ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی نُصرت اور اپنے جلیل القدر رفقاء کی مدد

اور تعاون سے اِس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ چلایا اور دس سال کے قلیل عرصہ میں جاہلی تہذیب کی ان دو سب سے بڑی نمائندہ عالمی طاقتوں پر ایسی کاری ضرب لگائی جس سے جاہلی تہذیب و تمدن کا پورا سنگھاسن زمین پر آ رہا۔

اِسلامی حکومت کی حدیں ہمارے پاکستان سے لے کر لیبیا تک اور رُوس سے لے کر عدن تک پھیل گئیں اور ممتاز محقق مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی تحقیق کے مطابق پچیس لاکھ ستائیس ہزار ۲۵۲۷۰۰۰ مربع میل رقبہ پر پرچم اسلام لہرانے لگا۔ حضرت عمرؓ کی اس عدیم النظیر حکمت عملی کی کامیابی بلکہ برق رفتاری کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ (ہاشمی صاحب ہی کی تحقیق کے مطابق) اسلامی فوجیں فاروقِ اعظمؓ کے دورِ حکومت میں روزانہ اوسطاً تین سو چون ۳۵۴ مربع میل رقبہ کو اسلامی قلمرو میں شامل کر کے وہاں امن و سلامتی کے پھریرے لہراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔

یہ تو رقبہ جاتی فتوحات تھیں۔ جن کی رفتار بہر حال ایک محدود علاقہ میں تھیں اس کے برعکس تبلیغ اسلام کی مہم جس کو آپ نے خارجہ پالیسی کے ساتھ ہی مربوط کر دیا تھا، اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ جاری تھی۔ دُور دُور کے علاقوں کے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے سورت، مالابار، سیلون جیسے دُور افتادہ مقامات میں اسلام کی روشنی دُورِ فاروقی ہی میں پہنچ چکی تھی۔ اور ان علاقوں میں ایک قابل ذکر تعداد اسلام قبول کر لینے والوں کی پیدا ہو گئی تھی۔

تبلیغی کام کے اس تیزی سے پھیلنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اِسلامی حکومت ایک نظریاتی حکومت ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہر اقدام، اپنی ہر پالیسی اور اپنی ہر حکمتِ عملی میں سب سے پہلے جو مقصد پیشِ نظر رکھتی ہے وہ نظریاتی ہوتا ہے اور اس کا ہدف اساسی نظریہ ہی کی بقاء، اشاعت اور تحفظ ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اسلامی حکومت غیر حکومتوں اور ملکوں سے صرف حکومتی سطح پر ہی تعلقات نہیں رکھتی بلکہ وہ دُنیا بھر میں عوام الناس کے ہر طبقے اور انسانوں کی ہر جماعت سے تعلق استوار کرنا اور اُن سے راہ و رسم پیدا کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتی ہے اِس سے اِن لوگوں

میں دعوتی اور تبلیغی کام کو منظم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس سے دُوسرا بڑا فائدہ
خارجہ پالیسی کے نقطۂ نظر سے یہ ہوتا ہے کہ چاہے اس علاقہ کے سارے یا اکثر لوگ
اسلام قبول نہ کریں لیکن وہ مسلسل اسلام کی دعوت سنتے رہتے ہیں اور اس طرح اُن کے کانوں
کے لیے اسلام کی صدا نامانوس نہیں رہتی اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات دشمن
اور برسرِ جنگ ملک کے انتہائی معتمد حلقوں تک میں اسلامی حکومت کے لیے ایک مضبوط
لابی (LOBBY) پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُن میں مسلمانوں اور اسلام کے لیے نرم گوشہ
رکھنے والے لوگوں کی ایک موثر تعداد جمع ہو جاتی ہے۔ جو بہت سے نازک مواقع پر بہت
ہی مفید اور کارآمد ثابت ہوتی ہے عہد فاروقی میں اس کی بہت سی مثالیں ہم کو ملتی ہیں۔
یہاں صرف ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

رومی حکومت کی پے در پے شکستوں کے اسباب و علل پر غور کرنے کے لیے ہرقل
نے ایک کانفرنس طلب کی اور اُن سے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ عرب ہم پر اس قدر
تیزی سے فتح حاصل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جبکہ وہ ہر اعتبار سے ہم سے کمتر ہیں؛ طاقت
زور، جمعیت، ساز و سامان، مال و دولت سب کچھ ان کے پاس ہم سے کم ہے اس کے
باوجود ان کو اس قدر عظیم الشان کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں ...... ہرقل کی یہ افتتاحی تقریر
سُن کر تمام ارکان خاموش رہے، صرف ایک معمر رُکن کچھ کہنے کے لیے اٹھا اور اس نے
یہ تقریر کی۔

"عربوں کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں، وہ رات کو عبادت کرتے
ہیں، دن کو روزے رکھتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، آپس میں ایک دوسرے
سے بالکل برابری کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارا حال یہ ہے۔ کہ
شرابیں ہم پیتے ہیں۔ بدکاریاں ہم کرتے ہیں، اقرار اور وعدہ کی پابندی ہم
نہیں کرتے دوسروں پر ظلم کرنے میں ہم پیش پیش ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے
کہ اُن کے ہر کام میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے اور ہمارا ہر کام
ہمت و استقلال سے خالی ہوتا ہے۔"

یہ واقعہ فاروق اعظمؓ کی خارجہ پالیسی کی کامیابی کا منتہائے کمال ہے دشمن ملک کی وہ سپریم کونسل جو اُمورِ جنگ پر غور کرنے کے لیے بیٹھی ہے۔ اس کا سب سے سینیئر رکن نہ صرف اسلامی تعلیمات سے کلی طور پر واقف ہے بلکہ مسلمانوں سے اخلاقی طور پر سخت مرعوب بھی ہے۔ غور کیجیئے کہ جب تمام ارکان ہرقل کے سوال کے سامنے لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے ہوں گے اور پھر اس شخص نے یہ زوردار تقریر کی ہو گی تو اس کی یہ تقریر بقیہ ارکان کی رائے پر کس قدر اثرانداز ہوئی ہو گی اور اُن کے دلوں سے مسلمانوں اور اسلام کی نفرت میں کس قدر کمی واقع ہوئی ہو گی اور ان کے دلوں میں اسلام کے لیے کس قدر نرم گوشہ پیدا ہوا ہو گا اور اس کے نتیجہ میں اُن کی فوجی اور سیاسی سرگرمیوں میں کیا کچھ اثرات مترتب ہوئے ہوں گے۔

فاروقِ اعظمؓ کی ان تمام کامیابیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سب سے پہلا سوال جو ہر قاری کے ذہن میں آسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اتنے مختصر وقت میں اس قدر عظیم الشان سیاسی اور فوجی کامیابیاں کیونکر حاصل ہوئیں۔ اُس سوال کا اصل اور مختصر جواب تو وہی ہے جو قرآن میں بار بار مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین،
لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید
ولو انہم آمنوا واتقوا لمثوبۃ من عند اللہ خیر لو کانوا یعلمون
ولو انہم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیہم من ربہم لاکلوا من فوقہم ومن تحت ارجلہم منہم امۃ مقتصدۃ وکثیر منہم ساء ما کانوا یعملون ۝

اور بہت سی دوسری آیات میں اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ دُنیا عالمِ اسباب ہے یہاں سبب اور مسبب اور علت و معلول کا سلسلہ جاری ہے۔ دنیا کا ہر واقعہ اپنے سے پہلے وقوع پذیر ہونے والے کسی واقعہ کا نتیجہ ہوتا ہے اور آئندہ اپنے اثرات چھوڑتا ہے اس سوال

کا ظاہر ہے ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ اگر فاروقِ اعظم کو بے مثال تدبر، زبردست سیاسی بصیرت اور یہ ذہنی اور عقلی صلاحیتیں عطا نہ ہوتیں اور وہ یہ سب تدابیر اور پالیسیاں اختیار نہ کرتے تو ہرگز یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی اور یہ تمام تر رحمت خداوندی اور مشیت الٰہی تھی جس نے یہ سب صفات فاروقِ اعظم اور اُن کے رفقاء کو عطا فرمائیں، اُن سے یہ عظیم الشان خدمت اپنے دین کی سربلندی کے سلسلہ میں لی اور ہر ہر قدم پر اُن کی راہنمائی کی، اُن کو سکینہ کے نزول سے نوازا اور بالآخر اُن کو دُنیا و آخرت میں سرخرو کیا۔

دنیا کی مختلف اقوام سے خارجہ تعلقات کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق نے جو تدابیر اختیار کیں، اُن میں سب سے بڑی اور اوّلین بات یہ تھی کہ آپ نے خارجی سیاست اور فوجی حکمتِ عملی کو آپس میں بالکل مربوط کر دیا۔ فاروقِ اعظمؓ کے اکثر و بیشتر جنرل وہ تھے جو اگر ایک طرف فوجی اُمور اور عسکری قیادت میں بے مثال تھے۔ تو دوسری طرف سیاسی اور سفارتی صلاحیتوں میں بھی اُن کا کوئی مثیل نہ تھا۔ حضرات عمرؓو بن العاص، خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص، النعمان بن مقرن، مغیرہؓ بن شعبہ وغیرہ حضرات ایسے تھے جو سیاست و عسکریت دونوں میں کامل بصیرت رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ کہ ان حضرات کی سفارتی اور سیاسی زندگی، کارناموں، صلاحیتوں، تدابیر اور اس طرح کے دُوسرے اہم پہلوؤں پر کسی شخص نے قلم نہیں اٹھایا۔ خدا کرے یہ چند سطور قارئین ضیائے حرم میں سے کسی کے دل میں اس موضوع پر لکھنے کا جذبہ پیدا کر دیں۔

حضرت عمرؓ نے اسلامی حکومت کی عسکری اور خارجی پالیسی کو یہاں تک مربوط کر دیا تھا کہ ہر علاقائی کمان کے سربراہ کو مقامی طور پر حالات کے پیشِ نظر پالیسی اختیار کرنے اور اس کے مطابق اقدامات عمل میں لانے کی ہدایت کر دی تھی ہر کمانڈر عمومی خارجہ پالیسی کی حدود میں رہ کر وقتاً فوقتاً ضروری اقدامات کرتا رہتا تھا اس وقت مختلف علاقوں میں متعدد کمانیں قائم تھیں شمال کمان کے سربراہ ـــــــ اور علاقہ کے گورنر ـــــــ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص شمال مغربی کمان کے سربراہ خود کمانڈر انچیف حضرت ابو عبیدہؓ تھے۔ افریقی کمان کے سربراہ اور افریقی ممالک محروسہ کے گورنر حضرت عمرؓو بن العاص

تھے۔ یہ حضرات حسبِ ضرورت اپنے پیش آمدہ احوال کے مطابق خارجہ پالیسی سے متعلق اقدامات کرنے کے مجاز تھے۔ ہر کمانڈ کے سربراہ کو ہدایت تھی کہ اپنی اختیار کردہ پالیسی اور اپنے تجویز کردہ اقدامات سے مرکز کو مطلع رکھے۔

فتحِ عراق کے بعد جب حضرت عمرؓ نے وہاں اسلامی فوجوں کے (BASE) قائم کرنے کا ارادہ کیا تو مدائن (شمال مشرقی صوبہ کا صدر مقام) کے فوجی گورنر[1] حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو لکھا کہ حذیفہؓ اور سلمانؓ کو بھیجو کہ وہ کوئی ایسا مقام تلاش کریں جو بیک وقت بری بھی ہو اور بحری بھی۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اس مقام اور دار الخلافہ مدینہ کے مابین نہ کوئی سمندر حائل ہو، نہ کوئی دریا اور نہ کوئی پل حائل ہو۔ ان دونوں بزرگوں پر مشتمل اس کمیشن نے تلاشِ بسیار کے بعد وہ جگہ منتخب کی جہاں کوفہ تعمیر کیا گیا۔ شہر کا نقشہ بھی تمام تر خود حضرت عمرؓ نے مدینہ سے بنا کر بھیجا اس کمیشن کے ایک رکن حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے۔ جو فارسی الاصل ہونے کے سبب ان تمام علاقوں سے دوسرے تمام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقف تھے۔ کمیشن کے دوسرے رکن حضرت حذیفہؓ بن الیمان تھے۔ جن کی دیانتداری اور امانت کی شہادت خود دربارِ رسالت سے دی جا چکی تھی۔ ان کے بارے میں کوئی شخص ہرگز یہ وسوسہ نہ کر سکتا تھا کہ وہ جگہ کے انتخاب میں ملی مصالح کے علاوہ کسی اور چیز کو درخورِ اعتنا سمجھیں گے۔

حضرت عمرؓ نے بیرونی تجارت کو بھی اس نہج پر منظم کرنے کے لیے بعض اقدامات کیے جن سے خارجہ پالیسی کو کامیاب بنانے میں مدد ملے۔ ان کو خارجہ پالیسی میں تجارت کی اہمیت کا احساس تھا۔ آج کل خارجی سیاست کا خارجی تجارت سے رابطہ و تعلق بہت

---

[1] فاروقِ اعظمؓ کے قریب قریب سارے گورنر فوجی گورنر ہوتے تھے جو بیک وقت شہری انتظامیہ کے افسرِ اعلیٰ اور صوبائی کونسل کے سربراہ ہوتے تھے۔ یہ (گزشتہ سے پیوستہ) اس پالیسی کا حصہ تھا جو فاروقِ اعظمؓ نے سیاست و عسکریت کو مرکوز کرنے کے سلسلہ میں اختیار کی تھی۔

بڑھ گیا ہے، آج دنیا کے ملکوں کے مابین تعلقات کی نوعیت کا فیصلہ ان کے درمیان تجارتی تعلقات کی نوعیت سے ہوتا ہے، اس وقت ان دونوں کے درمیان تعلق تو تھا لیکن اس گہری نوعیت کا نہ تھا جس قدر آج ہے اور یہ دونوں تعلقات اس حد تک ایک دوسرے پر منحصر بھی نہ تھے جس حد تک کہ آج ہیں۔ لیکن حضرت فاروق اعظم کی چشم بصیرت، تہذیب و تمدن اور علوم و سائنس کی اُن تمام ترقیات کو دیکھ رہی تھی جو آئندہ وقوع پذیر ہونے والی تھیں ان کو اس کا بھی احساس تھا کہ بین الاقوامی سیاست میں تجارتی تعلقات اور تجارتی سرگرمیوں کو کیا کچھ اہمیت حاصل ہونے والی ہے۔

انہی تمام وجوہات کی بناء پر انہوں نے غیر ممالک سے تجارتی تعلقات کو منظم کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے جو بہت دُور رس نتائج کے حامل تھے بہت سے تجارتی احکامات (مثلاً کسٹم ڈیوٹی سے متعلق احکامات) جاری کیے۔ لیکن ان میں سب سے اہم واقعہ غالباً یہ ہے۔ کہ فتح مصر کے بعد آپ نے مصر کے کچھ نمائندہ اصحاب کا ایک وفد گورنر مصر حضرت عمرؓو بن العاص کی قیادت میں مدینہ طلب کیا اور ان حضرات کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ دریائے نیل سے ایک نہر نکال کر سمندر میں ڈال دی جائے تاکہ دریائے نیل اور بحیرۂ قلزم میں براہ راست کشتی رانی ہو سکے اور اس طرح نہ صرف اندرون افریقہ دارالخلافہ سے براہ راست بحری راستہ کے ذریعہ منسلک ہو جائے بلکہ سامان رسد کی درآمد و برآمد میں بھی سہولت ہو جائے۔ اس لیے کہ خشکی کے راستے سے سامان تجارت لانے لے جانے میں دشواری ہوتی تھی اور مسافت بھی طویل ہو جاتی تھی وفد نے اس تجویز سے پوری طرح اتفاق کیا اور نہر کی کھدائی شروع ہو گئی۔ یہ نہر بنی اور خاصے عرصہ تک کام کرتی رہی۔ افریقہ سے مدینہ کو مال کی درآمد برآمد اسی کے ذریعہ ہوتی رہی۔ لیکن بعد میں جب اسلامی حکومت کی مرکزیت میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوا تو اُس کے جہاں اور اثرات رُونما ہوئے وہاں یہ بھی ہوا کہ اس نہر کی دیکھ بھال نہ ہو سکی اور بالآخر یہ بند ہو گئی۔

کسی ملک سے خارجی تعلقات کا بڑا دارومدار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ اس کے

بارے میں کس قدر معلومات رکھتے ہیں۔ کسی بھی ملک سے تعلقات کی نوعیت کا فیصلہ کرتے وقت یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ وہ ملک کتنا بڑا ہے، اس کی تجارتی، جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کیا ہے اس کے عام باشندوں کا ذہنی، مذہبی اور سیاسی رجحان کیا ہے اس ملک کے باشندوں میں فکری اور سیاسی اعتبار سے کون کون سے گروہ ہیں نیز اس ملک کی فوجی صلاحیت کس درجہ کی ہے؟ اس قسم کی تمام معلومات کے بغیر جو خارجہ پالیسی تشکیل دی جائے گی وہ ناکام ہی رہے گی۔ فاروق اعظمؓ نے اس امر کا نہایت عمدہ اہتمام کیا تھا کہ ہمسایہ طاقتوں کے بارے میں مکمل تفصیلی اور تازہ ترین معلومات دارالخلافہ میں پہنچتی رہیں۔ آپ اپنے سفراء اور فوجی حکام کو بھی جو اہم اور ضروری ہدایات دیا کرتے تھے اُن میں یہ ہدایت بھی شامل ہوتی تھی کہ جب دشمن کی سرزمین کے قریب پہنچو تو جاسوسوں کا جال بچھا دو۔

خبر رسانی کے لیے حضرت عمرؓ کے اس اہتمام کا یہ حال تھا کہ وہ بعض اوقات ایسے نو مسلموں کو جو سیاسی اور فوجی اعتبار سے اہم مقامات کے باشندے ہوتے تھے یہ حکم دیتے تھے کہ وہ سرِ دست اپنا اسلام ظاہر نہ کریں۔ یہ لوگ عموماً عراق وشام کے باشندوں میں سے ہوتے تھے۔ اور روم وایران کی سلطنتوں کے اندرونی حالات سے گہری واقفیت رکھتے تھے، وضع قطع سے یہ لوگ بالکل آتش پرست یا عیسائی معلوم ہوتے تھے۔

اس لیے ان لوگوں کے لیے صحیح حالات کا کھوج لگا کر اسلامی حکومت کو مطلع کر دینا دوسروں کی بہ نسبت بہت ہی آسان ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی بدولت بڑے بڑے نازک مواقع پر بہت سے کام نکلے اور بڑی بڑی مہمات سر ہوئیں اور تو اور بعض اوقات بہت سے غیر مسلم تک ان خبر رسانوں میں شامل ہو کر بہت کچھ کام کر جاتے تھے، یہ لوگ مسلمانوں کے حسنِ سلوک اور اسلامی حکومت کے عدل وانصاف کے گرویدہ ہو کر اس کی بقاء، ترقی اور اس کی امن وسلامتی کے خیال سے خبر رسانی کے لیے تیار ہو جاتے تھے بلکہ جنگ یرموک کے موقعہ پر جب مسلمان فوجی ضرورت سے حمص شہر خالی کرنے لگے تو یہودی علماء اور عوام تورات کے نسخے ہاتھ میں لے کر کہتے تھے کہ جب تک ہم زندہ ہیں رومیوں کو یہاں نہ آنے دیں گے عیسائی باشندے بھی حسرت سے کہتے تھے کہ خدا کی قسم تم ہم کو رومیوں سے بڑھ کر محبوب ہو۔

مرکزی سطح کے علاوہ مقامی طور پر بھی بہت سے مسلم حکام نے جاسوسی اور خبر رسانی کے انتظامات کر رکھے تھے یہ خبر رساں عام طور پر شام کے مختلف مقامات پر متعین تھے اور قیصر روم کی جنگی تیاریوں، سیاسی سرگرمیوں اور فوجی نقل و حرکت کی خبریں مسلمانوں کو دیتے تھے اس طرح یہ پورا علاقہ ایک زبردست اور مربوط نظام خبر رسانی میں جکڑا ہوا تھا۔ جس کے ذریعہ پل پل کی خبریں امیر المومنین حضرت عمرؓ سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے متعلقہ افسر تک پہنچتی رہتی تھیں۔

نظام خبر رسانی میں جہاں اس بات کی اہمیت ہے کہ دشمن کے بارے میں ضروری اطلاعات بروقت ملتی رہیں وہاں یہ امر بھی خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اپنے علاقے میں دشمن کی جاسوسی سرگرمیوں کو ناکام بنایا جائے۔ اس کام کے لیے حضرت عمرؓ نے بڑی سخت اور شدید قسم کی امتناعی اور احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔ اس معاملہ میں وہ کسی قسم کی نرمی یا مداہنت بالکل برداشت نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شمالی شام کے لیفٹیننٹ گورنر عمیرؓ نے ان کو رپورٹ دی کہ رومیوں کی سرحد کے بالکل متصل ہمارے ایک شہر عربسوس کے باشندے ہمارے راز دشمن تک پہنچا دیتے ہیں اور بار بار کی تنبیہ کے باوجود باز نہیں آتے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟

آپ نے اس موقع پر جو حکم دیا وہ تدبر، سیاست اور اسلامی عدل کا حسین ترین امتزاج اور بہترین نمونہ ہے آپ نے حکم دیا کہ اُن سے کہا جائے کہ یا تو اپنے سارے مال و اسباب اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ کا دوگنا معاوضہ قبول کر کے شہر خالی کر دیں اور کسی دوسری جگہ جا کر آباد ہو جائیں اور اگر اس پر وہ لوگ تیار نہ ہوں تو اُن کو شہر خالی کرنے کے لیے ایک سال کی مہلت دی جائے۔ اگر وہ ایک سال کے اندر اندر شہر خالی کر دیں تو ٹھیک ورنہ سال بھر گزرنے کے بعد شہر کو جبراً خالی کرا کر مسمار کر دیا جائے۔۔۔۔۔۔۔ ان ضدی اور ہٹ دھرم باشندوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا چنانچہ سال بھر کا نوٹس گزرنے کے بعد شہر کو خالی کرا کے تباہ کر دیا گیا۔

حکومتوں کے عروج و زوال میں بسا اوقات عورتوں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

بالخصوص غیر اقوام کی یہودی اور عیسائی عورتیں جو بیویاں اور بہویں بن کر مسلمانوں اور خاص طور پر معاشرہ کے بااثر لوگوں کے گھروں میں آتی ہیں۔ اُن کی شعوری اور لاشعوری ہمدردیاں اپنے سابقہ معاشروں، سابقہ نظاموں اور سابقہ حکومتوں کے ساتھ بہر حال باقی رہتی ہیں اور یہ ہمدردی مختلف شکلوں میں اسلامی ریاست کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی ہے یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے لیے کسی مثال کی ضرورت نہیں تاہم ماضیٔ قریب کی اسلامی تاریخ میں سلاطینِ عثمانی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان حضرات نے ــــــ گو بعض وقتی مصالح کے پیشِ نظر ہی سہی ــــــ بہت سی یہودی اور عیسائی عورتوں سے شادیاں کر کے ان کو اپنے حرموں میں داخل کر لیا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر یورپ کے مسیحی فرمانرواؤں کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور عثمانی حکومت میں اپنے سابقہ ملکوں کی لابی منظم کرتی تھیں مراد خاں اوّل بایزید یلدرم اور سلیمان قانونی جیسے اکابر سلاطین کی بیویاں عیسائی اور یورپ کے فرمانروا خاندانوں سے تعلق رکھنے والی تھیں۔ اکثر عثمانی خلفاء انہی عیسائی ماؤں کے بطن سے تھے اور اس اعتبار سے محض آدھے ترک تھے۔ اس تہذیبی اور معاشرتی عدم تحفظ کے جو نتائج سامنے آئے وہ عثمانی تاریخوں میں بالتفصیل موجود ہیں۔

فاروق اعظم کی چشمِ بصیرت بین الاقوامی سیاست کے اس اہم پہلو سے کیسے غافل رہ سکتی تھی اُن کو اس قسم کی شادیوں کے سیاسی تمدنی اور معاشرتی نتائج کی تباہ کن نوعیت کا شدید احساس تھا قرآن مجید کی آیت والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب کا مفہوم اُن کے نزدیک صرف یہ تھا کہ انفرادی سطح پر اگر کسی کے حالات متقاضی ہوں اور وہ کتابیہ محصنہ سے نکاح کے بغیر چارہ نہ پائے تو اس کو اجازت ہے لیکن یہ مطلب نہیں کہ اہل کتاب کی عورتوں سے گروہی نکاح (MASS MARRIAGE) کی کوئی مہم شروع کر دی جائے اور مسلمانوں کے گھر اہل کتاب کی عورتوں سے بھر جائیں اور اسلامی تہذیب و تمدن کی وہ ساری عمارت جو امومت کی بنیاد پر قائم ہے درہم برہم ہو جائے، یہودی اور عیسائی عورتیں مسلمانوں کے گھروں میں مسلط ہو جائیں اور مسلمان خود اپنے گھروں میں مسلط ہو جائیں اور مسلمان خود اپنے گھروں میں بھی دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کے شر سے محفوظ نہ رہیں۔

اس معاملہ میں فاروق اعظمؓ اپنے حکام کو سختی اور خصوصیت سے روکتے تھے۔ ایک بار گورنر مدائن حضرت حذیفہؓ بن الیمان نے ایک کتابیہ سے شادی کر لی تو اُن کو فاروقِ اعظمؓ کا سرکاری مراسلہ ملا کہ فوراً اس عورت کو طلاق دے دو۔ اگر تم لوگ اس طرح ان عورتوں پر ٹوٹ پڑے (کہ خود صوبے کا گورنر کتابیہ سے شادی کر کے عوام کو یہ راہ دکھا دے) تو یہ تو تمہاری عورتوں پر غالب آجائیں گی چنانچہ حضرت حذیفہؓ بن الیمان نے یہ مراسلہ ملتے ہی اس عورت کو طلاق دے دی۔

یہ تھے وہ چند اقدامات اور تدابیر جن کو کام میں لا کر فاروقِ اعظم نے اپنی خارجہ پالیسی کو چلایا اور بالآخر اس کو کامیابی کی انتہائی منازل تک پہنچا کر دنیا سے رخصت ہوئے کیا آج ہماری اسلامی حکومتوں کی خارجہ پالیسیاں مرتب کرنے والوں کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قریب ترین رفیق اور خادم کی سیرت میں کوئی نمونہ ہے؟ سوچیے اور خوب سوچیے۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ٥

کتابیات

اس مضمون کی تحریر میں حسب ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ الفاروق : علامہ شبلی نعمانی۔ مطبوعہ اعظم گڑھ

۲۔ الفاروق عمر : محمد حسین ہیکل مصری۔ مطبوعہ قاہرہ

۳۔ اخبار عمر و عبداللہ بن عمر : علی الطنطاوی مطبوعہ دمشق

۴۔ جہادِ صدیق : میجر جنرل محمد اکبر خاں رنگروٹ

۵۔ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ : مرتبہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مطبوعہ قاہرہ

۶۔ تفہیم القرآن : سید ابوالاعلیٰ مودودی
مطبوعہ لاہور، جلد سوم

۷ر رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی : ڈاکٹر محمد حمید اللہ
مطبوعہ کراچی

۸ر ازالۃ الخفاء .... شاہ ولی اللہ دہلوی
(اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی

۹ر بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب
محمود آلوسی، جلد سوم

۱۰ر ارض القرآن : سید سلیمان ندوی (جلد دوم)
مطبوعہ اعظم گڑھ

۱۱ر البیان و التبیین : عثمان بن بحر الجاحظ ،

حضرت فاروقِ اعظمؓ

بحیثیت

کمانڈرِ اعظم

تحریر: بریگیڈیئر گلزار احمد

کمانڈروں اور سپہ سالاروں کی سپاہیانہ اور قائدانہ قابلیت کا موازنہ از حد مشکل ہوا کرتا ہے۔ شاذ و نادر ہی دو سپہ سالاروں کو ایک جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وقت اور مقام کے بدلتے ہوئے تقاضے سپہ سالاروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی تزویرات (STRATEGY) اور اپنے ماتحت کمانڈروں کو دی جانے والی تدبیراتی ہدایات (TACTICAL GUIDANCES) میں ردّ و بدل کرتے رہیں علاوہ ازیں ہر سپہ سالار کے ہاتھ میں مختلف انفرادی خصوصیات اور ملّی کردار کی حامل سپاہ ہوتی ہیں جنگ کے اس اوّلین اور اہم ترین ہتھیار یعنی انسانی مواد کے صحیح استعمال سے ہی میدانِ جنگ میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اور فتح و شکست کا دار و مدار اسی پر منحصر ہوتا ہے۔

جب سپہ سالارِ اعظم سربراہِ مملکت کی ذمہ داریاں بھی ادا کر رہا ہو یا سربراہِ مملکت پر سپہ سالارِ اعظم کی ذمہ داریاں آن پڑیں تو ایسے منفرد کمانڈر کے مقام کا تعین مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی روزمرہ کی انتظامی اور سیاسی مصروفیات اسے وہ مہلت عطا نہیں کرتیں جو سپہ سالاروں کے لیے ضروری ہوتی ہیں کہ وہ موسم، جغرافیائی دشواریوں

اور فاصلوں کی عائد کردہ رکاوٹوں کو دشمن کی پیدا کردہ مشکلات میں شامل کرنے کے بعد اپنے ماتحت کمانداروں کا لائحہ عمل تجویز کریں اور نہ صرف یہ کہ اس فیصلہ شدہ منصوبے کے احکامات بروقت جاری کریں بلکہ اپنے ان کمانداروں کو حصولِ مقصد کے مطابق وسائل بھی مہیا کرتے رہیں اور وقتاً فوقتاً اپنے احکام پر نظرِ ثانی کرنے کے بعد مقامی ضرورتوں کے پیشِ نظر مزید احکام روانہ کرتے رہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب مختلف محاذوں پر متعین سپہ سالاروں اور سپہ سالارِ اعظم کے درمیان رابطہ قائم رہے اور ہر اہم خبر اسے وقت پر ملتی رہے تاکہ اس کے احکام اور اس کی روانہ کی ہوئی کمک ہر محاذ پر صحیح وقت پر پہنچ سکے۔

فاروقِ اعظمؓ کا عہد اوائل اسلام کا وہ زمانہ ہے جب اسلامی مملکت دنیا کی دو بڑی مملکتوں کے درمیان آزاد اور خود مختار زندگی کا آغاز کر چکی تھی۔ اور ان دونوں مملکتوں کی کوشش تھی کہ وہ اس ننھے سے پودے کو اُٹھنے اور پھلنے پھولنے نہ دیں فاروقِ اعظمؓ نے اس ذمہ داری کو جس خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے دو وسیع و عریض محاذوں پر جنگ لڑنا آسان نہیں تاریخ جنگ میں بہت کم ایسے کماندار نظر آئیں گے جنہوں نے دو محاذوں کی جنگ کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو کماحقہ پورا کیا ہو، دو محاذوں کی جنگ کے دوران جب کوئی مملکت خارجی مواصلاتی خطوط (EXTERIOR LINES OF COMMUNICATION) کی وجہ سے مزید مشکلات کا سامنا کر رہا ہو تو افواج کو ایک محاذ سے دوسرے محاذ تک جانے میں وقت اور دقت دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے حضرت عمر فاروق کے عہد کی اسلامی سلطنت کو خارجی مواصلاتی خطوط کی پیدا کردہ دقتیں بھی درپیش تھیں دراصل یہ دقتیں صدیق اکبرؓ کے دور ہی میں شروع ہو چکی تھیں۔

مملکتِ اسلام کی دونوں پڑوسی مملکتوں نے اس نوزائیدہ مملکت کے راستے میں اوائل ہی سے دشواریاں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔ رومی سلطنت نے جنگ کا آغاز

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی میں کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں موتہ کی لڑائی لڑی گئی تھی۔ یہ جنگ حضرت ابوبکر صدیق کے عہد میں بھی جاری رہی۔ ایران نے جنگ کا آغاز خلیفۂ اوّل کے عہد میں شروع کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام سے قبل یمن کا علاقہ ایران کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ دورِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں یمن کے گورنر نے اسلام قبول کر کے مدینہ کی حکومت کی باجگزاری تسلیم کر لی تھی۔ ایران کے حاکموں کو یہ ناگوار گزرا اور انہوں نے خلیفہ اوّل کے عہد میں جنگ کا آغاز کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ سرحدی قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا اور انہیں ایرانی حکومت تنگ کر رہی تھی حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو ان عرب قبائل کی مدد کے لیے بھیجا تاکہ وہ ایک زبردست مملکت کے ہاتھوں محفوظ رکھے جاسکیں۔

حضرت عمرؓ نے عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد اپنی توجہ پہلے عراق کی طرف مبذول کی۔ تاریخ دان اس کی وجہ نہیں بتاتا مگر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایران نے رومیوں کے خلاف ناکام رہنے کے بعد اور یمن وغیرہ کے علاقے کھو جانے کی وجہ سے اسلامی مملکت کو کمزور سمجھتے ہوئے اس کی سرحدوں پر حملے شروع کر دیے تھے اور ان سرحدوں کو محفوظ کرنے کے لیے حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے اسی طرف توجہ دینے کا فیصلہ کیا اس خصوصی توجہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عراق عرب کے جو علاقے ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں فتح ہو چکے تھے ان میں بھی بغاوت پھیلنے کے خدشات پیدا ہو رہے تھے بلکہ حضرت عمرؓ کے بھیجے ہوئے کمانڈر ابو عبیدہؓ کے پہنچنے سے قبل ہی شورش برپا ہو چکی تھی۔ اور اس فتنہ و فساد کی تہہ میں ایران کا ہاتھ نمایاں تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فوجی استخبارات (MILITARY INTELLEGENCE) کا انتظام بطریق احسن ان ہی خطوط پر قائم کر رکھا تھا جو غزواتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دوران خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے تھے سرورِ دو عالمؐ کے غزوات کی ایک خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ حضور اقدس نے فوجی استخبارات کے محکمے کو بہترین خطوط پر قائم کر رکھا تھا دشمن پورے نو سال میں ایک بار بھی حضورؐ کی غیر حاضری میں مدینہ منورہ پر حملہ نہ کر سکا، حالانکہ حضورؐ بہ نفس نفیس اپنے مقر قیادت سے غیر حاضری کی مدت

بعض اوقات چار سے آٹھ ہفتوں تک بھی رہی اور کم و بیش سات سو پچاس دن آپ مدینہ سے باہر رہے۔ اگر حضورؐ کی فوجی استحکامات میں کسی طرح کی کمی رہ جاتی تو خدشہ تھا کہ ایسے وقت آپ مدینہ سے باہر کسی مہم پر روانہ ہو جاتے جن کے دوران آپ کے دشمنوں نے مدینہ پر حملے کی تیاریاں مکمل کر رکھی ہوتیں۔ حضرت عمرؓ کی فوجی تربیت خود حضور اقدسؐ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ فوجی استحکامات کے پہلو کو نظر انداز کر دیتے۔ اس ضمن میں جو اصول حضور اقدسؐ اور فاروق اعظمؓ کی لڑائیوں سے اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جس مناسبت سے کسی ملک کی فوج کم ہو اس کی فوجی استحکامات اسی مناسبت سے محکم و برتر ہونی چاہیے تاکہ دشمن ناگہانیت کا حربہ استعمال نہ کر سکے۔

عراق کی مہم (Companion) میں جو بات خاص طور پر قابل غور ہے وہ یہ ہے۔ کہ کمانڈر اعظم نے شروع سے آخر تک محاذ پر ہر پہلو سے کڑی نگرانی رکھی۔ جب ابو عبیدہؓ شہید ہوئے اور مسلمان لشکر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تو فاروق اعظمؓ نے حضرت مثنیٰؓ کو حکم بھیجا کہ وہ عراق کے میدانی علاقہ سے ہٹ کر عراق اور عرب کے سرحدی علاقے میں ڈیرا ڈال لیں تاکہ اپنا دفاع بہتر طریق سے کر سکیں اور کمک کا انتظار کریں۔

جب دوسری بار ایرانیوں کا پلہ بھاری نظر آیا تو لام بندی کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور حضرت علیؓ کو اپنا نائب مقرر کر کے خود محاذ کی طرف روانہ ہوئے مگر صحابہ کے اصرار پر مدینہ لوٹ آئے اس کے باوجود فوج کی تنظیم اور نظم و نسق پر اس قدر کڑی نگرانی رکھی کہ طلایہ میمنہ اور میسرہ کے کمانڈر بھی خود چنے۔ یہاں تک کہ محاذ کے کمانڈر (Theatre Commander) کو احکام دیے کہ وہ راستہ میں فلاں فلاں مقام پر پڑاؤ ڈالے گا اور محاذ پر پہنچنے کے بعد میدانِ جنگ کا نقشہ مقر قیادت (Supreme Head Quarter) میں روانہ کرے گا تاکہ آئندہ کی تزویرات و تدبیرات کے متعلق تفصیلی احکام جاری کیے جا سکیں۔

لشکر کی تنظیم کچھ ایسے خطوط پر کی گئی تھی کہ آج بھی اس میں ردّ و بدل کی گنجائش نظر نہیں آتی یہاں تک کہ قاضی عساکر، سپلائی اور طبی شعبوں کے کمانڈروں کے نام بھی دربارِ خلافت

سے مقرر کیے گئے علاوہ ازیں حسابیات (ACCOUNTS) اور تراجم کے دفاتر بھی ساتھ کر دیے گئے تھے اور ان کے کمانڈر منتخب ہو گئے تھے۔

جس اضطراب سے خلیفۂ وقت نے قادسیہ کی لڑائی کے فیصلہ کا انتظار کیا اور قاصد کے انتظار میں شہر سے باہر کار مملکت میں مصروف رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں اپنی دی ہوئی ہدایات کے پیش نظر معلوم تھا کہ کن ایام میں یہ لڑائی اختتام کو پہنچے گی اس باریک بینی سے وہی سربراہ مملکت مستقبل کے واقعات کی پیش بینی کر سکتا ہے جس نے جنگ کے منصوبے اپنے علم کی بنا پر بنائے ہوں، جو اپنی افواج کی کارکردگی کے معیار اور دشمن کی عسکری خصوصیات کو کماحقہ سمجھتا ہو اور جس نے اپنی اس سمجھ بوجھ کو منصوبے بنانے کے دوران پیش نظر رکھا ہو۔

واقعات کی پیش بینی کا یہ عالم تھا کہ جو گھوڑے اور تلواریں بہترین مجاہدوں کو انعام کے طور پر عطا ہوئی تھیں وہ اس صبح کو محاذ کمانڈر کے پاس پہنچیں جس صبح کو فیصلہ کن لڑائی بپا ہوئی اور لشکر میں اعلان کر دیا گیا کہ دربار خلافت سے یہ انعامات اُن جانبازوں کے لیے بھیجے گئے ہیں جنہیں ان کو حاصل کرنے کے قابل سمجھا گیا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے عراق کے محاذ کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے شام کے محاذ سے حضرت ابوعبیدہؓ کو حکم دیا کہ وہ عراق پہنچ کر اس محاذ کو مزید استحکام دیں۔ یہ کمک عین وقت پر پہنچی۔ اُس دور کے ذرائع رسل و رسائل کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وقت اور فاصلوں کو اس خوبی سے نگاہ میں رکھنا ہر سپہ سالار کے بس کی بات نہیں۔

شام کے محاذ پر جب مسلمانوں کو امامسیہ کو چھوڑنا پڑا اور مسلمانوں کے وقار کو ٹھیس پہنچی تو حضرت عمرؓ نے مدینہ میں مجلس مشاورت کے سامنے تمام حالات رکھے اور متفقہ فیصلہ سے ابوعبیدہؓ کو مطلع کیا جو احکام اور کمک شام سے روانہ کی گئی اس کی مدد سے یرموک کی لڑائی لڑی گئی اِس لڑائی میں ایک سو "بدری" صحابہ شامل تھے۔ اور مسلمانوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔

شام کی مہم میں قیصریہ پر حملہ بھی دربارِ خلافت کے احکام کے مطابق کیا گیا تھا۔ شام کے جغرافیائی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہاں آٹھ چھاؤنیوں کا حکم دیا اور ہر چھاؤنی میں چار ہزار فوج قائم (STANDING ARMY) متعین کیا گیا۔ ان مقامات کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ کسی مقام کی بغاوت کو پڑوس کی چھاؤنیوں کی مدد سے فوراً فرو کیا جا سکتا تھا حضرت عمرؓ نے عنانِ حکومت کو اس خوبی سے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا کہ ایک زخمی کماندار کو جب بتایا گیا کہ فوج کو فتح حاصل ہو گئی ہے تو اس کے منہ سے فوراً یہ الفاظ نکلے" فتح کے لیے اللہ کا شکر ادا کرو اور عمر کو فوراً اس کی اطلاع دے دو" اور پھر یہ دلیر سپہ سالار مدام زندہ رہنے والوں میں شامل ہو گیا۔

عراق عرب فتح کرنے کے بعد حضرت عمر ہرگز نہ چاہتے تھے۔ کہ عراق عجم یا ایران کو فتح کیا جائے۔ ان کا قول تھا" کاش ہمارے اور ایران کے درمیان آگ کا دریا ہوتا! ایران کی جانب سے سرحدی جھڑپوں کی وجہ سے پہلے عراق عجم کو فتح کرنا پڑا اور پھر ۲۰ ہجری میں فیصلہ کیا۔

کہ چونکہ ایران کو فتح کرنے کے بغیر امن و سکون کی زندگی مشکل ہو گی اس لیے پورے ایران کو فتح کیا جائے۔

اب تک ایران کے ساتھ جو لڑائیاں ہوتی تھیں ان میں ایران کی طرف سے پوری مملکتِ ایران جس میں ماوراء النہر اور سندھ تک صوبے شامل تھے۔ ان کی فوجیں مسلمانوں کے بالمقابل آجاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے جب پورے ایران کو فتح کرنے کے احکام جاری کیے تو ساتھ ہی ایران کے ہر صوبے کے خلاف علیحدہ لشکر تیار کروا کر روانہ کیا تاکہ آئندہ ایران کی متحدہ قوت میدان جنگ میں مجتمع نہ کی جا سکے۔

حضرت عمرؓ کے عہد کی لڑائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دو محاذ کی جنگ کا مقصد فتوحات نہ تھا بلکہ دفاع مملکت اسلامی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس دور کی دنیا کی سب سے بڑی دو سلطنتوں کے ساتھ جنگ جاری رکھی گئی تھی اور اللہ تبارک و تعالےٰ کے اس حکم کی تعمیل کی گئی تھی جس میں فرمایا گیا ہے۔

قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم

جیسا کہ ذکر آچکا ہے رومی حکومت نے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی جنگ شروع کر دی تھی اور ایران نے حضرت ابوبکر صدیق کے عہد میں پہل کی تھی۔ حضرت عمرؓ عراق عرب کو مستحکم کرنے کے بعد آگے بڑھنا نہ چاہتے تھے،

مگر ایران کے پے در پے حملوں کی وجہ سے انہیں اپنی دفاعی تدبیروں کو ایرانی مملکت کی مشرقی حدود سے سندھ اور شمالی حدود یعنی ماورا النہر تک کے علاقوں میں امن قائم کرنا پڑا تاکہ اس فتنہ کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سدباب ہو سکے۔ اسی طرح رومی مملکت کے خلاف صرف ان علاقوں میں کارروائی کی گئی جہاں سے مملکت اسلام پر بھرپور حملہ ہو سکتا تھا شمال میں حلب کے مقام پر پہنچ کر اسلامی فوج کو روک لیا گیا اور مغرب میں مصر سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی گئی، یہ سب علاقے غیر رومی اقوام سے آباد تھے اور رومی لوگ بھی یہاں پر غیر ملکی فاتح کی صورت میں حکومت کر رہے تھے۔

غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح خلافت راشدہ کی لڑائیوں پر تحقیق کی طرف مسلمان طالبان علم اور مفکروں نے ابھی تک توجہ نہیں دی ضرورت ہے کہ دور اوّل کی تاریخ کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ اجتماعی امور میں اس دور نے فکر انسانی کو کن خطوط پر گامزن کیا تھا اور کہاں اور کیسے ان خطوط کا رخ غیر صالح سمتوں کی طرف موڑ دیا گیا۔ جب تک دور حاضر کا مسلمان اپنے اسلاف کے قائم کردہ خطوط کی جانب اپنے اجتماعی امور کا رخ نہیں موڑے گا اس کی ملی زندگی میں اطاعت خالق اور اطاعت فرستادہ خالق صلی اللہ علیہ وسلم کا عنصر شامل نہیں ہوگا ——— اس کی قومی کشتی بے ناخدا اور بے یار و مددگار ہونے کا نقشہ پیش کرتی رہے گی۔

ماہنامہ
ضیائے حرم لاہور
کے
انتہائی معیاری اور فقید المثال
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نمبر
کی اشاعتِ جدید پر ہدیۂ تبریک تہنیت
مفتی محمد زکریا تبسم خطیب غوثیہ مسلم سوسائٹی
اوسلو - ناروے

فتوحاتِ فاروقی

تحریر

میجر جنرل سرفراز خان ہلال جرأت

حیاتِ انسانی کی نشوونما کے عروج و زوال کی مسحور کن داستان میں کوئی دَور اتنا حیرت انگیز نہیں جتنا حضرت عمرؓ کا دس سالہ دورِ خلافت۔ اس دور نے نہ صرف تاریخ انسانی کی دو عظیم ترین سلطنتوں کیسار یہ اور قیصریہ کا تنزل دیکھا بلکہ اُس کی راکھ پر ایک ایسی نئی سلطنت اور تہذیب و تمدن کے نقوش اُبھرتے دیکھے جس نے معلوم دنیا کے ایک تہائی حصّے پر اپنی سچائی عدل و انصاف اور رُوحانی عظمت کے پرچم گاڑ دیے۔

اپنی پُر وقار سادگی کے باوجود عہد فاروقی کی سطوت اور جاہ و حشمت کا آفتاب اس آب و تاب سے چمکا کہ متعصّب سے متعصّب عیسائی مورخین بھی حضرت عمرؓ کو "فاروقِ اعظم" کے لقب سے یاد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ وہی فاروقِ اعظم تھے جن کی سادگی و استغناء کا یہ عالم تھا کہ جب شکست خوردہ ہرمزان کروفر سے دربارِ خلافت میں حاضر ہُوا تو آپ مسجد کے فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے تھے۔

ہرمزان جب مدینہ میں داخل ہُوا تو تاجِ مرصع اس کے سر پر تھا، دیبا کی قبا اور شاہانِ عجم کے جواہرات زیبِ تن تھے۔ کمر سے مرصّع تلوار لٹک رہی تھی درباریوں کا ہجوم اس کے جلو میں چل رہا تھا جب وہ مدینے میں داخل ہُوا تو اس نے پوچھا مسلمانوں کے

کے پادشاہ کا محل کونسا ہے؟ اُس کا خیال تھا کہ جس ہستی کے دبدبہ نے دنیا میں غلغلہ برپا کر رکھا ہے اس کا محل بھی اسی تناسب سے سج دھج کا عجیب و غریب مرقع ہو گا۔ امیرالمومنین اِس وقت مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے اور فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں ہرمزان کو شرفِ باریابی حاصل ہُوا۔

اِسلامی سلطنت کا یہ خاک نشین فرمانروا اپنی قدر و منزلت کے لیے کسی تصنع یا بے مقصد جاہ و حشم کا مرہونِ منت نہ تھا۔ اس کی عظمت کی اساس وُہ لائحۂ عمل تھا۔ جس کی رُوح پرورسادگی، خلوص اور سچائی قانونِ فطرت کے عین مطابق تھی اور جس کی ادنی سی ٹھوکر سے بکھرے ہوئے ذرے انسانی ارتقاء کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے تھے۔

یہی وہ کرشمہ تھا جس نے یوٓرپین مؤرخین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور وہ اِسلامی فتوحات کا راز پانے کی تگ و دو میں ٹھوکر پہ ٹھوکر کھاتے رہے۔ حقیقتاً اِس حیرت انگیز کرشمے کا راز صرف دو لفظوں میں پوشیدہ تھا "رُوحِ اسلام" لیکن تعصب کی تاریکی نے اُنہیں حقیقت کی روشنی دیکھنے سے محروم کر دیا تھا اُن کے نزدیک نہ صرف فتوحات کا باعث بلکہ خود فروغِ اسلام کا باعث عربوں کی "تلوار" تھی۔ اور خود عربوں کی تلوار اور بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ جب معرکہ قادسیہ سے پہلے مسلمانوں کے ایلچی مصالحت کے لیے یزدگرد کے دربار میں گئے تو مجوسیوں کو اُن کے تیروں پر تکلوں کا گمان ہوا اور یزدگرد نے اُن کی زنگ آلود اور بوسیدہ تلواروں کی طرف اشارہ کر کے کہا اسی سازو سامان کے بل بوتے پر عجم کی قوّت و سطوت سے ٹکر لینے آئے ہو؟

تعصب کی پینگیں کوئی کہاں تک بڑھائے لیکن انصاف کا تقاضا ہر صحیح العقل اور ذی شعور انسان کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس بے سروسامانی کے عالم میں اِسلام کے تیر و تلوار کے بَل بوتے پر اسلام پھیلانے کے لیے نہیں نکل سکتے تھے۔ البتہ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس بے سروسامانی کے عالم میں ہی عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی کی شاندار فتوحات کا وہ سلسلہ شروع ہُوا تھا جس کے سامنے قیصر و کسریٰ

کے تاج و تخت خس و خاشاک کی طرح بہ گئے تھے پھر ان فتوحات کا باعث اگر عربوں کی تلواریں نہ تھیں تو اور کیا تھا؟

ہم تاریخ کے اوراق میں اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غیر متعصب مورخین، خلافتِ راشدہ کے کسی دور میں جارحانہ جنگوں کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔ اس عہد کی تمام لڑائیاں دفاعی تھیں یا پھر مدافعتی تھیں۔ میرے نزدیک "دفاعی" جنگ وہ جنگ ہے جو محض دفاعی کارروائی پر مشتمل ہو اور "مدافعتی" جنگ وہ جنگ ہے جو حفظ ماتقدم کے طور پر کسی خطرے کو اس کے گہوارے میں ہی ختم کرنے کے لیے آگے بڑھ کر لڑی جائے۔

دولتِ کیساریہ و قیصریہ جزیرہ نمائے عرب کے شمال، مشرق اور مغرب میں تنی ہوئی تھیں جیسے مکڑی کا جال دونوں سلطنتیں اس وقت کی عظیم ترین قوت تھیں۔ ان کے وسائل غیر محدود تھے۔ اور ان کی عسکری قوت کی ہیبت قلوبِ عرب پر سیاہ بادل کی طرح آویزاں تھی۔ دونوں سلطنتیں توسیع پسندی کی جانب مائل تھیں لیکن ان کی فتوحات کا دھارا صحرائے عرب کے کناروں تک پہنچ کر رک گیا تھا۔

ان کی فتوحات کی ایک لہر دجلہ و فرات کی زرخیز وادیوں جسے عرب سواد کے نام سے یاد کرتے تھے سے گزر کر خلیج فارس کے غربی ساحل کے ساتھ ساتھ پھیل گئی تھی اور دوسری لہر شام و فلسطین کی سرسبز و شاداب وادیوں سے گزر کر وادی نیل کی جانب پھیلی ہوئی تھی۔

اگر درمیان میں صحرائے عرب کا بے آب و گیاہ ریگزار واقع نہ ہوتا تو دونوں قوتوں کا باہمی تصادم ناگزیر ہو جاتا۔ پھر یا تو دولتِ کیساریہ سلطنتِ قیصریہ کو دھکیل کر بحرِ روم میں پھینک دیتی یا پھر قیصریہ، دولتِ کیساریہ کو اٹھا کر بحیرۂ عرب میں ڈبو دیتی۔ اگر ایسا ہوتا تو دینِ اسلام اپنے اس گہوارے سے محروم ہو جاتا۔ جس کے قدرتی تحفظ نے اس کے پنپنے کے لیے ایک محفوظ آماجگاہ مہیا کر دی تھی اور جہاں سے ابھر کر اس کی تندو تیز لہروں نے بیک وقت دونوں کو اٹھا کر کوہِ قاف کے کوہستان پر پٹخ دیا تھا۔

تاجِ کسریٰ کا تسلط فارس، خراسان، آذربائیجان عراق عرب، عراق عجم، خوزستان اور حجر تک پھیلا ہوا تھا اور دولتِ روما کی مشرقی سلطنت قسطنطنیہ سے لے کر شام فلسطین اور مصر پر مشتمل تھی دونوں سلطنتیں اپنے نقطہ عروج سے گزر کر رُو بزوال تھیں۔ کسریٰ کے درباریوں میں تختِ کسریٰ کی وراثت کی کشمکش اپنی پوری تباہ کاریوں کے ساتھ نازک صورت اختیار کر رہی تھی۔ داخلی گروہ بندیوں اور محلاتی سازشوں نے خلفشار کی کیفیت پیدا کر دی تھی سلطنتِ رومہ میں بھی صورتِ حال اس سے کچھ مختلف نہ تھی ہرقل نے قیصرِ روم فوکاس کو قتل کر کے خود تاج وتخت پر قبضہ کر لیا تھا اس کے ساتھ ہی قیصر وکسریٰ میں توسیعِ سلطنت کے لیے باہمی جنگ چھڑ گئی تھی۔

ایران نے کیساریہ پر حملہ کر کے مصر وشام اس سے چھین لیا تھا پھر ہرقل نے ایران پر فوج کشی کی اور اپنے چھنے ہوئے علاقے واپس لے لیے اس طرح اِدھر داخلی خلفشار اور خارجی تصادم کیساریہ اور قیصریہ کو گھن کی طرح چاٹ کر رہا تھا اور اُدھر جزیرہ نمائے عرب میں قرآنِ کریم کی تعلیمات اور رسُول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ شخصیت عرب کے منتشر اور متحارب قبائل کو اخوت، اتحاد اور نظم وضبط کی کڑیوں میں جکڑ کر ایک نئی قوت کو جنم دے رہی تھیں اور صحرائے عرب کے ریگستانوں سے ایک نئی تہذیب اور نئے نظامِ حیات کے خوشے پھوٹ رہے تھے۔ یہی وہ کرشمہ تھا جس نے عہدِ فاروقی میں قیصر وکسریٰ کی بے پناہ قوتوں کو صحرانشینوں سے ٹکرا کر ایک وسیع اور ترقی پذیر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔

مہمات
عراق وشام کے فوری وجوہات

جس آگ کی بھٹی میں قیصر وکسریٰ کے تاج وتخت پگھل رہے تھے اس کی چنگاریوں سے اِسلام کی اُبھرتی قوت کے دامن کو بچانا اگر ناممکن نہ تھا تو ممکن بھی نہ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مسلمانوں پر قیامتِ صغریٰ بن کر ٹوٹا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی بھی اپنا توازن اور صبر وسکون کھو بیٹھے تھے۔ یہ صدیقِ اکبر کی متوازن اور

پُرسکون شخصیت ہی کا اعجاز تھا جس نے اِس نازک موقعے پر مسلمانوں کو مکمل انتشار میں ڈوبنے سے بچالیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ قبائل جو ابھی ابھی حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور جن کی سرشت میں اسلامی رُوح اچھی طرح سرایت نہیں کر پائی تھی مرتد ہو گئے کچھ قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اس کے علاوہ کاذب مدعیانِ نبوت نے اپنی جھُوٹی نبوت کے فتنے کھڑے کر دیے تھے۔

ان حالات کے اندر اسلام کی نوزائدہ سلطنت کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے کہ یا تو وہ خاموشی سے بڑھتے ہوئے طوفان سے دبک کر اپنے مستقبل کو تقدیر کے حوالے کر دیے یا پھر غیر متزلزل قوتِ ایمان سے سرشار ہو کر پورے وثوق سے آگے بڑھے اور طوفان کی خوفناک لہروں میں کود جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چند احتجاجی آوازوں کے باوجود دوسرے طریقہ کار پر عمل کیا جو ایک تو اُن کے ایمانِ کامل اور یقینِ محکم پر دلالت کرتا ہے اور دُوسرے زندہ رہنے کی کشمکش کے تقاضوں کا دارمدار بھی اسی پر تھا کہ جب خطرات میں چاروں طرف سے گھِر جاؤ تو نتائج سے بے پروا ہو کر بے خطر اُن میں کُود جاؤ۔ انہی حالات کے اندر جرات مند اقدامات اور استقامت آفریں ردعمل نے ہزاروں ہاری ہوئی جنگیں جیتیں اور تذبذب اور سہل انگاری نے ہزاروں جیتی ہُوئی جنگیں ہاریں۔

مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی سیاست یہ تھی کہ جو کام رسُول اللہؐ نے شروع فرمائے تھے انہیں ترک نہ کیا جائے اور جو کام آپ نے ترک فرمائے تھے انہیں اختیار نہ کیا جائے۔ چنانچہ مسند آرائے خلافت ہوتے ہی سب سے پہلا فرمان جو آپ نے صادر فرمایا تھا اور جو ایک مدافعتی تدبیر تھی کیونکہ قیصرِ روم آپ کی دعوتِ اسلام پر اس قدر برہم ہوا تھا۔ کہ اس نے اسلام کو ایک ناقابل برداشت فتنہ تصوّر کرتے ہوئے اُسے شروع ہی میں نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اِس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت ابوبکرؓ نے فتنۂ ارتداد اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کا انسداد بھی اپنی ذمہ داریوں کے اولین فرائض میں سے شمار کر لیا تھا۔ اسی زمانے

بنی عبان اور زبیان کے قبیلوں نے، جو مدینے کے قریب آباد تھے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ نے انہیں راہِ راست پر لانے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی اِن تدابیر پر بعض اکابرینِ اسلام بہت جز بز ہوئے۔ احتجاج کرنے والوں میں سے حضرت عمر پیش پیش تھے۔

اصحابِ رسُول کو شام کی مہم پر دو اعتراض تھے اوّل یہ کہ اسامہؓ نوعمر تھے۔ اوّل یہ کہ ——— اُن کی قیادت میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کا بطورِ عام سپاہی کے جانا بہت معیوب تھا۔ دوم اکابرینِ اسلام کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا، اور اُسی نے اُنہیں زیادہ متفکر کر دیا تھا کہ اگر یہ لشکر شام روانہ ہو گیا تو مدینہ، جو سلطنتِ اسلام کا دارالحکومت تھا۔ کا تحفظ مشکوک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مرتد قبائل اور منکرینِ زکوٰۃ کے خلاف لشکر کشی اسلامی لشکر کی مختصر قوت کو منتشر کر دے گی۔

حضرت ابوبکرؓ کا ردِعمل اُس راہرو منزل کا سا تھا جو اپنی منزل کو اچھی طرح پہچانتا ہو اور جس کا ہر قدم دشواریٔ منزل اور انجام سے بے نیاز ہو اور جو ایمان اور یقین کی اُس منزل پہ ہو جہاں سے منزلِ مراد صاف صاف دکھائی دیتی ہو۔ سیاسی تدبّر کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ سنگینی اقدام ہی سے حل کیا جائے اگر اس وقت حضرت ابوبکرؓ تذبذب میں پڑ کر اسلامی سلطنت کی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تو بغاوت اور اندرونی خلفشار کے شعلے پہلے سے بھی تیز ہو کر اور بھڑک اُٹھتے، اُن کی بروقت اور جرأت مندانہ لشکر کشی دُشمنانِ اسلام کے لیے اسلامی قوتِ عمل کا برملا اور واضح مظاہرہ تھا انہوں نے جتنا بڑا خطرہ مُول لیا اتنا بڑا رُعب و دبدبہ اپنے دشمنوں کے دلوں پر مسلّط کر دیا۔ جس کا نقطۂ عروج حضرت خالدؓ کی بُرق رفتار اور دہشت انگیز فتوحات تھیں۔

اس کے بعد عرب کے فتنہ پرداز قبائل پر کھل کر عیاں ہو گیا تھا کہ اسلامی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔ فتنۂ ارتداد اپنی طبعی موت مر کر فنا ہو گیا۔ کاذب مدعیانِ نبوت واصلِ جہنم ہوئے۔ منکرینِ زکوٰۃ نے توبہ کر لی اور شام میں سلطنتِ روم کا جوش و خروش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ غرض کہ حضرت ابوبکرؓ کی مدافعتی جنگی سیاست اُن کی

توقع کے مطابق کامران و ظفریاب ثابت ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ کی فتوحات نے حضرت عمرؓ کی روش میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی اور انہیں حفظِ ماتقدم کی جنگی سیاست کا مؤید و قائل بنا دیا۔ چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ نے تسخیرِ شام کا ارادہ کیا اور اہل الرائے کو بلا کر اُن کی رائے دریافت کی تو سب خاموش رہے اس پر حضرت عمرؓ کڑک کر بولے۔ "مسلمانو! آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم خلیفۂ رسول اللہ کو جواب کیوں نہیں دیتے جبکہ وہ تمہیں زندگی بخش جہاد کی طرف بلا رہے ہیں؟

عہدِ صدیقی کی لشکر آرایاں ہی دراصل عہدِ فاروقی کی حیرت انگیز فتوحات کا پیش خیمہ تھیں صدیقِ اکبرؓ کی فتوحات نے حضرت عمرؓ کی روش کو بدلا اور حضرت خالدؓ کی لافانی مہمات نے شام و عراق کی تسخیر کے دروازوں کا راستہ دکھایا تھا جن عربی النسل قبائل کے خلاف حضرت خالدؓ اور مثنیٰؓ کی تہذیبی مہمات کا آغاز ہُوا یا تو وہ تاجِ کسریٰ کے حلقہ بگوش تھے اور یا قلمروِ قیصریہ کے باجگزار تھے۔ اِن قبائل کی حمایت میں قیصر و کسریٰ کا میدانِ جنگ میں کود پڑنا اتنا ہی ناگزیر تھا جتنا اسلامی سلطنت کا اُن کی سرکوبی کے لیے نکلنا۔ یہ ایک ناگزیر تاریخی عمل تھا جس کی تہ میں اِسلام کو بزورِ شمشیر پھیلانے کے جذبے کا شائبہ تک نہ تھا۔ مسلمانوں کے سامنے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے تحفظ اور اپنی بقا کا مسئلہ تھا جب کہ قیصر و کسریٰ اپنے جابرانہ اور ظالمانہ نظام کو بہر صورت مشرقِ وسطیٰ میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا اندازِ فکر

زمانۂ جاہلیت سے لے کر مسندِ خلافت تک حضرت عمرؓ کے اندازِ فکر میں نمایاں تبدیلیاں رُونما ہوئیں اِسلام سے مشرف ہونے سے پہلے آپ عرب بھر میں ایک تندخُو، خشمگیں اور زود رنج نوجوان مشہور تھے۔ اُن کے غیظ و غضب سے دلیرانِ عرب کے دِل لرزتے تھے ان کی تنک مزاجی کا یہ عالم تھا کہ بات بات پر تلوار میان سے نکلتی تھی چنانچہ وہ کام جس کی تکمیل میں سردارانِ عرب متفقہ طور پر نکلنے سے ہچکچاتے تھے حضرت عمرؓ اکیلے ننگی تلوار اپنے ہاتھ میں لیے نکلے تھے۔ وہ عہدِ جاہلیت میں مسلمانوں کے سنگین ترین دشمن تھے۔

اُن کے نزدیک مسلمانوں کا وجود مکی نظام اور قریش کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کے لیے ایک خطرۂ عظیم تھا۔ اس لیے وہ اس کی شدید مخالفت پر کمربستہ تھے۔ لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کو ہر مصیبت اور ہر امتحان میں ثابت قدم پایا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اور جب اُن کے کان قرآن کریم کی آیات سے لذت آشنا ہوئے تو اسلام کی صداقت اور روحانی برتری بجلی بن کر اُن کے قلب و جگر پر گری اور وہ آنِ واحد میں اللہ اس کے رسول اور وحی پر ایمان لے آئے اور جب ایمان لے آئے تو ان کی تمام تر صلاحیتیں اور قوتیں اسلام کی حمایت ہی میں مرتکز ہو کر رہ گئیں جیسے پہلے اُس کی مخالفت کے لیے وقف تھیں۔

اسی طرح عہدِ صدیقی کے اوائلی دور میں وہ حضرت ابوبکرؓ کی مدافعتی جنگی سیاست سے کنارہ کش رہے اور عہدِ رسالت کی طرح اس دور میں بھی جنگ آزمائی اور شمشیر زنی سے زیادہ سیاست و مشاورت میں دلچسپی لیتے رہے۔ اسامہؓ کی لشکر کشی سے انہیں اتفاق نہ تھا۔ فتنۂ ارتداد و منکرین زکوٰۃ کی گوشمالی کے لیے وہ محتاط رویے کے حامی تھے لیکن جب خلیفۂ اوّل کی جنگی سیاست کامیاب رہی اور فتح و نصرت نے صدیق اکبرؓ کی پالیسی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تو حضرت عمرؓ نے صدق دل سے اپنا اندازِ فکر بدلا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اس میں جھونک دیا۔ حتیٰ کہ قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت اُن کے قدموں کو ٹھوکر میں چکنا چور پڑے ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بشارت دے رہے تھے۔

قبائل سے ابتدائی معرکہ آرائیاں

جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق میں جو تہذیبی مہمیں باغی قبائل کی سرکوبی کے لیے بھیجی گئیں ان کی مڈبھیڑ اُن بدوی قبائل سے ہوئی جو حیرہ کی ریاست میں بستے تھے۔ یا سیاسی طور پر اُس سے منسلک تھے۔ حیرہ ایک چھوٹی سی نیم عرب ریاست تھی جو دولتِ کسریٰ کی باجگزار تھی۔ یہی وہ ابتدائی مڈبھیڑ تھی جو آخر کار کسیاریہ اور قیصریہ کی تباہی کا پیش خیمہ بنی اس لیے اس کے سیاسی پس منظر پر ہم ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

جزیرہ نما کے شمال مشرقی کونے پر حیرہ کی ریاست تھی۔ جس کی حدود عراق عرب سے

ملتی تھیں۔ یہ ریاست ایرانی حکومت کے زیرِ تسلط تھی جس سے لے کر دریائے فرات کے زیریں حصّے کے مغرب میں ایک لق و دق اور بے آب و گیاہ صحرا تھا جسے عرب "صحرائے نفود" کے نام سے موسوم کرتے تھے صحرائے نفود سے لے کر دریائے فرات تک اور سطح مرتفع حیران کو شامل کر کے اس وسیع و عریض ریگزار میں بدو قبائل خیمہ زن تھے جو اپنی عادات و اطوار میں اب بھی ویسے ہی ہیں جیسے چودہ سو سال پہلے تھے۔ اِن میں سے اکثر عیسائی مذہب کے پیروکار تھے۔

جو قبائل شام کی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھے مثلاً قبیلہ غسان، وہ دولتِ رومہ کے باجگزار تھے اور جو مشرق میں عراق عرب کے ساتھ ساتھ آباد تھے۔ وہ سلطنتِ کسریٰ کے۔ یہ سب قبائل عربوں سے دوستی اور رشتے کی کڑیوں سے منسلک تھے۔ دریائے فرات کے ڈیلٹا میں وہ عرب قبائل آباد تھے جنہوں نے خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے ڈیلٹا کی زرخیز سرزمین پر کھیتی باڑی کر کے نسبتاً خوشحال زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی۔

دریائے دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ سرسبز و شاداب وادیوں کا گہوارہ تھا اور زمانہ قدیم سے استخوانِ نزاع بنا ہوا تھا۔ اِس کے بالائی حصّے کو میسوپوٹیمیا اور زیریں حصّے کو چیلڈیہ کہتے ہیں۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ زرخیز خطہ ایران کی سلطنتِ کسریٰ کے تسلّط میں تھا۔ اِس جغرافیائی خلت علت کے پیشِ نظر اسلامی سلطنت کی ابھرتی طاقت کے ساتھ دولتِ کسریٰ کا تصادم ناگزیر تھا۔ اگر اب تک عرب کے فاقہ کش اور مقہور قبائل نے کسریٰ اقتدار کے استحصالی عمل کو چیلنج نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کو متحد کرنے والی مرکزی قوت موجود نہ تھی اور نہ ہی اُن کا کوئی واضح نصب العین تھا۔

اسلام نے انہیں بہ مقصدیت عطا کی اور احساس کمتری کی بندشوں سے آزاد کیا عربوں پر اسلام کا یہی سب سے بڑا احسان تھا۔ عربوں نے اسلام کو بزورِ شمشیر نہیں پھیلایا تھا۔ (جس کا پرچار عیسائی مؤرخین ہمیشہ کرتے آئے ہیں) بلکہ اسلام نے اپنے روحانی اعجاز اور انقلاب انگیز پیغام سے عربوں میں وہ روح پھونک دی تھی جس نے انہیں قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کا مالک بنا دیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نوشیروان عادل کا پوتا پرویز تخت نشین تھا۔ وہ ایران کا آخری تاجدار تھا جس نے کسروی سلطنت کی سطوت و سالمیت کو برقرار رکھا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد دفعتاً ابتری پھیل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے حکومت کا شیرازہ متزلزل ہو کر رہ گیا تھا۔ دولتِ کسریٰ کو خانہ جنگیوں اور تخت نشینی کی رقابتوں و سازشوں نے اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا۔ یورپی مورخین نے اسلامی فتوحات اور قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے زوال کا سبب اسی خانہ جنگی کو قرار دیا ہے۔

بیشک یہ امر بھی عہد فاروقی کی فتوحات میں بہت ممد رہا لیکن ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ دیگر وجوہات اس سے کہیں زیادہ وجیہہ اور موثر تھیں۔ حضرت مثنیٰ جو بنی وائل کے سردار تھے اور تسخیر عراق کے بنیادی محرک وہی تھے۔ قبولِ اسلام سے پہلے عیسائی تھے۔ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو اُن کی ترغیب و تبلیغ سے اُن کا سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا اس کے بعد قبیلہ وائل پر اور خود حضرت مثنیٰ پر چاروں طرف سے مخاصمت اور مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ مثنیٰ بذاتِ خود جنگی مہارت میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ اُنہوں نے مخالفین کی جارحیت کا ترکی بہ ترکی جواب دیا لیکن جب چاروں طرف سے مخالفت کی گھٹائیں امڈ آئیں تو انہوں نے خلیفۂ اوّل سے مدد کی درخواست کی۔

اس وقت حضرت خالدؓ فتنۂ ارتداد کا انسداد کر چکے تھے معرکۂ یمامہ کی شاندار فتح نے اسلامی مرکز کے تحفظ اور سالمیت کی ضمانت مہیا کر دی تھی اِس لیے حضرت ابوبکرؓ نے نبی وائل کی دادرسی کے لیے حضرت خالدؓ کو روانہ کر دیا۔ حضرت خالدؓ اور مثنیٰ کا ایک ہی کمان میں یکجا ہونا اس دور کی فوجی قیادت کا بہترین الحاق تھا جس کے سامنے قبائلی مزاحمت کا بند خس و خاشاک کی طرح بہ گیا۔

عراق عرب کے ایرانی گورنر نے اپنے مطیع قبائل کی حمایت میں صف آرائی کی مگر عبرتناک شکست کھائی۔ خالد نے عراق عرب کے تمام سرحدی اہم مقامات فتح کر لیے اور حیرہ پر جو کوفہ سے چند میل پر واقع ہے۔ قبضہ کر لیا۔ جس سرعت سے فتوحاتِ عراق حضرت خالدؓ اور مثنیٰ کے قدم چوم رہی تھیں اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت خالدؓ کو عراق سے

شام منتقل نہ کر دیا جاتا تو تسخیر عراق و ایران کا عمل وقت سے پہلے مکمل ہو جاتا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ربیع الثانی ۱۳ھ (۶۳۴ ع) ہجری میں حضرت خالدؓ کو اُن کے لشکر سمیت شام بھیج دیا اور فتوحاتِ عراق کا دھارا سرِ دست رُک گیا۔

حضرت خالدؓ کی روانگی کے بعد عراق میں اسلامی فوج بہت کمزور ہو گئی تھی اُدھر ایرانی حکومت نے حیرہ کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے بہت بڑا لشکر اکٹھا کر لیا تھا۔ حالات کو مخدوش پاکر مثنیٰؓ نے وہی کیا جو ایک آزمودہ کار جرنیل کو کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے اپنی مختصر فوج کے منتشر اجزا کو مجتمع کیا اور صحرائے عرب کو پشت میں رکھ کر قلعہ بند ہو گئے اور ایرانی حملے کا انتظار کرنے لگے اس کے ساتھ ہی مثنیٰ حضرت ابوبکرؓ کو کمک بھیجنے پر رضامند کرنے کے لیے مدینہ روانہ ہو گئے۔

صدیقِ اکبرؓ عراق کی تشویش ناک صورتِ حال سے غافل نہ تھے چنانچہ انہوں نے اپنی علالت میں موت کے پیغام کا اشارہ پاکر حضرت عمرؓ کو فرمایا "عمرؓ میں جو کچھ کہتا ہوں۔ اُسے غور سے سُنو اور اس پر عمل کرو۔ مجھے اُمید ہے کہ میں آج ہی دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا۔ اگر میں مر جاؤں تو شام سے پہلے پہلے مثنیٰ کو کمک دے کر رخصت کر لینا اور اگر رات ہو جائے تو صبح سب سے پہلے یہی کام کرنا۔ اگر اللہ شام میں ہمیں فتح بخشے تو خالدؓ کی افواج کو عراق واپس بھجوا دینا کہ اس فوج میں عراق کے بڑے بڑے صاحبِ اثر سردار موجود ہیں جو اہلِ عراق پر جرات کے ساتھ حملہ کر کے انہیں مار بھگانے کی قوت رکھتے ہیں۔

مثنیٰؓ کے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی حضرت ابوبکرؓ انتقال فرما گئے تھے۔ حضرت عمرؓ پہلے ہی سے مدافعتی جنگی سیاست کے قائل ہو چکے تھے۔ لوگ جوق در جوق بیعت کے لیے آ رہے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اِس موقعے کو غنیمت جان کر مسلمانوں کو عراق کی مہم میں شامل ہونے کی دعوت دی اور یہ سلسلہ متواتر تین دن جاری رہا لیکن مسلمان شام جانے کے لیے تو مستعد تھے۔ لیکن عراق کی طرف رُخ کرنے کا کوئی نام نہ لیتا تھا اس کی وجہ تو کسریٰ کی بے پناہ قوت کا دبدبہ تھا۔ لیکن دوسری وجہ جو پہلے سے کہیں زیادہ وزنی تھی وہ حضرت خالدؓ کی

عسکری قیادت کی کشش تھی خالدؓ کی عسکری بصیرت و مہارت فتحیابی کی یقینی ضمانت تھی جبکہ عراق میں مسلمانوں کی حالت ایسی نہ تھی۔

بمشکل تیسرے روز حضرت عمرؓ اور مثنیٰؓ کے پر جوش خطبات نے اپنا اثر دکھایا۔ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن عمرو الثقفی عراق جانے کے لیے آگے بڑھے۔ ان کے بعد سلیط بن قیس نے اپنے آپ کو والنٹیر کیا اور پھر رضا کار مجاہدین کا تانتا بندھ گیا تھا۔ حضرت عمر کو جب امدادی لشکر تیار کرنے کا یقین ہو گیا تو انہوں نے بعجلت مثنیٰ کو عراق واپس بھیج دیا اور حضرت ابوعبیدہؓ کو سالار لشکر مقرر کیا۔ حقیقتاً تو عراق کی سپہ سالاری کے لیے مثنیٰ سے زیادہ موزوں و مستحق اور کوئی سالار نہ تھا۔ مثنیٰ کی فوجی مہارت اور جسارت مسلمہ تھی۔ عراق کے قبائل اور ایرانیوں کی جنگی چالوں کو ان سے بہتر کوئی نہ سمجھتا تھا۔ لیکن چونکہ ابوعبیدہؓ نے سب سے پہلے اپنے آپ کو والنٹیر کیا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے نہ صرف مثنیٰؓ کو بلکہ مہاجرین و انصار کے سب صحابہ کرام کو نظر انداز کر کے ابوعبیدہؓ کو سپہ سالاری کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ موؤرخین نے (خصوصاً عیسائی موؤرخین نے) حضرت عمرؓ کے اس اقدام کو ہدف تنقید بنایا ہے۔

اور حضرت عمرؓ کے فیصلے کو طبقاتی عصبیت اور رقابتی تعصب پر محمول کیا ہے یورپی موؤرخین نے قعقاعؓ اور مثنیٰؓ جیسے ماہرین فن جرنیلوں کو نسبتاً کم عہدے دینے اور حضرت خالدؓ جیسے عدیم المثال سپاہ سالار کی معزولی کو حالبجا بطور سند پیش کیا ہے ہم اس نقطہ نظر پر سرسری بحث کریں گے۔

اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ مدارج کے تعین میں پیمانہ اقدار کے قائل تھے اصحاب بدر کو سب مسلمانوں پر فوقیت حاصل تھی۔ اس کے بعد اہل بیت رسول کا رتبہ تھا سابقون اولون کو عام مسلمانوں پر ترجیح حاصل تھی اور مہاجرین کا رتبہ انصار سے بلند تھا۔ لیکن ان مدارج کا تعین نہ تو طبقاتی عصبیت پر تھا اور نہ حسد و رقابت پر بلکہ اس اصول پر تھا کہ سپاہ سالاران اسلام کے فرائض میدان جنگ تک ہی محدود نہ تھے۔ جیسے جیسے اسلامی فتوحات کا دائرہ آگے بڑھتا جاتا تھا، سول ایڈمنسٹریشن، سیاسی نظام کا نفاذ اور دین اسلام کی تبلیغ

کا اہم کام بھی انہی کی ذمہ داریوں میں شامل تھا جو احکامِ قرآن اور سُنتِ رسول ؐ کے عین مطابق ہونا چاہیے تھا۔

ظاہر ہے کہ اِس کام کے لیے موزوں ترین وہی لوگ تھے جنہوں نے آفتاب رسالت ؐ کی شعاؤں سے براہِ راست استفادہ کیا تھا۔ اسلامی معاشرے کی عظمت کی یہ بین دلیل ہے۔ کہ سرداری، سپاہ سالاری یا سیادت کے تقاضے نہ تو کسی اہمیت کے حامل تھے اور نہ ہی وہ کسی تفرقے کے باعث بنے۔

حضرت عمرؓ یا دیگر اصحاب کبار کی نگاہ میں مرتبے یا فتوحات کی وہ اہمیت نہ تھی جو اسلامی تعلیم کو اس کے خالص ترین رُوپ میں پیش کرنے کو تھی۔ حضرت عمر تھے کہ سعدؓ بن ابی وقاص اور ابو عبیدہؓ بن الجراح کی سپاہ سالاری حضرت خالدؓ مثنیٰ اور قعقاع جیسے عظیم المرتبت سالاروں کی عسکری عظمت اور مہارت کے اعتراف کو کسی صورت زک نہیں پہنچاتی مثنیٰ اور قعقاعؓ حلقۂ اِسلام میں تو وارد تھے۔

حادثۂ جسر

ہم نے ابو عبیدہؓ کو تازہ لشکر تیار کرنے میں سرگرم عمل اور مثنیٰ کو عراق واپس لوٹتے ہوئے چھوڑا تھا۔ جب حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنا لشکر تیار کر لیا تو خفان کے مقام پر حضرت مثنیٰ سے جا ملے اُدھر ایرانی فوج نے حیرہ کی طرف نقل و حرکت شروع کی حیرہ اور قادسیہ کے درمیانی علاقے میں نمارق کے مقام پر مخالف فوجوں کا تصادم ہُوا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد ابو عبیدہؓ کے اسلامی لشکر کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔ نمارق سے ابو عبیدہ بارسما کی طرف بڑھے جہاں ایرانی سپہ سالار جالینوس محاذ قائم کرنے کی کوشش میں تھا۔ یہاں بھی فتح و نصرت نے مسلمانوں کے قدم چومے اور ابو عبیدہؓ نے اسلامی افواج کو عراق عرب کے سرحدی علاقوں پر پھیل جانے کا حکم صادر کیا۔

جب ایرانی پایۂ تخت میں مسلمانوں کی فتوحات کی خبریں پہنچیں تو رستم جس کے ہاتھ میں فوجی قیادت تھی بہت برہم ہوا۔ رستم نے اپنے نامی گرامی سالار بہمن جادویہ

کو کثیر لشکر دے کر مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ابو عبیدہؓ پہلے ہی سے دریائے عتیق عبور کر کے ایرانی سپاہ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ بہمن بھی اپنا ٹڈی دل لشکر لے کر دریا کے اس پار پہنچا جب اُس نے میدان جنگ کا جائزہ لیا تو اُس پر عیاں ہو گیا۔ کہ جہاں اسلامی فوج فروکش تھی وہ میدان اُس کے ڈھب کا نہ تھا چنانچہ اُس نے ایک چال چلی۔ ابو عبیدہؓ کو کہلوا بھیجا۔ یا تم دریا عبور کر کے ہماری طرف آؤ یا پھر ہمیں دریا عبور کرنے دو۔ بہمن کا خیال تھا کہ ابو عبیدہ بہادر اور عزت مند سالار ہیں مگر دقیق جنگی چالوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کا اندازہ تھا کہ ابو عبیدہؓ عزت و شجاعت کے تقاضوں پر جنگی اصولوں کو قربان کر دیں گے باوجودیکہ مثنیٰ اور سلیطؓ جیسے آزمودہ کار سالاروں نے انہیں دریا عبور کر کے جنگ کرنے سے روکا لیکن انہوں نے کہا۔ کہ اسے ہماری بزدلی پر محمول کیا جائے گا اور دریا عبور کرنے کا حتمی حکم صادر کر دیا۔

ایرانیوں نے پہلے ہی سے اپنی پسند کا محاذ جما لیا تھا اور اسلامی لشکر کے لیے وہ علاقہ چھوڑا تھا جو جنگی نقل و حرکت کے لیے دشوار گزار اور مسدود تھا۔ ایرانیوں نے اپنی صفوں کے آگے ہاتھیوں کے پرے جمائے تھے جس سے مسلم کیولری نامانوس تھی انہیں دیکھتے ہی اُن کے گھوڑے بدک کر پیچھے بھاگنے لگے اور اپنی ہی پیدل فوج کو روندتے ہوئے انتشار اور سراسیمگی کا باعث بنے۔

جب حضرت ابو عبیدہؓ نے سراسیمگی کا یہ عالم دیکھا تو گھوڑے سے کود گئے اور پیدل ہی ہاتھیوں پر حملہ آور ہوئے لیکن ایک کوہ پیکر سفید ہاتھی نے انہیں روند کر شہید کر ڈالا۔ اس کے بعد اُن کے بھائی نے علم سنبھالا لیکن وہ بھی شہید ہوئے اس کے بعد ابو عبیدہؓ کے قبیلے کے سات آدمیوں نے یکے بعد دیگرے اسلامی علم اپنے ہاتھ میں لیا اور منتشر سپاہ کو اکٹھا کر کے باقاعدگی سے لڑنا شروع کر دیا۔ ٹوٹے ہوئے پل کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ خود پل کے تحفظ میں ایرانی فوج کو روکے رکھا اور بچی کھچی فوج کو واپس دریا عبور کرنے کا حکم دیا۔

گو اس لڑائی میں مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن مثنیٰ کی جنگی مہارت اور جرأت مندانہ قیادت نے لشکرِ اسلام کو کلیتاً نیست و نابود ہونے سے بچا لیا۔ مثنیٰ کو یقین تھا کہ بہمن اپنی

فتح کو مسلمانوں کی کلی شکست میں تبدیل کرنے کے لیے ان کا تعاقب کرے گا اس لیے وہ بہ سرعت تمام اپنی فوج کو ہٹا کر حیرہ لے آئے۔

اسی اثناء میں بہمن کو خبر ملی کہ ایرانیوں کے دو گروہ رستم اور فیروزان کی سرکردگی میں حصول اقتدار کے لیے برسرِپیکار ہیں۔ اس نے مثنیٰ کے تعاقب کے بجائے سیدھا مدائن کا رُخ کیا۔ یہ مہلت مسلمانوں کے لیے نعمتِ غیبی بن کر نمودار ہوئی۔ مثنیٰ نے ہر سُو قبائل عرب کی طرف اعانت کے لیے سفیر روانہ کر دیے۔ قبائل نے مثنیٰ کی دعوت قبول کر لی اور بڑی تعداد میں لشکرِ اسلام میں شامل ہونے لگے۔ ان لوگوں میں بنی مز کے عیسائی بھی شامل تھے جب ایرانیوں کو ان تیاریوں کا علم ہوا تو رستم و فیروزان سردست اپنے اختلافات کو ختم کر کے ایک لشکرِ جرار مہران ہمدانی کی سپہ سالاری میں بھیجنے پر متفق ہو گئے۔

بویب کی شاندار فتح

۱۴ھ ——— ۶۳۵ء

جب حضرت مثنیٰ کو ایرانیوں کی یورش کا علم ہوا تو وہ اپنی پسند کا میدانِ کارزار چُننے کے لیے سیدھے بویب پہنچے اور دریائے فرات کے کنارے محاذ آرائی کا سامان کیا۔ مہران بھی اپنی فوج لے کر اسی مقام پر پہنچ گیا۔ اسی اثناء میں حضرت جریر بھی حضرت عمرؓ کی ہدایات پر کمک لے کر مثنیٰؓ سے آملے۔

مہران نے معرکہ جسر کے ٹیکٹکس دُہرانے کی کوشش کی اور ایک بار پھر افواجِ اسلام کو دریا پار کر کے اپنی طرف آنے کی ترغیب دی لیکن مثنیٰ اس کے جال میں پھنسنے والے جرنیل نہ تھے انہوں نے دریا عبور کرنے سے اجتناب کیا اور ایرانیوں کے دریا عبور کرنے کا انتظار کرنے لگے۔ مہران جو جسر کی فتح یابی کے بعد خود اعتمادی کے نشے میں چُور تھا خود دریا عبور کرنے پر آمادہ ہو گیا اور دریا عبور کرتے ہی مسلمانوں پر حملے کا آغاز کر دیا معرکہ جسر کی طرح اب بھی اس کے ہراول میں ہاتھیوں کی قطاریں تھیں مثنیٰ ہاتھیوں کی ہیبت کا اثر معرکہ جسر میں دیکھ چکے تھے۔ ہاتھیوں سے نپٹنے کے لیے انہوں نے اپنے منتخب دستوں کو مخصوص ٹریننگ دی اور انہیں یہ

طریقہ کار سکھایا گیا کہ جب ہاتھی حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں تو مجاہدین اُن کا راستہ چھوڑ دیں اور دائیں بائیں اور عقب سے انہیں گھیر کر اُن کی پیدل فوج سے علیحدہ کر دیں پھر پہلے دُور سے اُن پر تیروں کی بوچھاڑ کریں اور آخر کار لمبے بھالوں اور تلوار سے اُن کی آنکھوں اور سُونڈ پر حملہ کریں اور ہودجوں کی رسیاں کاٹ کر فیل بانوں کو نیچے گرا دیں۔ اس قسم کی ٹریننگ سے یہ فائدہ ہوا کہ کم از کم غازیانِ اسلام ہاتھیوں سے نبٹنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کر دیے گئے اور ہاتھیوں کی یلغار کے ڈر کا افسوں زائل ہو گیا۔

اس کے علاوہ معرکۂ بویب میں حضرت مثنیٰ نے وہی ٹیکٹکس استعمال کیے جو حضرت خالدؓ کی قیادت میں نہایت کامیابی کے ساتھ پہلے آزما چکے تھے۔ جب ایرانی لشکر حملے کے لیے آگے بڑھا تو مثنیٰؓ نے اپنے میمنہ اور میسرہ کو اُن کے میسرہ اور میمنہ پر علی الترتیب حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جب دونوں فلینکس (FLANKS) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تو اپنی ریزرو کیولری کو لے کر اُوپر سے چکر کاٹا اور دُشمن کی بغل اور قلب پر بھرپور حملہ کر دیا جس سے دشمن کے قلب میں اَبتری پھیل گئی۔ ایرانیوں کا میمنہ اور میسرہ جو خود چند دستے لے کر صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام کی طرف بڑھے جہاں مہران کا ہیڈ کوارٹر تھا وہ مہران کے تخت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور بنی تغلب کے ایک غازی نے مہران پر جھپٹ کر حملہ کیا اور اُسے قتل کر دیا پھر اچک کر اس کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور پکارا "میں ہوں تغلب کا جوان جس نے سالارِ عجم کو قتل کر دیا ہے"۔

جب ایرانیوں نے اپنے سالار کے قتل کی خبر سنی تو سراسیمہ ہو کر فرار ہونے لگے۔ اسی اثنا میں مثنیٰ نے اپنی قیادت میں ایک دستہ لیا اور پُل پر قبضہ کر کے فرار کا راستہ مسدود کر دیا۔ یہ اقدام مثنیٰ کی جسارت، مہارت اور طرفہ قیادت کی ایک اونیٰ مثال تھی۔ ایرانیوں نے جب اپنے فرار کا راستہ مسدود پایا تو اُن کا رہا سہا نظم و ضبط بھی جاتا رہا اور بھگدڑ مکمل شکست میں منتقل ہو گئی۔

عرب مورخوں نے عجمی مقتولین کی تعداد کا شمار ایک لاکھ سے اُوپر کیا ہے اس معرکے میں عجمی لشکر کی تعداد کا اندازہ دو لاکھ اور اسلامی لشکر کا کوئی بیس ہزار ہے معرکۂ بویب

میں غازیانِ اسلام نے بہادری اور جرأت کے لافانی کارنامے سرانجام دیے لیکن حقیقتاً یہ مثنیٰ کی عسکری قیادت کے کمال کا عروج تھا جس نے مسلمانوں کی تقدیر کا دھارا شکست سے موڑ کر شاندار فتح کی طرف پلٹ دیا۔

معرکہ بویب دنیا کی فیصلہ کن اور اہم جنگوں میں شمار ہوتا ہے یہ دولتِ کسریٰ کے زوال کا آغاز تھا اور اسلامی سلطنت کے عروج کا اہم قدم۔ اس معرکے نے ایرانیوں پر اسلامی لشکر کی وہ دھاک بٹھائی کہ اس کے بعد افواجِ عجم کے قدم کبھی بھی فتح یابی کی طرف نہ بڑھ سکے۔ معرکہ بویب عہدِ فاروقی کی مہمات کا اہم ترین موڑ تھا۔ اگر معرکہ جسر کی طرح بویب میں بھی مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا یا جنگ کا نتیجہ مشکوک ہوتا تو نہ صرف یہ کہ عراق اور شام کی فتوحات کا دھارا رُک جاتا بلکہ خود اسلامی سلطنت کی سالمیت سنگین خطرے میں پڑ جاتی۔

جنگِ بویب نے مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ دولتِ کسریٰ کی ناقابلِ شکست قوت کا فسوں کاسۂ حباب کی طرح ٹوٹ گیا اور اُس کا کھوکھلا پن بے نقاب ہو کر رہ گیا۔ مسلمانوں کی عسکری قوت کا رُعب اور دبدبہ اگر تاجدارِ کسارٰیہ وقیصریہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ تو اب اُسے نظرانداز بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اس کا دُوسرا پہلو یہ تھا کہ اب عربوں اور ایرانیوں کی دشمنی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ مصالحت کے تمام امکانات ختم ہو چکے تھے۔

جس طرح معرکہ جسر کے بعد مسلمانوں کے دِل میں سپر انداز ہونے اور ایرانیوں سے دبک کر نچلا بیٹھ جانے کا خیال تک نہ ہُوا تھا۔ اِسی طرح جنگِ بویب کے بعد ایرانیوں نے بھی گھٹنے ٹیکنے کے بجائے انتقام کی پُرخطر وادی کی طرف اپنے قدم بڑھائے اِس مقام پر پہنچ کر تاریخ کا طالب علم اِسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دولتِ کسریٰ اور سلطنت اسلامی کی کشمکش تب تک جاری رہی جب تک اس زمانے کی ایرانی سلطنت کا خاتمہ نہ ہو گیا۔

معرکۂ قادسیہ

مہمات ایران کی اہم ترین لڑائی

۱۴ھ ——— ۶۳۵ء

بویب کی شکست نے ایرانیوں کو اپنی سیاسی و فوجی قوت کے بکھرتے شیرازے پر غور و خوض کرنے پر مجبور کر دیا۔ داخلی انتشار اور انحطاط کا سیلاب بلاخیز تبھی رُک سکتا تھا کہ کوئی کرشمہ معجزانہ طور پر انہیں متحد کر کے عربوں کے بپھرے ہوئے سیلاب کے سامنے بند کھڑا کرنے کے لیے آمادہ کر دے لیکن اتحاد کا خواب تب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا جب تک رُستم و فیروزان کے مابین اقتدار کی جنگ ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ رستم و فیروزان بھی صورتِ حال سے بے خبر نہ تھے۔ آخر احساسِ زیاں ہوسِ اقتدار پر غالب آیا اور رستم و فیروزان نے باہمی مشورے کے بعد خانوادۂ کسریٰ کے ٹمٹماتے چراغ کو پھر سے روشن کیا اور یزدگرد کو لا کر اس کے آبائی تخت پر بیٹھا دیا۔

بیگمات کی محلاتی سازشوں اور نسوانی اقتدار کے مایوس کُن دورِ زوال کے بعد نرینہ اور جواں سال وارثِ کسریٰ کا تخت نشین ہونا ایرانیوں کی خشک کھیتی کے لیے نئی تر و تازگی کی حیات بخش لہر لایا۔ اُمید کا جلا سڑا چمن پھر سے سرسبز و شاداب ہونے لگا۔

ایرانی اکابرین، سرخیل و عوام اپنے باہمی اختلافات بھُلا کر کھوئے ہوئے وقار اور زائل شدہ عظمت کی بازیابی کے لیے جواں سال کسریٰ کے جھنڈے کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے کم مایہ اور زبوں حال عربوں کے خلاف تنفر و انتقام کی آگ ایک دم چمک اٹھی۔ لیکن کیا تاجِ کسریٰ کے پرستاروں کو اس کا احساس بھی تھا کہ وہ عرب جنہیں وہ حقیر و زبوں حال تصور کرتے تھے اور جو صدیوں سے ایرانیوں کے باجگزار چلے آتے تھے۔ اب اسلام نے اُن کے بے حس و بے جان قالب میں زندگی کی نئی روح پھونک دی ہے جو غلامی اور محکومی کی زنجیروں کو توڑ کر اطرافِ عالم میں پھیلنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔

حضرت مثنیٰؓ کو جب ایرانیوں کی تیاریوں کا علم ہُوا، جس کی وہ پہلے ہی سے توقع

رکھتے تھے تو ان کی عسکری بصیرت نے ایک بار پھر اسلامی لشکر کو یقینی تباہی سے بچالیا۔ انہوں نے اسلامی لشکر کو ایک مقام پر مجتمع کیا اُن کی تنظیم و ترتیب مکمل کی اور ذی قار میں سمٹ کر صحرائے عرب کو اپنا بیس (BASE) بنا کر مدینہ سے تازہ کمک آنے کا انتظار کرنے لگے اِدھر مدینہ میں خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ نئے لشکر کو ترتیب دینے میں مشغول تھے جس کی قیادت کے لیے حضرت سعد بن ابی وقاص کا انتخاب ہُوا۔

لیکن حضرت سعدؓ ابھی ذی قار نہیں پہنچے تھے کہ حضرت مثنیٰؓ کا انتقال ہو گیا معرکہ جسر میں جو زخم انہیں لگا تھا وہ ابھی تک مندمل نہیں ہوا تھا۔ اور آخرکار وہی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہُوا۔

حضرت مثنیٰ کی شہادت نے تاریخ کے اس اہم موڑ پر افواج اسلام کو ایک آزمودہ کار جری اور صاحب کمال جرنیل کی خدمات سے محروم کر دیا۔ مثنیٰ کی فوجی بصیرت، مہارت اور جسارت حضرت خالدؓ کی مہارت کو بھی پیچھے چھوڑتی تھی۔ "اگر حضرت خالدؓ بن ولید کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ایک عدیم المثال سپہ سالار اور اللہ کی تلوار تھے تو مثنیٰؓ بن حارثہ کی اس اوّلیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تسخیر عراق کی بساط سب سے پہلے انہوں نے ہی بچھائی تھی۔ اُن کے سیاسی تدبر نے عربی النسل قبائل کو مذہبی اختلافات کے باوجود مجتمع کر کے اسلام کی حمایت میں دولتِ کسریٰ کے خلاف صف آرا کر دیا تھا۔

اُن کی عسکری بصیرت کا اندازہ اس وصیت سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے حضرت سعدؓ کے لیے چھوڑی تھی۔

> "ایرانیوں سے اُن کی شیرازہ بندی سے پہلے ہی فیصلہ کن معرکہ آرائی کی جائے۔ ابتدائی جنگ ایرانیوں کے ملک میں گھس کر نہ کی جائے۔ بلکہ سرحد پر کی جائے جہاں صحرائے عرب کی دشواریاں عجمیوں کے لیے مشکلات اور عربوں کے لیے مانوس میدانِ جنگ کے فوائد پیدا کریں گی۔ اگر مسلمانوں کو اللہ ایرانیوں پر غالب کر دے تو آگے بڑھنا مشکل نہ ہو گا۔ اور اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو عرب اپنے رستوں سے زیادہ واقف اور اپنی سرزمین میں زیادہ جری ہوں گے

اور ان کے لیے پلٹ کر حملہ کرنا آسان ہو گا۔

آج چودہ سو سال کے بعد واقعات کی کھلی روشنی میں کوئی ماہر جنگ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی پلان پیش نہیں کر سکتا جو مثنیٰؓ نے اپنی وصیت میں چھوڑا تھا۔ یہ امر گہری دلچسپی کا باعث ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو جو ہدایات بھیجیں وہ مثنیٰ کی وصیت سے کس قدر مطابقت رکھتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کی ہدایات یہ تھیں۔

"جب تم قادسیہ پہنچو تو اس بات کا خیال رکھنا کہ قادسیہ ایام جاہلیت سے ایران کا دروازہ ہے۔ ان لوگوں کی تمام مادی ضروریات اسی دروازے سے فراہم ہوتی ہیں۔ وہ ایک سرسبز و شاداب اور محفوظ و مستحکم مقام ہے جس کے پل اور دریا ایک فصیل کا کام دیتے ہیں۔ اس لیے تمہارے مسلح دستے ان راستوں پر ہونے چاہئیں اور باقی لوگ پیچھے کسی مقام پر۔"

ایک اور خط میں حضرت عمرؓ نے سپہ سالارِ اسلام کو قادسیہ سے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

اس دور کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ حضرت سعدؓ نے حضرت مثنیٰؓ کی بیوہ سلمیٰ سے نکاح کر لیا تھا۔ عربوں میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی عظیم المرتبت ہستی انتقال کر جاتی تھی تو اس کی عزت و تکریم کے طور پر اس کی بیوہ سے نکاح کر لیا جاتا تھا تاکہ اسے وہی عظمت و بزرگی حاصل رہے جو مرحوم کے دورِ حیات میں اسے میسر تھی۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جنگِ قادسیہ کے دوران حضرت سلمیٰ کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ پیش آتا ہے۔

یزدگرد نے جو لشکرِ عظیم مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے تیار کیا تھا اس کی کمان رستم کے سپرد تھی جو ایرانی تاریخ کا ایک عظیم ہیرو تھا۔ رستم جب اپنے ٹڈی دل لشکر کو لے کر مدائن سے روانہ ہوا تو اس کی نفری ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ تینتیس ہاتھی اس کے آگے پیچھے چل رہے تھے جن کے وسط میں شاپور کا سفید ہاتھی تھا۔ اس کے برعکس حضرت سعدؓ کی کمان میں صرف چھتیس ہزار فوج تھی۔ جو قادسیہ کے اہم فوجی مقام پر اپنے مورچے جمائے ہوئی تھی یوں دکھائی دیتا ہے کہ طاقت کے نشے، نفری کی برتری اور

ہاتھیوں کی معیت نے ایرانی ہائی کمانڈ کے ذہن کو سٹریٹجیکل مہمات کی اہمیت سے غافل کر دیا تھا ورنہ اگر رستم چاہتا تو بڑھ کر مسلمانوں سے پہلے قادسیہ پر قبضہ کر سکتا تھا۔ رستم نے قادسیہ پہنچنے میں چار ماہ لگا دیے اور سُرعت سے آگے بڑھنے میں لیت و لعل کرتا رہا اس کے برعکس مسلمان قادسیہ کی عسکری اہمیت کو اچھی طرح پہچانتے تھے جیسا کہ حضرت عمرؓ کی ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت سعدؓ نے اپنی صف آرائی اس طریقے سے کی کہ سامنے سے دریا ان کی حفاظت کر رہا۔ ایک فلینک پر خندق شاپور تھی اور پشت پر لق و دق صحرا اپنی تمام تر دشواریوں کے ساتھ پھیلا ہُوا تھا۔ مقام جنگ کا انتخاب ہی مسلمانوں کی فتحیابی کے لیے ایک اہم امر بنا۔ رستم نے قادسیہ پہنچنے میں چار ماہ صرف کر دیے تھے۔ دراصل وہ مسلمانوں سے ٹکر لینے سے آخری دم تک کتراتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طویل عرصے میں مسلمان رسد و رسائل کی دشواریوں سے گھبرا کر خود بخود ہی منتشر ہو جائیں گے۔

آخر کار دریا عبُور کر کے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ اُس نے پل پر سے دریا عبُور کرنے کی اجازت چاہی اور اجازت نہ ملنے پر ایک دُور مقام سے دریا عبُور کیا۔ رستم کی صف آرائی وہی تھی۔ جو اس وقت عموماً رائج تھی۔ وسط میں "قلب" تھا۔ جس میں ہاتھی تھے۔ دائیں اور بائیں فلینک پر میمنہ اور میسرہ کی فوجیں تھیں۔ کیولری اور کچھ پیدل فوج کو بطور ریزرو پیچھے رکھا گیا تھا رستم خود قلب کے وسط میں ایک زرنگار تخت پر بیٹھا تھا جس پر چتر سایہ کیے ہُوئے تھا۔

عرب سپہ سالاروں کا یہ قاعدہ کلیہ تھا کہ وہ جنگ میں گھوڑے کی زین پر بیٹھتے تھے۔ لیکن جنگِ قادسیہ میں حضرت سعد عرق النسا کے مرض میں مُبتلا تھے۔ وہ دریا کے کنارے ایک ایرانی محل پر بیٹھے جنگ کی قیادت کر رہے تھے۔ وہ سینے کے بل تکیے کا سہارا لیے اوندھے پڑے پرچوں پر لکھ لکھ کر اپنے احکام میدانِ جنگ میں پہنچا رہے تھے۔

قادسیہ کی جنگ تین روز متواتر جاری رہی۔ ہر ایک دن قیامتِ صغریٰ کا نمونہ تھا۔ دونوں فریق اس بے جگری سے لڑے کہ عرب مورخین نے ہر ایک دن کی جنگ

کو علیحدہ علیحدہ نام دیا ہے دونوں فریق پر یہ امر عیاں تھا کہ معرکہ قادسیہ کے نتیجے سے عجمی اور اسلامی اقتدار کے انجام کا فیصلہ ہو جائے گا۔ معرکہ قادسیہ دُنیا کے اُن اہم ترین معرکوں میں شمار ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے عقب میں نئے سیاسی نظام کی بنا ڈالی اور انسانی زندگی کے ہر شعبے پر گہرے نقوش چھوڑے۔

جنگ کا آغاز ایرانیوں کی جانب سے ہُوا جب دستور انہوں نے سب سے پہلے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا اور اپنی پیدل فوج سے بھرپور حملہ کیا جس کا ہر سپاہی سرتاپا آہنی زرہ میں غرق تھا۔ عرب گھوڑے مہیب ہاتھیوں کو دیکھ کر بدک کر پیچھے ہٹے۔ اسلامی فوج میں ابتری پھیل گئی اور ایرانی فوج نے جھپٹ کر عربوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ایرانیوں کا زیادہ دباؤ بنی اسد کے قبیلے پر تھا۔ حضرت سعدؓ محل کی بالکونی میں لیٹے اور شدتِ درد سے کراہتے یہ سب نظارہ دیکھ رہے تھے۔

مسلمانوں کی جرأت و پامردی کے ناقابلِ فراموش کارنامے پہلے دن کی جنگ میں کسی امید افزا انجام کی بشارت نہ دے سکے دُوسرے دن کی جنگ شروع ہونے سے پہلے امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر چھ ہزار مجاہدین پر مشتمل کمک ہاشمؓ بن عتبہ کی قیادت میں شام سے بھیجی گئی۔ ہاشمؓ نے قعقاعؓ بن عمرو کو مقدمۃ الجیش کا کمانڈر بنا کر پہلے روانہ کر دیا۔

یہ وہی قعقاعؓ ہیں جن کے متعلق صدیق اکبرؓ نے ایک مہم کے دوران کہا تھا۔ جس لشکر میں اِن قعقاعؓ جیسا جانباز موجود ہو وہ لشکر شکست نہیں کھا سکتا" قعقاعؓ بھی مثنیٰ کی طرح حضرت خالدؓ کی جنگی تربیت کے فسوں کارانہ اعجاز کا کارنامہ تھے۔

جب رات کی تاریکی دوسرے دن کی صبح کے سرمئی نور میں تحلیل ہونے لگی تو اُفق پر قعقاعؓ کا لشکر نمودار ہُوا جو صرف ایک ہزار کی نفری پر مشتمل تھا۔ قعقاعؓ نے جنگ میں شامل ہوتے ہی جنگی ٹیکٹکس میں ایک انوکھا عنصر شامل کر دیا۔ اور اپنی ولولہ انگیز قیادت سے لشکرِ اسلام میں بجلی کی نئی لہر دوڑا دی۔ انہوں نے اپنی ایک ہزار کی مختصر جمعیت کو دس حصوں میں منقسم کر دیا تھا۔ اور انہیں حکم دیا تھا کہ جب تک ایک دستہ نظروں سے اوجھل

نہ ہو جائے۔ دوسرا دستہ آگے نہ بڑھے جب ہر ایک دستہ حملہ کرنے کے مقام پر پہنچتا تو نعرۂ تکبیر کے دل ہلا دینے والے نعروں کے شور میں قعقاعؓ اُن کی قیادت کرتے اور دشمن پر ٹوٹ پڑتے۔ قعقاعؓ کی یہ چال دشمن کے دل و دماغ پر بجلی بن کر ٹوٹی ایرانیوں اور خود عربوں پر اس کا یہ تاثر ہوا کہ اسلامی سپاہ کو کثیر التعداد کمک پہنچ رہی ہے اس سے ایرانیوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں اُمید کے دیے جگمگا رہے تھے۔

دوسرے دن کی جنگ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ جسے مؤرخین نے اپنے مخصوص انداز میں نہایت دلچسپی سے پیش کیا ہے قابل ذکر ہے اِس واقعہ سے لشکر اسلام کے ہر سپاہی کے جوش جہاد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ الو محجن سرزمین عرب کے مشہور و معروف سپہ سالار تھے جنہیں جنگ کے دوران حضرت سعدؓ نے شراب نوشی کے جرم میں قید کر دیا تھا

جب معرکہ کارزار گرم ہوا۔ اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے اُلو محجنؓ کے کانوں سے ٹکراتے لگے تو وہ پا بہ زنجیر حضرت سعدؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جہاد کی اجازت چاہی لیکن انہوں نے جھڑک کر واپس کر دیا۔ الو محجنؓ وہاں سے مایوس ہو کر سلمیٰ زوجہ سعدؓ کے پاس پہنچے اور درخواست کی کہ وہ ان کی بیڑیاں کھول دیں اور حضرت سعدؓ کا " بلقا " نامی گھوڑا سواری کے لیے دیں اور قسم کھائی کہ اگر زندہ رہا تو خود بخود لوٹ کر بیڑیاں پہن لوں گا۔ اُنہوں نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ الو محجنؓ اچک کر بلقا پر سوار ہو گئے اور برق رفتاری سے ایرانیوں پر ٹوٹ پڑے وہ جس طرف کا رُخ کرتے تھے۔ دشمن کو گاجر مُولیوں کی طرح کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے تھے لوگ اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ دیکھ کر دم بخود تھے لیکن شاہسوار کو پہچاننے سے قاصر تھے حضرت سعدؓ جو یہ منظر دیکھ رہے تھے بے اختیار پکار اٹھے۔ بخدا حملے کا انداز الو محجنؓ کا ہے۔ اگر الو محجن قید میں نہ ہوتا تو میں کہتا یہ الو محجنؓ ہے اور اس کی سواری میں بلقا ہے۔

جب شام کی سیاہی نے میدانِ جنگ پر خاموشی کے پردے ڈال دیے تو الو محجنؓ واپس

لوٹ آئے اور زندان میں داخل ہو گئے جب حضرت سعدؓ نیچے اُترے تو بلقا کو پسینے میں شرابور پاکر بہت متحیر ہوئے جس پر سلمیٰؓ نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ حضرت سعدؓ نے بیساختہ کہا "واللہ میں ایسے مجاہد کو ایک لمحے کے لیے بھی زندان میں نہیں رکھ سکتا۔

رات گئے تک دوسرے دن کی جنگ جاری رہی لیکن جب رات کی تاریکی نے دوست دشمن کی تمیز کرنا ناممکن بنا دی تو تلواریں میان میں کر دی گئیں۔ دوسرے دن کی جنگ کا پلّہ بلا شک وشبہ مسلمانوں کے حق میں بھاری رہا۔ قعقاعؓ کی ولولہ انگیز قیادت نے جنگ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

اُن کی جدّت پسند فطرت نے دشمن کو اچنبھے میں ڈالنے اور اُسے دھوکے میں رکھنے کے لیے کئی راہیں نکال لی تھیں۔ اُن کی اختراع پسندی کی ایک مثال یہ ہے کہ ہاتھیوں کے بدل کے طور پر اپنے قبیلے کے اُونٹوں پر خیمہ نما جھول ڈال کر اُن پر برقعے اوڑھوا دیے تھے۔ اور یہ عجیب الخلقت منظر ہاتھیوں سے بھی زیادہ وحشت انگیز تھا جس نے ایرانی کیولری کی صفوں میں تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ ان اُونٹوں کے ہاتھوں ایرانی فوج کا وہی حشر ہُوا۔ جو یومِ ارماث میں ہاتھیوں کی وجہ سے عربوں کا ہوا تھا۔

دُوسرے دن کی کارروائی پر حضرت سعدؓ نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور چین کی نیند سوئے لیکن قعقاعؓ اُس رات جاگتے رہے۔ انہیں دشمن کو دھوکہ دینے کی نئی ترکیب سُوجھی۔ رات کی تاریکی میں انہوں نے اپنے تھکے ماندے اور زخموں سے چور جتھے کو نہ تو سستانے کا موقع دیا اور نہ ہی زخموں کی مرہم پٹی کرنے دی۔ ان کے سامنے اِس وقت ان سے کہیں اہم اور سنگین تقاضے اُن کی عسکری صلاحیت کے لیے چیلنج بنے ہوئے تھے۔

قعقاعؓ نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا تھا کہ تیسرے روز کی جنگ ہار جیت کے بغیر ختم نہیں ہونی چاہیئے حصولِ مقصد کے لیے انہوں نے ان دو جنگی اصولوں پر عمل کیا جنہوں نے بسا اوقات جنگوں کی حیران کُن تاریخ میں کم تر فوج کو بیشتر فوج پر فتحیاب کروایا تھا۔ اُن کا پلان دھوکے (DECEPTION) اور اچنبھے (SURPRISE) پر مبنی تھا جس کا مقصد دشمن کے دل و دماغ کو ماؤف کرنا تھا۔ انہوں نے رات کے پردے میں اپنی زیرِ کمان

سپاہ کو اسی مقام پر واپس بھیجا جہاں سے وہ اس دن صبح کے وقت نمودار ہوئے تھے اور انہیں حکم دیا کہ پو پھٹتے ہی ایک دستے کے بعد دوسرا دستہ نعرہ تکبیر بلند کرتا ہوا اور گرد و غبار اڑاتا ہوا میدانِ جنگ میں نمودار ہو اس ترکیب کا اثر وہی ہوا جس کی قعقاعؓ کو توقع تھی۔ عربوں اور ایرانیوں دونوں نے اسے تازہ دم کمک سمجھا۔ ایرانیوں کے حوصلے پست ہوئے اور عربوں نے نئے عزم اور نئے حوصلے سے سرشار ہو کر ایرانیوں پر بھرپور حملہ کر دیا اور اس جوش و خروش سے لڑے کہ جس طرف بھی جھپٹے قتل و غارت پھیلاتے نکل گئے۔ اسی اثناء میں ہاشم بن عتبہ بھی تازہ کمک کے ساتھ قعقاعؓ سے آملے۔

جب تیسرے دن کا سورج ڈوبا تو پہلے دو دن کے برعکس جنگ بند نہ ہوئی۔ بلکہ رات بھر خونریز ہنگامہ جاری رہا۔ دونوں فریق مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ کہ جنگ کا فیصلہ کر کے ہی تلواریں نیام میں کریں گے۔ مورخین نے اس رات کو "لیلۃ الہریر" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چوتھے روز کی صبح تک بھی فتح نے کسی فریق کے پرچم سے دامن وابستہ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ قعقاعؓ کی جسارت اور تنوع پسند جنگی چالوں نے ایرانیوں پر حتمی وار کر کے فتح و نصرت کا دامن اپنی طرف کھینچ لیا۔ انہوں نے خالدؓ کے مرغوب ٹیکٹکس پر عمل کر کے جنگ کو مسلمانوں کے حق میں ختم کر دیا۔

قعقاعؓ نے ایرانیوں کے میمنہ اور میسرہ پر بیک وقت شدید حملے کر کے انہیں دریا کی طرف دھکیلنا شروع کیا حتیٰ کہ ایرانی قلب کی سپاہ اُن کی اعانت کے لیے بڑھی اور قلب کی صفوں میں رخنہ پڑ گیا جسے قعقاعؓ کی عقابی نگاہوں نے بھانپ کر قلب پر بھرپور حملہ کر دیا جس کا مقصد رستم کے تختِ زرنگار تک پہنچنا تھا۔ مجاہدین اسلام مارتے دھاڑتے اور قلب کی صفوں کو چیرتے تختِ رستم تک جا پہنچے۔ جب رستم نے یہ منظر دیکھا تو تخت سے اتر کر مردانہ وار جنگ کی بھٹی میں کود گیا حتیٰ کہ ہلال نامی شخص تخت پر چڑھ کر پکارا۔ "ربِ کعبہ کی قسم میں نے رستم کو قتل کر دیا۔ اس اعلان نے ایرانیوں کی توجہ رستم کے تخت کی طرف مبذول کی تو تخت کو خالی پا کر بھاگ کھڑے ہوئے اس طرح قعقاعؓ کی جدت طرازی نے ڈرامائی انداز میں مہماتِ ایران کی اہم ترین جنگ کا عربوں کے حق میں خاتمہ کر دیا۔ گو حضرت سعدؓ سالارِ لشکر تھے۔ لیکن معرکہ قادسیہ کے حقیقی ہیرو قعقاعؓ ہی تھے۔

معرکۂ قادسیہ کا شمار دنیا کی اہم ترین جنگوں میں ہوتا ہے اس جنگ نے دولتِ کسریٰ کے اقتدار کے زوال کی پہلی اور آخری گھنٹی بجائی اور اس پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کی سسکتی ہوئی رُوح پھر کبھی عروج کے زینے پر قدم نہ جما سکی اس معرکے نے بے سروسامان مُسلمانوں کے اُبھرتے اقتدار کو دُنیا کے سامنے یوں پیش کیا کہ اُس کی ایک ہتھیلی پر شاہانِ کسریٰ کا تابعدار تاج تھا اور دُوسری ہتھیلی پر دولتِ قیصریہ کا مرصع تخت یہ وہ جنگ تھی جس کی گرہ میں ایک ایسا نظام جس نے انسانی زندگی کے رُوحانی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی اقدار پر انقلابی تغیرّ بپا کیا جس کی لہریں کرۂ ارض کے دور دراز گوشوں میں محسوس ہونے لگیں۔

فتح مدائن

۱۵ھ ———— ۶۳۶ء

معرکۂ قادسیہ کے بعد مدائن جو دولتِ کسریٰ کا پایۂ تخت تھا۔ پکے ہوئے پھل کی طرح مسلمانوں کی جھولی میں گرنے کے لیے تیار تھا۔ ایرانی فوجی قوت منتشر ہو کر تین حصّوں میں بٹ چکی تھی۔ فیروزان نہاوند جا کر قلعہ بند ہُوا۔ ہرمزان نے اہواز میں پناہ لی اور مہران نے مدائن جا کر دم لیا۔ جنگی نقطۂ نظر سے حضرت سعدؓ کو شکست خوردہ اور منتشر ایرانی فوج کا تعاقب کرنا چاہیے تھا لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر انہوں نے قادسیہ میں ہی قیام کیا۔ ہو سکتا ہے کہ سعدؓ اس وقت تک کُوچ نہ کرنا چاہتے ہوں۔ جب تک کہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو جائیں۔ بعض روایات میں یہ بھی درج ہے کہ امیر المومنین نے خود انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا تھا تاکہ بعد کا مرحلہ مکمل تیاری کے بعد شروع کیا جائے۔

فتح مدائن گو بذاتِ خود ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے لیکن قادسیہ کی فیصلہ کن جنگ کے بعد اس کا ظہور پذیر ہونا لازمی امر تھا۔ ایرانی فوج اس قدر دل برداشتہ ہو چکی تھی کہ مدائن کا دفاع محض ایک رسمی کارروائی بن کر رہ گیا تھا۔ یزدگرد مدائن کی جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ری بھاگ گیا تھا اور ایرانی فوج کے لیے اپنے دارالحکومت کے

تحفظ کے لیے جانیں قربان کرنے کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ مدائن پر قبضہ کرنے کے بعد عراقِ عرب کی تسخیر کا کام ختم ہو چکا تھا لیکن ایرانی فوج کے منتشر دستے جا بجا مزاحمت پر تلے ہوئے تھے۔ مدائن فتح کر لینے کے لیے اسلامی فوج عراقِ عرب میں پھیل گئی اور تکریت، موصل ہیت اور قرقیسیا پر قبضہ کر لیا۔

اب عراقِ عرب کی تسخیر مکمل ہو چکی تھی اور حضرت عمرؓ کے سامنے نظام سلطنت اور دیگر بندوبستی امور کے متعلق منصوبہ بندی کا مسئلہ درپیش تھا۔ دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ زمانہ قدیم سے "بین النہرین" کہلاتا تھا۔ یہ خطہ اپنی شادابی اور زرخیزی کے باعث ہمیشہ انتخوانِ نزاع بنا رہا ہے۔ فتحِ عراق کے بعد فاتحین کی جانب سے یہ مطالبہ امیرالمومنین کی خدمت میں پہنچایا گیا کہ بین النہرین کی زرخیز اراضی عرب فاتحین کو تقسیم کر دی جائے چونکہ معاملہ اہم نوعیت کا تھا اس لیے امیرالمومنین نے اسے مجلسِ مشاورت کے سامنے پیش کیا جس میں حضرت علی اور حضرت عثمان جیسی روحِ اسلام کی شناسا ہستیاں موجود تھیں حضرت علیؓ اور ابنِ عباس کے دانشمندانہ مشورے پر امیرالمومنین نے اراضی کو فاتحین میں تقسیم کرنے کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ دینِ اسلام کے فروغ کے لیے یہ فیصلہ ایک نیک فال تھا۔ جس نے مفتوحہ اقوام کو اسلامی عدل و انصاف کا معتقد کر دیا۔ کسریٰ کے جابرانہ اور نامنصفانہ نظام کے مقابلے میں اسلامی نظام اُن کے لیے سایہ رحمت بن کر آیا اور وہ جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تجویز کے مطابق تمام ملک کا سروے (SURVEY) کرایا گیا اور ہر خطے کی اس کی زرخیزی اور پیداوار کے مطابق درجہ بندی کی گئی۔ لگان کی نئی شرح مقرر کی گئی اور کسروی نظام کی ظالمانہ اور سنگین شرح کو منسوخ کیا گیا دیرینہ اور آبائی مالکوں کو اُن کی اراضی واپس کر دی گئی۔ زمین کی فروخت پر پابندی لگا دی گئی تاکہ پرانے مالکوں کو اس ذریعے سے زمین سے محروم نہ کر دیا جائے۔ پرانی نہروں کی صفائی اور مرمت کا انتظام کیا گیا اور دونوں دریاؤں کے درمیانی علاقوں اور کناروں کے ساتھ ساتھ نئی نہروں کا جال پھیلا دیا گیا۔ زراعت کی ترقی کے لیے کثیر رقوم بطور تقاوی دی گئیں۔

یہ تھے وہ چند فوری اصلاحی وفلاحی اقدام جن پر عمل کر کے مسلمانوں نے مفتوحہ اقوام پر ثابت کر دیا کہ اسلام کے علمبردار صرف فتح ہی کرنا نہیں جانتے بلکہ اُن کا حقیقی اور دیرپا نصب العین نسلِ انسانی کی روحانی اور اقتصادی فلاح و بہبود ہے اُن کی فتوحات میں فلاح انسانی کا یہی جذبہ موجزن ہے۔ جو علاقائی گروہ بندی عصبیت اور مذہبی تعصب سے پاک ومبرّا تھا۔

عراق عرب اور شام کی فتوحات کے بعد حضرت عمرؓ کا ارادہ یہ تھا کہ اسلامی فتوحات کے سرحدیں یہیں تک ختم ہو جائیں۔ چنانچہ جب سعد بن ابی وقاص نے فارس کے علاقے اور عراق عجم میں آگے بڑھنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا۔

"کاش! سواد (عراق عرب) اور پہاڑ (ایرانی سلسلۂ کوہ) کے درمیان دیوار کھڑی ہو جائے کہ نہ وہ ہماری طرف آسکیں اور نہ ہم اُن کی طرف جاسکیں"۔

لیکن ایرانیوں کے جذبۂ انتقام اور حفظِ ماتقدم کے تقاضوں نے انہیں اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ امیر المومنین نے جب انتقام کی آگ کو بھڑکتا محسوس کیا تو اپنی عسکری قوت کو مجتمع کرنے کے لیے کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیوں کے قیام کا حکم صادر فرمایا۔

معرکہ نہاوند

دولتِ کسریٰ کا ٹمٹماتا چراغ جو گل کر دیا گیا۔

۲۱ ھ ———— ۶۴۱ ء

جب امیر المومنین کو ایران کی انتقامی سرگرمیوں کا علم ہوا تو وہ بہت متردد ہوئے۔ حضرت عمرؓ نہیں چاہتے تھے کہ ایرانیوں کے ساتھ کسی نئی جنگ کا آغاز ہو لیکن ہر دن ایرانیوں کے جارحانہ اقدام کی تازہ خبریں موصول ہونے لگیں، حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ زیادہ تذبذب عراقِ عرب کی فتوحات پر بھی پانی پھیر دے گا۔ اس لیے آپ نے نعمان بن مقرن کو تیس ہزار فوج دے کر نہاوند کی جانب روانہ کیا جہاں ایرانی سپاہ اکٹھی ہو رہی تھی۔ یہ تاج کسریٰ اور اسلامی سلطنت کی آخری ٹکر تھی۔

معرکۂ نہاوند کو عراق عجم کی فتوحات میں وہی حیثیت حاصل ہے جو قادسیہ کو عراقِ عرب کی مہمات میں حاصل تھی۔ یہ اقتدارِ کسریٰ پر حتمی اور فیصلہ کن ضرب تھی۔ اِس لیے عرب مورخین نے معرکہ نہاوند کو "فتح الفتوح" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

فیروزان سپہ سالارِ ایران کی سٹریٹجی یہ تھی کہ وہ کھلے میدان میں عربوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے نہاوند کی مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعہ بندیوں میں مورچہ بند ہو کر لڑے اس کا خیال تھا کہ ان قلعہ بندیوں سے ٹکرا ٹکرا کر مسلمان اپنی قوت زائل کر دیں گے اور وہ موقعہ پاتے ہی قلعے سے نکل کر مسلمانوں کو شکست دے دے گا۔ مسلمانوں کے لیے قلعے کو تسخیر کرنا نہایت کٹھن کام تھا۔

قلعے پر کھلے بندوں حملہ کرنا اپنے آپ کو تباہی کے غار میں دھکیلنا تھا آخر کار طلیحہ بن خویلد نے اپنی رائے ظاہر کی کہ مسلمانوں کی کچھ جمعیت کو قلعے کی طرف بڑھنے کے لیے بھیجا جائے جو چاروں طرف سے قلعے کو اپنے نرغے میں لے لے اور انہیں مشتعل کرنے کے لیے خوب تر تیر برسائے اور جب ایرانی جوش میں دلوانے ہو جائیں تو پسپائی کا انداز اختیار کرتے ہوئے انہیں تعاقب کرنے کی ترغیب دیں اور قلعے کی دیواروں سے دور لے آئیں۔ پھر چھپا ہوا اسلامی لشکر اُن پر ٹوٹ پڑے طلیحہ کی اس جنگی چال کو سب نے پسند کیا۔ اور اس نازک مگر اہم مہم کے لیے ایک بار پھر نظرِ انتخاب قعقاعؓ پر ہی پڑی۔

قعقاعؓ نے جس خوش اُسلوبی سے اِس مہم کو سر انجام دیا وہ عسکری مہارت کی ایک درخشندہ مثال ہے قعقاع نے حرف بہ حرف اِس تجویز پر عمل کیا اور نہایت کامیابی سے دشمن کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے درجہ بہ درجہ پیچھے ہٹے حتیٰ کہ ایرانی اپنی برجیوں اور قلعہ بندیوں سے دور نکل آئے۔ آن کی آن میں چھپی ہوئی اسلامی فوج بے خبر ایرانیوں پر ٹوٹ پڑی اور وہ اپنا توازن اور یکجہتی قائم نہ رکھ سکے خندق کا پُل ہجوم کے وزن سے ٹوٹ گیا جس سے ایرانیوں میں اور زیادہ خوف و ہراس اور سراسیمگی پھیلی۔ اتنے میں رات کی تاریکی نے خندق کی کھائی کو نظروں سے اوجھل کر دیا جس میں ایرانی کیولری کا بیشتر حصہ گر کر تباہ ہو گیا اس کے علاوہ ایرانی مقتولین کی تعداد اسی ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اِسلامی لشکر نے آگے

بڑھ کر اسلامی پرچم قلعے پر نصب کر دیا جو اُن کی بیّن فتح کا اعلان تھا۔
نہاوند کی شکست کے بعد یزدگرد نے رے، مرو، اصطخر میں مسلمانوں کی پیش قدمی کو روکنا چاہا مگر ناکام رہا۔ نہاوند کی شکست نے ایرانی مدافعت کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور اسلامی فتوحات کا بپھرا ہوا ریلا آذربائیجان، خراسان، فارس اور مکران کو روندتا ہوا تمام قلمروئے کسریٰ پر پھیل گیا۔

فتوحاتِ فاروقی پر ایک نظر

فتوحاتِ فاروقی نہ صرف تاریخِ اسلام کا بلکہ تاریخِ عالم کا ایک ایسا حیرت انگیز باب ہے جس پر عرب اور یورپی مورخین نے حضرت عمرؓ کے تدبر، سیاسی بصیرت، دُور اندیشی اور حسنِ تنظیم کو دل کھول کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں حسد و بغض کی بنا پر طنز و تنقید کے تیر کچھ خفیہ اور کچھ برملا، چلتے دکھائی دیتے ہیں دس سال کی قلیل مدت میں شام، عراقِ عرب، عراقِ عجم، فارس، آذربائیجان اور خراسان کی دارالحکومتوں پر اسلامی پرچم کا لہرانا حضرت عمرؓ کو دُنیا کے عظیم ترین فاتحین کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ ان فتوحات کے گرد و غبار میں اُس وقت کی معلوم دنیا کی دو عظیم ترین سلطنتوں کے تخت و تاج کی دھجیاں اُڑتی نظر آتی ہیں اور پھر یہ کرشمہ اُس قوم کے ہاتھوں رونما ہونا تھا جس کے متعلق یزدگرد نے جنگِ قادسیہ کے موقعہ پر عرب سفیروں سے حقارت میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں کہا تھا:

"میں نے دُنیا میں تم سے زیادہ بدبخت، تم سے زیادہ کم سواد، تم سے زیادہ خستہ حال کوئی قوم نہیں دیکھی جب تم سرکشی کرتے تھے تو ہم تمہاری سرکوبی کے لیے سرحدی سرداروں کو ذرا سا اشارہ کرنا کافی سمجھتے تھے۔"

پھر عہدِ فاروقی کے اِس اعجاز آفرین کرشمے کا راز کیا ہے؟ کیا یہ تاریخ کا ایک اتفاقی حادثہ تھا جس کا کوئی جواز تھا نہ تشریح؟ اگر تاریخ کے اوراق پر غائرانہ نظر ڈالی جائے تو نسلِ انسانی کے ارتقاء میں شاید ہی کوئی ایسا حادثہ رُونما ہُوا ہو۔ جو اسباب و جواز کے

سیاق و سباق سے مبرّا ہو تاریخ نام ہی عناصرِ حوادث کو اُن کے اسباب و جواز کے اٹل قوانین کی روشنی میں پیش کرنے کا ہے۔

تاریخ اسلام کے اس حیرت انگیز کرشمے کا بنیادی اور اہم ترین سبب تو وہی ہے۔ جو مغیرہؓ بن شعبہ نے یزدگرد کو اس کے طنز آمیز جملے کے جواب میں دیا تھا۔

"بے شک ہم ایسے ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ خستہ حال تھے۔ ہم بغض و عداوت اور افلاس و بدبختی کا شکار تھے پھر اللہ نے جب اپنا نبی مبعوث فرمایا اور اس نے دینِ حق کی طرف ہماری راہنمائی کی تو ٹوٹے ہوئے دل اُجڑ گئے۔ فاقہ مستی شکم سیری سے بدل گئی اور ہمیں وہ نعمتیں حاصل ہو گئیں جن سے ہمارے باپ دادا ناآشنائے محض تھے۔"

اسلامی فتوحات کا بنیادی راز بس اِس میں مخفی ہے کہ رسولِ عربی کی نظرِ کرم اور اسلامی تعلیمات نے اِن گمنام، افلاس زدہ اور کینہ پرور عربوں میں استغنا، اخوت اور ایثار کی وہ رُوح پھونک دی تھی۔ جو اگر دریا کی لہروں سے ٹکراتی تھی تو دریا انہیں راستہ دے دیتے تھے، اگر پہاڑوں سے ٹکراتی تو پہاڑ اپنی گھاٹیوں کے دامن اُن کے لیے کھول دیتے تھے اور جب آہنی دیواروں سے ٹکراتی تو دیواریں پگھل جاتی تھیں۔

ورنہ اس کے علاوہ عربوں کے مالی وسائل ویسے کے ویسے تھے۔ وہی ناداری، وہی زنگ آلود تلواریں اور وہی تیر جن پر تکلوں کا گمان ہوتا تھا۔ اگر اُن میں کوئی تبدیلی رُونما ہوئی تو وہ قوتِ ایمان کی تبدیلی تھی اور اخلاق و عادات کی پاکیزگی کی تبدیلی تھی۔ جس نے اُن کی غلامانہ ذہنیت، فرسودہ نظامِ حیات اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بپھرے ہوئے طوفان کی انقلابی رُوح عطا کی جس کے سامنے قیصر و کسریٰ کا تمام تر جاہ و حشم اور عسکری قوت خس و خاشاک کی طرح بہ گئے۔

متعصب مورخین نے قیصر و کسریٰ کے زوال کو محض خانہ جنگی اور حصولِ تاج و تخت کے لیے محلّاتی سازشوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ بیشک یہ امر بھی کئی اسباب میں سے ایک تھا۔ لیکن یہ اُس اہمیت کا حامل نہ تھا جو کلیتاً قیصر و کسریٰ کے زوال کا باعث بنی یہ دونوں

مملکتیں بیشک اندرونی شازشوں کی وجہ سے کمزور سہی مگر اتنی کمزور نہ تھیں کہ عربوں کی بے سروسامانی کے آگے اپنا سر جھکا دیتیں۔ فتوحات عراق اور شام میں سے کوئی معرکہ ایسا نہ تھا جس میں ایرانیوں کی نفری عربوں سے چار یا پانچ گنا زیادہ نہ تھی۔ پھر ایرانیوں کے مہیب ہاتھی، سر سے پاؤں تک آہنی زرہوں میں ڈوبے ہوئے سپاہی زرہ پوش گھوڑے، تلواریں نیزے، گرز، تیر و بتر عربوں سے کہیں بہتر اور موثر تھے۔ اگر عربوں کو مجوسیوں پر کوئی فوقیت تھی تو وُہ قوتِ ایمان کی تھی جو اسلامی تعلیم کی مرہونِ منت تھی اور جس کے متعلق پنولین کا قول ہے۔

"ایمان کی قوت کو مادّی قوت سے وہی نسبت ہے جو نو کو ایک سے ہے۔"

بُغض اور تعصّب کے اندھیرے محمدؐ اور قرآنِ کریم کے اعجاز کی لو کو کسی صورت مدہم نہیں کر سکتے۔

جہاں یورپین مؤرخین نے مذہب اسلام کے رُوح پرور اعجاز کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے وہاں یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ اسلامی سلطنت کی توسیع کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام کا پھلنا پھُولنا ایک قُدرتی عمل تھا اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے بے روک ٹوک پلیٹ فارم میسر ہو جاتا تھا۔ مفتوح اقوام کو دینِ اسلام کی رُوحانی، اخلاقی اور اقتصادی برتری کو مشاہدہ کرنے کے لیے بہت قریب سے موقع ملتا تھا۔ جو توہمات اور فرسودہ تہذیب سے لبریز اور مظالم سے چکنا چُور نظام کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ زنگ آلود عرب تلواروں کی قیصر و کسریٰ کی عسکری تمکنت کے سامنے کوئی حیثیت نہ تھی۔ اگر عربوں کی تلواروں کو جلا ملی تو وُہ رُوحِ اسلام کا کرشمہ تھا۔ اسلام تلوار کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ تلوار اسلام کی مرہونِ منت تھی۔

خلفائے راشدین کی خارجہ پالیسی کا رہنما اصول توسیع پسندی نہ تھی بلکہ اسلام کا پیغام اُس کے خالص ترین رُوپ میں پیش کرنا تھا۔ میں اس نکتے پر پہلے بحث کر چکا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں جو مہمات شام اور عراق بھیجی گئی تھیں وہ محض مدافعتی جنگی پالیسی کے تحت تھیں۔ حضرت عمرؓ عراق عرب کی تسخیر کے بعد اُس سے آگے کسی قسم کی پیش قدمی کے خواہاں

نہ تھے چنانچہ جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے مدائن کی تسخیر کے بعد آگے بڑھنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:-

"کاش: سواد اور پہاڑ کے درمیان ایک دیوار حائل ہو جائے کہ نہ وہ اِدھر آ سکیں اور نہ ہم اُدھر جا سکیں"

حضرت عمرؓ کا یہ بیان خلوص اور نیک نیتی پر مبنی تھا جس میں توسیع پسندانہ عزائم کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔

اگر حضرت عمرؓ کی پالیسی میں فوجی قوت کے بل بوتے پر اپنی سلطنت کی وسعت کا کوئی شائبہ ہوتا تو وہ مہمات کے سالارِ اعظم کے انتخاب میں یقیناً عسکری صلاحیتوں کو ترجیح دیتے لیکن عملاً ایسا نہ تھا۔ جہاں فتوحات شام، عراق اور فارس کے اصلی ہیرو حضرت خالدؓ مثنیٰؓ اور قعقاعؓ تھے وہاں سپہ سالاری کے فرائض حضرت سعدؓ، ابوعبیدؓ اور ابوعبیدہ کے سپرد تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ احکاماتِ قرآنی وسُنتِ رسول پر سختی سے عمل اور اسلامی تعلیم کے باعمل مظاہرے اور قرآنِ کریم کے پیغام کو اُس کے اصلی اور پاکیزہ ترین رُوپ میں پیش کرنے کو عسکری فتوحات پر ترجیح دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ کام وہی لوگ سر انجام دے سکتے تھے۔ جن کے سینے براہِ راست آفتابِ رسالت کی کرنوں سے منور تھے۔

حضرت خالدؓ جیسے عظیم المرتبت جرنیل سے جنہیں نطقِ نبوت نے "سیف اللہ"، کا لقب دیا تھا جب کچھ بے اعتدالیاں سرزد ہونے کا شبہ پیدا ہوا تو حضرت عمرؓ نے انہیں معزول کرنے میں کچھ تامل نہ کیا۔ اور اسلامی فتوحات اور عسکری مورال پر اس کے مضر اثرات کی بالکل پرواہ نہ کی اور اس بات کی بھی پرواہ نہ کی کہ ان کا یہ عمل ان کی اپنی ذات کے لیے ناخوشگوار تنقید کا باعث بنے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت خالدؓ کی معزولی کے بعد شام میں اسلامی فتوحات کا دھارا اپنی پوری تندی وتیزی سے محروم ہوگیا تھا۔ اس طرح مثنیٰ اور قعقاعؓ کو بے مثال عسکری صلاحیت کے حامل تھے۔ لیکن سابقون اولون میں سے نہ تھے اور حضرت سعدؓ کے مقابلے میں وہ روحِ اسلام کے کامل مبلغ نہ تھے۔

سپہ سالار کے فرائض محض میدانِ جنگ کی قیادت تک ہی محدود نہ تھے بلکہ فتح کے بعد

اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ اور مذہبی قیادت و تبلیغ بھی اُن کی اہم ترین ذمہ داری تھی۔ اِس سے یہ بات بلا خوفِ تردید واضح ہو جاتی ہے۔ کہ خلیفۃ المسلمین کے ذہن میں فروغِ دین کے لیے عسکری قوت کو ذریعہ بنانے کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ بلکہ اسلام کے فروغ کا دار و مدار اسلامی تعلیم کو اس کے خالص اور شفاف رُوپ میں ہی نشر کرنے کو سمجھا گیا تھا۔

بعض متعصب مؤرخین نے مالِ غنیمت کی طمع و لالچ کو بھی اسلامی فتوحات کی ایک وجہ قرار دیا ہے بیشک عرب مفلس تھے، نادار تھے اور ان کے اقتصادی وسائل مسدود تھے۔ لیکن کب سے وہ ایسے تھے؟

یقیناً زمانۂ قدیم اور تاریخ کے تاریک ترین دَور سے ان کی اقتصادی حالت خستہ چلی آتی تھی پھر طلوعِ اسلام سے پہلے وہ بھوک کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کیوں کوئی انقلاب نہ لا سکے؟ مفلسی اور ناداری اُن کو کسی منظم طاقت میں تبدیل نہ کر سکی یہ اسلام کی رُوح پرور تعلیم ہی تھی جس نے اُن کو منتشر اور گریز پا صحرائی سپرٹ کو ایک بے پناہ انقلابی قوت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس کی تلاطم خیز لہریں بیکراں ہو کر استحصالی قوتوں کے ظالمانہ نظام کو ڈبو کر ہر سُو پھیل گئیں۔

اُس زمانے میں جبکہ کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی جس کی کوئی ماہانہ تنخواہ نہ تھی۔ مالِ غنیمت کا ان کی ضروریات پُورا کرنے کے لیے تقسیم کرنا ایک ناگزیر عمل تھا اور یہ اُس زمانے کا تسلیم شدہ اور مروجہ طریقہ کار تھا۔ جس میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہ تھی۔ مالِ غنیت کی تقسیم کا انحصار شخصی لوٹ کھسوٹ پر نہ تھا۔ بلکہ بیش بہا جواہرات اور سیم و زر کے انبار بھی اِسی دیانت داری سے جمع کرا دیے جاتے تھے جیسے ایک کرم خوردہ لباس اگر ایران و عراق کی مہمات کا مقصد حصولِ زر اور امیر بننے کی تمنا ہوتی تو حضرت عمرؓ سواد کی زرخیز اراضی اصلی مالکوں کو نہ لوٹا دیتے بلکہ اپنی فاتح فوج کی تسکین کرتے مالِ غنیمت کی طمع کا الزام بھی ویسا ہی مضحکہ خیز اور بے سروپا ہے جیسے تلوار سے اسلام پھیلانے کا بہتان۔

مسلمانوں کی ظفرمندی کا دوسرا بڑا راز ان جملوں میں مضمر ہے جو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ کی قیادت میں شام کی فوجی مہم کو روانہ کرتے ہوئے کہے تھے۔

"تم میں جو شخص مارا جائے گا شہید ہوگا اور جو بچ جائے گا مدافع عن الدین ہوگا"
ان سادہ سے جملوں میں فلسفۂ حیات و ممات کا وہ فسوں پوشیدہ ہے جس کے سامنے تمام دُنیا کے مادی وسائل اور جنگی سامان کی فراوانی و برتری ہیچ ہے۔ انسان موت سے اس لیے ڈرتا ہے کہ اس کی عمرِ طبعی ختم ہو کر فنا کی نامعلوم گھاٹیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اُس کے سامنے ایک ایسا لائحۂ عمل پیش کیا جائے جس سے اُسے ابدی اور بہتر زندگی کی بشارت مل جائے۔ تو اُسے حاصل کرنے کے لیے کونسا خطرہ ہے جو وہ مول نہیں لے گا اور اگر وہ خطرات سے بچ کر زندہ رہے اور قوم کی آنکھ کا تارا بن جائے اور غازی کہلائے تو اس کی انا کی کیسی خاطر خواہ تسکین ہوتی ہے شہادت کا رتبہ موت کا رد ہے اور غازی کا لقب زندگی کا بہترین انعام۔ یہی وہ سادہ سا فلسفہ تھا جس نے مسلمانوں سے وہ کارہائے نمایاں کرائے جنہوں نے مورخین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔
ان روحانی اقدار کے اعجاز کے علاوہ مسلمانوں کی فتوحات کے محض جغرافیائی، طبقاتی اور فنی اسباب بھی تھے۔ عرب بیشک نادار تھے۔ اور زندگی کی تگ و دو میں اکثر قدرتی حوادث کے شکار رہتے تھے۔ لیکن اس ماحول نے انہیں جفاکشی، بُردباری، تحمل اور حوادث سے دلیری کے ساتھ نپٹنے کے جوہر عطا کیے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ جنگِ قادسیہ کے دوران لیلۃ الہریر کی تاریکی میں جبکہ ایرانی سپاہ جنگ کی تھکن سے چور خوابِ استراحت میں محو تھی قعقاع کی زخموں سے چور سپاہ ایک اہم جنگی چال کی تکمیل میں دُکھ اور تھکن کا سفر طے کر رہی تھی۔ عربوں کی خوراک سادہ اور بہترین حیاتین سے مالا مال تھی۔ سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ کھجور میں ہر قسم کے حیاتین وافر تعداد میں موجود ہیں کھجور عربوں کا مرغوب کھاجا تھا جو پکا پکایا مل جاتا تھا اور بھاری تعداد میں اُونٹوں پر لاد کر جنگ میں لے جایا جا سکتا تھا۔ اس طرح وہ ضخیم باربرداری کی قیود سے آزاد تھے اُونٹ کا وجود عربوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اُونٹ نہ صرف اپنے لیے اپنے وجود میں ہی خوراک اور پانی کے ذخیرے کا بہترین ریزرو رکھتا تھا بلکہ ضرورت پڑنے پر لشکریوں کے لیے خوراک اور پانی کا بہترین ڈپو تھا۔ باربرداری کے لیے وہ ایک تیز رو اور قابلِ

اعتماد ذریعہ تھا جسے صحرا کی دشواریاں بے اثر نہیں بنا سکتی تھیں۔
صحرا عربوں کا بہترین دوست اور ایرانیوں اور رومیوں کے لیے ایک ناقابل حل معمہ تھا۔ ایرانی اور رومی اس کی پہنائوں میں اپنے آپ کو گم پاتے تھے اس کے برخلاف عرب اُس کی فطرت سے بخوبی آشنا تھے۔ اُس کی دشواریوں کو جانتے تھے اس کے موسمی تغیر و تبدل کی پیچیدگیوں سے آگاہ تھے۔ اس کے غیر معین اور دشوار گزار راستوں کے چپے چپے کو پہچانتے تھے صحرا کی وسعتوں میں اُن کے اڈے محفوظ اور ناقابلِ تسخیر تھے جو ایرانیوں اور رومیوں کی دسترس سے باہر تھے۔
حضرت خالدؓ اور مثنیٰؓ نے جب عراق کی مہم کا آغاز کیا تو انہوں نے اِس بات کا خیال رکھا کہ وہ ایرانیوں کو اُن مقامات کی طرف بڑھنے کی ترغیب دیں جہاں لشکرِ اسلام کی پُشت پر صحرا کی دشواریاں تحفظ کرتی ہوں۔ اسی طرح جسر کی شکست کے بعد مثنیٰ اسلامی فوج کو سمیٹ کر صحرا کے گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اور اُسے تباہی سے بچا لیا تھا۔ حضرت سعدؓ کے لیے مثنیٰؓ نے جو وصیت نامہ لکھا تھا اُس میں اس بات کا خاص ذکر تھا کہ

"اسلامی افواج آگے بڑھنے کے بجائے سرحد پر ہی فیصلہ کن جنگ لڑیں، اگر اللہ نے انہیں فتح سے ہمکنار کیا تو آگے بڑھنا مشکل نہ ہو گا۔ لیکن اگر فیصلہ اس کے برعکس ہوا تو ایرانیوں کے لیے صحرا میں تعاقب کرنا تباہ کن ثابت ہو گا اور عربوں کا ان پر پلٹ کر جھپٹنا آسان ہو گا"

قادسیہ کے میدانِ جنگ کا انتخاب بھی اُنہیں امور کو مدِّنظر رکھ کر کیا گیا تھا۔
عرب فطرتاً اپنے صحرا کی آزاد فضائوں کی طرح مسلمہ طریقۂ جنگ کی پابندیوں سے آزاد تھے۔ وہ تیز حس تھے اور خطرات کو بھانپنے میں چھٹی حس رکھتے تھے۔ وہ حالات کے مطابق اپنے ٹیکٹکس بدلتے رہتے تھے۔ اس کے برعکس ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ کا طریقہ دقیانوسی اور معروف ٹیکٹکس کے مطابق تھا۔ وہی ہاتھی، وہی قلب وہی میمنہ و میسرہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عرب ہاتھیوں سے کس قدر غیر مانوس تھے اور اوائل

میں ہاتھیوں نے ان کی صفوں میں کس طرح انتشار پھیلایا تھا لیکن عربوں نے جلد ہی اس کا حل تلاش کر لیا اور ہاتھیوں کے رُخ ایرانیوں کی اپنی صفوں کی طرف موڑ دیئے اس کے باوجود ایرانیوں نے اپنے ٹیکٹکس نہیں بدلے ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ قعقاع نے کس طرح اپنی قلیل نفری کو بڑھا چڑھا کر میدانِ جنگ میں داخل کیا تھا۔

ایرانی پیدل فوج اور کیولری بھاری بھر کم آہنی زرہوں میں غرق ہوتی تھی جس سے اُن کے جسم بوجھل اور بھدّے ہو جاتے تھے اور سرعت و چابکدستی سے نقل و حرکت کرنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا تھا اس کے مقابلے میں گو عرب آہنی زرہوں کے تحفظ سے اکثر محروم ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ اور ان کے گھوڑے ہلکے پھلکے تھے اور تیزی سے نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ وہ تیزی سے وار بھی کر سکتے تھے۔ اور وار بچا بھی سکتے تھے۔ عربوں نے ہر معرکے میں ایرانیوں پر نقل و حرکت کی جنگ مسلّط کی اور فتح یاب ہوئے۔

عربوں میں یہ سب عسکری صلاحیتیں موجود تھیں لیکن سب کی سب دھماکے سے چھن جانے کی منتظر تھیں۔ دینِ اسلام کی رُوح افزا اور انقلاب انگیز تعلیم نے وہ دھماکہ مہیّا کیا۔ جس نے ایک طرف ان کی صلاحیتوں کو جھنجھوڑا اور دُوسری طرف اُن کے منتشر، مغلوب اور متحارب اجزا کو اخوت، اتحاد اور سالمیت کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ کر نوعِ انسانی کی فلاح اور راہنمائی کے لیے ایک متحرک اور ناقابلِ تسخیر قوت میں منتقل کر دیا۔

حضرت عمرؓ اس یلغار کی نوکِ سناں تھے جس نے باطل قوتوں کے جسد میں پیوست ہو کر انہیں نیست و نابود کر دیا تھا۔ اور ان کی راکھ پر اسلامی سلطنت کی پرشکوہ عمارت تعمیر کی تھی۔

دورِ فاروقی میں
ہلال و صلیب کی معرکہ آرائیاں

تحریر

لیفٹیننٹ کرنل فضل الرحمان

اس سے پہلے کہ حضرت سیدنا عمرؓ فاروق کے دورِ خلافت میں ہلال و صلیب کی جنگوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے یہ بہتر ہو گا کہ اُن فوجی و سیاسی حالات کا مختصراً ذکر کیا جائے جن سے سلطنتِ اسلامیہ حضرت عمرؓ کے منصبِ خلافت پر مامور ہوتے وقت نبرد آزما تھی۔ حضورؐ کا وصال جو ۱۲، ربیع الاوّل ۱۱ھ (۲۵، جون ۶۳۲ء) دوشنبہ کے دن بعد دوپہر ہوا، نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے لیے ایک سانحہ عظیم تھا۔

حضورؐ کے دورِ نبوت میں عرب کے بیشتر اور مشہور قبائل اسلام قبول کر چکے تھے مکہ فتح ہو چکا تھا۔ اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ اسلام کی اُبھرتی ہوئی طاقت کی خبریں گرد و پیش میں پھیل چکی تھیں۔ حضورؐ ایران و روم کے فرمانرواؤں کے نام دعوتِ اسلام روانہ فرما چکے تھے۔ جن کو بڑی شدت سے ٹھکرایا جا چکا تھا۔

عرب کے چند قبیلے بعثتِ نبوی سے پہلے شام کے سرحدی اضلاع میں جا کر آباد ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ شام کے اندرونی اضلاع پر قابض ہو چکے تھے یہ قبیلے غسان و جذام

کے نام سے مشہور تھے اور شام کے بادشاہ کہلاتے تھے مگر یہ ان کا خانہ ساز لقب تھا۔ درحقیقت وہ رُومی سلطنت کے صوبہ دار تھے اِن لوگوں نے اسلام سے پہلے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا ۔ ۶ھ میں جب قیصرِ روم کو دعوتِ اسلام کا خط لکھا گیا اور دحیہ کلبی (قاصد) واپس آتے ہوئے ارضِ جذام میں پہنچے تو انہی شامی عربوں نے اُن پر حملہ کیا اور مال و اسباب لُوٹ لیا۔ اِسی طرح جب حضورؐ نے حارث بن عمیر کو خط دے کر حاکم بُصریٰ کے پاس بھیجا تو عمرو بن شرجیل نے اُن کو قتل کر دیا چنانچہ اس انتقام کے لیے حضورؐ نے ۸ھ میں لشکر کشی کی اور غزوہ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔

۹ھ میں رومیوں نے مدینہ پر حملے کی تیاریاں کیں جب حضورؐ خود پیش قدمی کر کے مقام تبوک تک پہنچے تو اُن کو آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہُوا۔ اگرچہ اس وقت عارضی طور پر لڑائی رک گئی لیکن رومی اور غسانی مسلمانوں کی فکر سے کبھی غافل نہ رہے یہاں تک کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں مدینہ پر چڑھ نہ آئیں۔ اِسی حفظِ ماتقدم کے لیے ۱۱ھ میں رسُول اللہؐ نے اسامہ بن زیدؓ کو سردار بنا کر شام کی مہم پر بھیجا۔ چونکہ یہ ایک عظیم الشان طاقت کا مقابلہ تھا۔ اِس لیے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے علاوہ اور نامور صحابہ فوج کے ساتھ جانے پر مامور ہوئے۔ اسامہؓ ابھی روانہ نہیں ہوئے تھے کہ حضورؐ نے انتقال فرمایا۔

جب حضرت ابوبکرؓ مسندِ خلافت پر متمکّن ہوئے تو عرب کی یہ حالت تھی کہ وہ دونوں ہمسایہ سلطنتوں یعنی ایران و روم کا ہدف بن چکا تھا خود عرب میں فتنۂ ارتداد زور پکڑ گیا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق نے قوتِ ایمانی، استقلال و حوصلہ مندی کا بے مثل مظاہرہ کیا اور حیران کن قلیل مدّت میں فتنۂ ارتداد کا قلع قمع کر کے عرب قبائل کو دوبارہ ایک جھنڈے تلے جمع کر کے ایران و روم جیسی عظیم الشان سلطنتوں کی سرحدوں پر دستک دینے لگے۔ خلافت کے دُوسرے ہی برس یعنی ۱۲ھ میں عراق پر لشکر کشی ہوئی اور حیرہ کے تمام اضلاع فتح ہو گئے۔ آغاز صفر ۱۳ھ میں شام پر کئی طرف سے لشکر کشی کی مندرجہ ذیل افسروں کے تحت فوجیں منظم کر کے شام روانہ کیں۔

(ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۱)

حضرت ابوعبیدہؓ   حمص پر

یزیدؓ بن ابی سفیان	دمشق پر
شرجیلؓ بن حسنہ	اُردن پر
عمروؓ بن العاص	فلسطین پر

حضرت ابوبکرؓ نے جب ان افسروں کو شام پر حملے کے لیے روانہ کیا تو ان کو ہدایات دیں
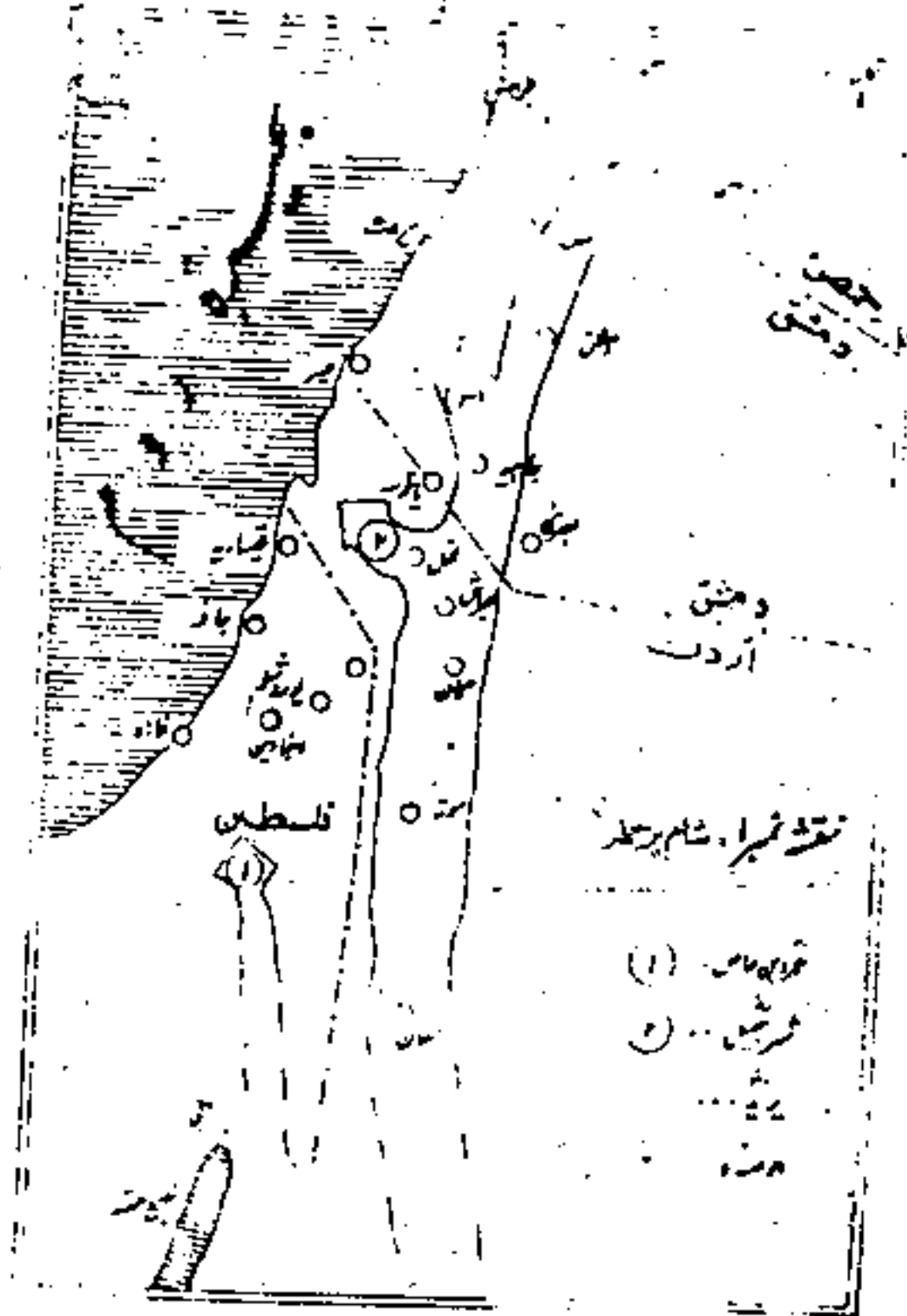
کہ اپنے علاقے فتح کرنے کے بعد وہ والی کی خدمات بھی انجام دیں گے۔ مامور کردہ علاقے میں اگر کسی دوسرے افسر کو امداد کے لیے طلب کیا جائے تو اسی علاقے کا افسر متحدہ فوجوں کا کمانڈر ہوگا۔ ہاں اگر چاروں لشکروں کو یکجا ہوکر رومیوں سے لڑنا پڑے تو حضرت ابوعبیدہؓ تمام اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف ہوں گے۔ یہ واضح احکام تھے جو فوجی نقطہ نگاہ سے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک ذی ہوش اور اولوالعزم سربراہ مملکت کے ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان لشکروں کی مجموعی تعداد چوبیس ہزار تھی۔ عرب کی سرحد سے نکل کر ان افسروں کو ہر قدم پر رومیوں کے بڑے چھوٹے منظم دستے ملے۔ اس کے علاوہ قیصر نے تمام ملک سے فوجیں جمع کرکے ان کے مقابلے میں بھیجنے کے احکام جاری

کیے اور ایک لشکرِ جرار اجنادین کے مقام پر جمع کر دیا جس کی تعداد نوے ہزار تھی۔ یہاں سے وہ فلسطین اور اُردن میں کسی طرف بھی مسلمانوں کی پیش قدمی کو روک سکتے تھے۔ تمام افسران نے حضرت ابو عبیدہ کو ان رومی افواج کی نقل و حرکت کے متعلق آگاہ کیا تین اسلامی لشکر اس وقت قریبی علاقوں میں ہی تھے۔ جن کو حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے زیرِ کمان لے لیا۔ عمرو بن العاص الگ تھلگ تھے۔ چنانچہ اُن کو بڑی تشویش ہوئی اور ابو عبیدہ سے امداد طلب کی۔

حضرت ابو بکرؓ کو ابو عبیدہؓ نے تمام حالات سے آگاہ کیا۔ شام میں حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اور اُدھر عراق میں اسلامی فوجوں کی کامیابی کے پیشِ نظر حضرت ابو بکرؓ نے خالد بن ولید کو جو عراق میں برسرِ پیکار تھے۔ حکم دیا کہ وہ نصف فوج لے کر فوراً شام کا قصد کریں اور مسلمانوں کی امداد کو پہنچیں اور آکر تمام اسلامی لشکر کی کمان سنبھال لیں نصف فوج حضرت مثنیٰ کے تحت عراق میں ہی مقیم رہی۔ حضرت خالدؓ تقریباً نو ہزار مجاہدین کو لے کر جن میں صحابۂ کرام کی خاصی تعداد تھی۔ فوجی تاریخ کے مشکل ترین پانچ روزہ سفر کے بعد جو عراق و شام کے لق و دق اور بے آب و گیاہ ریگزاروں سے گزرنے کی داستان ہے۔ دمشق پہنچے۔

حضرت ابو عبیدہؓ کو خلیفۃ المسلمین کا حکم سنایا۔ ابُو عبیدہؓ نے جو "امین الامت" کے لقب سے مشہور تھے اور مسلمانوں میں بڑے اعلیٰ منصب پر مامور تھے، خندہ پیشانی سے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے آپ کو اور اپنی تمامتر فوج کو خالدؓ کے تحت کر دیا۔

خالدؓ اور ابو عبیدہؓ نے خود پیش قدمی کر کے اجنادین پر رومن افواج کو شکست دی۔ اب فتح شام کے دروازے مسلمانوں پر کھل چکے تھے خالدؓ تمام افواجِ اسلامی کو لے کر دمشق کی طرف بڑھے۔ رُومی اس شہر کو ہر قیمت پر بچانے کی ٹھان چکے تھے۔ دمشق پہنچ کر خالدؓ نے ہر طرف سے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ اگرچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں شروع ہُوا۔ لیکن فتح حضرت عمرؓ کے عہد میں حاصل ہوئی۔

یہ پس منظر ذہن نشین کرنے کے بعد اُمید ہے کہ قارئین کرام آئندہ آنے والے واقعات اور جنگوں کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کریں گے یہاں پر یہ گوش گزار

کرنے کی جرأت بھی کرتا ہوں کہ ان جنگوں کو مورخین نے کافی الجھا کے پیش کیا ہے۔
خصوصاً جنگوں کی وقوع پذیر ہونے کی تاریخوں، فوجوں کی تعداد اور طریقہ جنگ وغیرہ میں فوجی و تاریخی نقطۂ نگاہ سے بہت تضاد پایا جاتا ہے۔ باوجود اس کمی کے ان جنگوں کے نتائج پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس لیے حالات کو سمجھنے اور مسلمانوں کو فتح و نصرت کو حقیقت پر مبنی تصور کرنے میں کوئی خاص وقت پیش نہیں آتی۔ بہر حال میں نے جو تفصیلات مضمون میں درج کی ہیں وہ کثرت رائے پر مبنی ہیں۔
واقعات کی ترتیب کے اختلاف پر مختصراً مضمون کے آخر میں خیالات لکھ دیے ہیں۔

اہم نکتہ

جس کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم اور موجودہ دور کی جنگوں میں اگر ذرائع رسل و رسائل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اپنے اپنے دور میں یہ مخصوص انداز میں اثر پذیر ہوتے آئے ہیں۔ زمانۂ حاضر کی ایجادات نے رابطے کے جو ذرائع عالم انسانیت کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ ان کی وجہ سے جنگی کارکردگی میں انقلاب عظیم برپا ہوا ہے۔ آج سینکڑوں بلکہ ہزار ہا میل کے فاصلے پر رہتے ہوئے بھی ماتحت افواج کے ہر شعبہ سے براہ راست تعلق قائم رکھنا آسان ہے اور احکام آناً فاناً اور فرداً فرداً ہر سمت اور ہر گوشہ میں پہنچ سکتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ایک کمانڈر میدان جنگ کے دور دراز اور کسی بھی حصے میں بہ نفس نفیس منٹوں اور گھنٹوں میں وارد ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حسن انتظام کی خوبیوں کی کی وجہ سے جہاں اعلیٰ کمانڈروں کو لمحہ بہ لمحہ حالات کی خبر ملتی رہتی ہے۔ وہاں ماتحت افراد کو بھی بھروسہ رہتا ہے کہ اُن کی ہر ضرورت بہر حال اعلیٰ حکام کو معلوم ہوتی رہتی ہیں۔
ساتھ ساتھ ماتحت افراد اور تنظیموں کو چوکنا رکھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سربراہ مملکت سے لے کر ایک ادنیٰ افسر تک وہ اپنی تمام ذاتی خوبیوں اور خصوصیات کو بروقت اور حسب ضرورت بروئے کار لا کر اپنی شخصیت

کو ماتحتوں پر موثر طور پہ مسلّط کر سکتے ہیں۔

موجودہ دور کا مقابلہ اگر حضرت عمرؓ کے دور سے کیا جائے تو بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ کوسوں اور میلوں کی دوری سے اپنے احکام اُونٹ و گھڑ سوار پیغام رسانوں کے ذریعے افواج کو پہنچانے ہوں تو نہ صرف بہت وقت صرف ہوتا تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگی حالات اِس طور تبدیل ہونے کا ہمیشہ امکان موجود رہتا تھا کہ ارسال کردہ احکام جنگ میں پہنچنے پر بے سُود ثابت ہوں۔ جہاں تک ذاتی طور پر براہِ راست اثر پذیر ہونے کا تعلق ہے۔ اس کا امکان بعید از قیاس تھا۔ اِن مخصوص حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سربراہِ مملکت ایسا شخص ہونا چاہیئے جو اعلیٰ ترین ذاتی صفات کا مالک ہو اور جس کا رعب و جلال دُور دراز فاصلے سے بھی محسوس کیا جا سکے اور جس کی عزت وتوقیر ہر متنفس دِل کی گہرائیوں سے کرتا ہو۔ جو عاملین وافسران دُور دراز علاقوں میں مقرر کیے جائیں وہ بھی اپنی جگہ و منصب کے لیے ہر لحاظ سے موزوں تر ہوں تا مرکز سے دوری اُن کے کردار وعمل کو صراطِ مستقیم پر رکھنے میں کوئی فرق نہ ڈال سکتی ہو غرض کہ وہ ایسی شخصیتیں ہوں جن پر ہر حال میں مکمل اعتماد کیا جا سکے اور مرکزی احکام کی عدم موجودگی میں ان کا ہر فیصلہ مذہب وملت کی بہتری اور عظمت کا آئینہ دار ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ سربراہِ مملکت کے ابتدائی احکام اتنے جامع اور بالغ نظری پر موقوف ہوں کہ وہ آنے والے بیشتر حالات سے نپٹنے کے لیے موزوں ہوں۔ صرف ان اقدام کے ذریعے ہی مقاصد حاصل کیے جا سکتے تھے۔ اور انتظار اور تذبذب سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا تھا۔

فلسطین اور شام میں جنگوں کی فہرست

دورِ فاروقی میں جو چھوٹی بڑی جنگیں فلسطین اور شام میں لڑی گئیں۔ اُن کی فہرست طویل ہے ظاہر ہے کہ اس ایک مضمون میں سب پر سیر حاصل بحث نہیں ہوسکتی اِس لیے میں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قارئین کرام کے لیے سب جنگوں کی فہرست پیش کر دوں جو تاریخی نقطۂ نظر سے سلسلے وار ہو اور صرف اُن چند بڑی جنگوں کا تفصیلاً ذکر کروں جو اہم

تبدیلیوں کی پیش خیمہ تھیں۔ تاریخی رابطے استوار رکھنے کے لیے دو بڑی جنگوں کے درمیان یا
دوران میں ان چھوٹی جنگوں کا ذکر بھی اجمالاً آتا رہے گا۔ اُمید ہے یہ طرزِ بیان قارئین کے
لیے باعث دلچسپی ہوگا۔ جنگ کے سمجھنے میں جغرافیائی اور جنگی نقشے اہم کردار کے حامل ہوتے
ہیں۔ چنانچہ جو نقشہ بھی میسر آیا ہے۔ پیشِ خدمت کر رہا ہوں۔

فتح دمشق	رجب ۱۳ھ / ۶۳۵ء
فحل	ذیقعد ۱۳ھ / ۶۳۵ء
حمص (پہلی جنگ)	۱۴ھ
یرموک	رجب ۱۵ھ / ۶۳۶ء
بیت المقدس	۱۶ھ / ۶۳۷ء
حمص (دوسری جنگ)	۱۷ھ / ۶۳۸ء
قیساریہ	شوال ۱۹ھ / ۶۴۰ء

مندرجہ بالا جنگوں کے علاوہ متعدد چھوٹے بڑے معرکے بھی ہوئے جو اپنی جگہ اہم ضرور
تھے مگر وہ باقاعدہ جنگوں کا حصہ بن گئے کیونکہ یا تو وہ آنے والی کمک کو روکنے کے لیے لڑے
گئے یا بھاگتے ہوئے دشمن کے تعاقب کے دوران میں پیش آئے اس مضمون میں فتح دمشق
جنگ یرموک اور فتح بیت المقدس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے کا ارادہ ہے پھر بھی
ڈر ہے کہ مضمون طویل ہو جائے گا۔

فتح دمشق

رجب سنہ ۱۳ھ

۶۳۵ء

دمشق ملک شام کی جنت کہلاتا تھا۔ چونکہ عہدِ جاہلیت میں اہلِ عرب تجارت کے لیے وہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے اس لیے اس کی عظمت کا شہرہ تمام عرب میں تھا۔ شہر کے اندرونی مرکزی حصّے کے گرد ۳۵ فٹ اُونچی قلعہ نما فصیل تھی جس میں داخلے کے لیے چھ دروازے تھے۔ ان دنوں دمشق کا رومن کمانڈر انچیف تھامس تھا جو شہنشاہ ہرقل کا داماد ہونے کے ساتھ ساتھ متعصب عیسائی تھا۔ فنِ سپاہ گری میں طاق اور علم و شجاعت میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ دمشق شہر میں تعینات رومی فوج کا اعلیٰ کمانڈر جنرل عزازیر تھا۔ جو مشہور و معروف پرانا جرنیل تھا اس نے مشرقی علاقہ میں ایک عمر گزاری تھی اور ایرانیوں اور ترکوں کے خلاف کئی کارہائے نمایاں دکھائے تھے اس کو اس بات پر فخر تھا کہ اُسے آج تک شکست کا سامنا نہیں ہُوا۔

عربی زبان بخوبی بول سکتا تھا دمشق شہر میں رُومی فوج کی تعداد بارہ ہزار تھی مگر دمشق میں سامانِ رسد و روزگار خاطر خواہ طور پر موجود نہ ہونے کی وجہ سے لمبے محاصرے کی صوُرت میں تیاریاں نامکمل تھیں۔

ہرقل کو اجنادین کی شکست کی خبر حمص میں ملی جسے سُن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ حمص سے انطاکیہ آگیا اور دمشق پر اسلامی حملے کو روکنے کے لیے بچی کھچی رومی افواج کو وقوسا جانے کا حکم دیا تاکہ یہ دستے اسلامی فوجوں کو روکیں اور دمشق میں محاصرے کے لیے تیاری مکمل کی جا سکے۔ اس کے علاوہ مزید پانچ ہزار فوج جنرل کلوس کے تحت دمشق روانہ کی۔ اب دمشق میں رومی فوجوں کی تعداد سترہ ہزار ہو گئی۔

وقوسا میں رومی مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور خالدؓ کے ساتھ اچھی خاصی لڑائی لڑنے کے بعد شکست کھا کر پسپا ہو گئے اور خالدؓ نے اپنا کوچ دمشق کی طرف جاری رکھا۔ اسلامی فوج اپنے اپنے کمانڈروں کے تحت دمشق میں جمع ہونے کے لیے خالدؓ کے لشکر کے پیچھے پیچھے مخصوص فوجی انداز میں آ رہی تھی جسے ایک مقررہ وقت تک دمشق پہنچنے کے احکام

ملے ہوئے تھے۔
دمشق میں تھامس نے شہر کے باہر لڑنے کا منصوبہ بنایا اور فوج کا کچھ حصہ ضروری دفاع کے لیے شہر میں متعین کر کے بارہ ہزار فوج کے ساتھ شہر کے باہر تقریباً دس میل کے فاصلے پر مرج الصفر کے مقام پر صف آرا ہو گیا۔ اس فوج کا کمانڈر جنرل عزازیر اور نائب کلوس تھا۔ ان رومی جرنیلوں کو حکم دیا گیا کہ مسلمانوں کو میدان میں جنگ کر کے دمشق سے دور بھگا دیا جائے اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اتنے وقت تک روکے رکھا جائے کہ شہر کو لمبے محاصرے کے لیے تیار کیا جا سکے۔

چنانچہ ۱۹ رجادی الآخر ۱۳ھ کو مرج الصفر کے مقام پر اسلامی اور رومی فوجیں صف آراء ہو گئیں اس مقام پر خالدؓ کی اپنی فوج جو وہ عراق سے ہمراہ لائے تھے اور شرجیل کی فوج سب سے پہلے پہنچیں۔ باقی اسلامی افواج کے آنے سے پہلے خالدؓ نے یہ بہتر سمجھا۔ کہ رومیوں کو مشغول رکھا جائے۔ چنانچہ مبارزانہ جنگ کا سلسلہ شروع کیا۔ جیسا کہ قارئین کرام جانتے ہوں گے کہ یہ مقابلے انفرادی بہادری و فنِ سپہ گری کی بہترین عکاسی کرتے تھے۔ جانباز باری باری آگے نکل کر مخالف فوج کے جانباز کو للکارتے تھے۔ اور اس مقابلے میں ایک دوسرے کو پچھاڑتے تھے مقابلہ صرف اسی وقت ختم ہوتا تھا جب دونوں میں سے ایک قتل ہو جاتا یا بھاگ جاتا تھا۔ ان مقابلوں میں مسلمان مجاہدوں نے رومیوں کے کئی مشہور و معروف جنگجو ہلاک کر دیے جس سے رومی مرعوب ہو گئے۔

آخر میں خالدؓ خود تنِ تنہا مقابلے کے لیے میدان میں نکلے۔
ان کے مقابلے میں یکے بعد دیگرے جنرل کلوس اور پھر خود جنرل عزازیر آئے۔ ان دونوں کو خالدؓ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے اور لشکر میں لا کر قید کر دیا۔ اسی اثنا میں اسلامی فوج کے باقیماندہ دونوں لشکر جو عمروؓ بن العاص اور ابوعبیدہؓ کی سرکردگی میں تھے پہنچ گئے۔ خالدؓ نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ رومی جو نقصان کی وجہ سے اور جن کے دو اعلیٰ ترین جرنیل ضائع ہو چکے تھے حملے کی تاب نہ لا کر پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ پس شہر دمشق جو ان کی پشت پر تھا اس کے اندر قلعہ بند ہو کر لڑنے کے سوا انہیں اور کوئی چارہ نظر نہ

آیا۔ چنانچہ ۲۰ جمادی الآخر ۱۳ھ (۲۰ اگست ۶۳۴ء) کو اسلامی فوجوں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرے کی تنظیم

شہر دمشق کے چھ دروازے تھے۔ خالدؓ کا اپنا ہیڈ کوارٹر باب شرقی کے قریب ایک قدیم گرجا میں تھا اور چار سو سواروں کا ایک دستہ براہ راست اپنے ماتحت رکھا باقیماندہ عراقی لشکر رافع کے تحت مشرقی دروازے پر متعین کیا باقی افسروں کو یوں مامور کیا۔ (نقشہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں)

شرجیلؓ — باب توما (شمال مغربی)

ابو عبیدہؓ — باب جابیہ (مغربی)

نقشہ نمبر ۲ فتح دمشق

عمرو بن العاصؓ — باب فرادیس (شمالی)

یزید بن ابی سفیانؓ

باب کیسان
باب صغیر } جنوبی
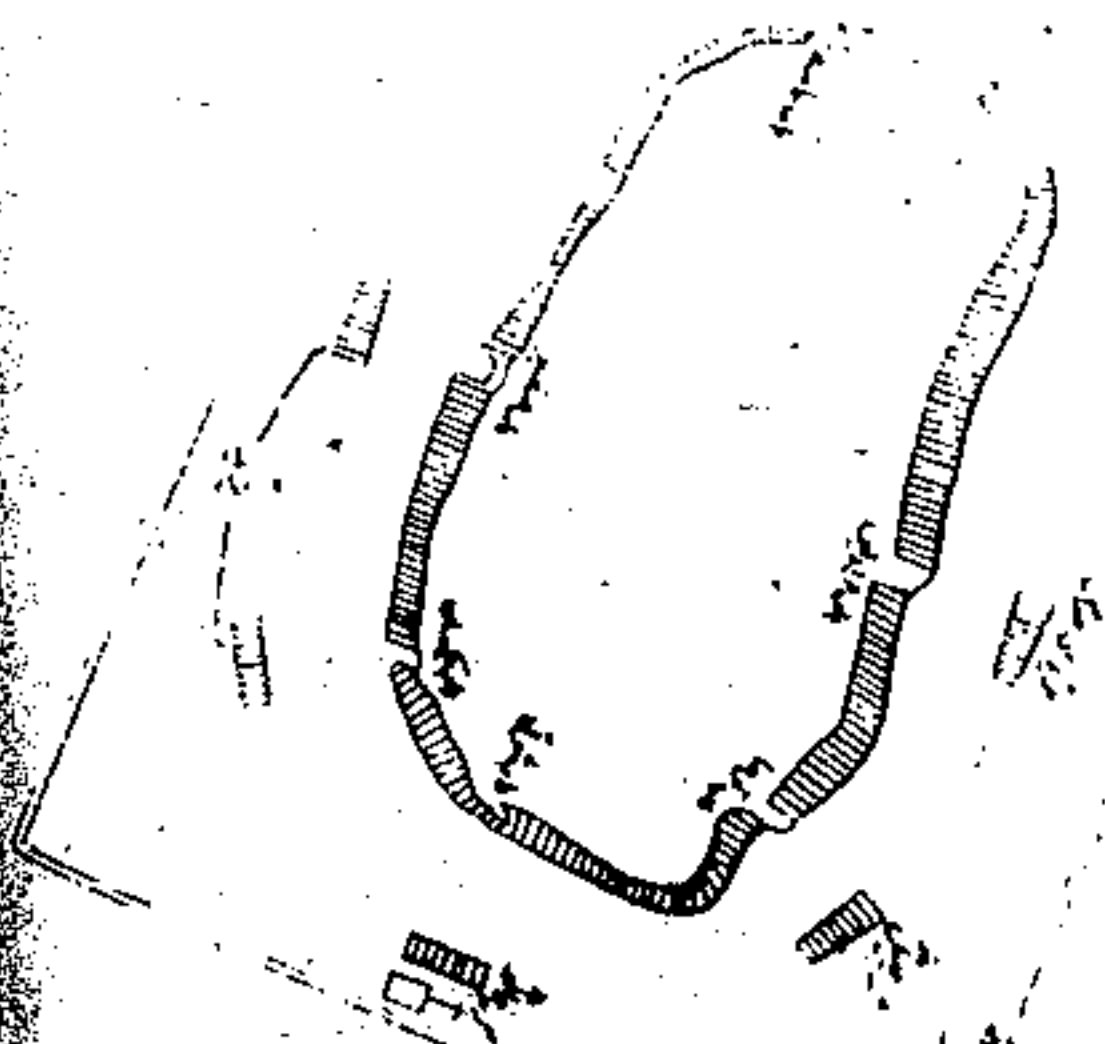
ہر ایک جرنیل کے تحت چار سے پانچ ہزار مجاہد تھے۔ مسلمانوں کی کل تعداد تقریباً بیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ خالدؓ نے مندرجہ ذیل احکام دیے۔

(۱) دشمن کے تیروں کی زد سے کیمپ دور لگائے جائیں۔
(۲) تمام دروازوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔
(۳) اگر دشمن کے تیر انداز فصیل سے تیر چلائیں تو اپنے تیر اندازوں کو آگے بڑھا کر جوابی بوچھاڑ کریں۔
(۴) دشمن اگر کسی بھی دروازے سے باہر آنے کی کوشش کرے تو اُسے شہر کے اندر دھکیل دیں۔
(۵) اگر دشمن کا دباؤ زیادہ ہو جائے تو سپہ سالار اعظم سے مدد طلب کی جائے۔ اس غرض کے لیے دو ہزار سواروں کو ضرارؓ کے ماتحت کر دیا گیا ہے جو دروازوں کے درمیان خالی جگہوں کی گشت کے ذمہ دار تھے۔ اور بوقت ضرورت دوسرے لشکروں کی مدد کرنے کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔

انطاکیہ سے رومی کمک

ہرقل مرج الصفر کی شکست کی خبر سن چکا تھا اُس نے مزید کمک دمشق روانہ کرنے کے احکام جاری کیے۔ رومی سلطنت دمشق جیسے اہم شہر کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی کیونکہ اس کا مطلب شام سے دستبردار ہونے کے مترادف تھا۔ چنانچہ محاصرے کے دس دن کے اندر اندر بارہ ہزار کے ایک لشکر جرار کی حفاظت میں سامانِ جنگ سے لدا ہوا قافلہ انطاکیہ سے دمشق روانہ ہو چکا تھا۔ اس کا سامنا اُس اسلامی دستے سے جو دمشق کے شمال میں متعین تھا، ناگزیر تھا۔ ۱۰ رجب ۱۳ھ (۹ ستمبر ۶۳۴ء) کو ایک ایلچی نے اس رومی لشکر کے آنے کی خبر دی۔ خالدؓ نے فوراً پانچ ہزار سوار ضرارؓ کی ماتحتی میں روانہ کیے۔

ضرار نے شمالی دستے کو زیرِ کمان لے کر "سنیتہ العقاب" (جو ایک درہ ہے) کے قریب ایک نیچی گھاٹی میں گھات لگا لی۔ دوسرے دن جب رومی لشکر اس جگہ سے گزرنے لگا تو حملہ کر دیا۔ ضرار تیر سے شدید زخمی ہو کر قید کر لیے گئے۔ رومی جو بلندی پر تھے۔ اور اُن کی تعداد بھی مسلمانوں سے دُگنی تھی شدید مقابلہ کر رہے تھے۔ رافع نے جو ضرار رض کے بعد کمانڈر تھا خالد کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔

خالد رض کی مشکلات

اب خالد کو مشکل حالات کا سامنا تھا۔ ایک طرف رومیوں کے اس نئے لشکر کو دمشق پہنچنے سے روکنا تھا۔ کیونکہ یہ دمشق پہنچ جاتا تو اسلامی افواج دشمن کی دونوں فوجوں کے درمیان پس کر رہ جائیں اب سوال یہ تھا کہ محاصرے سے کتنی فوج نکال کر منظم کی جائے اور وہ کس وقت بھیجی جائے خطرہ یہ تھا کہ اگر محصورین کو یہ معلوم ہو گیا کہ محاصرہ کمزور ہو گیا ہے تو عین ممکن تھا کہ وہ یلغار کر کے محاصرے کو توڑ کر باہر آ جائیں اُدھر یہ بھی ضروری تھا کہ فوج کے جس حصے کو بھی روانہ کرنا ہو دیر نہ کی جائے ورنہ رافع رض کو شکست دے کر رومی لشکر معہ سامان دمشق پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ آخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ محاصرے کو از سرِ نو ترتیب دی جائے۔ اور چار ہزار سواروں کے لشکر کو لے کر آدھی رات کے بعد خالد خود رافع رض کی امداد کے لیے پہنچیں اور خالد رض برق رفتاری سے منہ اندھیرے ہی رافع کے لشکر سے جا ملے۔

مسلمان لڑکی کا جوشِ انتقام

ابھی خالد رض رافع سے تھوڑی دور ہی تھے کہ اُن کے پاس سے ایک نوجوان جو تیز رفتار گھوڑے پر سوار تھا گزرا۔ خالد نے اُسے روکنا چاہا مگر وہ رومیوں پر حملے کے لیے لپکا تھا۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس، سینے پر پیتل کی تختی لٹکائے ہوئے تلوار اور نیزہ سے لیس، سبز کپڑے کا نقاب منہ پر لیے ہوئے تھا جس سے صرف آنکھیں نظر آ رہی

تھیں۔ یہ نوجوان بار بار اور بے دریغ حملے کرتا جاتا تھا اور جو رومی اس کی زد میں آتا ته تیغ ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے میں رافع اور خالدؓ مل گئے اور دونوں لشکروں کو ترتیب دے کر خالدؓ نے لڑائی کے لیے صف آرا کیا۔ اس اثنار میں نقاب پوش مجاہد نے کمال جرأت اور سپاہ گری کے جوہر دکھائے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خودکشی پر آمادہ ہے اس کے حملے ایسی بے جگری سے جاری تھے کہ رافعؓ کی فوج میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا عام حملے کا حکم دے دیا گیا۔ دوران جنگ خالدؓ اس نقاب پوش کے پاس آئے اور کہا۔

"اے نوجوان مجاہد مجھے اپنا چہرہ دکھاؤ مگر وہ تیزی سے پھر حملے کے لیے چلا گیا۔

چند سوار اُسے یہ کہنے کے لیے گئے کہ تمہارا افسر اعلیٰ تمہیں بلا رہا ہے

تاکہ تمہاری بہادری کے صلے میں تمہیں انعام دیا جائے گا۔ مگر

وہ اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھنا بہتر سمجھتا تھا اب جونہی وہ حملے سے واپس آیا تو خالدؓ نے تحکمانہ لہجے میں اُسے رُکنے کے لیے کہا وہ رک گیا۔ خالدؓ نے کہا "تم نے بہادری کا حق ادا کیا اور ہمارے دلوں کو جذبۂ جہاد سے سرشار کر دیا۔ بتاؤ تم کون ہو؟ خالدؓ نے اس کا جواب سُنا تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ یہ تو کسی لڑکی کی آواز تھی "اے سپہ سالار مجھے اپنے آپ کو بے نقاب ہونے میں شرم محسوس ہو رہی ہے۔ آپ ایک نامور اور فتح مند جرنیل ہیں اور میں ایسی جنس سے تعلق رکھتی ہوں جس کے لیے پردے میں رہنا ہی بہتر ہے۔ میں اِس لیے اِس طرح لڑ رہی ہوں کیونکہ میرے دل کو غم و غصہ کی آگ نے گرما دیا ہے۔ خالدؓ نے کہا "تم کون ہو؟ میں خولہ ہوں ضرار کی بہن میرے بھائی کو دشمنوں نے قید کر لیا ہے۔ مجھے اُسے رہا کرانا ہے۔ خالدؓ نے دل ہی دل میں الازور (ضرار اور خولہ کے والد) کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا۔ پھر چلو ہمارے ساتھ مل کر حملہ کرو۔"

رومیوں کی پسپائی

مسلمانوں کا حملہ دوپہر گئے تک جاری رہا جس کی رومی تاب نہ لا سکے اور حمص کی طرف پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ خالدؓ نے اُن کے تعاقب میں ایک چھوٹا سا دستہ روانہ کیا

اور خود فوراً واپس دمشق پہنچے۔ کیونکہ محاصرے والی فوج کی قوت میں نو ہزار افراد کی کمی ہو گئی تھی۔

ضرارؓ کو رومی بطور تحفہ ہرقل کے پاس لے جا رہے تھے۔ رافع نے اچانک حملہ کر کے اُسے رہا کرا لیا۔

محصورین کی بددلی

رُومی محصورین کو اب ہرقل کی طرف سے کمک پہنچنے کا کوئی یقین نہ رہا۔ اس لیے اُن کے حوصلے پست ہو گئے دمشق کے قدیم باشندوں نے مسُلمانوں سے صُلح کرنے کا پُرزور مشورہ دیا۔ تھامس نے اُن کا حوصلہ بڑھانے کے لیے پُرزور حملہ کرنے کا وعدہ کیا تاکہ محاصرہ ٹُوٹ جائے۔ چنانچہ علی الصبح تھامس نے باب توما سے جہاں شرجیلؓ کا لشکر متعین تھا۔ ایک پُرزور حملہ کیا اور رومی تیر اندازوں نے مسُلمانوں کو بھاری نقصان پہنچایا دروازہ کھول کر رُومی باہر آنے میں کامیاب ہو گئے مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اسی اثناء میں ایک تیر تھامس کی آنکھ میں آ کر پیوست ہو گیا یہ تیر اسی معرکے میں جاں بحق ہونے والے مجاہد آبان بن سعید بن العاص کی بیوہ کی کمان سے نکلا تھا۔ یہ خاتون اپنے خاوند کی شہادت کی خبر سُن کر آگ بگولہ ہو گئی تھی۔ اور ترکش لے کر میدان کارزار میں اُتر آئی تھی۔ تھامس کے شدید زخمی ہونے سے اُس کی فوج میں بد دلی پھیل گئی اور رُومی پھر واپس قلعے میں محصور ہونے پر مجبور ہو گئے۔

تھامس جو ایک آنکھ کھو چکا تھا غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور ایک اور شدید حملے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اِس دفعہ رومیوں نے دوبارہ باب توما پر ہی یلغار کی مگر ساتھ ہی باب جابیہ باب صغیر اور باب شرقی پر بھی حملے کیے تاکہ شرجیل کو مدد نہ مل سکے۔ ابو عبیدہؓ، یزیدؓ اور رافعؓ کو گھمسان کی جنگ لڑنی پڑی۔ خالدؓ اور ضرارؓ نے رافعؓ اور یزیدؓ کی بروقت مدد کی اور رومیوں کو بھاری نقصان کے ساتھ فصیل کے اندر دھکیل دیا۔ محاصرہ توڑنے کے لیے تھامس کی یہ آخری کوشش تھی۔

مسلمانوں کا شہر میں داخلہ

جونا ایک یونانی نوجوان ایک یونانی لڑکی پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ اگرچہ اُس کی شادی اس لڑکی سے ہو چکی تھی مگر اچانک جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے لڑکی کے گھر والے رسم روانگی کو ملتوی کرنے پر مجبور تھے۔ جونا لڑکی کو گھر لانے پر مصر تھا چنانچہ وہ ۱۹ رجب ۱۴ھ کی رات کو رسّے کی مدد سے مشرقی دروازے کے پاس فصیل سے اُترا اور خالدؓ سے ملنے کے لیے کہا۔ اپنی داستان اور خواہش حضرت خالدؓ کے گوش گزار کی اور مدد کے عوض رومی فوج کے خفیہ راز بتانے کا وعدہ کیا۔ اس یونانی نوجوان نے خالدؓ کو مطلع کیا کہ آج رات عیسائی بطریق کے ہاں لڑکا پیدا ہونے کی خوشی میں ایک جشن منعقد ہو رہا ہے۔ دعوت میں شراب نوشی بھی عام ہو گی اور سوائے چند پہرہ داروں کے رومی نشہ میں دُھت ہوں گے مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر موقع شہر میں داخل ہونے کا شاید پھر دیر سے آئے۔ جونا کو خالدؓ نے اسلام پیش کیا اور واپس شہر کے اندر جا کر انتظار کرنے کو کہا۔

خالدؓ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے مگر چونکہ وقت کم تھا اس لیے باقی تینوں لشکروں کو آگاہ نہ کر سکے۔ سیڑھیوں اور کمندوں کی مدد سے فصیل پر چڑھ کر پہرے داروں کی خفیف سی مدافعت کو فرو کرتے ہوئے باب شرقی کے کواڑ کھول دیے دروازہ کھلتے ہی رومی ہوشیار ہو گئے مگر خالد نے اپنے مجاہدین کو لے کر شہر کے مرکزی حصّے پہ قبضہ کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کی۔ تھامس کو دمشق ہاتھ سے نکل جانے کا یقین ہو گیا۔ اُس نے جب دیکھا کہ دوسرے دروازوں سے کوئی ناگوار حادثہ پیش نہیں آیا تو وہ بھانپ گیا کہ خالدؓ اکیلا لڑ رہا ہے۔ اس نے ایک شاطرانہ چال چلی جو بڑی سوجھ بوجھ کی غماز ہے۔ اُس نے یہ سمجھ لیا کہ دوسرے افسروں خصوصاً حضرت ابوعبیدہ کو یہ علم نہیں ہو گا کہ خالدؓ بزورِ شمشیر شہر میں داخل ہو گیا ہے۔ اس لیے اُس نے بڑی عجلت سے اپنے ایلچی باب جابیہ روانہ کیے۔ اور ابوعبیدہؓ کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور جزیہ ادا کرنے کی پیش کش

کردی۔ ابوعبیدہؓ کو یہ معلوم نہ تھا کہ خالدؓ بزورِ شمشیر شہر میں داخل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے صلح کی شرائط اس یقین کے ساتھ منظور کر لیں کہ خالدؓ بھی مزید کشت و خون کے خواہشمند نہیں ہیں۔

علی الصبح حضرت ابوعبیدہؓ نے دوسرے افسروں کو بھی صلح کی اطلاع دی اور باب جابیہ سے تھامس، دیگر معزز باشندوں اور بطریق کے ہمراہ شہر کے وسط کی طرف پر امن بڑھنے لگے۔ یکایک ابوعبیدہؓ نے خالدؓ اور ان کے رفقاء کو خون سے آلودہ تلواریں ہاتھ میں لیے دیکھا تو وہ سمجھے معاملہ کچھ اور تھا۔ خالدؓ اُن کو یوں تلواریں میانوں میں کیے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئے فضا میں سکوت چھا گیا۔ دونوں طرف کے مسلمان حیران تھے حضرت خالدؓ نے کہا یہ شہر ہم نے بزورِ شمشیر فتح کیا ہے مگر حضرت ابوعبیدہؓ پُر امن شکست کی شرائط منظور کر چکے تھے۔ اس بات پر مُصر تھے کہ ایک مسلمان کا وعدہ تمام مسلمانوں پر عائد ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مؤرخ لکھتے ہی خالدؓ نے صُلح نامے پر اپنے دستخط ثبت کر دیے جس کا متن کچھ ان الفاظ میں تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ مسلمانوں کے دمشق میں داخلے کے بعد تمام اہلِ دمشق کی جانیں، مال عبادت گاہیں عمارات، اور شہر کی فصیلیں محفوظ رہیں گی ان کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ مسلمانوں کا یہ وعدہ اللہ اور اس کے رُسول خلیفۃُ المسلمین اور تمام مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ جب تک اہلِ دمشق باقاعدگی سے جزیہ دیتے رہیں گے مسلمانوں کی طرف سے انہیں بہترین سلوک کی اُمید رکھنی چاہیئے۔"

خالد کی معزولی

حضرت خالدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو دمشق فتح ہونے کی خبر ایک تفصیلی خط لکھ کر روانہ کی۔ یہ خط ۲ر شعبان ۱۳ھ (یکم اکتوبر ۶۳۴ء) کو لکھا گیا۔ قاصد یہ خط لے جا چکا تھا۔ کہ حضرت ابوعبیدہؓ نے خالدؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کی خبر دی اور یہ بتایا کہ اب حضرت عمرؓ ابن الخطاب خلیفۃ المسلمین ہیں۔ خلیفۂ دوم کا خط ابوعبیدہؓ کے ہاتھ میں تھا جسے

خالد لیکر پڑھنے لگے جب اس فقرہ پر پہنچے کہ

میں تمہیں خالدؓ بن الولید کی افواج کا

کمانڈر اعلیٰ مقرر کرتا ہوں "

تو آنکھ اٹھا کر اُوپر دیکھا......... اس خط کو آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ گزر چکا تھا مگر ابو عبیدہؓ نے جنگی مصلحتوں کی بنا پر اس کے متعلق کسی کو نہ بتایا تھا حضرت خالدؓ کی معزولی پر بحث اس مضمون کے دائرے میں نہیں سما سکتی لہٰذا اس سے زیادہ لکھنے سے اجتناب کر رہا ہوں۔

فحل کی لڑائی

دمشق کی شکست نے رُومیوں کو سخت برہم کیا ہرقل نے ہر طرف سے فوجیں جمع کیں اور پُورے زور و قوت کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے آمادہ ہوا۔ ذی قعدہ ۱۳ھ دسمبر ۶۳۴ء) میں رومیوں کی اسی ہزار فوج بسیان کے مقام پر جو دریائے اُردن کے مغرب میں واقع ہے، جمع ہونا شروع ہو گئیں اسلامی فوج اب تازہ دم ہو چکی تھی اور عرب سے امیر المومنین نے مزید کمک بھی بھیج دی تھی۔

ابو عبیدہؓ نے باہم مشورہ کے بعد اس رومی فوج کو نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کیا۔ یزید کے ماتحت دمشق میں ایک مضبوط دستہ چھوڑنے کے بعد اسلامی فوج نے کوچ کیا۔ رُومیوں نے جب یہ سُنا کہ اسلامی فوجیں فحل پر حملہ کرنے کے ارادے سے بڑھی چلی آرہی ہیں تو اُنہوں نے ندیوں کے بند توڑ دیے جس سے ارد گرد کی تمام زمین زیرِ آب آگئی اور دلدل بن گئی۔ مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

مسلمان ایک لمبے عرصے تک وہاں ڈیرے ڈالے پڑے رہے رُومیوں نے مسلمانوں کو غافل خیال کرکے ۲۶ ذیقعد ۱۳ھ کی رات کو حملہ کر دیا۔ لیکن مسلمان بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ رات بھر اور اگلے روز رات تک مدافعانہ جنگ بڑی کامیاب سے لڑی۔ رُومیوں کو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ اُن کی ہمتیں پست ہو گئیں۔

اور پسپا ہونا شروع ہو گئے۔ رات کا وقت تھا۔ گھبراہٹ میں وہ راستہ بھول گئے شکست اور پریشانی نے انہیں اپنی ہی پھیلائی ہوئی کیچڑ میں دھکیل دیا جہاں وہ پھنس کے رہ گئے۔ افراتفری میں رومی فوج منتشر ہو گئی تقریباً دس ہزار مارے گئے شرجیلؓ اور عمرو بن العاص نے دلدل اور کیچڑ کو عبور کرتے ہوئے بلیسان کو محاصرے میں لے لیا۔ اور اہل شہر نے جزیہ پر صلح کر لی۔

ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو نامہ فتح لکھا اور پوچھا کہ مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ "رعایا ذمی قرار دی جائے اور زمین بدستور زمینداروں کے قبضے میں چھوڑ دی جائے۔"

اس معرکے کے بعد اُردن کے تمام شہر اور مقامات نہایت آسانی سے فتح ہو گئے اور ہر جگہ شرائط صلح میں یہ لکھ دیا گیا۔ کہ مفتوحین کی جان و مال، زمین، مکانات گرجے، عبادت گاہیں سب محفوظ رہیں گی۔ صرف مسجدوں کی تعمیر کے لیئے کسی قدر زمین لے لی جائے گی۔

رومیوں کی اس شکست کے بعد ابو عبیدہؓ اور خالدؓ حمص روانہ ہو گئے، شرجیل نے طباریہ کو فتح کیا اور اس آخری فتح کے بعد جو ذی الحج ۱۳ھ میں ہوئی اُردن میں ہر قسم کی مدافعت ختم ہو گئی۔

فحل اور بلیسان کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے شام و فلسطین میں متعین افسران فوج کو از سر نو احکام جاری کیے۔ حضرت ابو عبیدہؓ کو حمص، حضرت عمرو بن عاص اور شرجیلؓ کو فلسطین اور یزیدؓ کو بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں کو فتح کرنے کے احکام ملے۔

حمص ۱۴ھ
۶۳۵

حضرت ابو عبیدہؓ کو حضرت عمرؓ نے حمص پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ خالدؓ کو ساتھ لے کر دمشق کی راہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے دمشق کے شمال میں اسلامی فوج کا جو حصہ دمشق کی امداد و اعانت کے لیے متعین تھا اس کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اُدھر

جب ہرقل کو دمشق اور اُردن میں اپنے لشکروں کی شکست کی خبر ملی اور اُسے یہ معلوم ہُوا کہ مسلمانوں کا ارادہ اب حمص فتح کرنے کا ہے تو اِس نے مشہور پادری توذر کی زیرِ قیادت ایک عظیم الشان لشکر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا۔ بعد میں اِس لشکر کو ناکافی سمجھ کر شنس کی زیرِ قیادت اتنا ہی بڑا ایک اور لشکر بھی توذر کے پیچھے روانہ کیا۔ دمشق کے مغرب میں "مرج الروم" کے مقام پر مسلمانوں کی ان دونوں لشکروں سے مڈھ بھیڑ ہوئی حضرت ابوعبیدہؓ شنس نامی کے مقابل ہوئے اور حضرت خالدؓ توذر کے مقابل صف آرا ہوئے۔ صبح اُٹھ کر مسلمانوں نے دیکھا کہ توذر اپنی فوج لے کر غائب ہے البتہ شنس اپنی فوج کے ہمراہ ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔

حضرت خالدؓ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے معلوم ہُوا کہ توذر اپنی فوج لے کر دمشق کی جانب جا رہا ہے۔ آپ نے فوراً بھانپ لیا کہ توذر کا مقصد دمشق پہنچ کر اچانک اُس فوج پر حملہ کرنا ہے جو دمشق کی حفاظت کے لیے یزیدؓ کی سرد گی میں وہاں متعین ہے۔ ابوعبیدہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد خالدؓ نہایت تیزی سے اُس کے پیچھے روانہ ہوئے۔

توذر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دمشق پہنچ کر اُسے ایک فوج سے نہیں بلکہ دو مسلمان فوجوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ توذر نے ابھی حملہ ہی کیا تھا کہ خالدؓ اپنی فوج کے ہمراہ پہنچ گئے اور توذر پر عقب سے حملہ کر دیا۔ توذر کی فوج دونوں اسلامی فوجوں کے درمیان پس کے رہ گئی۔

توذر حضرت خالدؓ کے ہاتھ سے قتل ہُوا۔ حضرت خالدؓ اس معرکے سے فارغ ہو کر جب مرج الروم واپس پہنچے تو ابوعبیدہ بھی شنس پر فتح پا چکے تھے یہ معرکہ محرم ۱۴ھ (مارچ ۶۳۵ء) میں پیش آیا۔

مرج الروم سے ابوعبیدہ نے خالدؓ کو سیدھا حمص بھیجا اور خود بعلبک چلے گئے۔ وہاں کے لوگوں نے صلح کر لی۔ اب ابوعبیدہ حمص آ کر خالدؓ سے مل گئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جاڑے کا موسم تھا اور حمص کی شدید سردی عربوں کی برداشت سے باہر تھی۔ اہلِ حمص اُسی دن مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلتے تھے جس دن جاڑا تیز ہوتا

تھا۔ وہ اس اُمید پر قلعہ بند تھے کہ مسلمان سردی کی شدت سے تنگ آکر یا جونہی ہرقل کی کمک پہنچے گی بھاگ جائیں گے لیکن مسلمانوں نے ثبات و صبر سے کام لیا اور عیسائیوں کو ہرقل کی مدد نہ پہنچی۔

سردی کا موسم گزر گیا اور رومیوں کی آخری اُمید بھی جاتی رہی تو اُنہوں نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی جو ابوعبیدہؓ نے منظور کر لی حمص کے دروازے کھول دیے گئے۔ اور مسلمان حمص کے بازاروں میں آزادی سے آنے جانے لگے۔ اہل حمص یہ دیکھ کر خاصے حیران تھے کہ مسلمان جو چیز خریدتے ہیں اس کی قیمت ٹھیک ادا کر دیتے ہیں۔ ایسا سلوک اِس زمانے میں مسلمانوں کے سوا اپنے محکوموں سے اور کون کر سکتا تھا۔

شام و فلسطین کی مزید فتوحات

ابوعبیدہؓ نے عبادہ بن صامت کو حمص چھوڑا اور خود حماۃ کی طرف روانہ ہوئے۔ حماۃ والوں نے اِن کے پہنچتے ہی صلح کی درخواست کی اور جزیہ دینا منظور کیا۔ وہاں سے روانہ ہو کر شیزر اور پھر معرۃ النعمان پہنچے، ان مقامات کے لوگوں نے خود اطاعت قبول کر لی۔ ان سے فارغ ہو کر لاذقیہ کا رُخ کیا۔ لاذقیہ والے قلعہ بند ہو کر مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ ابوعبیدہؓ نے شہر کا استحکام دیکھ کر محسوس کیا کہ اسے سر کرنا دشوار ہے۔ اِس لیے حضرت ابوعبیدہؓ کو ایک جنگی چال چلنی پڑی۔ انہوں نے شہر سے دُور پڑاؤ ڈالا۔ اور اتنے گہرے گڑھے کھودنے کا حکم دیا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا سوار چھپ جائے جب گڑھے کھد گئے تو یہ ظاہر کیا کہ گویا مسلمان حمص واپس جا رہے ہیں۔ شہر والوں نے جب انہیں واپس جاتے دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اور اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے رات ہونے پر مسلمان واپس آکر ان گڑھوں میں چھپ گئے۔ صبح کے وقت کمین گاہوں سے نکل کر دفعتہً حملہ کیا اور دم کے دم میں شہر فتح ہو گیا۔

حمص کی فتح کے بعد ابوعبیدہؓ نے ہرقل کے پایۂ تخت انطاکیہ کا ارادہ کیا مگر دربارِ خلافت سے حکم پہنچا کہ

"تم ابھی وہیں رہو اور شام کے طاقتور قبائل عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرو۔ میں بھی انشاء اللہ یہاں سے برابر کمک بھیجتا رہوں گا۔"

چنانچہ ارشاد کے موافق فوجیں واپس بلالی گئیں اور بڑے بڑے شہروں میں افسر اور نائب بھیج دیے گئے خالدؓ کو دمشق بھیجا اور ابوعبیدہ نے خود حمص میں اقامت اختیار کی۔

اُدھر فلسطین میں عمرو بن العاص اور شرجیل کو اجنادین میں رومیوں سے دوسری جنگ لڑنی پڑی اور اس کے بعد دونوں لشکر الگ الگ ہو گئے۔ عمرو بن العاص نے نیا بلس، عمواس غازہ اور یبنی فتح کر لیے اور شرجیلؓ نے بحیرۂ روم کے ساحلی مقامات عکرے اور طیر پر قبضہ کر لیا۔

یزیدؓ اور معاویہؓ دونوں بھائی مل کر دمشق سے روانہ ہوئے اور صیدون، عارقہ، جبیل اور بیروت کی اہم بندرگاہوں پر قابض ہو گئے۔ چنانچہ ۱۴ھ کے اختتام تک تمام فلسطین، اُردن اور جنوبی شام سوائے بیت المقدس اور قیساریہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گئے۔

جنگِ یرموک

رجب ۱۵ھ

شام کا میدان جنگ ایسا تھا ۶۳۶ء جس میں دونوں حریف ایک دوسرے پر صرف مخالف سمتوں سے آکر ہی وار کر سکتے تھے۔ اس میں داخل ہونے کے دروازے دونوں حریفوں کے آبائی مراکز کی طرف سے کھلتے تھے۔ شام اور فلسطین کے مغرب میں بحیرہ روم تھا جس میں سے رومی بغیر کسی مداخلت کے آجا سکتے تھے۔ اس کے جنوب اور مشرق میں صحرا تھا۔ جس میں نقل و حرکت کے لیے عربوں کو کوئی روکنے والا نہ تھا۔ جیسے عرب سمندر میں اثر پذیر نہیں ہو سکتے تھے اسی طرح رومی صحرا سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے پس دونوں افواج کے لئے یہی بہتر تھا کہ جب وہ لڑائی کے لئے صف آرا ہوں تو ایسے مقامات کو مستقر بنائیں جہاں سے شکست کی صورت میں محفوظ علاقوں کی طرف پسپائی عمل میں لا سکیں اور فتح مندی کی حالت میں شکست خوردہ حریف کو اس سے پہلے کہ وہ محفوظ مقامات کی طرف پسپا

ہو سکے نیست و نابود کر سکیں۔

رُومی شام کے میدانِ جنگ کو کسی بھی صورت میں خالی چھوڑ کر پیچھے نہیں جا سکتے تھے کیونکہ یہ اُن کی سلطنتوں کا اہم حصّہ تھا۔ مسلمان افواج چُونکہ رُومی علاقوں میں لڑ رہی تھیں۔ اِس لیے فوجی نقطۂ نگاہ سے وہ فائدے میں تھیں اور کسی جگہ بھی جہاں سے اُن کا رابطہ عرب سے باآسانی کھُلا رہ سکے جمع ہو سکتی تھیں ان اہم فوجی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ہی ہرقل نے شام و فلسطین کی جنگوں کے اس سب سے عظیم معرکے کو ترتیب دیا۔

ہرقل جب ۶۱۰ء میں تخت نشین ہُوا تو اِس کی سلطنت کمزور تھی مگر اس نے تقریباً بیس سال مسلسل جد و جہد کر کے اس کی سرحدوں کو وسیع تر کر دیا۔ اُس نے شمالی بربر قبائل اور کاپیشیا کے ترکوں کو شکست دے کر خسروی سلطنت کو جو اپنے دور کی عظیم اور منظم طاقت تھی، از ہر کیا یہ سب کچھ اُس کے اعلیٰ ترین حسنِ انتظام اور فنِ سپاہگری کا مرہونِ منت تھا۔ لیکن اب اُسے ایک ایسی قوم نے ہزیمت اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا جسے وہ اپنی نظروں میں حقیر ترین خیال کرتا تھا اِس کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہو چکی تھیں۔ باوجود کہ اُس نے سب لڑائیاں پوری سوچ بچار اور غور و خوض سے لڑنے کی کوشش کی تھی۔ مگر پھر بھی اُسے شکست ہوتی چلی گئی اور مسلمان فتح پر فتح حاصل کرتے گئے۔ اور سارے کے سارے فلسطین اور شام میں حمص تک قابض ہو چکے تھے اب وہ ایک ایسی خوفناک لڑائی کی تیاری کرنے لگا۔

جس میں رُومی فوجوں کی تعداد اور طاقت اتنی ہو کہ اس سے پہلے سرزمین شام نے کبھی نہ دیکھی ہو۔ اِس فوج کو وہ ایسی حسن و خوبی سے لڑانے کا ارادہ کر چکا تھا کہ عرب بچ کر نہ جا سکیں تاکہ اپنی پے در پے شکستوں کو فتح و کامرانی میں بدل دے۔

ہرقل نے رُوم، قسطنطنیہ، جزیرہ، آرمینیہ ہر جگہ احکام بھیجے کہ تمام فوجیں پائے تخت انطاکیہ میں ایک تاریخ معین تک حاضر ہو جائیں۔ ان احکام کا پہنچنا تھا کہ فوجوں کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ انطاکیہ کے چاروں طرف فوجوں کا ٹڈی دل پھیلا ہوا تھا۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے جو مقامات فتح کر لیے تھے۔ وہاں کے امراء اور رئیس اُن کے

عدل و انصاف کے اِس قدر گرویدہ ہو گئے تھے کہ مذہبی اختلافات کے باوجود وہ خود اپنی طرف سے دشمن کی خبریں حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے ذریعے ہی ابو عبیدہؓ کو تمام واقعات کی اطلاع پہنچ رہی تھی۔

اس وقت مسلم افواج چار حصّوں میں منقسم تھیں۔
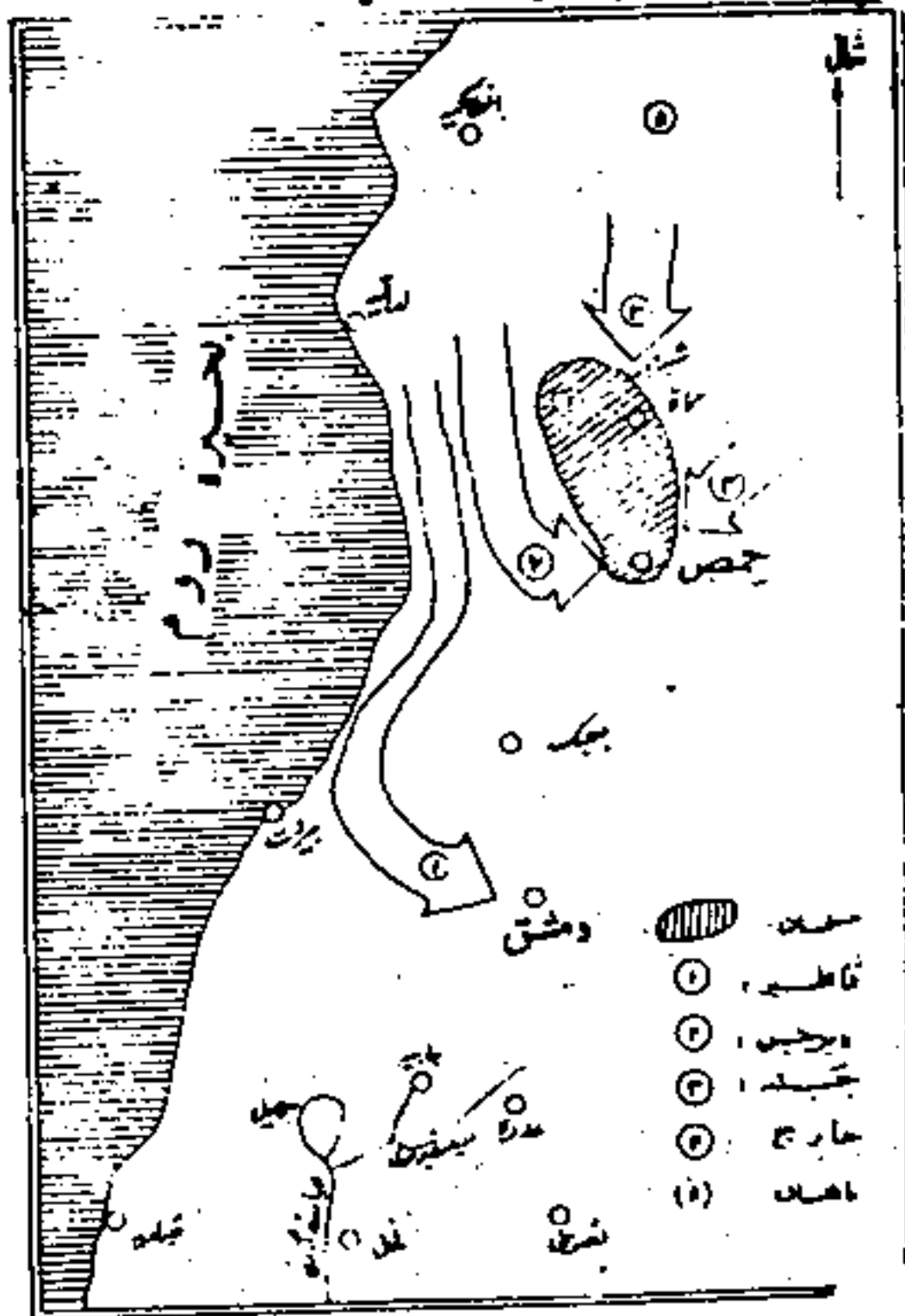
عمرو بن العاص فلسطین میں شرجیلؓ اُردن میں یزیدؓ قیساریہ میں اور ابو عبیدہؓ اور خالدؓ حمص اور شمالی علاقہ میں۔ منتشر مسلمان نازک حالات سے دوچار تھے۔ ہرقل نے اِس موقعہ سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ہی اپنی فوج کو منظم کرکے ابتدائی احکام دیے قیساریہ میں کمک بھیج کر وہاں کی تعداد چالیس ہزار کر دی تاکہ یزیدؓ کا لشکر مسلمان افواج سے ملنے کے لیے نہ نکل سکے۔

ہرقل کے احکام

رُومی افواج مندرجہ ذیل منصوبہ پر عمل کریں گے (نقشہ نمبر ۳ ملاحظہ ہو)

۱۔ قناطیس کی فوج ساحل کے ساتھ ساتھ بیروت جا کر مغرب کی سمت سے دمشق پر حملہ کرے گی تاکہ ابوعبیدہ باقی اسلامی فوج سے کٹ کر رہ جائیں۔

۲۔ جبلہ کی فوج حمص پر حماۃ کے راستے حملہ کرے گی۔ یہ فوج عرب عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ ہرقل نے جبلہ سے کہا عرب عرب سے لڑے گا اور مشہور مقولے "لوہا لوہے کو کاٹتا ہے" پر عمل درآمد مفید ثابت ہو گا۔

۳۔ دیرجن کی فوج حمص پر مغربی سمت سے حملہ آور ہو گی جو مسلمانوں کا بایاں پہلو ہے۔

۴۔ جارجہ حمص پر شمال مشرق سے آ کر مسلمانوں کے دائیں پہلو پر حملہ آور ہو گا۔

۵۔ باہان کی فوج عیسائی عربوں کے پیچھے پیچھے بڑھے گی اور ضرورت پڑنے پر استعمال کی جائے گی۔

رُومی منصوبے کا جائزہ

یہ بڑا سوچا سمجھا اور مسلمانوں کے خلاف خطرناک منصوبہ تھا۔ ہرقل چاہتا تھا کہ حمص پر مسلمانوں کے مقابلے میں تقریباً دس گنا رومی فوج جمع ہو جائے اور اُن کو شکست دے کر جنوب کا رُخ کرے اُسی وقت قیساریہ سے رُومی فوج حرکت میں آ جائے گی اس طرح اسلامی لشکر جو منتشر ہیں اُن کو ایک ایک کر کے ملیامیٹ کر دے گی۔

رُومی کوچ کی تیاریاں

رُومی سلطنت میں جگہ جگہ فتح کی دعائیں مانگی گئیں۔ مذہبی راہنماؤں نے جوش بھری تقریروں سے لوگوں کے دل گرما دیے۔ مذہب کا واسطہ دے کر اُن کو قربانی پر اُبھارا رُومی افواج جون کے وسط ۶۳۶ء میں انطاکیہ سے روانہ ہوئیں جب رُومی ہراول دستے حمص اور دمشق پہنچے تو ایک بھی مسلمان سپاہی وہاں پر موجود نہ تھا وہ سب حیران رہ گئے۔

اسلامی افواج کا ردِ عمل

مسلمانوں کو رُومیوں کے تمام منصوبوں کا علم ہو رہا تھا جس سے وہ بجا طور پر شوش تھے۔ جو بھی نئی خبر آتی تھی وہ پہلے سے زیادہ خوفناک ہوتی۔ حضرت ابوعبیدہؓ اور خالدؓ نے باہمی مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ساری اسلامی فوج کو شمالی اور وسطی شام اور فلسطین سے بلا کر یکجا کر دیا جائے تا کہ رُومیوں کی اتنی بڑی تعداد سے نبٹا جا سکے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ نے سب لشکروں کو بمقام جابیہ اکٹھا ہونے کا حکم دیا۔ یہ مقام شام، اُردن اور فلسطین سے آنے والے راستوں کے سنگم پر واقعہ تھا۔ بحیثیت سپہ سالار اعلیٰ ابوعبیدہؓ نے شرجیلؓ، یزیدؓ اور عمروؓ بن عاص کو مفتوحہ علاقے چھوڑ کر جابیہ آنے کا حکم دیا۔ پس رُومیوں کے دمشق پہنچنے سے پہلے ابوعبیدہؓ خالدؓ اور یزیدؓ کے لشکر جابیہ پہنچ چکے تھے باقی دونوں لشکر بھی پہنچنے والے تھے۔ اس طرح اسلامی فوج موت کے پنجہ سے بچ کر نکل آئی۔

یہ ایک ایسی شاندار فوجی تدبیر تھی جس کا فیصلہ کن نتیجہ برآمد ہُوا۔

مفتوحہ علاقوں سے مسلمانوں کا سلوک

مسلمان حمص کو چھوڑ رہے تھے تو حضرت ابوعبیدہؓ نے جزیہ کی تمام رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ

"اب ہم نہ آپ لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اب آپ اپنے خود ذمہ دار ہیں"

عیسائیوں پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہُوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ "خدا تمہیں واپس لائے"

یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہُوا۔ انہوں نے کہا "توراۃ کی قسم جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا یہ کہہ کر شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے۔ ابوعبیدہؓ نے صرف حمص والوں کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا بلکہ جس قدر اضلاع

فتح ہو چکے تھے ہر جگہ لکھ بھیجا کہ جزیہ کی جس قدر رقم وصول ہوئی ہے۔ واپس کر دی جائے۔

دربارِ خلافت کو اطلاع

حضرت ابو عبیدہ نے دمشق کے لیے روانہ ہونے سے پہلے تمام حالات سے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر کہ مسلمان رومیوں کے ڈر سے حمص سے چلے آئے نہایت رنجیدہ ہوئے۔ لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا۔ کہ کل فوج اور افسرانِ فوج نے یہی فیصلہ کیا تو تسلی ہوئی اور فرمایا کہ: خدا نے کسی مصلحت سے تمام مسلمانوں کو اس بات پر متفق کیا ہوگا"۔ ابو عبیدہؓ کو جواب لکھا کہ "میں مدد کے لیے سعیدؓ بن عامر کو بھیجتا ہوں لیکن فتح و شکست فوج کی قلت و کثرت پر نہیں ہے"۔

ابو عبیدہؓ جب دمشق پہنچے تو قاصد عمرؓو بن العاص کا خط لے کر پہنچا جس میں تحریر تھا۔ کہ اُردن کے اضلاع میں عام بغاوت پھیل گئی ہے اور حمص کو چھوڑ کر چلا آنا نہایت بے رعبی کا سبب ہوا ہے۔ ابو عبیدہؓ نے جواب میں لکھا کہ حمص کو ہم نے ڈر کر نہیں چھوڑا بلکہ مقصود یہ تھا۔ کہ دشمن کے محفوظ مقامات سے نکل آئیں اور اسلامی فوجیں جو جابجا پھیلی ہوئی ہیں یکجا ہو جائیں خط میں یہ بھی لکھا کہ میں وہیں آکر تمہیں ملتا ہوں۔

دوسرے دن ابو عبیدہؓ نے دمشق سے روانہ ہو کر یرموک پہنچ کر قیام کیا۔ عمرؓو بن العاص بھی یہیں آکر ملے۔ ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس ایک اور قاصد دوڑایا اور لکھا کہ رومی بحر و بر سے اُبل پڑے ہیں اور جوش کا یہ حال ہے کہ فوج جس راہ سے گزرتی ہے۔ راہب اور خانقاہ نشین بھی نکل نکل کر فوج کے ساتھ ہوتے جاتے ہیں۔

خط پہنچا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے لوگوں کو جمع کر کے سنایا تمام صحابہ بے اختیار رو پڑے اور نہایت جوش سے پکار کر کہا کہ امیر المومنین خدا کے لیے ہم کو اجازت دیجیے۔ کہ ہم اپنے بھائیوں پر جا کر نثار ہو جائیں۔ اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ امدادی فوجیں روانہ کی جائیں جب قاصد نے یہ بتایا کہ رومی یرموک سے تین چار منزل کے فاصلہ پر

ہیں تو حضرت عمرؓ نہایت غمزدہ ہوئے اور کہا کہ افسوس اب کیا ہو سکتا ہے۔ اتنے عرصہ میں کیونکر مدد پہنچ سکتی ہے، ابو عبیدہ کے نام پُر تاثیر خط لکھا اور قاصد سے کہا کہ خود ایک ایک صف میں جا کر یہ خط سنانا۔ یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ جس دن قاصد پہنچا اسی دن عامر بھی ہزار آدمی کے ساتھ پہنچ گئے۔ مسلمانوں کو نہایت تقویت ہوئی اور استقلال کے ساتھ لڑائی کی تیاریاں شروع کیں۔

یرموک کا میدانِ جنگ

ابو عبیدہؓ نے افسروں سے مشورہ کیا کہ لڑائی کے لیے اسلامی فوجوں کو کس جگہ جمع کیا جائے۔ بحث و تمحیص کے بعد حضرت خالدؓ کی رائے سے سب نے اتفاق کیا خالدؓ نے کہا کہ جابیہ سے نکل کر عذرا کو پشت پر رکھتے ہوئے دریائے یرموک پر فوجوں کو صف آرا کرنا چاہیے۔ یہاں پر مرکز سے کمک بھی آسانی سے پہنچ سکے گی اور ہمارے سامنے اپنی سوار فوج کے حملے کے لیے کھلا میدان بھی ہوگا۔

نقشہ بزہم مخالف فوجوں کی یرموک میں صف آرائی
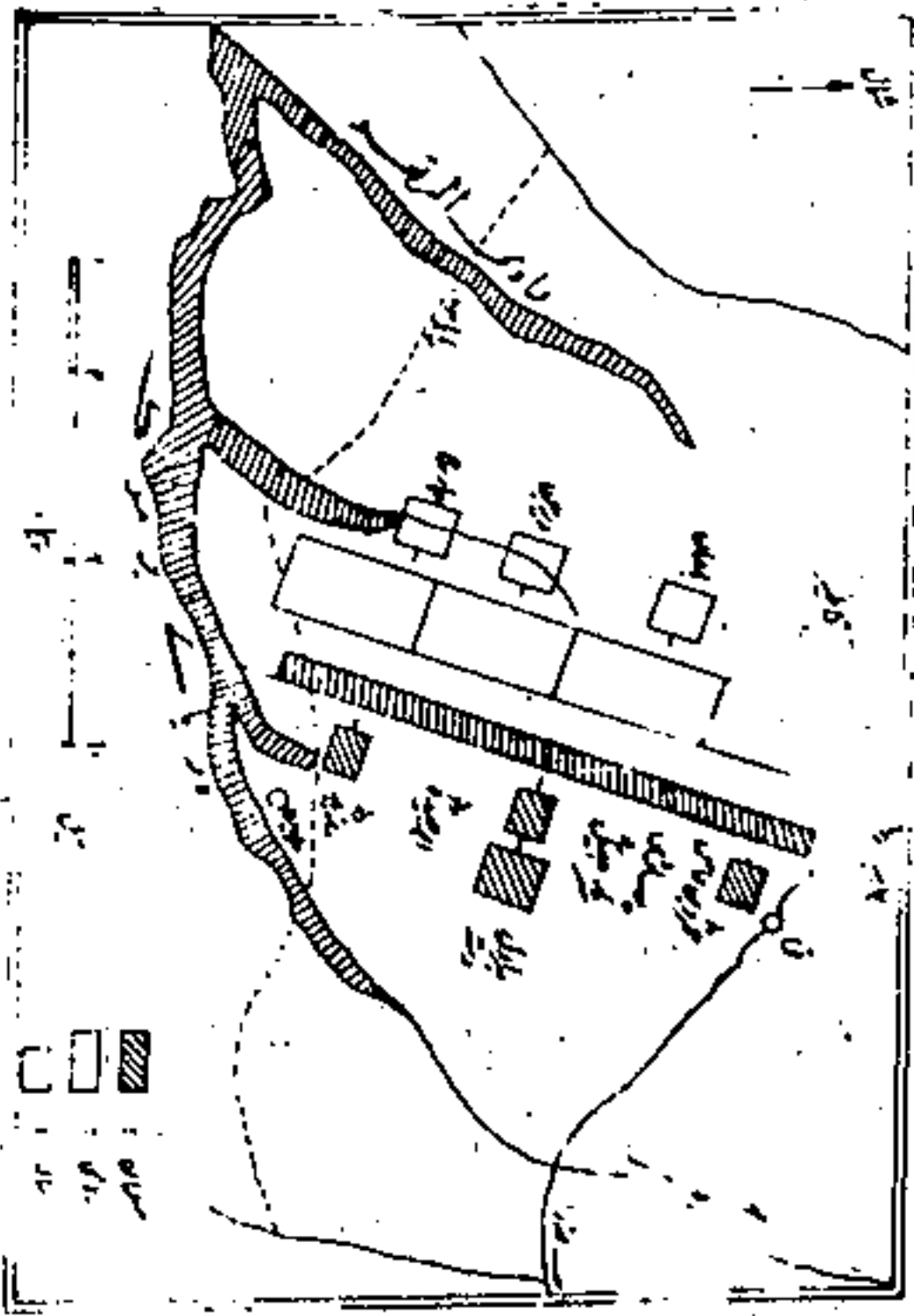
یرموک کا میدانِ جنگ جو اسلامی و رومی فوجوں کے درمیان تھا اُس کے مغربی اور جنوبی حصے گہری گھاٹیوں سے گھرے ہوئے تھے۔ مغرب میں وادی رقعد تھی جو دریائے یرموک سے بمقام یاقوسہ آکر مل جاتی تھی دریائے رقعد کے کنارے نہایت ہی کھڑے تھے جن کی اونچائی سینکڑوں فٹ تھی۔ اس دریا پر قابلِ ذکر صرف ایک پایاب مقام تھا۔ جنوب میں دریائے یرموک تھا۔ شمال میں وادئ رقعد سے عذرا کی پہاڑیوں تک تیس میل لمبا میدان تھا۔ اِس میدان کا وسطی اور مغربی حصہ یرموک کا اصل میدانِ جنگ تھا۔

مخالف فوجوں کی صف آرائی (نقشہ نمبر۴ ملاحظہ فرمائیں)

رُومی فوجوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی ان کو چار حصّوں میں تقسیم کر کے مختلف افسروں کے تحت کر دیا گیا ہر پیادہ حصّہ فوج کو علیحدہ علیحدہ سوار دستے دے دیے گئے جو اُن مقرر کردہ افسرانِ بالا کے تحت تھے۔ رومن کیمپ ایک سرے سے دُوسرے سرے تک بارہ میل لمبا تھا۔ جارج کی تیس ہزار فوج نے اپنے آپ کو زنجیریں پہنا کر جکڑ رکھا تھا دس دس سپاہی ایک ایک زنجیر میں بندھے ہوئے تھے ان سب نے موت کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ رُومی فوج کی تیس صفیں تھیں۔

اسلامی فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی جن میں دس ہزار سوار شامل تھے حضرت ابوعبیدہؓ نے صف آرائی کی تنظیم کے لیے خالدؓ کو تمام اختیارات دے دیے اور خود دُوسرے ضروری انتظامات مثلاً سامانِ رسد و جنگ، عورتوں اور بچّوں کا انتظام خوراک وغیرہ کو منظم کرنے میں مشغول ہوئے۔

خالدؓ نے پیادہ فوج کے چھتیس دستے بنائے۔ ہر ایک دستے میں تقریباً آٹھ سے نو سو تک افراد تھے۔ سوار فوج کے تین دستے بنائے۔ ہر ایک میں دو ہزار سوار تھے چار ہزار سواروں کا ایک الگ ہراول دستہ بنایا پیادہ فوج چار بڑے حصّوں میں تقسیم کر کے ہر ایک میں نو نو دستے شامل کیے۔

اسلامی کیمپ رومیوں کے عین بالمقابل گیارہ میل لمبا تھا۔ اسلامی فوج رومیوں کے مقابلے میں ایک پتلی سی لکیر تھی جس کی گہرائی صرف تین صفیں تھیں ہر صف پر الگ الگ ایسے افسر متعین کیے جو بہادری اور فنون جنگ میں شہرتِ عام رکھتے تھے۔ قاضی کی خدمت حضرت ابوالدرداؓ کے سپرد ہوئی لشکر کے قاری حضرت مقدادؓ تھے واعظ ابوسفیان تھے جو پُرجوش تقریروں سے فوج کو جوش دلانے کے ذمہ دار تھے۔ اور اس کام کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔

صُلح کی پیشکش

ابھی دونوں فوجیں صف آرا ہو رہی تھیں کہ رومیوں کے ایک قاصد نے آکر باہان کو جو کمانڈر انچیف تھا ہرقل کا یہ پیغام دیا کہ مسلمانوں سے صلح کی بات چیت کی جائے اور اگر وہ واپس عرب میں چلے جانے پر رضامند ہو جائیں تو انہیں نہایت ہی فراخدلانہ شرائط اور تحفے تحائف دے کر خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔ باہان نے اپنی فوج کے ایک اعلیٰ افسر جارج نامی کو قاصد بنا کر بھیجا جس وقت وہ پہنچا شام ہو چکی تھی اُس نے مسلمانوں کو مغرب کی نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا جس ذوق و شوق، محویت سکون و وقار خشوع و خضوع و ادب سے انہوں نے نماز ادا کی۔ قاصد نہایت حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھتا رہا جب نماز ادا ہو چکی تو اس نے ابوعبیدہؓ سے چند سوالات کیے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ تم حضرت عیسٰی کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ ابوعبیدہ نے قرآن کی یہ آیتیں پڑھیں۔

یَآ اَھۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ (سے لے کر .... وَلَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ تک)

مترجم نے ترجمہ کیا تو جارج پکار اٹھا کہ بلاشک عیسٰی کے یہی اوصاف ہیں اور بے شک تمہارا پیغمبر سچا ہے یہ کہہ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا مگر ابوعبیدہ نے اُسے اس خیال سے کہ رومیوں کو بدعہدی کا گمان نہ ہو مجبور کیا کہ کل جو سفیر یہاں سے جائے گا اس کے ساتھ چلے آنا دوسرے دن حضرت خالدؓ بطور سفیر رومیوں کی لشکرگاہ میں گئے۔

حضرت خالدؓ کو بڑے احترام کے ساتھ باہان نے اپنے برابر بٹھایا اور اپنی تقریر شروع کی حضرت عیسیٰؑ کی تعریف کے بعد قیصر کا نام لیا اور بڑے فخر سے کہا کہ ہمارا بادشاہ تمام بادشاہوں کا شہنشاہ ہے ترجمان پورا ترجمہ نہیں کر چکا تھا کہ خالد نے باہان کو روک کر کہا۔ تمہارا بادشاہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ہم نے جس کو سردار بنا رکھا ہے اس کو اگر ایک لمحظہ بادشاہی کا خیال آئے تو ہم فوراً اُسے معزول کر دیں۔

باہان نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا" اہل عرب تمہاری قوم کے جو لوگ ہمارے ملک میں آکر آباد ہوئے ہم نے ہمیشہ اُن سے دوستانہ سلوک کیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ان مراعات کا تمام عرب ممنون ہوگا۔ لیکن خلافِ توقع تم ہمارے مُلک پر چڑھ آئے اور چاہتے ہو کہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال دو۔ تم کو معلوم نہیں کہ بہت سی قوموں نے بارہا ایسے ارادے کیے لیکن کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ اب تم کو کہ تمام دُنیا میں تم سے زیادہ کوئی قوم جاہل، وحشی اور بے سروسامان نہیں، یہ حوصلہ ہُوا ہے۔ ہم اس پر بھی درگزر کرتے ہیں بلکہ اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو انعام کے طور پر سپہ سالار کو دس ہزار اور افسروں کو ہزار ہزار اور عام سپاہیوں کو سوسو دینار دلا دیے جائیں گے۔

باہان اپنی تقریر ختم کر چکا تو خالد اُٹھے اور حمد و نعت کے بعد کہا۔

" بے شبہ تم دولتمند ہو، مالدار ہو صاحب حکومت ہو، تم نے اپنے ہمسایہ عربوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی ہم کو معلوم ہے لیکن یہ تمہارا کچھ احسان نہ تھا بلکہ اشاعتِ مذہب کی ایک تدبیر تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ وہ عیسائی ہوگئے۔ اور آج خود ہمارے مقابلے میں تمہارے ساتھ ہو کر ہم سے لڑتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم نہایت محتاج تنگ دست اور خانہ بدوش تھے ہمارے ظلم و جہالت کا یہ حال تھا کہ قوی کمزور کو پیس ڈالتا تھا، قبائل آپس میں لڑ لڑ کر برباد ہوتے جاتے تھے۔ بہت سے خدا بنا رکھے تھے اور ان کو پُوجتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے بُت تراشتے تھے اور اُن کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن خدا نے ہم پر رحم کیا اور ایک پیغمبر بھیجا جو خُود ہماری قوم میں سے تھا اور ہم میں سب سے

زیادہ شریف، زیادہ فیاض اور زیادہ پاک خو تھا۔ اس نے ہم کو توحید سکھائی اور بتایا کہ خدا کا کوئی شریک نہیں، وہ بیوی اور اولاد نہیں رکھتا وہ بالکل یکتا و یگانہ ہے۔ اس نے ہم کو یہ بھی حکم دیا کہ ہم ان عقائد کو تمام دنیا کے سامنے پیش کریں جس نے ان کو مانا وہ مسلمان ہے اور ہمارا بھائی ہے۔ جس نے نہ مانا لیکن جزیہ دینا قبول کرتا ہے اس کے ہم حامی و محافظ ہیں جس کو دونوں سے انکار ہو اس کے لیے تلوار ہے۔"

باہان نے جزیہ کا نام سن کر اپنے لشکر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ مر کر بھی جزیہ نہیں دیں گے ہم جزیہ لیتے ہیں دیتے نہیں" غرض صلح نہ ہو سکی اور خالدؓ اٹھ کر چلے آئے اب اس آخری لڑائی کی تیاریاں شروع ہو گئیں جس کے بعد رومی پھر کبھی سنبھل نہ سکے۔

دونوں فوجوں کو یرموک میں آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

اسی اثنا میں دونوں فوجوں میں جھڑپیں بھی ہو چکی تھیں جن میں رومیوں نے مسلمانوں کے حوصلے اور جنگی تیاریوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ لڑائی میں اس دیر کی وجہ سے مسلمانوں کو خلیفہ ثانی کی طرف سے چھ ہزار کی تازہ کمک پہنچ گئی تھی جس سے مسلمانوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔

اسلامی فوج کے لڑنے کا طریقہ

میدانِ کارزار میں مسلمانوں کے لڑنے کا طریقہ حسب ذیل تھا۔

۱۔ تمام نیزہ باز صفِ اوّل میں رکھے گئے تاکہ حملہ آور ان کی تیز نوکوں سے چھد کر ہی دوسری صفوں تک پہنچ سکیں۔

۲۔ تیر انداز صفِ اوّل میں جا بجا متعین کیے گئے تاکہ جونہی دشمن حملے کے لیے آگے بڑھیں ان کو دور ہی روکا جائے اور زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے۔

۳۔ جب حملہ آور صفوں میں گھس آئیں تو ان کا نیزوں اور تلواروں سے

خاتمہ کیا جائے۔

۴۔ دشمن اگر میمنہ اور میسرہ کے کسی حصے کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو جائے تو ان کے اعلیٰ افسروں کے تحت جو سوار دستے متعین ہیں اُن کو استعمال میں لا کر اپنی صفوں کو پھر سے استوار کیا جائے۔

۵۔ قلب کے دستوں کی امداد کے لیے خالدؓ ہراول دستے اور تیسرے سوار دستے کو ہر وقت تیار رکھیں گے اور یہی دستے حسبِ ضرورت فوج کے کسی بھی حصے کو مدد دینے کے لیے مہیا کیے جائیں گے۔

میدانِ کارزار کا عسکری جائزہ

دونوں فوجوں کے جنوبی پہلو تو دریائے یرموک پر ہونے کی وجہ سے محفوظ تھے۔ شمالی پہلو کھلے تھے جن پر پیچھے یا ایک طرف سے حملے کیے جا سکتے تھے۔ عقبی زمین کی حالت مختلف تھی مسلمانوں کے عقب میں میدان یرموک کا وہ حصہ تھا جس کے مشرقی کنارے پر عذرا کی بکھری ہوئی پہاڑیاں اور جبل الدروز تھا۔ پسپائی کی صورت میں یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے بہترین جائے پناہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس رومی افواج کے کچھ حصہ کے عقب میں دشوار گزار وادی الرقعد تھی جو پسپائی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ پس یہ وادی جہاں رومیوں کو آخری دم تک لڑنے کی ترغیب دلا رہی تھی وہاں اگر رومیوں کے پسپائی کے شمالی راستے کٹ جائیں تو پھر یہی وادی موت کا بھیانک کنواں ثابت ہو سکتی تھی اگر رومیوں کو اس میں دھکیل دیا جاتا تو پھر بچ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ان کو بے جگری سے لڑ کر جنگ جیتنے کی پوری کوشش کرنے پر ابھارتی ہوگی۔

اعلیٰ سطح پر سوچنے کے فوجی انداز

حضرت خالدؓ کی جنگی مہارت اور فنونِ جنگ سے واقفیت عسکری تاریخ کی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ جنگِ یرموک کی تجویز بناتے وقت اسی وادی الرقعد کی اہمیت

اُن کے ذہن میں تھی چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ رومیوں کے ساتھ جو مسلمانوں سے پانچ گنا ہیں مدافعانہ جنگ لڑی جائے اور جب رومی پے در پے حملے کرتے ہوئے تھک جائیں تو مسلمان پر زور اور منظم حملے کر کے رومیوں کو وادی الرقعد کی طرف دھکیل کر گھیرے میں لے لیں۔ رومی اِس وادی کی اہمیت سے غافل تھے۔

آغازِ جنگ

اب دونوں فوجیں ہتھیاروں سے پوری طرح لیس تھیں۔ اعلیٰ افسر اپنے ذہنوں میں لڑائی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر چکے تھے اور ذہنی طور پر حریفوں کو شکست دینے کے لیے مستعد تھے۔ جو تجویزیں زیرِ غور آ چکی تھیں اُن کو عملی جامہ پہنانے میں جو فوج بھی سبقت لے جائے گی فتح و نصرت اُس کے قدم چومے گی۔ مسلمانوں کی تعداد اگرچہ کم تھی مگر ان میں صحابہ کرام تھے اور ایک سو بزرگ جنگِ بدر کے مجاہدین تھے جو بدر میں رسول اللہ کے ہمرکاب رہے تھے۔

عرب کے مشہور قبائل میں سے دس ہزار سے زیادہ صرف قبیلہ ازد کے لوگ تھے۔ اس معرکہ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ عورتیں بھی اس میں شریک تھیں۔ ابوعبیدہؓ نے عورتوں اور بچوں کے کیمپ فوج کے عقب میں اِس طرح منظم کیے تھے کہ ہر دستے کے خاندانوں کے کیمپ خود اُن کے پیچھے رکھے گئے تھے۔

امیر معاویہؓ کی ماں ہندہ حملہ کرتی ہوئی بڑھتی تھیں تو پکارتی تھیں

عَضَدُوا الْغُلْفَانَ بِسُيُوفِكُمْ۔ امیر معاویہؓ کی بہن جویریہ نے بھی بڑی دلیری سے جنگ کی۔ مقداد جو نہایت خوش آواز تھے، فوج کے آگے آگے سورہ انفال جس میں جہاد کی ترغیب ہے، کی تلاوت کرتے جاتے تھے۔

اُدھر رومیوں کے جوش کا عالم یہ تھا کہ تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں زنجیریں پہن لی تھیں تاکہ پیچھے ہٹنے کا خیال تک نہ آئے۔ جنگ کی ابتداء رومیوں کی طرف سے ہوئی ہزاروں پادری اور بشپ ہاتھوں میں صلیب لیے آگے تھے۔ یہ سروسامان

دیکھ کر ایک شخص کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ اللہ اکبر کس قدر بے انتہا فوج ہے۔ خالدؓ نے جھلا کر کہا "چپ رہ، خدا کی قسم میرے گھوڑے کے سم اچھے ہوتے تو میں کہہ دیتا کہ عیسائی اتنی ہی فوج اور بڑھا لیں"

غرض عیسائیوں نے نہایت زور شور سے حملہ کیا اور تیروں کا مینہ برساتے ہوئے بڑھے مسلمان دیر تک ثابت قدم رہے لیکن حملہ اس زور کا تھا کہ مسلمانوں کا میمنہ ٹوٹ کر فوج سے علیحدہ ہو گیا اور نہایت بے ترتیبی سے پیچھے ہٹا۔ ہزیمت یافتہ ہٹتے ہٹتے حرم کے خیمہ گاہ تک آ گئے عورتوں کو یہ حالت دیکھ کر سخت غصہ آیا اور خیمہ کی چوبیں اکھاڑ لیں اور للکاریں نامردو! ادھر آئے تو چوبوں سے تمہارا سر توڑ دیں گے خولہ یہ شعر پڑھ کر لوگوں کو غیرت دلاتی تھیں۔

یا ھاربا عن نسوۃ تقیات
رمیت بالسھم والمنیات

میمنہ میں قبیلہ ازد شروع حملہ سے ثابت قدم رہا تھا۔ عیسائیوں نے سارا زور ان پر ڈالا۔ لیکن وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے جنگ کی یہ شدت تھی کہ فوج میں ہر طرف سر ہاتھ بازو کٹ کٹ کر گرتے جا رہے تھے لیکن سپاہیوں کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی تھی۔ قبیلہ کے سردار عمروؓ بن الطفیل تلوار مارتے جاتے تھے اور للکارتے جاتے تھے کہ: ازدیو! دیکھنا مسلمانوں پر تمہاری وجہ سے داغ نہ آئے۔" نو بڑے بڑے بہادر ان کے ہاتھ سے مارے گئے اور آخر خود شہادت حاصل کی۔

حضرت خالدؓ نے اپنی فوج کو پیچھے لگا رکھا تھا۔ دفعتہً صف چیر کر نکلے اور اس زور سے حملہ کیا کہ رومیوں کی صفیں تتر بتر کر دیں۔ عکرمہؓ بن ابوجہل نے جو اسلام لانے سے پہلے اکثر کفار کے ساتھ رہ کر لڑے تھے۔ گھوڑا آگے بڑھایا اور کہا: عیسائیو! میں کسی زمانے میں (کفر کی حالت) خود رسول اللہ سے لڑ چکا ہوں۔ کیا آج تمہارے مقابلہ میں میرا پاؤں پیچھے ہٹ سکتا ہے! یہ کہہ کر فوج کی طرف دیکھا اور کہا مرنے پر کون بیعت کرتا ہے؟ چار سو شخصوں نے جن میں ضرار بن ازور بھی تھے مرنے پر بیعت کی اور اس ثابت قدمی سے لڑے کہ قریباً سب وہیں کٹ کر رہ گئے۔ عکرمہؓ کی لاش مقتولوں

کے ڈھیر میں ملی کچھ دم باقی تھا۔ خالدؓ نے اپنے زانو پر ان کا سر رکھا اور منہ میں پانی ٹپکایا۔

عین اس وقت جب میمنہ میں بازارِ قتال گرم تھا۔ جارج نے میسرہ پر حملہ کیا۔ بدقسمتی سے اس حصے میں اکثر لخم و غسان کے قبیلہ کے آدمی تھے جو شام کے اطراف میں بود و باش رکھتے تھے۔ ایک مدت سے رُوم کے باجگزار رہتے آئے تھے۔ رُومیوں کا جو رُعب دلوں میں سمایا ہوا تھا۔ اُس کا یہ اثر ہُوا کہ پہلے ہی حملے میں اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اگر افسروں نے ہمت سے کام نہ لیا ہوتا تو لڑائی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ رومی بھاگنوں کا پیچھا کرتے ہوئے خیموں تک پہنچ گئے عورتیں یہ حالت دیکھ کر بے اختیار نکل پڑیں۔ اور ان کی پامردی نے عیسائیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

قباث بن اشیم، سعد بن زید، یزید بن ابی سفیان داد شجاعت دے رہے تھے۔

یزید بن ابی سفیان بڑی ثابت قدمی سے لڑ رہے تھے اتفاق سے اُن کے باپ اُبوسفیان جو فوج کو جوش دلاتے پھرتے تھے ان کی طرف آنکلے۔ بیٹے کو دیکھ کر کہا۔ تو سپہ سالار ہے اور سپاہیوں کی بہ نسبت تجھ پر شجاعت کا زیادہ حق ہے۔ تیری فوج میں اگر ایک سپاہی بھی تجھ سے بازی لے گیا تو تیرے لیے شرم کی بات ہے۔

شرجیلؓ کا یہ حال تھا کہ رومیوں کا چاروں طرف نرغہ تھا اور یہ بیچ میں ڈٹے ہوئے تھے۔ قرآن کی یہ آیت اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ پڑھتے جاتے تھے اور نعرہ مارتے تھے کہ خدا کے ساتھ سودا کرنے والے اور خدا کے ہمسایہ بننے والے کہاں ہیں؟ یہ آواز جس کے کان میں پڑی بے اختیار لوٹ پڑا یہاں تک کہ اکھڑی ہوئی فوج پھر سنبھل گئی۔

اس لڑائی کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی حباش بن قیس جو ایک بہادر سپاہی تھے۔ لڑتے لڑتے کسی نے ان کے پاؤں پر تلوار ماری اور ایک پاؤں (پنجہ) کٹ کر الگ ہو گیا۔ حباش کو خبر تک نہ ہوئی تھوڑی

دیر کے بعد جب لڑائی کا زور کم ہُوا تو ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ میرا پاؤں کدھر گیا ان کے قبیلے کے لوگ اس واقعہ پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔

ایک اور واقعہ جو قارئین کے لیے مسرت و فخر کا باعث ہوگا۔ لڑائی کے چوتھے روز سخت لڑائی ہو رہی تھی اور شدت میں جب تھوڑا سا وقفہ ہُوا تو حضرت خالدؓ سخت پریشان نظر آرہے تھے۔ اُن کے رفقاء یہ دیکھ کر حیران ہوئے مگر جب خالدؓ نے ان سے کہا کہ ان کی لال رنگ کی ٹوپی کہیں کھو گئی ہے اُسے ڈھونڈھ لائیں تو وہ تشویش کی وجہ سمجھے۔ تلاش کے بعد ٹوپی مل گئی جسے خالدؓ لے کر بہت خوش ہوئے اور شکر ادا کیا۔ کچھ لوگوں کو اس ٹوپی کے متعلق معلوم نہیں تھا۔ اُن کے استفسار پر خالدؓ نے بتایا کہ جب حضور نے آخری حج بیت اللہ کے بعد اپنے سر مبارک کے بال منڈوائے تو میں نے حضورؐ کے کچھ بال اُٹھا لیے۔

حضورؐ نے مجھ سے پوچھا "اِن بالوں کو کیا کرو گے؟ میں نے عرض کیا کہ اے اللہؐ کے پیغمبر میں لڑائیوں کے دوران میں اِن سے قوت حاصل کروں گا۔ اس پر حضور نے فرمایا جب تک اِن کو پاس رکھو گے ہمیشہ فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے گی۔ چنانچہ میں نے ان بالوں کو اس لال ٹوپی میں سلوا لیا تھا اور مجھے آج تک ایسا دشمن نہیں ملا جسے شکست نہ دی ہو۔

لڑائی کے دونوں پہلو اب تک برابر تھے بلکہ غلبہ کا پلہ رُومیوں کی طرف تھا دفعتہً قیس بن ہبیرہ جن کو خالدؓ نے فوج کا ایک حصّہ دے کر میسرہ کی پشت پر متعین کر دیا تھا۔ عقب سے نکلے اور اِس طرح ٹوٹ کر دشمن پر گرے کہ رُومی فوج سنبھل نہ سکی تمام صفیں تتر بتر ہو گئیں۔

اور گھبرا کر پیچھے ہٹیں۔ ساتھ ہی سعید بن زید نے قلب سے نکل کر حملہ کیا اور رُومی دُور تک ہٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ انہیں دھکیل کر وادی الرقعہ کی طرف لے گئے۔ خالد نے سوار دستوں سے اُن کے فرار کے راستے بند کر دیے اور وہ گھر کے رہ گئے آخر اُن پر اتنا دباؤ ڈالا گیا کہ وہ ہٹتے ہٹتے اس بھیانک وادی میں سینکڑوں فٹ کی بلندی سے گر کر بڑی کسمپرسی کی حالت میں موت کی نیند سو گئے۔

رومیوں کے جس قدر آدمی مارے گئے۔ ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔ طبری اور ازدی نے لاکھ سے زیادہ بیان کی ہے۔ بلاذری نے ستر ہزار لکھا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے تین ہزار کا نقصان ہوا۔

حضرت ابو عبیدہ نے حضرت عمرؓ کو نامہ فتح لکھا اور ایک مختصر سی سفارت بھیجی حضرت عمرؓ یرموک کی خبر کے انتظار میں کئی دن سے سوئے نہ تھے۔ فتح کی خبر پہنچی تو دفعتہ سجدہ میں گر گئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ تھی اس لڑائی کی سرسری سی روئداد اس جنگ کی ایمان افروز، جوش ایمانی اور انفرادی قربانی سے لبریز سینکڑوں داستانیں ہیں مگر ان سب کو اس مضمون کے لیے احاطہ تحریر میں لانا ناممکن ہے۔ اصل لڑائی چھ روز تک رہی۔

شام سے ہرقل کا اخراج

جنگ یرموک ہلال و صلیب کی فیصلہ کن جنگ تھی۔ اب رومیوں کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ شام کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ جائیں۔ قیصر انطاکیہ میں تھا کہ شکست کی خبر پہنچی اسی وقت قسطنطنیہ کی تیاری کی اور چلتے وقت شام کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"الوداع اے شام! اب ہم کبھی واپس نہیں لوٹیں گے۔"

مفکر اسلام، مفسر قرآن، نباض عصر
حضرت ضیاء الامت
پیر محمد کرم شاہ الازہری
سجادہ نشین آستانہ عالیہ بھیرہ شریف
کی دینی، علمی اور ملی خدمات پر انکی خدمت عالیہ میں
ھدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔
اور اللہ رب العزت سے انکی درازی عمر اور صحت کیلئے دعاگو ہیں۔
اراکین: جماعت جند اللہ - انگلستان

فتوحاتِ فاروقی کی وسعت وخصوصیت

تحریر

مولانا عبدالقدوس ہاشمی

فاروق اعظم امیرالمومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ۴۰ قبل الہجرۃ میں بمقام مکہ مکرمہ قبیلۂ قریش کی شاخ بنی عدی کے گھرانے میں پیدا ہوئے وہیں پرورش و پرداخت ہوئی۔ وہ ماہر النساب سحر البیان خطیب، پہلوان اور بڑے اچھے شہسوار تھے انہوں نے بسلسلۂ تجارت، یمن، شام، عراق اور بہت سے مقامات کے کئی بار سفر بھی کئے تھے یہ نامور شجاع اور بہت ہی نامور معدلت پرور تھے۔ مکہ کی حکومت میں ان کو سفارت اور فصل خصومات کا کام سپرد تھا، گویا آج کی زبان میں وہ سفیر مطلق بھی تھے۔ اور سربراہ عدلیہ بھی۔

۶ ؁ قبل الہجرت میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے بعد مسلمان ہوئے۔ یہ السابقون الاولون میں چالیسویں یا اکتالیسویں مسلمان تھے۔ خود حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ایمان لانے کی دعا کی تھی۔ ان کے ایمان لانے کے بعد ہی مسلمان اس قابل ہو سکے کہ کھلے بندوں کعبہ کے قریب آئیں ورنہ اس سے پہلے کفار مکہ مسلمانوں کو کعبہ کے سامنے نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار مشیر اور جلیل القدر دوست رہے۔ وہ صلح و جنگ میں ہر جگہ آپ کے رفیق ہوتے تھے ہر اہم کام میں ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ وہ سفر و حضر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب

ہوتے تھے اور خوشی وغم میں شریک وہ اپنی اصابت رائے اور سوجھ بوجھ کے لیے مشہور ہیں حتیٰ کہ خود حضور نے فرمایا "عمرؓ کی زبان پر حق ہی آتا ہے" وہ خضوع، خشوع عدل و انصاف اور ایمان و اخلاص کے لیے ضرب المثل تھے اور آج تک ضرب المثل ہیں۔

وہ رسول اللہ کے ہم نسب تھے۔ آٹھویں پشت میں ان کا نسب نامہ کعب بن لوی بن فہر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کے ساتھ جو عدی کے بھائی مرہ بن کعب سے چلتا ہے، مل جاتا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر تھے۔ ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت بی بی حفصہؓ کو حضرت سرور کائنات کی زوجیت کا شرف حاصل ہے وہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے حضرت بی بی فاطمہ الزہرا کی صاحبزادی بی بی کلثومؓ ان کے نکاح میں تھیں۔

خلافت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے جب ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ ہجری کو وفات پائی تو حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ان کی جگہ خلیفہ ہوئے دو دن پہلے ہی حضرت ابوبکرؓ ان کا نام پیش کر کے مسلمانوں سے منظوری حاصل کر چکے تھے۔ جب یہ خلیفہ ہوئے تو لوگوں نے ان کو خلیفۂ خلیفۂ رسول اللہ کہہ کر مخاطب کرنا شروع کیا یہ بڑا طویل سا جملہ بنا جاتا تھا۔ اس لیے خود فاروق اعظم نے نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے بعد آنے والے تمام خلفائے اسلام کے لیے عہدہ کے اعتبار سے امیر المومنین (ایمان والوں میں سے صاحب حکم) کا لفظ تجویز کیا اور سارے مسلمانوں نے اسے پسند کیا اس طرح حضرت فاروق اعظم وہ پہلے آدمی ہیں۔ جو امیر المومنین کے لقب سے ملقب ہوئے اور ان کے بعد تمام خلفائے اسلام امیر المومنین کہے جاتے رہے۔

حضرت فاروق اعظم نے اپنے زمانۂ خلافت میں حکومتی نظم و نسق کے تمام صیغے قائم کیے مجاہدین کی فوجی تنظیم کو تکمیل تک پہنچایا، رفاہی امور کے لیے دفاتر قائم کیے اور

معاشی ترقیوں کے لیے مناسب و موثر بندوبست فرمائے ان کے دس سالہ دورِ خلافت پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں خلافتِ فاروقی سے متعلق ساری باتوں کا ایک مختصر سے مضمون میں احاطہ ممکن نہیں ہے ہم اپنے مضمون میں صرف فتوحاتِ فاروقی پر چند اعداد و شمار اور بعض اہم ترین خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر انسان کو حیرت ہوتی ہے۔

وفات

حضرت فاروق اعظم ۲۹ ذی الحجہ ۲۳ ہجری کو شہید ہوئے۔ ۲۶ ذی الحجہ کو حضرت عمر صبح کی نماز پڑھانے کو مسجدِ نبوی مدینہ منورہ میں کھڑے ہوئے تو فیروز نامی ایک مجوسی آتش پرست نے جو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا غلام تھا۔ آپ پر دو دھاری تلوار سے حملہ کیا۔ آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر امامت کے لیے کھڑا کر دیا اور خود گر پڑے آپ پر قاتل نے پے در پے چھ وار کئے تھے اور خون بہہ رہا تھا مسلمانوں نے اس صورتحال میں بھی نماز پوری کی۔ فیروز نے اور بھی کئی اشخاص کو قتل کیا اور راہ فرار نہ پا کر خودکشی کر لی۔

حضرت عمرؓ اس کے بعد دو دن زندہ رہے اور تیسرے دن رفیق اعلیٰ سے جا ملے ہفتہ یکم محرم ۲۴ ہجری کو حضرت بی بی عائشہ صدیقہ کے حجرہ میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر کی قبریں تھیں۔ ان کو بھی ان کی تمنا اور حضرت بی بی عائشہ کی اجازت کے موجب دفن کر دیا گیا۔

نمازِ جنازہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور قبر میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے مل کر اتارا۔

فتوحات کی وسعت

اس طرح خلافتِ فاروقی کی جملہ مدت قمری سال کے حساب سے ۱۰ سال ۶ ماہ اور

آٹھ دن ہوئی جو ۷۲۹ ۳ دنوں پر مشتمل ہے اس وقت خلافت اسلامیہ کا کل رقبہ تقریباً ۲۵۱۱۶۶۵ مربع میل پر محیط تھا اس رقبہ میں سے تقریباً ۱۲۰۹۵۰۱ مربع میل خود حضرت فاروق اعظمؓ کے حسن انتظام سے اور ان ہی کے دور خلافت میں فتح ہوئے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی مشہور کتاب الفاروق میں حضرت عمرؓ کے زیر سایہ ممالک کا کل رقبہ ۲۲۵۱۰۳۰ مربع میل لکھا ہے لیکن اس کی وجہ بھی اسی کتاب میں موجود ہے کہ آرمینیا طبرستان، لیبیا اور جزیروں کے رقبے انہوں نے شمار نہیں کئے تھے اسی طرح اور بھی بعض رقبے انہوں نے اس لئے چھوڑ دیئے تھے کہ وہاں کے مقامی حاکموں کو ماتحتی میں لینے کے بعد بھی انہیں ابھی بالکلیہ بے دخل نہیں کیا گیا تھا مثلاً طبرستان میں جزیہ لے کر قدیم انتظام باقی رکھا گیا تھا لیکن بہر حال یہ علاقے فتح ہو چکے تھے اس لئے ہم نے انہیں شمار میں لے لیا ہے۔

حضرت سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات (۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری) کے وقت اسلامی حکومت کا رقبہ تقریباً (۹۲۷۰۰۰) مربع میل تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو ارتداد کا اتنا بڑا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ کہ اکثر حصہ خلافت صدیقی سے نکل گیا۔ حضرت صدیق اکبر نے عزم راسخ اور ایمان کامل سے اس فتنہ کا کامیاب مقابلہ کیا اور نہ صرف اس فتنہ کو دبا کر سب کو خلافت کے ماتحت لے آئے بلکہ صرف سوا دو سال کی مدت خلافت میں مزید (۲۷۵۱۶۴) مربع میل کا اس میں اضافہ کر دیا۔

جب حضرت صدیق اکبر نے وفات پائی اس وقت خلافت اسلامیہ کا رقبہ تقریباً (۱۲۰۲۱۶۴) مربع میل تھا۔ اس کے بعد جب حضرت فاروق اعظم خلیفہ ہوئے تو اس رقبہ میں ۱۳۰۹۵۰۱ مربع میل کا مزید اضافہ ہو گیا اور حضرت فاروق اعظم کی وفات کے وقت خلافت اسلامیہ تقریباً (۲۵۱۱۶۶۵) پچیس لاکھ گیارہ ہزار چھ سو پینسٹھ مربع میل پر محیط تھی۔

۱۵۱ مربع میل یومیہ

اس ۱۳۰۹۵۰۱ مربع میل کے رقبہ کو جب ان کے ایام خلافت (۳۷۲۹) دنوں پر

پر تقسیم کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اوسطاً خلافت فاروقی کے ہر دن میں تقریباً (۲۵۱)
مربع میل ایک فرلانگ (وکسر بالا) کا اضافہ ہوتا رہا۔
ممکن ہے کہ مزید تلاش و تحقیق سے ان اعداد میں کچھ فرق آجائے، لیکن اس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ یہ واقعہ اور یہ حقیقت حیرت افزا ہی رہے گی کہ اس زمانہ میں جب کہ ذرائع خبر رسانی بہت ہی کم تھے۔ اونٹوں اور گھوڑوں کے سوا کسی تیز رفتار سواری کا وجود نہ تھا۔ اور یہ اونٹ اور گھوڑے بھی ان بزرگ مجاہدین کو پوری طرح کہاں میسر تھے۔ ہتھیاروں کا یہ عالم تھا کہ ٹوٹی تلواریں ان پر نیام کی جگہ کمبل کے چیتھڑے لپیٹے ہوئے سواری کا یہ عالم کہ بارہ بارہ مجاہدین کے لیے ایک ایک جانور، رسد کا یہ عالم کہ فوجیں ہفتوں تک تھوڑے سے ستو پر بسر کرتی تھیں۔ پیاس بجھانے کے لیے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے معدہ کا پانی بارہا کام میں لایا جاتا۔ کہیں چھ چھ کھجوریں کھانے کو مل جاتیں اور میٹھا پانی پینے کو مل جاتا تو گویا عید ہو جاتی۔
نہ جنرل کہیں کے فوجی تعلیم یافتہ اور نہ سپاہی قواعد پریڈ سے آشنا۔ پھر اسلامی احکام جنگ کی شدید پابندیاں، عبادتوں اور اسلامی اخلاق و آداب پر شدت سے عمل۔ نمازیں قضا نہ ہوں، روزے چھوٹنے نہ پائیں۔
جسمانی و روحانی طہارتوں میں کمی نہ آنے پائے۔ شہروں کو فتح کرو مگر کسی کا ایک پیسہ کا مال بھی نہ لوٹو نہ برباد کرو۔ گاؤں سے گزر جاؤ مگر کسی کی کھیتی کو نہ روندو، باغوں میں پھلوں کو جھومتے ہوئے دیکھو لیکن ان میں سے ایک پھل بھی نہ توڑو۔ غیر مضافی آبادی کی حفاظت کرو، نہ کسی کی عزت و آبرو میں فرق آئے اور نہ ان کی جان و مال کو نقصان پہنچے، عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، بوڑھوں کو کچھ نہ کہو، بچوں کا خون نہ بہاؤ اپنے دلوں کو ہر آلودگی سے بچاؤ حتیٰ کہ خود اپنی ناموری و شجاعت کا خیال بھی نہ آنے دو جہاد کرو اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کی زمین پر امن قائم کرنے کے لیے جہاد کرو۔
یہ بے پناہ پابندیاں اور مقابلہ دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ دو بڑی بڑی بادشاہیوں یعنی قیصر و کسریٰ کی حکومتوں سے جن کے پاس دولت کی فراوانی، ہتھیاروں

کی بہتات، تربیت یافتہ فوجوں اور تجربہ کار جرنلوں کے ٹڈی دل اور یہ مقابلہ بھی مسلمانوں نے خود اپنی خوشی سے اپنے سر نہیں لیا تھا۔ بلکہ ان ہی حکومتوں نے مسلمانوں کو حقیر سمجھ کر دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے لڑائی کی طرح ڈالی تھی، فارس کے فرمان روا نے تو حضرت سرور کائنات کے تبلیغی خط ہی کو بے ادبی قرار دے کر پھاڑ دیا اور خط لانے والے بزرگ صحابی کو ذلیل کر کے نکلوا دیا۔ خط لکھنا ہی بے ادبی سمجھی گئی اور یمن کے وائسرائے کو حکم دے دیا گیا کہ خط لکھنے والے کو گرفتار کر کے بھیج دیا جائے خسرو پرویز نے خط پڑھا ہی نہیں، وہ خط جس میں کوئی دھمکی نہیں بلکہ صرف توحید پر ایمان کی دعوت تھی۔ اللہ رے غرور شہنشاہی،

ان ساری باتوں پر غور کیجئے تو یہ بات قیاس ہی میں نہیں کہ مسلمان ان بادشاہیوں کو مٹانے کے لیے بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ نکل پڑے ہوں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں شہنشاہوں نے مسلمانوں کو حقیر سمجھا اور انہیں دنیا سے نیست و نابود کر دینے کے لیے لڑائی کی طرح ڈالی، مسلمانوں کے پاس یقین و ایمان کی قوت کے سوا اگرچہ کوئی سامان جنگ نہ تھا لیکن یہ قوت ہی ایسی فیصلہ کن قوت ہے کہ

بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اسے قرآن و صاحب قرآن کا معجزہ کہیئے یا صحابہ کرام کی کرامت کہ حضرت فاروق اعظم نے ان دونوں مغرور شہنشاہوں کا غرور خاک میں ملا دیا اور چشم عالم نے یہ دیکھا کہ ہر چوبیس گھنٹے میں ۲۵۱ مربع میل سے زائد رقبہ زمین جلالت فاروقی کے سامنے سرنگوں ہوتا رہا مجاہدین بڑھتے رہے اور ملک پر ملک اور شہر پر شہر فتح ہوتے رہے قلعوں کی دیواریں گرتی رہیں، محلات کے سر بہ فلک آہنی دروازے مدینہ منورہ میں کھجوروں کی پتیوں سے چھائی ہوئی مسجد نبوی کے سامنے اور اس میں بیٹھے ہوئے پرانے پیوند لگے کرتے میں ملبوس ایک بندہ خدا اور غلام رسول اللہ کے حضور میں سجدے کرتے رہے۔ نہ ان کی تربیت یافتہ فوجیں کام آئیں اور نہ ان کے بھرے ہوئے خزانے۔

قیامِ امن

یہ سیلاب فتوحات اور اس شان کے ساتھ کہ نہ کہیں باغ اور کھیتیاں ویران ہوئیں نہ آبادیوں میں آگ لگائی گئی نہ کسی عورت پر کسی مجاہد نے ہاتھ اٹھایا۔ نہ کسی کی آبرو لوٹی گئی، نہ کسی بچہ کا خون ناحق کسی نے بہایا۔ نہ کہیں بازار لوٹے گئے اور نہ کسی غیر مضافی آبادی کے اطمینان وسکون میں فرق آیا نہ کاشتکاروں سے کھیت چھینے گئے، نہ کاریگروں سے کارخانے اور حد تو یہ ہے کہ اس تیرہ لاکھ مربع میل رقبۂ زمین پر قیامِ امن کے دوران میں ناروا طور پر کسی کے باغ سے ایک پھل بھی کسی نے نہیں توڑا۔

ایک شخص نے حمص میں ایک یہودی کے باغ سے باہر لٹکتا ہوا ایک پھل توڑ لیا تو حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے اس مجاہد کو اس ظلم کی سزا دے دی۔ اتنے ممالک فتح ہو گئے اور کسی راہب کے ذوقِ یکسوئی کو ٹھیس نہ لگی قیصر وکسریٰ کی شہنشاہیاں ختم ہو گئیں اور کسی تارک الدنیا کے گیان دھیان میں کوئی خلل اندوزی نہ ہوئی۔

مشرقی رومی سلطنت ختم ہوئی، فارس کی کسروانی شہنشاہیت نیست و نابود ہو گئی اور عرب کے ریگزاروں میں اونٹ چرانے والے اٹھے اور صحرائی ریگ کی طرح ساری فضا پر چھا گئے۔ ساربانوں کو جہاں بانی ملی اور انہوں نے عدل وانصاف، نظم وضبط اور آئینی حکومت کا وہ درخشاں نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ آج تک دنیا اس کے لیے ترس رہی ہے۔ عہد فاروقی میں ممالک فتح ہوئے لیکن انسان خانماں برباد نہیں ہوئے اس لیے لاکھوں جنگ زدہ اور بے خانماں انسانوں کے لبسانے کا سوال کہیں نہیں پیدا ہوا۔ نہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لاکھوں پناہ گیروں کا سیلاب آیا کسی کا اپنے گھر اور جائیداد سے بے دخل کیا جانا تو بڑی بات ہے۔ عہد فاروقی میں تو کسی مجاہد کو اس کی بھی اجازت نہ تھی کہ مفتوحہ ممالک میں کسی سے زمین وجائیداد خریدے اور کھیتی باڑی کرے۔

اس کے برخلاف عراق و فارس کے بے زمین کاشتکار اپنی زمینوں کے موروثی مالک قرار پائے مصر کے کسان نئی بنائی ہوئی نہروں سے آب پاشی کرنے لگے، شام، عراق

اور ایران کی صنعتوں میں اضافہ ہوا۔ افتادہ زمینوں کے بڑے بڑے رقبے زیر کاشت آگئے اور زمینوں کی پیداوار بڑھ گئی۔ کاریگر زیادہ کام کرنے لگے اور تجارت میں تو ایسی ترقی ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

جنگ اور جہاد

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پہلے بھی بہت سے فاتح و کشور کشا ہوئے ہیں اور ان کے بعد بھی ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کے علاقوں کا رقبۂ زمین فتوحات فاروقیہ کے رقبہ سے زیادہ بھی ہو۔ لیکن فتح کے دوران کی کیفیات اور اس کے بعد کے مستقل و لازوال اثرات کو دیکھ کر یہ حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ ملک گیری اور چیز ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ اور چیز وطن کے لیے شاہی کی وسعت کے لیے استحصال کے لیے اور ناموری اور دھاک جمانے کے لیے جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے پائیدار امن قائم کرنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو جہاد و قتال ہوتا ہے ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

ایک فاتح و کشور کشا کیخسرو بھی تھا، ایک سکندر بھی۔ ایک چنگیز اور ایک ہلاکو بھی لیکن ان کی فتوحات کے دوران میں آبادیوں پر کیا گزری کیسی کیسی ویرانیاں ہوئیں کیا کیا قیامتیں بپا ہوئیں اور تو اور حضرت فاروق اعظم کے بعد مسلمان کہلانے والوں کی فتوحات کو ہی دیکھئے۔ کیا نظر آتا ہے علاوہ ازیں جہاں سوز، تیمور لنگ اور نادر شاہ افشار کے ہاتھوں دنیا والوں پر کیا گزری غزنہ جل کر راکھ ہوا۔ فارس و شام میں خون کی ندیاں بہ نکلیں۔ دہلی میں قتل عام ہوا کیا کچھ نہ ہوا۔ خیر یہ تو پرانے زمانے کی باتیں تھیں نئے زمانہ میں تہذیب و شائستگی کے دعویداروں نے کون سے جرائم اٹھا رکھے۔ ستم رانی اور جفاکاری کے کیسے کیسے ہولناک مناظر دنیا نے دیکھے، حبشہ کے شہر ہرار پر زہریلی گیس اٹلی کے مہذب سورماؤں نے پھینکی، انسان تو انسان، درخت تک سوکھ گئے۔ گلہریاں اور چھپکلیاں تک مر گئیں، ہیروشیما پر امریکہ کے محافظین انسانی حقوق نے ایٹم بم مارا، پتھر تک پگھل گئے۔ جرمنی

کے مدعیان تہذیب کے ہاتھوں روس پر قیامت آئی اور روس کے درد دل رکھنے والوں نے کوہ یورال کے مشرق میں بیس سال تک مسلسل قتل وخون کا تماشہ دکھایا قازقستان نے ان کے ہاتھوں کیا کچھ نہ دیکھا داغستان میں انہوں نے کیا کچھ نہ کیا !

یہ ایک حقیقت ہے اور ناقابل انکار حقیقت کہ خدا کی راہ میں جہاد اور قومی مفاد کے لیے جنگ و جدال میں بڑا فرق ہوتا ہے ؎

بہت سے سورما ہیں لعنت بھیجی ہیں جن کو
زمیں جن کے قدم چومے مجاہد ان کو کہتے ہیں۔

حدودِ فتوحات

ممالک کے حدود عہد فاروقی سے اب تک کئی بار بدل چکے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مختصر سی تحریر کے آخر میں ان ممالک کی ایک فہرست دے دی جائے جو آج کل خلافت فاروقی کے حدود میں واقع ہیں یا ان ممالک کے موجودہ رقبہ میں خلافت فاروقی کے بعض حصے شامل ہیں۔

۲۳ھ کے اختتام پر فتوحات فاروقی کی حدیں یہ تھیں۔

شمال میں بحر خزر کے مغربی کنارہ کے ساتھ ساتھ مقام دربند سے تقریباً سو میل آگے شمال تک (کوہ قاف کے آگے تک)

جنوب میں عدن اور اس کے جنوب میں واقع جزائر تک

مشرق میں پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں مکران تک (اور بقول بلاذری مقام تھانہ تک جو آج کل صوبۂ بمبئی میں شمار کیا جاتا ہے)

مغرب میں لیبیا کے شہر طرابلس الغرب تک ان حدود کے اندر آج کل یہ حکومتیں ہیں۔

(۱) لیبیا (۲) مصر (۳) فلسطین (۴) شام (۵) اردن (۶) لبنان (۷) عراق (۸) ایران (۹) افغانستان (۱۰) سعودی عرب (۱۱) سلطنت عمان (۱۲) قطر (۱۳) امارات

متحدہ عربیہ (۱۴) یمن جنوبی (عدن وغیرہ) (۱۶) پاکستانی بلوچستان (۱۷) رُوسی آذربائجان (۱۸) مشرقی جنوبی ترکی (۱۹) روسی تاجکستان اور ازبکستان، ترکمانستان (۲۰) کویت (۲۱) بحرین (۲۲) سوڈان (شمالی حصہ)

حضرت فاروق اعظم ان سارے علاقوں کا مدینہ منورہ میں بیٹھ کر بغیر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے نظم و نسق کرتے تھے اور کہیں کوئی انتظامی خرابی پیدا نہ ہوتی تھی اور آج ہمارے لیڈر ہم کو یہ بتاتے ہیں کہ کسی ملک کا انضمام اگر دوسرے ملک سے ہو جائے تو بہت سی انتظامی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

مقبوضہ

ممالک فتح سے پہلے اور بعد

تحریر

پیر محمد کرم شاہ

درخت کی قدر و منزلت کا پتہ اس کے پھل سے چلتا ہے اور ایک نبی کی عظمت و جلالت اس کی تعلیمات کی اثر انگیزی اس کی تربیت کے اثرات اور اس کے برپا کردہ انقلاب کی ہمہ گیری اور پائیداری کا آئینہ اس کے شاگرد اور اس پر ایمان لانے والے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے سرور آقا علیہ الصّلوٰۃ و السّلام کو رحمت للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا اگر آپ اس شانِ رحمۃ للعالمینی کا صحیح اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو آپ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان غلاموں کو دیکھیں جن کی تربیت حضور نے خود فرمائی ہے اگرچہ حضور کا ہر صحابی اپنے پسندیدہ کمالات و خصائل کے لحاظ سے منفرد ہے لیکن حضور کی رسالت و نبوت کے جو جلوے ہمیں سیرتِ فاروقی میں نظر آتے ہیں۔ ان کی شان ہی نرالی ہے۔ آیئے ذرا تنگ نظری اور بے جا ضد کو چند لمحوں کے لیے پسِ پشت ڈال دیں اور دیکھیں خطاب کا بیٹا عمر جب فیضانِ نبوت سے فیض یاب ہوا تو

وہ کیا سے کیا بن گیا۔ آپ کی سیرت کے متعدد پہلو ہیں ایک سے ایک تابندہ تر اور درخشندہ تر ہے۔ مجھے ان سطور میں آپ کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اپنے عہدِ خلافت میں اس شاگردِ رشید نے اپنے محبوب کے لائے ہوئے دین کی کیا خدمات انجام دیں۔ آپ کی ذاتِ بابرکات سے مسلمانوں کو کیا فیض پہنچا اور ستم رسیدہ اور خستہ حال اقوام جن کو آپ کا سایہ عاطفت نصیب ہوا انہیں آپ نے کیا دیا جبکہ محکوم اپنے حاکم غلام اپنے آقا غریب شہری اپنے دولتمند ہموطنوں کے استحصال کا بری طرح شکار تھا۔ اس کو کس طرح ذہنی اور معاشی جکڑ بندیوں سے نجات دلائی!!

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے بعد جب آپ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے اس وقت جزیرہ عرب کے فقط مندرجہ ذیل علاقے اسلامی قلمرو میں داخل تھے۔ حجاز، یمن، حضر موت، بحرین اور نجد، ان علاقوں کی مجموعی آبادی جس میں بچے بوڑھے، بیمار اور عورتیں سبھی شامل تھیں۔ چند لاکھ نفوس سے زائد نہ تھی ان صوبوں میں کوئی علاقہ زرعی اعتبار سے اتنا خوشحال نہ تھا کہ وہ حالتِ جنگ میں، حسبِ ضرورت اجناسِ خوردنی فراہم کرسکے اس زمانہ میں افواج کے لیے جس طرح کے اسلحہ کی ضرورت تھی ان کی بہم رسانی کے لیے بھی کہیں کارخانے نہ تھے۔ کوئی ایسی بیرونی طاقت بھی نہ تھی جو وقتِ ضرورت مسلمانوں کی اسلحہ یا خوراک سے امداد کرسکے ان علاقوں کی افرادی قوت ایسی تھی جو اسلام سے پہلے کبھی ایک پرچم تلے جمع نہ ہوئی تھی، ان میں قبائلی رقابتوں، باہمی عداوتوں اور شخصی عناد و حسد کی وسیع خلیجیں عرصہ سے حائل تھیں۔ اس خلیفہ برحق نے اپنی فراستِ ایمانی، اپنی بیمثال عبقریت، اپنے بے نظیر تدبر سے کس طرح دنیا کی دو بڑی طاقتوں کو پے درپے شکستیں دیں اور کس طرح ان مفتوحہ علاقوں میں ہر قسم کے جور و استبداد کا خاتمہ کیا اور ایک بابرکت ذہنی، فکری اخلاقی اور معاشی انقلاب برپا کیا اگر آپ ان حالات کی روشنی میں فاروقی فتوحات کا جائزہ لیں گے تب آپ کو ان کی اہمیت کا صحیح احساس ہوگا آپ نے اپنے ساڑھے دس سالہ مختصر دور میں مندرجہ ذیل ممالک فتح کیے۔ عراق عرب، عراق عجم، فارس، خراسان، کرمان مکران موجودہ بلوچستان، آرمینیا، شام، فلسطین، اُردن، لبنان، سینا، مصر، طرابلس یعنی موجودہ لیبیا۔

دنیا میں آپ سے پہلے بھی بڑے بڑے فاتح گزرے ہیں جن کی فتوحات کے محیر العقول تذکرے سُن کر انسان دم بخود ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہ بھی ہوئے جن کی سطوت و ہیبت سے دنیا لرزہ بر اندام رہتی تھی۔ بڑے بڑے جرنیل بھی گزرے ہیں جن کی جنگی چالیں اور تدبیریں آج بھی ماہرین حرب کو ورطہ حیرت میں ڈال رہی ہیں اگر حضرت فاروق نے بھی ان ہی کی طرح ملک فتح کیے ہوتے اپنی سطوت و جبروت کا ڈنکا بجایا ہوتا اور فقط دوسرے نامور جرنیلوں کی طرح اپنے دشمنوں کو ہر میدان میں شکست فاش دی ہوتی تو ان کارناموں کے باعث آپ کو عالمگیر شہرت کے مالک فاتحین کی صف میں تو کھڑا کیا جا سکتا یا بادشاہوں کی تاریخ میں ایک اور عظیم الشان بادشاہ کے نام کا اضافہ کر دیا جاتا آپ کو ان جرنیلوں میں شمار کیا جا سکتا جنہوں نے وسائل کی کمی کے باوصف اپنے سے کہیں طاقتور ملکوں پر اپنی فتح و نصرت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ یہ سب کچھ تو ہو سکتا لیکن دنیا آپ کو فارُوق اعظم نہ کہتی۔ ہم انہیں شان رحمۃ للعالمین کا مظہر اتم نہ کہتے اور نہ آپ کو اسلامی نظام حیات کی افادیت فوقیت اور قابل عمل ہونے کی قطعی دلیل کے طور پر پیش کر سکتے۔

آئیے! فتح اسلامی سے پہلے ان ممالک کے حالات کا جائزہ لیں یہ دیکھیں کہ پہلے ان کے عقائد کیا تھے، ان کی اخلاقی حالت کیسی تھی۔ وہ معاشی اور اقتصادی لحاظ سے کس پوزیشن میں تھے اور جب فارُوق اعظم کے سپاہی وہاں پہنچے تو ان میں ذہنی فکری اخلاقی اور معاشی طور پر کیا انقلاب رُونما ہو گیا۔

عراق

سب سے پہلے ہم جزیرہ عرب کے مشرقی علاقہ عراق کا ذکر کرتے ہیں یہاں بڑے بڑے عالی مرتبت سلاطین گزرے ہیں جن کے عہد میں عراق نے ہر لحاظ سے ترقی کی ہے۔ ان کا آخری فرمانروا خاندان بنو لخم تھا ان کا پایۂ تخت حیرہ تھا۔ ابتدا میں یہ خود مختار سلطنت تھی لیکن آخر کار اسے کسریٰ کی پشت پناہی حاصل کرنا پڑی بنی لخم کے ایک بادشاہ نعمان کی والدہ نصرانی تھی۔ چنانچہ نعمان نے بھی نصرانیت اختیار کر لی۔ اس علاقہ کا

ظاہر تاجدار تو یہ تھا لیکن حقیقی اختیار کسریٰ کے ہاتھ میں تھا چنانچہ عدی بن زید جو کسریٰ کا ندیم اور مقرب تھا اور جسے نعمان نے قتل کرا دیا تھا اس کے بیٹے نے خسرو پرویز سے نعمان کی چغلی کھائی چنانچہ اسے پرویز نے ہاتھیوں کے پاؤں میں پھینک دیا۔ انہوں نے اس کا کچومر نکال دیا۔ بنی لخم اگرچہ عربی النسل تھے لیکن ان کی اپنی زبان زوال پذیر تھی۔ اور سریانی زبان مروّج تھی۔ اس طرح یہاں کے لوگ اہل فارس کے غلام اور زیر نگیں تھے۔ اس علاقہ کی وسیع و عریض زرخیز زمینیں جو چند جاگیرداروں کے پاس تھیں جن کی اکثریت ایرانی تھی وہ کاشتکاروں سے اتنا ٹیکس وصول کرتے کہ وہ بیچارے دو وقت کی روٹی کے لیے بھی ترستے رہتے۔ سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ معاشی بدحالی نے ان کو بالکل بے بس بنا کر رکھ دیا تھا ۶۳۳ء میں جب مسلمان مجاہدین وہاں پہنچے اور ایرانی لشکر کو وہاں سے مار بھگایا تو عراق کے لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسلام کے غازی جہاں جاتے وہاں کے مکین بڑی محبت اور گرمجوشی سے ان کا استقبال کرتے۔ جبر و تشدد کی جن زنجیروں میں وہ عرصہ دراز سے جکڑے ہوئے تھے۔ وہ یکایک ٹوٹ کر گر پڑیں۔ انہیں آج آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ مسلمانوں نے ان کے ساتھ یہ تحریری معاہدہ کیا کہ اہل عراق کے مال، جان اور آبرو کی حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہو گی۔ یہاں کے لوگوں کو اپنی مذہبی رسوم و عبادات ادا کرنے کی مکمل آزادی ہو گی ان کے شخصی مقدمات کا فیصلہ ان کے اپنے ہم عقیدہ علماء کریں گے۔ کاروبار اور نقل و حرکت میں کوئی مزاحمت نہ کی جائے گی سب سے مشکل مسئلہ یہ درپیش تھا کہ عراق کی زرخیز اراضی کا کیا کیا جائے؟ بعض صحابہ نے مطالبہ کیا کہ یہ اراضی مجاہدین اسلام میں تقسیم کر دی جائے لیکن حضرت فاروق اعظم کی فراست و بصیرت نے ان کی یہ تجویز مسترد کر دی اور جو لوگ ان اراضی پر آباد تھے انہیں بیدخل نہیں کیا گیا۔ بلکہ فتوحات فاروقی کے ابتدائی دور میں یہ آرڈیننس جاری کیا گیا کہ کوئی مجاہد مسلمان وہاں زرعی زمین خرید بھی نہیں سکتا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں کے اصلی باشندوں کے وسائل معاش پر فاتح مسلمان قابض نہ ہو جائیں۔ نیز فوجی جرنیلوں کو سختی سے یہ ہدایات دی گئیں کہ مسلمان لشکر آبادیوں سے دور رہیں۔ تاکہ وہاں کے شہریوں کو کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ اسلامی لشکر کے لیے شہروں

سے باہر چھاؤنیاں قائم کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ صرف اِس آدمی کو وہاں کے قصبوں اور دیہات میں جانے کی اجازت ملتی جس کے تقویٰ اور دیانتداری پر قائدِ لشکر کو پُورا اعتماد ہُوتا۔

صرف یہی نہیں کیا گیا بلکہ ملک کی زراعت کو ترقی دینے کے لیے دجلہ و فرات سے نہریں جاری کرنے کی طرف توجہ دی جانے لگی اور جہاں سیم نے زمینوں کو ناکارہ بنا دیا تھا وہاں سے سیم کے پانی کی نکاسی اور اسے خشک کرکے زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے انتظامات کیے جانے لگے۔ عراق کے باشندوں نے مسلمانوں کو فرشتۂ رحمت تصوّر کیا۔

انہوں نے آج تک اپنے بادشاہوں کے مظالم بھی برداشت کیے تھے اور ایرانی غلامی کی ذلت کو بھی جی بھر کر گوارا کیا تھا۔ صدہا سال بعد پہلی بار انہیں یہ احساس ہُوا کہ وہ انسان ہیں وہ اشرف المخلوق ہیں۔ ان پر صرف فرائض کا بارِ گراں ہی نہیں بلکہ ان کے حقوق بھی ہیں وہ آزادی سے اپنے عقائد کا اظہار بھی کرسکتے ہیں وہ جو محنت کریں گے اس کا فائدہ سب سے پہلے انھیں اور ان کے اہل وعیال کو ہوگا۔ انہیں صرف خراج ادا کرنا ہے جو ان ٹیکسوں سے کہیں کم ہے جو وہ آج تک ادا کرتے چلے آئے ہیں۔

یہی وہ اسباب تھے جن کے باعث انہوں نے اپنی قدیم ثقافت کو جو فسق و فجور کا پلندا تھی اٹھا کر پھینک دیا۔ اپنے ان آبائی عقائد و نظریات کو جو نِرا گورکھ دھندا تھے چھوڑ دیا اور اسلام کے سادہ اور سچے اصولوں کو صدقِ دل سے قبول کر لیا۔ سُریانی زبان کی جگہ عربی زبان نے لے لی۔

فارُوقِ اعظم کے لشکر کے مبارک قدم کیا آئے کہ ان کی دُنیا بدل گئی۔ ان کا دِل اور ذہن بدل گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کا مقدّر بدل گیا۔ وہ بغیر کسی ادنیٰ تشدد کے فوج در فوج دینِ محمّدی صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کرتے گئے۔ یہ عراق وہی ہے جو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا مولد و منبع رہا ہے۔ بابل و نینوا کا تمدّن اور ثقافت اور ان کی سیاسی برتری سے کون واقف نہیں لیکن اپنے سیاسی اور علمی عروج کے دَور میں بھی یہ پتھر کی مُورتیوں کو سجدہ کرتے رہے۔ خداوندِ ذوالجلال کے آستانۂ عظمت و جبروت پر انہیں پہلی دفعہ جبینِ

نیاز جھکانے کا اس وقت شرف حاصل ہُوا جب حضرت فاروقِ اعظم کے لشکر نے انہیں سیاسی اور ذہنی غلامی سے آزاد کرایا اور انہیں معاشی استحصال کی لعنت سے چھٹکارا دیا۔

عراق کا رقبہ ۱،۶۷،۹۲۵ مربع میل ہے اور چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہاں کے باشندوں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۹۴ فی صد ہے۔

ایران

عراق کے طول و عرض میں اسلام کا پرچم لہرانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ کے سپاہی ایران کے نشیب و فراز کو نورِ ہدایت سے منوّر کرنے کے لیے پہنچے، آپ پہلے اس بات کو ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے ایران کے اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور معاشی حالات کیسے تھے اور اسلامی قلمرو میں داخل ہونے کے بعد ان میں کیا تغیر رُونما ہُوا۔ تب ہی آپ ان فیوض و برکات کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جن سے فاروقِ اعظم نے سرزمین ایران کو مشرّف فرمایا۔

عرصۂ دراز سے ایران اخلاقی پستی سے دوچار تھا۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کو بڑی بے دردی سے پامال کر دیا گیا تھا۔ بدترین نوعیت کی بے راہروی ملک کا دستور بن گئی تھی۔ کوئی اس اخلاقی انحطاط پر متاسف نہ تھا۔ جنسی بے راہروی کی دُوسری صورتوں کو تو آپ رہنے دیں وہاں تو یہ حالت تھی کہ بیٹی اور بہن سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا روزمرّہ کے معمولات میں سے تھا اور اس میں قطعاً کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی تھی یہ صرف نچلے طبقہ کا ہی دستور نہ تھا یا بعض بدطینت یا سفلہ مزاج لوگوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ شاہی خاندان میں بھی اس کا عام رواج تھا۔ آپ یہ پڑھ کر یقیناً ششدر رہ جائیں گے۔ کہ یزدجرد ثانی نے اپنی بیٹی سے شادی رچا رکھی تھی۔ بہرام گور جو چھٹی صدی عیسوی میں تختِ ایران پر متمکّن تھا۔ اس نے اپنی بہن کو اپنی بیوی بنایا ہُوا تھا۔ کوپن ہاگن یونیورسٹی (ڈنمارک) کے پروفیسر آرتھر کرسٹن سین جو السنہ شرقیہ کے اُستاد تھے انہوں نے اپنی کتاب "ساسانی عہد میں ایران" میں لکھا ہے۔

"ساسانی کے ہم عصر مورخین نے لکھا ہے کہ محرمات یعنی بہن بیٹی وغیرہ کے ساتھ شادی کرنے کا عام رواج تھا اسے گناہ یا عیب خیال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اسے ایک عمل صالح قرار دیا جاتا جس سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا "

اس جلتی آوارگی اور عیش پرستی کے خلاف "مانی" نے آواز بلند کی اور اس نے مطلق شادی کرنے کو ہی گناہ قرار دیا۔ لیکن بہرام نے اس کو ۲۷۶ء میں قتل کرا دیا باایں ہمہ اس کی دعوت بے اثر ثابت نہ ہوئی کئی لوگ اس کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ ۴۸۷ء میں ایک اور شخص پیدا ہوا جس نے اخلاق کا رہا سہا تصور بھی خاک میں ملا دیا اس کا نام مزدک تھا اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تمام لوگ برابر پیدا ہوئے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی مساویانہ زندگی بسر کریں جس میں کوئی امتیاز نہ ہو اس نے کہا مال و دولت اور عورت ایسی چیزیں ہیں کہ لوگ ان پر اپنا حقِ ملکیت قائم کرتے ہیں اور کسی دوسرے کو اپنی ان چیزوں کے قریب نہیں آنے دیتے اس نے کہا یہ سراسر ظلم ہے اور نظریۂ مساوات کی خلاف ورزی ہے۔ اس لیے مال و دولت اور بیوی پر انفرادی ملکیت کا خاتمہ از حد ضروری ہے "شہرستانی" لکھتے ہیں۔ اس نے عورتوں کو حلال کر دیا اور اموال کو مباح قرار دیا اور ہر شخص کو ان میں اس طرح حصہ دار بنایا جس طرح پانی، آگ اور گھاس میں ہر آدمی حصہ دار ہے۔

اوباش نوجوانوں اور عیش پرست دولتمندوں کو یہ دعوت بڑی پسند آئی یہاں تک کیقباد شاہِ ایران نے بھی یہی مسلک اختیار کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایران میں فسق و فجور کا سیلاب اُمڈ آیا کسی کی عزت محفوظ نہ رہی کسی کا مال محفوظ نہ رہا گھر کی حرمت خاک میں مل گئی۔ مؤرخ طبری کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

"کمینہ فطرت لوگوں نے اس دعوت کو غنیمت سمجھا اور مزدک کی اس تحریک کے علمبردار بن گئے۔ شرفاء پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مزدک کے پیروکار دندناتے ہوئے لوگوں کے گھروں میں گھس آتے، مال اور ساز و سامان لوٹ لیتے عورتوں کی عصمتوں کو خاک میں ملا دیتے اور کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ انہیں

روک سکے۔ کیقباد کو جو ایک خوش خصال بادشاہ تھا عوام کالانعام نے مزدک کا نظریہ قبول کرنے پر مجبور کیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ اسے معزول کر دیں گے قلیل عرصہ میں یہ حالت ہو گئی کہ باپ کو اپنی اولاد کا اور اولاد کو اپنے باپ کا علم نہ رہا۔

ان کی اخلاقی خستہ حالی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس کوئی صحیح آسمانی مذہب نہ تھا ابتدا میں وہ سورج، چاند اور دیگر ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔ زرتشت نے آکر انہیں توحید کی دعوت دی۔ اس کے بعد مرورِ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں آگ کی پرستش شروع ہوگی۔ آگ جلا تو سکتی تھی۔ چنانچہ مزدک اور اس کے پیروؤں نے ایران جو گل و عندلیب کا ملک تھا اُسے گندگی کے ڈھیر میں بدل کر رکھ دیا۔

سیاسی طور پر ایران بدترین قسم کی ملوکیت کا شکار تھا، شاہی خاندان کے علاوہ کوئی قابل سے قابل شخص بھی تختِ سلطنت پر متمکن نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ شاہی خاندان صرف اُمورِ مملکت پر ہی قابض نہ تھا بلکہ اُسے مذہبی تقدس بھی حاصل تھا، کوئی ایرانی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شاہی خاندان کے علاوہ کوئی اور بھی ان کا سربراہ بن سکتا ہے۔

معاشی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی بادشاہ اور اس کے مقرب امراء ازحد دولت مند تھے۔ عام آبادی مفلوک الحال اور عسرت و افلاس کی زندگی بسر کر رہی تھی ذرائع معاش، زراعت و تجارت تک محدود تھے مزروعہ اراضی چند جاگیرداروں کی ملکیت تھی مزارعین اور کاشتکاروں پر ناقابلِ برداشت حد تک ٹیکس اور لگان تھا جس نے انہیں بدترین قسم کی بدحالی میں مُبتلا کر دیا تھا۔

مذہبی تشدد اور تعصب اپنے اَوج پر تھا۔ لوگوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ شاہی مذہب زرتشت کو اختیار کریں۔ عیسائیوں کے جو فرقے وہاں آباد تھے ان میں باہمی رقابتیں بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ اپنی مشہور کتاب "دی پریچنگ آف اسلام" میں لکھتے ہیں۔

نسطورین فرقہ کے بشپ بارساؤما (BARSAUMA) نے ایران کے بادشاہ

کے کان بھرے کہ ہمارا فرقہ تو تمہارا خیر خواہ اور تابعدار ہے لیکن آرتھوڈکس
عیسائی فرقہ کی وفاداریاں رومیوں کے ساتھ ہیں اِس لیے ان کی سرکوبی ضروری
ہے چنانچہ آرتھوڈکس فرقہ کے جو پادری قتل کیے گئے ان کی تعداد ۸۰۰۷ بتائی
جاتی ہے اور اس فرقہ کے دُوسرے مقتولوں کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اس
طرح کے مذہبی تشدد کے خونی واقعات اکثر ہوا کرتے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا میں ہے۔

کہ نوشیرواں جس کا عدل و انصاف مشہورِ عالم ہے وُہ بھی جبراً لوگوں کو اپنے
مذہب میں داخل کیا کرتا تھا "

وہاں کے باشندے مختلف طبقات میں تقسیم کیے گئے تھے شاہی خاندان اور چند دُوسرے
خاندانوں کو چھوڑ کر باقی تمام لوگ بہت حقیر سمجھے جاتے تھے دستکاروں اور اہل حرفہ کو
خصُوصیت سے بڑی حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ ان حالات نے عام ایرانیوں کی زندگی کو
جہنم زار بنا رکھا تھا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب اللہ تعالیٰ کے سپاہیوں کا لشکر ایران
میں داخل ہُوا۔ پروفیسر آرنلڈ " دی پریچنگ آف اسلام " میں لکھتے ہیں۔

کہ ان حالات نے ایران کے باشندوں کو اسلامی انقلاب کو خوش آمدید کہنے کے
لیے ذہنی طور پر بالکل تیار کر دیا تھا اور وہ بڑے جوش وخروش سے اِس نئے
دین کو قبول کرنے لگے جس نے اپنی سادگی اور دلِ آویزی کے ساتھ ایک ہی
جھٹکے سے تمام تاریکیوں کو کافور کر دیا۔ رُوح کے سامنے نئے افق کھول دِیے
نئی امیدیں ان کے دلوں کو گدگدانے لگیں اور غلامی اور خستہ حالی کی ان زنجیروں
سے انہیں آزادی کا مژدہ سنایا۔"

ایران کے لوگ بکثرت مشرف باسلام ہونے لگے خصوصاً بڑے شہروں کے صنعتی طبقے
اور اہل حرفہ اسلام کو قبول کرنے میں پیش پیش تھے۔ اس کے بعد پروفیسر مذکور لکھتے
ہیں کہ:

"اسلام کی اس وسیع مقبولیت کی وجہ طاقت یا تشدد ہرگز نہ تھا بلکہ اس کا باعث مسلمانوں کی وہ رواداری اور وسیع الظرفی تھی۔ جس کے ساتھ وہ غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے"

مسلمانوں کے آنے سے لوگوں کو مذہبی آزادی نصیب ہوئی طبقات کی تقسیم ختم ہوئی۔ کلکم من آدم و آدم من تراب کے ارشادِ نبوی نے امتیازات کے سارے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ عدل و انصاف میں فاتح اور مفتوح کے ساتھ یکساں سلوک کیا جانے لگا۔ کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے بیدخل نہیں کیا گیا۔ ظالمانہ لگان معاف کر دیے گئے انہیں صرف خراج اور جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ ہر ملک میں حکومت کے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہاں کے شہریوں کو ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں اس میں مسلمان اور غیر مسلمان برابر ہیں مسلمان جو رقم ادا کرتے اسے زکوٰۃ اور عشر کہا جاتا اور غیر مسلم رعایا جو ٹیکس ادا کرتی اسے جزیہ اور خراج کہا جاتا غیر مسلم خراج ادا کرنے کے بعد ہر قسم کی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاتے اور اسلامی حکومت پر فرض ہو جاتا کہ وہ اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے ان کے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرے لیکن مسلمانوں پر زکوٰۃ اور عشر ادا کرنے کے باوجود سرحدوں کی حفاظت اور اندرونِ ملک فتنہ و فساد کی بیخ کنی کی ذمہ داری بھی تھی نام کا فرق اس لیے ہے۔ کہ زکوٰۃ اور عشر دینِ اسلام میں مالی عبادت ہے اور عبادت کا مکلف صرف مسلمان ہوتا ہے غیر مسلم مکلف نہیں ہوتا۔

ایران کا رقبہ ۲۰۰، ۲۶،۶ مربع میل ہے۔ مسلم آبادی ۹۸ فی صد

مغربی محاذ

جب جزیرۂ عرب کے مشرقی جانب والے ممالک نورِ اسلام سے منور ہو رہے تھے۔ اور وہ زنجیریں جنہوں نے صدیوں سے انسانیت کو جکڑ رکھا تھا وہ ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی تھیں۔ اسی وقت عرب کے مغرب میں واقع علاقے شام، اردن، فلسطین، لبنان میں بھی حضرت فاروقِ اعظم کے یہ قدسی صفات غازی ہر طرح کے ظلم و طغیان اور فسق و فجور

کے آثار کو مٹانے میں محو تھے یہ سب علاقے رُومی حکومت کے باجگزار تھے۔ سات سو سال سے قیصرِ روم کی یہاں حکومت تھی۔ اس طویل عرصہ میں انہوں نے عیسائیت کو پھیلانے کے لیے ہر حربہ اختیار کیا وہاں کے مشہور قبائل عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ لیکن پادریوں کی باہمی فرقہ بازیوں نے ان لوگوں کو ذہنی پریشانی میں مُبتلا کر دیا تھا ان فرقوں کے درمیان عداوت و منافرت اتنی شدید تھی کہ ہمیشہ دنگا فساد ہوتا رہتا تھا۔ ان علاقوں کی زرخیز زمینوں پر رومی افسر قابض تھے اور وہاں کے اصلی باشندے کھیتی باڑی کرتے یا مزدوری کر کے پیٹ بھرتے کاشت کاروں پر لگان کا بوجھ ناقابلِ برداشت تھا۔ اتنی صدیاں حکومت کرنے کے باوجود رومیوں نے حاکم و محکوم کے امتیازات کو مٹانے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ اس کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہے وہاں کے اصلی باشندوں سے طرح طرح کے ٹیکس وصُول کرنے کے سوا رُومیوں کو اور کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہ تھی۔

یہ حالات تھے جب دینِ حنیف کے علمبردار سسکتی اور کراہتی ہوئی انسانیت کی امداد کے لیے پہنچے۔ انہوں نے جہاں رومی حکومت کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹا اور وہاں بسنے والے لوگوں کو آزادی کی نعمت بخشی وہاں اس کے ساتھ ساتھ انہیں مذہبی آزادی کا مژدہ بھی سنایا۔ ظالمانہ محصُول اور لگان معاف کر دیے ہر غیر مسلم ذمی کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری خود قبول کی ان کے نجی مقدمات کے تصفیہ کے لیے ان کے ہم عقیدہ جج مقرر کیے جو ان کے مذہب کے مطابق ان کے مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے ان کو عبادات کی مکمل آزادی دی۔ بنمونہ کے طور پر آپ اس معاہدہ کی نقل ملاحظہ فرما دیں۔ جو فتح دمشق کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اہلِ دمشق کو لکھ کر دیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذا ما اعطیٰ خالد بن الولید اھل دمشق اِذا دخلھا اعطاھم اماناً علی انفسھم و اموالھم و کنائسھم و سُور مدینتھم لایُھدَمُ ولا یُسکن شیئاً فی دُورِھم۔ لھم بذلک عھد اللہ و ذمۃ رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم والخلفاء والمؤمنین لا یُعرض لھم الا بالخیر اذا اعطوا الجزیۃ (بلاذری)

ترجمہ

بسم اللہ شریف کے بعد لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو خالد بن ولید نے اہل دمشق سے کیا جب وہ دمشق میں داخل ہوئے خالد نے انہیں ان کی جانوں ـــــــ ان کے اموال اور ان کے گرجوں کو امان دی ہے ان کے شہر کی فصیل نہیں گرائی جائے گی اور ان کے مکانوں میں مسلمان سکونت اختیار نہیں کریں گے یہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا عہد ہے اور اس کے رسول کریم کی ذمہ داری ہے تمام خلفاء اور اہل ایمان اس کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ جزیہ دیتے رہیں گے۔ ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک جائے گا۔"

عراق اور ایران کی طرح یہاں بھی حضرت فاروق اعظم نے سخت ممانعت کر دی تھی کہ مسلمان سپاہی وہاں کے شہروں قصبوں اور بستیوں میں نہ جائیں تاکہ وہاں کے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے اسلامی لشکروں کے لیے شہروں سے الگ چھاؤنیاں قائم کیں۔ نیز آپ نے اس بات سے بھی مسلمان غازیوں کو روک دیا کہ وہاں کے لوگوں کی زرعی زمینیں خرید کریں اگر یہ احتیاطی اور عادلانہ تدابیر اختیار نہ کی جاتیں تو وہاں کے اصلی باشندوں کو طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان کے عمل کی آزادی متاثر ہوتی۔ ان کی زرخیز زمینیں ان کے ہاتھوں سے نکل کر مسلم فاتحین کے قبضہ میں چلی جاتیں اور ان کے وسائل معیشت بڑی طرح متاثر ہوتے۔

مسلمانوں کی اس انوکھی طرز حکومت نے وہاں کے لوگوں کے دل موہ لیے انہیں عرصہ ہائے دراز کے بعد آرام کا سانس لینا نصیب ہوا۔ لگانوں اور ٹیکسوں کے بارگراں سے انہیں چھٹکارا ملا۔

ایسے عدل و انصاف کا ایسی وسیع النظری اور رواداری کا انہوں نے تصور تک بھی نہ کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ برضا و رغبت حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے انہوں نے رومیوں کی اخلاق باختہ ثقافت اور شرافت سے گری ہوئی تہذیب کو ترک کر دیا اور اسلامی ثقافت و تمدن کو صدق دل سے اپنا لیا۔ اس علاقہ میں جو قبائل آباد تھے ان کی

اصلی زبان عربی تھی لیکن روم کی طویل غلامی کے باعث انہوں نے اپنے حاکموں کی زبان اختیار کر لی تھی اور عربی زبان تقریباً متروک ہو چکی تھی اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو وہاں کے باشندوں نے عربی کو اختیار کر لیا اور جتنی وطنی زبانیں مروج تھیں وہ متروک ہو گئیں اور عربی کو ہی اپنی گفتگو، تحریر، تقریر اور اپنی علمی تصانیف کی زبان کے طور پر اپنایا۔

شام، فلسطین، سینا مصر اور یہاں تک کہ لیبیا کی آخری حدود تک جو علاقے عہدِ فاروقی میں فتح ہوئے اب وہ عربی زبان کا وطن بن گئے ہیں اسلامی علوم، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی ثقافت کے مراکز کی حیثیت انہیں حاصل ہو گئی ہے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اس اثناء میں کئی انقلاب آئے۔ اقتدار نے کئی کروٹیں بدلیں۔ صلیبی حملوں کی شدت مسلسل ایک صدی تک جاری رہی۔ لیکن اسلام کا جو گلستان حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہاں کھلایا تھا۔ وہ آج بھی سدا بہار ہے۔ یہی علاقے قرآن اور علومِ قرآن کا مرکز ہیں۔ سنتِ نبوی اور فقہِ اسلامی کی خیر و برکات سے آج بھی ان ممالک کے در و دیوار جگمگا رہے ہیں۔

یہ ہے وہ انقلاب جو حضرت فاروق اعظم کی مخلصانہ کوششوں سے ان ممالک میں رونما ہوا جس کا دائرہ اثر ظاہری حدود تک ہی نہیں بلکہ عقل و دانش کی اونچی چوٹیوں اور دلِ کی بیکراں وسعتوں پر آج بھی اس کا پرچم لہرا رہا تھا اور قیامت تک اسی شان و شوکت سے لہراتا رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہ ہیں وہ خصوصیات جن میں کوئی فاتح کوئی جرنیل اور کوئی شہنشاہ آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ کے انہی کمالات کے باعث دنیا آپ کو فاروقِ اعظم کہتی ہے ہم آپ کو اسلامی تعلیمات کا پیکر رعنا یقین کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل خطاب کے بیٹے عمر کو سرفراز فرمایا اور آغوشِ نبوت کے اس تلمیذ ارشد نے چار دانگ عالم میں اسلام کا بول بالا کر دیا۔

اب ان ممالک کا رقبہ اور ان میں مسلم آبادی کے تناسب پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

اُردن

رقبہ ۳۷۷۳۸ مربع میل

مسلم آبادی ۹۱ فی صد

شام

رقبہ ۷۱۴۹۸ مربع میل

مسلم آبادی ۸۷ فی صد

مصر

رقبہ ۳،۸۶،۶۶۱ مربع میل

مسلم آبادی ۹۲ فی صد

لیبیا

رقبہ ۶،۷۹،۳۶۲ مربع میل

مسلم آبادی ۹۶ فی صد

لبنان

رقبہ ۳۹۵۰ مربع میل

مسلم آبادی ۵۷ فی صد

فاروقِ اعظم
اور
غیر مسلم رعایا

تحریر

ڈاکٹر اشتیاق حسین ہاشمی

اسلام نے تاریخِ عالم میں اغیار کے ساتھ سلوک کے سلسلہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا خواہ وہ اغیار متحارب ہوں یا غیر متحارب دوسرے ممالک کے رہنے والے ہوں یا بلادِ اسلام میں خلافتِ اسلامیہ کے پرچم کے سایہ میں زندگی گزارتے ہوں متحارب دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا ہے وہ دُنیا کی متمدن اقوام کے رویّہ سے کہیں اعلیٰ وارفع تھا، تباہی کا نہیں چنانچہ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وقٰتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ ، فان انتھوا فلاعدوان الا علی الظٰلمین (۱۹۴)

(ترجمہ)

"اُن سے اُس وقت تک لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہی ہو جائے اور اگر وہ رُک جائیں تو ظالموں کے علاوہ کسی کے لیے سزا نہیں ہے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی جنگ کرنے کی ہدایت کی ہے۔

جو فتنہ کو روکنے اور اصلاح کی غرض سے ہو۔ فتنہ میں جو چیز سب سے زیادہ انسان کو مجبور کرنے والی ہے وہ یہ ہے کہ اُسے اللہ کے علاوہ کسی اور کے احکام کا پابند بنا دیا جائے اور اُس کے ضمیر کی آزادی کو کچل دیا جائے اگر فتنہ پھیلانے والے اور دوسروں کو غیر اللہ کی مرضی کے آگے زبردستی جھکانے والے اپنے جرائم سے باز آجائیں اور ظلم کا طریقہ چھوڑ دیں تو پھر اُن سے باز پُرس اور جنگ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اب اس اصول جنگ کا مقابلہ اُن لڑائیوں سے کیجیے جن کا مقصود دوسروں کو غلام بنانا اور اُن کا استحصال ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ اسلام ایسی جنگ کو ناپسند کرتا ہے جو ظلم اور بربادی پر منتج ہوتی ہے اس لیے جب مسلمان افواج غیر مسلموں کے خلاف بھیجی جاتی تھیں تو اُنہیں تاکید ہوتی تھی کہ غیر متحارب افراد یعنی بڈھوں، مجبوروں، مریضوں، عورتوں اور بچوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں اور اس طرح بے ضرورت کسی چیز کو تباہ نہ کریں درختوں کو اور آب رسانی کے وسائل کو نقصان نہ پہنچائیں، البتہ اگر دشمن جنگل میں چھپ کر حملہ کی گھات میں بیٹھے یا درختوں کے جھنڈ اُسے پناہ دیتے ہوں تو اُن کی صفائی جنگی اعتبار سے ضروری ہو جاتی ہے۔

جنگ کے بعد مفتوح اقوام کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ میں بھی وہی رُوح کارفرما رہی ہے جو جنگ کے مسائل میں تھی اسلام میں مفتوح اور ایسی اقوام کو جو مسلمانوں کی حکومت میں رہنا قبول کریں اہل ذمہ یا ذمی کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح خود اُن غیر مسلموں کی حیثیت اور حقوق کی تعبیر ہے جو مسلمانوں کی حکومت میں زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں، اُن کی آزادی اور داخلی وخارجی خطرات سے حفاظت کے مسلمان ذمہ دار ہوتے تھے حقیقت یہ ہے کہ شریعتِ اسلام کی رُو سے ذمیوں کو جو حقوق حاصل تھے اُن کے لیے اب بہت سے اسلامی ممالک کے مسلمان ترستے ہیں ذمی صرف اسلامی حکومت کی سیادت تسلیم کرتے اور ٹیکس ادا کرنے کے بعد پوری آزادی اور امن کی زندگی بسر کرتے تھے چونکہ مسلمان شریعت اسلام کی پابندی کرتے تھے اس لیے حکومت قانونی تحفظات کا پاس کرتی تھی۔ اور نہ خود اُن کی سرمو خلاف ورزی کرتی تھی نہ کسی اور کو کرنے دیتی تھی۔

ذمیوں کے حقوق کی داغ بیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہی پڑ گئی تھی، بالخصوص غزوۂ تبوک کے سلسلہ میں یہود و نصاریٰ کی آبادیوں کو جو حقوق آپ نے مرحمت فرمائے تھے وہی اہل ذمہ کے ساتھ رواداری اور استحسان کی بنیاد بنائے گئے لیکن ان کی ترویج میں وسعت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیدا ہونی شروع ہوئی حضرت عمر کو شرائع اسلام میں جو تفقہ حاصل تھا۔ اُس کا ثبوت فقہ عمر کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہ نے تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا ہے اس تفقہ کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت عمر کو جب یقین ہو گیا کہ وہ قاتل کے حربہ سے جان بر نہ ہو سکیں گے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری کا وقت سر پر آپہنچا ہے تو انہوں نے اپنے جانشین کے لیے جو وصیت فرمائی اس میں اہل ذمہ کی حفاظت کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ آپ کا ارشاد تھا کہ خلیفۂ وقت کو ذمیوں کے متعلق اللہ اور اُس کے رسول کی ذمہ داری کا احساس ضروری ہے اُن کے ساتھ جو عہد تھا اُس کو پورا کرنا لازمی ہے اُن کے دشمنوں سے لڑا جائے اور اُن سے اتنا ٹیکس نہ لیا جائے جو اُن کی طاقت سے زیادہ ہو۔

مسلمان اہل ذمہ سے اس لیے ٹیکس وصول نہ کرتے تھے کہ انہیں مفتوح یا ذلیل سمجھتے تھے بلکہ اسے اُن کی حفاظت کے صلہ خدمت کے طور پر لیتے تھے۔ قیصر روم (رومتہ الشرق) ہرقل نے عربوں کی فتوحات کا سدِ باب کرنے کی غرض سے زبردست جنگی تیاریاں کیں اور ایک زبردست لشکر لے کر مسلمانوں کے خلاف بڑھا حضرت ابو عبیدہؓ نے جو حمص میں تشریف فرما تھے اس خبر کو سُن کر ایک مجلس شوریٰ مرتب کی کہ اب ایسے لشکرِ جرار کے خلاف دفاع کی کیا صورت اختیار کی جائے یزید بن سفیان نے جو حضرت امیر معاویہ کے بھائی تھے رائے دی کہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں محفوظ چھوڑ کر جیش اسلامی شہر کے باہر صف آرا ہو۔ اس رائے کو اس لیے تسلیم نہیں کیا گیا کہ شہر کی آبادی عیسائی تھی اور اس کا امکان تھا کہ وہ موقعہ پا کر عورتوں اور بچوں کو ایذا پہنچاتی یا انہیں اسیر کر کے ہرقل کے حوالہ کر دیتی اس کے جواب میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ عیسائیوں کو شہر سے باہر نکال دیا جائے لیکن چونکہ ان عیسائیوں کو اس شرط پر اپنی کفالت میں لیا گیا تھا کہ وہ

شہر میں امن سے رہیں گے لہذا انہیں نکالنا نقض عہد کے مترادف ہوتا۔ بالآخر طے ہوا کہ حمص کو خالی کر دیا جائے اور اسلامی افواج دمشق پر جمع ہو کر ہرقل کا مقابلہ کریں اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے افسر خزانہ کو ہدایت کی کہ غیر مسلم رعایا سے جو جزیہ لیا گیا تھا وہ واپس کر دیا جائے اس لیے کہ اُن سے جو ٹیکس لیے جاتے ہیں اُن کا جواز یہ ہے کہ ذمیوں کی دشمنوں سے حفاظت کی جائے چونکہ مسلم افواج اس وقت حفاظت سے قاصر تھیں لہذا ٹیکس کو اپنے پاس رکھنا مناسب نہ تھا اور یہ برتاؤ صرف حمص والوں سے نہیں کیا گیا بلکہ جہاں جہاں سے اسلامی افواج واپس ہٹیں وہاں کا جزیہ واپس کر دیا گیا۔

اس واقعہ سے ذمیوں کی حیثیت اور جزیہ کی نوعیت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ ذمی اسلامی سلطنت میں ایک حلیف قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے تھے وہ چونکہ اسلام کے مکلف نہیں تھے اس لیے اُن پر جہاد فرض نہ تھا۔ اسلامی حکومت دفاع کے لیے اُن پر تکیہ نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اُن سے یہ کہتی کہ وہ دارالاسلام کے دفاع میں ہاتھ بٹائیں تو وہ کہہ سکتے تھے کہ اسلام کے قوانین جہاد کے وہ پابند نہیں ہیں۔ اگر وہ اپنے طوع و رغبت سے افواج اسلام میں شامل ہو کر لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے کہ فوجی ملازمت کے دوران اُن سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ بعض فرنگی مصنفین نے لکھا ہے کہ ذمیوں پر محاصل کا ایسا بار ہوتا تھا کہ وہ مسلمان ہو کر فائدہ میں رہتے تھے اور اس لیے مسلمان ہو جاتے تھے یہ سراسر غلط ہے اس لیے کہ مسلمانوں پر فی الحقیقت بار زیادہ تھا اوّل تو جہاں تک کاشتکاری کا تعلق تھا بعض زمینیں عشری نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف عرب کی زمینیں جن کے مالک شروع میں ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ اور وہ افتادہ اراضیات جو حکومت کی اجازت سے آباد کی جاتی تھیں بعض اور اراضیات عشری تھیں۔ یہ زمینیں رقبہ میں خراجی زمینوں سے بہت کم تھیں اور تمام وہ زمینیں جو مسلمانوں کے پاس تھیں عشری نہیں تھیں بلکہ ان میں بھی بہت زیادہ خراجی تھیں اور یہاں یہ حال تھا کہ خراج میں مسلمانوں اور ذمیوں میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہ تھی مسلمان زکوٰۃ دینے کے مکلف تھے جو تمام مال پر دینی پڑتی تھی اور اسے ادا کرنے کے مکلف اہل ذمہ نہ تھے جزیہ کی

مقدار ایسی نہ تھی کہ وہ کسی کو اپنا دین چھوڑنے پر آمادہ کرتی۔ اوّل تو اسے صرف وہی ادا کرتے تھے جو اس کی اہلیت رکھتے تھے اور اس سے تمام وہ افراد جو جزیہ دینے کی اہلیت نہ رکھتے تھے یا جو فوجی ملازمت کے قابل نہ تھے۔ یا وہ لوگ جو اپنے دین کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ مثلاً رُہبان و مذہبی پیشوا مستثنیٰ تھے۔ الغرض ذمیوں پر مسلمانوں کے مقابلہ میں کچھ ایسا بار نہ تھا کہ مسلمان زیادہ فائدہ میں ہوتے اور بضرورت کے موقعہ پر وہ اپنا کاروبار، گھر، مکان، اہل دنیال کو چھوڑ کر لڑنے پر جانے کے لیے مکلف تھے جس سے اُنہیں مالی نقصان ہوتا تھا ذمی کے مسلمان ہوتے پر اُس کی زمین عشری نہیں ہو جاتی تھی البتہ اُسے زکوٰۃ اور جہاد کی ذمہ داری قبول کرنی پڑتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ بہت سے علاقوں کی آبادی جہاں اسلامی حکومتیں عرصہ تک قائم رہیں اکثر غیر مسلم ہی رہی اور جہاں اسلام پھیلا اُس کے اسباب دینی تھے، اقتصادی نہ تھے۔

ذمیوں کے دینی تحفظ کا یہ عالم تھا کہ اُن کے معابد محفوظ تھے، اُنہیں آزادی کے ساتھ اپنے دینی شعائر کو قائم رکھنے کا اختیار تھا، اُن کی عبادات میں کوئی مخل نہیں ہوتا تھا، بلکہ اُن کے دینی نظام کو بھی ایسا تحفظ تھا کہ

اُن کے دینی رہبروں کے اختیارات میں فرق نہ آیا اور اُن کے بعض فرقوں کے اعلیٰ ترین رہنما مسلمانوں کی حکومت میں عزت و اختیار کی زندگی بسر کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک رعایت دی کہ جب بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جو یونانی بیت المقدس چھوڑ کر رومیوں کی حکومت میں جانا چاہیں وہ آزاد ہیں اور اُن کے کلیساؤں اور معابد کی حفاظت کی جائے گی کسی مسلمان کو یہ حق نہ تھا کہ وہ کسی ذمی کو تکلیف پہنچائے اس کی توہین کرے یا اُسے قتل کر دے اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو اسے وہی سزا ملتی جو مسلمان کے قتل کرنے پر دی جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ قانونی طور پر مسلمانوں اور ذمیوں میں کوئی ایسی تفریق نہیں کی جاتی تھی جس سے ذمیوں کے حقوق مجروح ہوں۔ اگر ایک طرف ایسے مسلمان کو جو اپاہج یا ضعیف ہو جاتا بیت المال سے وظیفہ ملتا تو بعینہٖ کوئی ذمی بھی کسبِ معاش کے قابل نہ رہتا اُسے

بھی اسی طرح وظیفہ دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک ذمی بھیک مانگتا نظر آیا۔ تو اُسے اپنے گھر لے آئے اور چونکہ وہ کام کرنے کے قابل نہ تھا۔ آپ نے بیت المال سے اُس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ آپ کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ تندرست اور کام کرنے والے ذمیوں سے اسلامی معاشرہ کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لیے اگر وہ کام کرنے کے قابل نہ رہیں تو معاشرہ پر لازم تھا کہ وہ اُن کی نگہداشت اور کفالت کرے۔

ذمیوں کی توہین ہرگز گوارا نہ تھی ایک نہایت متقی و زاہد حاکم نے ایک مرتبہ غصہ میں ایک ذمی سے ناراض ہو کر کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ تجھے رُسوا کرے اس پر انہیں اس قدر ندامت ہوئی کہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ حضرت عمرؓ کا ایک عیسائی غلام تھا اُس پر آپ اکثر اسلام کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے لیکن وہ مسلمان نہ ہوا، آپ نے اُس پر نہ دباؤ ڈالا، نہ اُس سے سخت کلامی کی اور اُسے اُس کی حالت پر قائم رہنے دیا۔

اس زمانہ میں تو جابر و ظالم حکومتیں یہ بھی برداشت نہیں کرتیں کہ کوئی شخص حکومت کی ادنیٰ سی مخالفت بھی کرے۔ مسلمان شہریوں کی بھی نام نہاد اسلامی حکومتیں ایسی زبان بند کرتی ہیں اور مخالفت کی حالت میں ایسی ایذا پہنچاتی ہیں کہ الامان اُن کی عزت نفس کو مجروح کرتی ہیں اور اُنہیں ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتیں لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب بعض ذمیوں نے قلمرو اسلامیہ کے خلاف سازش کی اور رومی دشمنوں سے نہ صرف ساز باز رکھی بلکہ اُن کے لیے جاسوسی بھی کی پہلے تو اُنہیں متنبہ کیا گیا اور پھر امن و امان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ملک بدر کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر بخران کے عیسائی جو یمن اور اس کے اطراف میں پورے اطمینان کے ساتھ رہتے تھے آمادہ بغاوت ہو گئے اور انہوں نے اسلحہ اور گھوڑے جمع کرنے شروع کر دیے تو اُنہیں اسلامی قلمرو سے بھی نکالا گیا۔ اُنہیں عراق میں آباد ہونے کی اجازت دی گئی۔ اور اس کے علاوہ تمام سہولتیں مہیا کی گئیں۔ حکام کو ہدایت کی گئی کہ عراق یا شام میں جہاں وہ جائیں اور ۲۴ مہینہ تک جزیہ نہ لیا جائے نیز حکام ہر طرح اُن کی مدد کریں اور اُن کی

مدد کریں اور اُن کی درخواستوں پر ہمدردی کے ساتھ غور کریں۔

اُس زمانہ میں اسلامی قلمرو کی معیشت تقریباً کلیتہً زرعی تھی اِس لیے زرعی قوانین کا آبادی پر بہت اثر پڑتا تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ کی توجہ کاشت کاری کی ترقی کی طرف بہت زیادہ تھی اور اُس وقت قلمرو میں ذمی کاشتکاروں کی بہت بڑی تعداد تھی اس لیے اُن کی خوشحالی کے ذرائع کو مستحکم کرنا ضروری تھا جب عراق فتح ہوا تو دجلہ و فرات کی سیراب زمینیں تمام دوسرے علاقوں سے زیادہ زرخیز تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اوّل تو فتح عراق کے بعد تمام اراضی مقامی باشندوں کے ہاتھ میں رہنے دی اور اُن کے مالکانہ حقوق تسلیم کر لیے اس امر پر صحابہ میں اختلاف تھا خصوصاً امرائے فوج نے تمام علاقوں کو اپنی جاگیر بنانا چاہا اور کاشت کاروں کو رومہ اور ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کی طرح اپنا غلام (سرف) بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ کئی دن کی بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ زمین کو کاشت کاروں کی ملکیت میں ہی چھوڑ دیا جائے۔ اور اُن سے مناسب خراج وصول کیا جائے جو زمینیں پہلے بادشاہ کی مملوکہ یا لاوارث تھیں انہیں حکومت کے اختیار میں دے دیا گیا۔ امرائے فوج اور دُوسرے مسلمانوں کو جاگیر بنانے سے منع کر دیا گیا تاکہ مقامی آبادی کے حقوق میں مداخلت کا امکان باقی نہ رہے جب کسی جگہ کا خراج مقرر کیا جاتا تھا۔ تو اُس علاقہ کے تجربہ کار غیر مسلموں کو بلا کر مقامی حالات معلوم کیے جاتے تھے اور اُن کے مشورہ سے خراج متعین ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے زرعی حکومت کی جو بنیاد قائم کی اور جن اُصول پر خراج کے تعین اور اراضی کی ملکیت کو طے کیا گیا وہ آئندہ تمام اسلامی دور میں مستند قرار پائے اور اسی سبب سے مسلمانوں کے عہد کے زرعی بندوبست اور طریقہ کار کو ازمنہ وسطیٰ کا روشن ترین طریقہ سمجھا گیا۔

حضرت عمرؓ نے زراعت کی ترقی کے لیے آب پاشی کے وسائل کی تعمیر پر بہت زور دیا اور اُس زمانہ میں جو تعمیرات ہوئیں وہ چنگیز و ہلاکو کے حملوں تک قائم رہیں اور اُن میں اضافہ ہوتا گیا لیکن جب غیر مسلم مغلوں کے حملہ نے دنیائے اسلام کے مشرقی علاقوں کو تاراج کیا تو آبپاشی کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا اور دُنیائے اسلام کی معاشی بدحالی

کی بنیادیں قائم ہو گئیں۔

جو حکومتیں قانون کی پاسداری کرتی ہیں اور اس کی پابند رہتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جن کے قوانین مناسب اور انسانی حقوق کی عظمت پر قائم ہوتے ہیں۔ اُن کے تمام شہری چین اور عزت سے رہتے ہیں۔ اسلام کے شرائع چونکہ فیاضی و حق شناسی پر قائم ہیں اِس لیے اُن کے ماتحت مسلم وغیر مسلم راحت سے زندگی بسر کر سکتے ہیں پھر ان اسلامی اُصولوں کی تعبیر و تفسیر اور زندگی کے مسائل پر اُن کے انطباق کے لیے ایسے روشن خیال، مخلص، مدّبر اور بے نفس حکمراں ہوں۔ جیسے کہ حضرت عمر تھے تو ظاہر ہے کہ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اگر اُن کی جگہ کوئی نفس پرست اور خود غرض حکمراں ہوتا تو مسلمان اور ذمی دونوں بے حال و پریشان ہوتے۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کا

غیر مسلموں سے حُسنِ سلوک

تحریر

پروفیسر محمد مسعود احمد

ایک نظریاتی حکومت میں ان لوگوں کے لیے جگہ نہیں ہوا کرتی جو اس نظریے کے دل سے مخالف ہوں اور ہر وقت کاٹ میں لگے رہتے ہوں ——— ایسے لوگوں کو گوارا کرنا مستقبل کے لیے فتنوں کو دعوت دینا ہے لیکن فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک روا رکھا ——— ان کے مال کی حفاظت کی۔ ان کی جان کی حفاظت کی، انکے مذہب کی حفاظت کی، انکے شعائر قومی کی حفاظت کی، انکے معابد کی حفاظت کی، ان کی تہذیب و تمدن کی حفاظت کی، اُن کے غریبوں اور ضعیفوں کی کفالت کی۔ ان کے دشمنوں سے مقابلہ کیا ——— غرض وہ کچھ کیا جو اس ترقی یافتہ دور میں بھی نہیں کیا جا سکتا ——— اس ترقی یافتہ دور میں نظریاتی حکومتوں میں حکومت سے اختلاف رکھنے والا گردن زدنی سوختنی اور کشتنی ہے ——— جہاں روا داری نظر آتی ہے وہاں صرف دکھاوا ہی دکھاوا ہے، حقیقت کچھ اور ہے ——— ڈبلیو منٹگمری واٹ (W. Montgomery) (W&H) غیر مسلموں کے عناد و اختلاف کے باوجود عہد فاروقی میں مسلمانوں کی وسعتِ قلبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

Despite this obstinacy, as it appeared to them, the Muslims were prepared to tolarate Jews and christians as "with in the Islamic state and to admit that their presence did not Conflict absolutely with its religious basis.[1]

ترجمہ:۔ (ذمیوں کی) اس سرکشی اور خود رائی کے باوجود (جو مسلمانوں کی نظر میں سرکشی و خود رائی ہی تھی) سلطنتِ اسلامیہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ذمی کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے مسلمان تیار تھے اور یہ تسلیم کرتے تھے کہ ان یہود و نصاریٰ کی موجودگی سلطنت کی مذہبی اساس سے بالکل متصادم نہیں۔

ہم پرانی شراب کو نئے پیمانوں سے ناپتے ہیں لیکن اصول تنقید یہ ہے کہ پرانی شراب کو پرانے پیمانوں سے ناپا جائے ——— اگر ایسا کیا گیا تو فاروق اعظم کا حسن سلوک ظلم و استبداد اور تعصب و تنگ دلی کی ان فضاؤں میں آفتاب عالم تاب کی طرح چمکتا نظر آئے گا ——— آؤ آؤ! اغیار کی جفا کاریوں کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اسلام کی اس چاندنی کا چھٹکنا دیکھو۔

عہد و پیمان کی پاسداری، انسان کی شرافت و صداقت شعاری کا معیار ہے ——— جو شخص معمولی سے معمولی عہد و پیمان کا پاس و لحاظ رکھتا ہے بلاشبہ وہ گلشن شرافت کا گل سرسبد اور دیار صداقت کا تاجدار ہے ——— فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اغیار سے کئے گئے عہد و پیمان کا جو پاس و لحاظ رکھا شاید ہی کسی نے رکھا ہو بلکہ اس دور میں بھی مشکل ہے۔ آجکل دوستوں سے کئے گئے عہد و پیمان کا خیال نہیں رکھا جاتا تو اغیار سے کئے گئے عہد و پیمان کا کہاں خیال رکھا جا سکتا ہے بلکہ دور جدید میں تو عہد شکنی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہے ——— لیکن فاروق اعظم کا دامن صداقت عہد شکنی کے

---

1 W. Montgomery Wah: Islam and the Integration of Society, Canada 1966. P. 158

داغ سے داغدار نہیں —— دیکھو دیکھو رئیس خوزستان (ایران) ہُرمزدربارِ فاروقی میں قید ہو کر آیا ہے۔ گردن زدنی ہے کہ اس نے بہت سے مسلمان افسروں کو شہید کیا ہے قتل کا مصمم ارادہ ہے اچانک وہ پانی مانگتا ہے اور پانی پینے تک کی امان طلب کرتا ہے، امان دی جاتی ہے لیکن وہ پانی نہیں پیتا رکھ دیتا ہے[1] یا پھینک دیتا ہے حاضرین ہکا بکا رہ جاتے ہیں —— اگر کوئی اور ہوتا تو دشمن کی اس حرکت سے اور طیش میں آجاتا لیکن نہیں نہیں فاروق اعظم نے ہاتھ روک لیا —— عہد و پیمان کی اس پاسداری کو دیکھ کر ہرمز حیران رہ گیا اور اسی وقت مسلمان ہو گیا۔

جب غالب، مغلوب سے معاہدہ کرتا ہے تو خواہ وہ ایک ہی دین و ملت کے کیوں نہ ہوں لیکن ہمیشہ غالب اپنی بات اُوپر رکھتا ہے اور اگر کسی مصلحت و حکمت کی وجہ سے بات نیچی رکھتا ہے۔

تو پھر عمل نہیں کرتا، وہ معاہدہ ایک افسانہ بن کر رہ جاتا ہے، دورِ جدید کی سیاست میں آئے دِن یہ نظارے سامنے آتے رہتے ہیں —— لیکن دیکھو دیکھو فاروقِ اعظم کو دیکھو، سرزمینِ قدس میں ایک خادم ساتھ لیے چلے آرہے ہیں، وہ خلیفۃ المسلمین ہیں لیکن فقیرانہ آرہے ہیں ان کی سادگی نے شاہوں کے تکلفات خاک میں ملا کر رکھ دیئے —— اور دیکھو بیت المقدس کے مغلوب عیسائیوں سے ایک معاہدہ کیا جا رہا ہے شاید تاریخ عالم اس معاہدے کی نظیر نہ پیش کر سکے —— ۱۵ھ / ۶۳۶ء میں یہ معاہدہ لکھا گیا حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن العاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت معاویہ بن سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس پر گواہ ہیں —— ذرا اس معاہدے کی تمہید تو ملاحظہ ہو:-

---

[1] شبلی نعمانی: الفاروق بحوالہ عقد الفرید لابن عبدالبر باب المکیدۃ فی الحرب ص ۲۲۴

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام، امیر المومنین عمر نے ایلیا (بیت المقدس) کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کے جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے۔"

اور اب اس معاہدے کی تفصیلی دفعات ملاحظہ ہوں۔

(۱) ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی اور نہ ان کے احاطے کو نقصان پہنچایا جائے گا۔

(۲) نہ ان کی صلیبوں اور نہ ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔

(۳) مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا۔

(۴) نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔

(۵) یونانیوں میں جو شہر سے نکلے گا اس کی جان و مال کو امان ہے تا آں کہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائے اور جو ایلیا (بیت المقدس) میں رہنا اختیار کرے تو اس کو بھی امان ہے اور اس کو جزیہ دینا ہوگا[1]

ٹی ڈبلیو۔ آرنلڈ (T.W. Arnold) نے اس معاہدے کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

The extent of this toleration so striking in the history of seventh century —may be judged from the terms granted to the conquered cities.

---

[1] شبلی نعمانی نے الفاروق (ص ۲۲۲-۲۲۳) میں تاریخ ابو جعفر جریر طبری کے حوالے سے اس معاہدے کا جو متن نقل کیا ہے یہ دفعات وہاں سے لی گئی ہیں۔ ٹی ڈبلیو آرنلڈ T. W. ARNOLD نے اپنی کتاب The preaching of Islam کے صفحہ ۵۶ اور ۵۵ پر اس معاہدے کا ترجمہ پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس معاہدے کے الفاظ میں مورخین نے اختلاف کیا ہے، اس اختلافِ رائے کی تفصیلات کے لیے اس نے لکھا ہے۔

For a discussion of this document see

ترجمہ:۔اس رواداری کی رفعت وبلندی کا اندازہ ان شرائط سے لگایا جا سکتا ہے جو مفتوحہ شہروں کے لیے منظور کی گئیں ——— یہ رواداری ساتویں صدی عیسوی میں نہایت حیرت ناک اور قابلِ توجہ ہے۔

معاہدے کے بعد فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں داخل ہوئے ایک پادری کے ساتھ گرجا میں تشریف لے گئے کہ نماز کا وقت آ پہنچا، پادری نے عرض کیا کہ گرجا میں ہی نماز ادا فرمالیں لیکن فاروقِ اعظم نے وہاں نماز ادا نہ فرمائی کہ مبادا مسلمان اس گرجا کو مسجد بنالیں کہ امیر المومنین نے یہاں نماز ادا فرمائی ہے[3] ——— اللہ اللہ یہ حزم و احتیاط اور معاہدین کے ساتھ یہ حسنِ سلوک!

فاروقِ اعظم نے مذہبی تعصب و تنگ دلی کے اس دور میں وہ مذہبی آزادی دی کہ شاید اس ترقی یافتہ دور میں بھی میسر نہ ہو ——— تمام معاہدات اٹھا کر دیکھ لیجیے مذہبی آزادی کی ضمانت نمایاں نظر آتی ہے ——— جرجان آذربائیجان، موقان کے باشندوں سے جو معاہدات کیے گیے وہاں مذہبی آزادی کی ضمانت موجود ہے[1] اس سے بڑھ کر اور کیا آزادی ہوگی کہ ان کے معابد میں خود نماز پڑھنے سے احتراز کیا جائے!

جو شخص مذہبی آزادی کے معاملے میں اتنا روشن خیال ہو کہ اپنے غلام استنق سے بھی باز پُرس نہ کرے، صرف ترغیب و تشویق سے کام لے، جب وہ نہ مانے تو یہ آیت قرآنی پڑھ کر خاموش ہو جائے ——— لا اکراہ فی الدین ———

Caetani vol III گزشتہ سے پیوستہ
Thomas walker[1] p. 952. Sqq.
Arnold: The Preaching of Islam lahore 1965, p. 56. 2. Muhammad Ali: early caliphate. Lahore 1951. p. 137.

[3] شبلی: الفاروق، ص ۲۹۴، بحوالہ طبری ۲۶۵۸ - ۲۶۶۲

بھلا دوسروں سے مذہب کے معاملے میں کیا باز پُرس کرتا۔

ٹی پی ہیوز T.P. Hughs نے فاروقِ اعظمؓ کی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے بنو تغلب کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب انہوں نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور آپ نے تبدیلی مذہب پر ان کو مجبور کرنا چاہا تو دربارِ خلافت سے یہ فرمان جاری ہوا۔

"Leave them" — he wrote, in the profession of the gospel[1]

ترجمہ: "آپ نے تحریر فرمایا کہ ان کو دینِ عیسوی پر ہی رہنے دو"

مصر کی مکمل فتح کے بعد بہت سے قبطی اور رومی گرفتار ہو کر آئے، فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فاروقِ اعظم سے ان کے مستقبل کے بارے میں استفسار فرمایا تو جواب آیا۔

> سب کو بلا کر کہدو کہ ان کو اختیار ہے، مسلمان ہو جائیں یا اپنے مذہب پر ہی رہیں ——— اسلام قبول کر لیں گے تو ان کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں ورنہ جزیہ دینا ہو گا جو تمام ذمیوں سے لیا جاتا ہے[2]

دورِ جدید کے مورخ فلپ کے ہٹی (Hitti) نے اگرچہ فاروقِ اعظم کے معاملے میں زیادہ انصاف سے کام نہیں لیا لیکن یہ اعتراف اس نے بھی کیا ہے کہ آپ کے عہدِ مبارک میں غیر مسلموں کو بالکل مذہبی آزادی حاصل تھی، وہ لکھتا ہے۔

---

[1] T.P. Hughs: A Dictionery of Islam. P. 653

[2] شبلی نعمانی: الفاروق ۵۷-۲۵۶ (بحوالہ طبری ۲۵۸۲-۲۵۸۳)

Being outside the pale of Moslem Law they were allowed the jurisdiction of their even religious communities.[2]

ترجمہ: قانونِ اسلامی کے دائرہ سے باہر ہونے کی وجہ سے ذمیوں کو اپنے مذہبی فرقوں کے مقدمات فیصل کرنے کا عدالتی اختیار حاصل تھا۔

مشہور شیعہ مؤرخ امیر علی نے بھی فاروق اعظمؓ کی اس رواداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مسلمانوں کو حکماً لوگوں کے دین میں مداخلت سے روک دیا گیا[3]

ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ نے فاروقِ اعظم کی رواداری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

They were allowed the free and undisturbed exercise of their religion[4]

ترجمہ: ذمیوں کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی بلا روک ٹوک کھلی اجازت تھی۔

معاہدین کے علاوہ وہ غیر مسلم جنہوں نے برضا و رغبت خلافت اسلامی میں رعیت کی حیثیت سے رہنا قبول کیا یعنی ذمی ——— ان کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ ان کو جو خصوصی رعایات دی گئیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلافتِ فاروقی میں غیر مسلموں کو کیا عزت و وقار حاصل تھا۔ شاید یہ عزتِ و وقار خود مسلمانوں کو آج کسی مسلم حکومت میں بھی حاصل نہ ہو ——— فاروقِ اعظمؓ کی عالی حوصلگی، دریا دلی اور بے مثال رواداری نے مسلم اور غیر مسلم رعیت کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا کہ دونوں بڑی حد تک

---

۲ P:K: Hitti: History of the Arabs, New, York, 1963 p. 170

۳ امیر علی: تاریخ اسلام (ترجمہ اردو (A Short History of Saracens مطبوعہ لاہور، ص ۵۸

۴ T.W.Arnold.: The preaching of Islam.P.56

مساوی ہو گئے ـــــــ ذمیوں کے لیے مندرجہ ذیل اصُول و قوانین پیش نظر رکھیے اور پھر دیکھیے کہ مساوی تھے یا نہیں؟

(۱) مسلمان کسی ذمی کو قتل کرتا تو قصاص میں قتل کیا جاتا[۱] ـــــــ چنانچہ بقول حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک مسلمان نے عیسائی کو قتل کر دیا یہ مقدمہ خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا، آپ نے مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا کہ وہ قاتل سے قصاص لیں چنانچہ قاتل قصاص میں قتل کیا گیا[۲]

دورِ جدید میں غیر مسلم رعایا کا کیا پوچھنا اگر مسلمان ہی اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے تو اس کا کوئی پرسان حال نہیں ـــــــ پھر سچ کہو کہ امن و سلامتی خلافتِ فاروقی میں تھی یا جدید حکومتوں میں ہے؟

(۲) ذمی پر مسلمان کا ظلم و ستم کرنا تو بڑی بات ہی ہوگی اگر وہ سخت کلامی بھی کرتا تو سزا کا مستحق ہوتا[۳] ـــــــ اور سزا تو بعد میں ملتی مسلمان افسران خود اس کا خیال رکھتے کہ یہ نوبت نہ آنے پائے چنانچہ حاکم حمص (شام) حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے غصے میں ایک ذمی کو صرف اتنا کہا۔

اخزاک اللّٰہ (خدا تجھے رسوا کرے) حاکم موصُوف کو اس حرکت پر اتنی ندامت ہوئی کہ دربارِ خلافت میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

یہ تابناک مثال سامنے رکھو اور اپنی حالت پر غور کرو کہ غیر تو غیر اپنوں کے لیے وہ گالیاں اور دشنام طرازیاں کہ الامان والحفیظ!

یہ ہماری حالت ہے اور وہ ان کی حالت تھی ـــــــ وہ اخلاق کی کس بلندی پر

---

[۱] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۴۳۱ ب عنایہ شرح ہدایہ، جلد ہشتم، ص ۲۵۶

Jamil Ahmad: Hundred great Muslims, Lahore 1971. P.44

(ب) برہان شرح مواہب الرحمٰن، جلد سوم، ص ۲۸۶

[۳] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۴۳۱

تھے اور ہم کسی پستی میں ہیں
ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا!

(۳) ذمیوں سے صرف دو ٹیکس وصول کیے جاتے جزیہ اور خراج اس کے برخلاف مسلمانوں سے زیادہ ٹیکس وصول کیے جاتے مثلاً زکوٰۃ (جس کی مقدار جزیہ اور خراج سے کہیں زیادہ تھی) اس کے علاوہ مسلمانوں سے عشر بھی لیا جاتا تھا[۱]

(۴) بیت المال سے رضا کاروں کو جو تنخواہیں ملتی تھیں اس میں ذمی برابر کے شریک تھے۔

(۵) اپاہج اور ضعیف مسلمانوں کے لیے بیت المال سے جو وظیفہ مقرر ہوتا تھا اس میں ذمی برابر کے شریک ہوتے تھے۔

نوٹ:۔ اگر جزیہ کی رقم بیت المال میں جمع کی جاتی اور اس سے نہ ذمی اپاہجوں کو کچھ دیا جاتا، نہ ان کے ضعیفوں کی مدد کی جاتی اور نہ ان کی جان و مال کی حفاظت کی جاتی تو یقیناً جزیہ ایک ظالمانہ ٹیکس سمجھا جاتا لیکن ایسی صورت میں اس کو کونسا دانشمند ظلم و ستم سے تعبیر کر سکتا ہے؟

(۶) ملکی نظم و نسق میں ذمیوں سے مشورہ کیا جاتا چنانچہ عراق کے نظم و نسق میں ان سے مشورہ لیا گیا اور مصر کے انتظام میں مقوقس سے اکثر مشورہ کیا جاتا رہا[۲]

(۷) مسلمانوں کے لیے لازم تھا کہ وہ ذمیوں پر ظلم نہ کریں، نہ ان کو نقصان پہنچائیں اور اور نہ ان کا مال بلا وجہ کھانے پائیں —— فتح شام کے وقت حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام فاروق اعظم نے جو فرمان جاری فرمایا اس میں یہ تمام ہدایات موجود ہیں[۳]

---

[۱] شبلی نعمانی: الفاروق ص ۳۴۱ [۲] ایضاً ص ۴۲۶ (بحوالہ مقریزی جلد اوّل، ص ۷۴)
(ب) Muhammad Ali: Early Califate p. 181
(ج) Jamil Ahmed: Hundred great Muslims P. 45
[۳] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۲۷ (بحوالہ کتاب الخراج، ص ۸۲)

(۳) عجمیوں کو ان کی زمینوں پر مالکانہ حقوق عطا فرمائے اور یہ زمین انہیں کے قبضے میں رہنے دیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

فاروق اعظم نے ذمی رعایا کو وہ حقوق عطا فرمائے جو اس عہد کی دوسری سلطنتوں میں رعایا کو حاصل نہ تھے روم اور فارس کی حکومتوں میں غیر قوموں کے حقوق غلاموں سے بدتر تھے۔ شام کے عیسائی باوجودیکہ رومیوں کے ہم مذہب تھے لیکن ان کو مقبوضہ زمینوں پر کسی قسم کا اختیار نہ تھا بلکہ وہ خود ایک قسم کی جائیداد خیال کیے جاتے تھے۔ یہودیوں کا حال اس سے بھی بدتر تھا بلکہ اس قابل بھی نہ تھا۔ کہ کسی حیثیت سے ان پر رعایا کا اطلاق کیا جائے کیوں کہ رعایا کچھ نہ کچھ حق تو رکھتی ہے، وہ تمام حقوق سے محروم تھے اور حد تو یہ ہے کہ "حق" نام سے بیگانہ تھے ——— لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کو اتنی مراعات دیں کہ وہ رعایا ہو گئے بلکہ اس سے بڑھ کر ان کی حیثیت معاہدین کی سی ہو گئی ہے

ٹی ڈبلیو۔ آرنلڈ مقامی لوگوں پر فاروق اعظم کے اس بے مثال رحم و کرم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

For the provinces of Byzantine empire that were rapidly acquired by the prowess of Muslims found themselves in the enjoyment of a toleration such as had been unknown to them for many centuries.[1]

ترجمہ: بازنطینی حکومت کے وہ صوبے جو بہت ہی جلد مسلمانوں کی بے مثال دلیری و شجاعت کے آگے سپر انداز ہو گئے رواداری اور حسنِ سلوک کی ایک

ے الیضاً ص ۴۲۰

1 T.W. Arnold: the preaching of Islam, P.56.

ایسی پرمسرت فضا محسوس کر رہے تھے جو صدیوں سے ان کے لیے انجانی تھی"

چنانچہ ایران کو فتح کرنے کے بعد کسانوں پر ٹیکس کا بوجھ ہلکا کیا گیا انہیں ان کی زمینوں پر قابض کیا گیا، ضرورت پڑنے پر کاشتکاروں کو پیشگی رقم دی گئی، زمین کی فروخت حکماً بند کر دی گئی تاکہ مقامی لوگوں کے حقوق محفوظ رہیں[2]

یہ تمام حقائق ایک شیعہ مورخ نے قلم بند کیے ہیں، اسی سے ان حقائق کی صداقت عیاں ہے۔

سرزمین شام وعراق پر قبضہ کرنے کے بعد یہ مسئلہ سامنے آیا کہ زمین وہاں کے باشندوں کے قبضے میں رہنے دی جائے یا دشمن کا مال قرار دے کر فوج میں تقسیم کر دی جائے۔ فاروق اعظمؓ اس تقسیم کے خلاف تھے جب کہ بعض حضرات اس کے موافق تھے جب مسئلہ طے نہ ہوا تو مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا گیا۔ جانبین نے دلائل پیش کیے۔ لیکن فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس تقسیم کی مخالفت میں ایک دلیل پیش کی چنانچہ زمین مقامی غیر مسلم رعایا کو دے دی گئی۔ ڈاکٹر حسینی نے اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

Finely 'Umar quoted verses 7-9 of chapter LIX of the Quran wherein declared that the conquered lands belong to the poor among the Muhjirin and the Ansar and those who came after them. "He laid exphasis on the clause" who came after them" and carried his proposal through.[3]

---

2. Amir Ali: A short History of Saracens. P. P. 54-5
3. Dr. S.A.Q. Husaini: ARABS Administeration. Lahore 1966. P.

(ترجمہ) آخرکار حضرت عمرؓ نے قرآن کریم کی ۵۹ ویں سورۃ (حشر) کی آیت نمبر ۷ تا ۹ کا حوالہ دیا جس میں بتایا گیا ہے کہ مفتوحہ زمین مہاجرین و انصار کے غربا کے لیے ہے اور ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد آئے حضرت عمرؓ نے آیت کے اس حصے پر زور دیا "اور جو ان کے بعد آئے اور اس طرح اپنی تجویز کو مجلس شوریٰ میں پاس کرایا۔

الغرض فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذمیوں اور غیر مسلموں کو ممکنہ حد تک مراعات دیں ——— دیوانی معاملات میں کیا، فوجداری معاملات میں کیا، شخصی اور مذہبی معاملات میں کیا ——— حد تو یہ ہے کہ ذمی کو یہ بھی رعایت دی گئی ہے کہ جب چاہے عقد ذمہ توڑ دے لیکن مسلمان عقدِ ذمہ نہیں توڑ سکتا[1] یعنی اگر وہ خلافت اسلامیہ میں رعیت بن کر رہنا چاہتا ہے خوشی سے رہے اور جزیہ دیتا رہے لیکن اگر کہیں اور جانا چاہتا ہے تو پھر جہاں جی چاہے چلا جائے، کوئی پابندی نہیں ———

یہ تو ذکر تھا ان غیر مسلموں کا جنھوں نے پُر امن رعایا کی حیثیت سے خلافت اسلامیہ میں رہنا پسند کیا لیکن فاروقِ اعظم نے ان غیر مسلموں کے ساتھ بھی رواداری اور فراخ دلی کا ثبوت دیا جو قیدی بنا کر لائے گئے چنانچہ تقریباً ۱۷ھ/ ۶۳۸ء میں گورنر بصرہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حاکم اہواز (ہرمز) کی عہد شکنی کی وجہ سے حملہ کیا اور شکست دے کر ہزاروں آدمی لونڈی غلام بنا کر لائے لیکن جب فاروقِ اعظمؓ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ سب کو آزاد کر دیا جائے[2]

اور تو اور باغیوں، سرکشوں اور بغاوت پر اکسانے والوں کے ساتھ بھی وہ سلوک کیا جو آج رواداری اور عدل گستری کی داعی کوئی قوم یا حکومت نہیں کر سکتی ——— سنیے سنیے!

---

[1] مولانا مودودی: اسلامی ریاست، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء ص ۵۸۶ (بحوالہ درالمختار جلد اوّل ص ۱۱۲) [2] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۲۱۹

خیبر کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں پر سازش اور بغاوت جیسے الزامات ثابت ہو چکے تھے لیکن ان سے باز پرس نہ کی گئی صرف اتنا حکم دیا گیا کہ ان علاقوں کو چھوڑ کر کہیں اور جا کر بس جائیں اور بیت المال سے ان کی املاک کا پورا پورا معاوضہ ادا کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ان کے لیے سفر کی سہولتیں مہیا کی جائیں جہاں جائیں آسائش کا خیال رکھا جائے اور اسی پر بس نہیں بلکہ کچھ عرصہ کے لیے جزیہ بھی معاف کر دیا گیا[3]

یہ جلاوطنی نہیں صرف نقل مکانی تھی ——— روشن خیالی اور ترقی کے اس دور میں ایسے سازشیوں کو یا تو قتل کر دیا جاتا ہے یا ذلیل و خوار کر کے اور ان کا سب کچھ لے کر جلاوطن کر دیا جاتا ہے، مگر فاروق اعظمؓ نے تنگ دلی اور تعصب کے اس دور میں بھی ایسا نہ کیا۔

سرحد شام پر واقع عربسوس کے شہریوں نے جب رومیوں سے ساز باز کی اور سازش و بغاوت کا یہ راز فاش ہوا تو کوئی انتقام نہ لیا گیا بلکہ یہ انتہائی روا دارانہ فرمان جاری کیا گیا۔

جس قدر ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب ہیں سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دے دو اور ان سے کہو کہ کہیں اور چلے جائیں اس پر راضی نہ ہوں تو ایک برس کی مہلت دو اور اس کے بعد (بھی ساز باز سے باز نہ آئیں) تو جلاوطن کر دو[1]

---

3. Early caliphate p.181 Muhammad Ali.

نوٹ:۔ فلپ کے ہٹی نے یہ الزام لگایا ہے کہ فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ) نے ان یہودیوں اور عیسائیوں کو پچھلے معاہدات کی پروا نہ کرتے ہوئے جلاوطن کر دیا اور یہ لوگ شام اور عراق میں جا کر بس گئے۔

{History of the Arabs, New Youk, 1963, P.:69

ہٹی نے ان لوگوں کی سازشی اور باغیانہ ذہنیت کا ذکر کیا ہے اور نہ ان کو دی گئی مراعات کا اور اس طرح اپنے قاریوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے (مسعود) [1] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۳۲۴ (بحوالہ فتوح البلدان ص ۱۵۷)

کیا دورِ جدید کی کوئی حکومت اپنے دشمنوں کے ساتھ یہ سلوک کر سکتی ہے؟ سازشوں اور بغاوتوں کے باوجود ان کی رضاجوئی اور دلداری کا خیال رکھ سکتی ہے؟

ہرگز نہیں ہرگز نہیں! دُشمن اور باغی کے ساتھ تو حُسنِ سلوک بڑی بات ہے، مخالفین کے ساتھ وہ شرمناک سلوک کیا جاتا ہے جس سے رُوحِ تہذیب کانپ اُٹھتی ہے۔

بعض مؤرخوں نے غیر مسلموں پر فاروقِ اعظمؓ کی چند پابندیوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان پابندیوں کی حقیقت واضح کر دی جائے تاکہ خلقِ فاروقی کے تابناک چہرے پر آئندہ کوئی خاک نہ ڈال سکے۔

جن پابندیوں کا ذکر کیا گیا ہے وُہ یہ ہیں۔

(۱) غیر مسلم رعایا کے لیے لباس مخصوص فرمایا۔
(۲) شراب بیچنے اور خنزیر رکھانے پر پابندی عائد کی۔
(۳) ناقوس بجانے اور صلیب نکالنے کی اجازت نہیں دی۔
(۴) بچوں کو بتیسما (Baptism) دینے پر پابندی لگا دی۔
(۵) نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی ممانعت کر دی۔
(۶) جزیہ نافذ کیا
(۷) یہودیوں اور عیسائیوں کو ان کے گھروں سے نکالا۔
(۸) غلامی کو رواج دیا ——— وغیرہ وغیرہ ہم ایک ایک کر کے ان الزامات کی حقیقت واضح کرتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ دشمن مورخوں نے حقائق و واقعات کو کس طرح مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلا الزام

غیر مُسلم رعایا کے لیے لباس مخصُوص فرمایا

تہذیب و ثقافت خصوصاً لباس کے بارے میں یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ محکوم قوم رفتہ رفتہ حاکم تہذیب و تمدن کو اپنانے لگتی

ہے اور اس کی اپنی تہذیب معدوم ہو کر رہ جاتی ہے ـــــــ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حاکم قوم، محکوم کی تہذیب و تمدن میں مدغم ہو جاتی ہے۔ فاروق اعظمؓ نے حاکم و محکوم دونوں اقوام کی انفرادیت کو مجروح ہونے سے بچایا ایک نظریاتی ملک میں ایسا کرنا ایک سیاسی تقاضا ہے اور مذہبی ضرورت بھی ـــــــ اگر غیر مسلموں کے لیے کوئی نیا لباس تجویز کیا جاتا تو شاید ہم اس کو سیاسی غلامی مسلّط کرنے سے تعبیر کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے لیے ان کا اپنا لباس مخصوص فرمایا اور اس طرح ایک طرف ان کو ذہنی غلامی سے آزاد کیا کہ محکومیت کی وجہ سے کہیں وہ اپنا لباس ترک کر کے مسلمانوں کا لباس نہ اپنا لیں اور دوسری طرف کی ملّی انفرادیت کو مجروح ہونے سے بچا لیا۔

قومی تعمیر و تشکیل میں لباس ایک بڑی حقیقت ہے اس کو دورِ جدید میں خوب سمجھا جا رہا ہے ـــــــ لیکن اس حزم و احتیاط کے باوجود اسلامی تہذیب و ثقافت نے پورے جزیرۂ عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور آثارِ کفر ایسے مٹے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ فرانس کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر گستاولی بان نے مقامی تہذیب و ثقافت کی اس حیرت انگیز تبدیلی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ملک مصر میں مسلمانوں نے وہ اثر دکھایا کہ کبھی یونانیوں اور رومیوں کو بھی نصیب نہ ہوا تھا، مسلمانوں نے ان کی زبان، مذہب، تمدن و تہذیب جو ایک ہزار سال سے چلا آ رہا تھا، سب کچھ اس طرح بدل کر رکھ دیا کہ وہاں کے لوگ اپنی تاریخ کو بھول گئے اور جدید علمی تحقیقات نے صدیوں بعد اس تہذیب کو گردِ زمانہ کے اندر سے نکالا ہے"[2]

یہ انقلاب اس وقت آیا جب مقامی تہذیب و تمدن کی پوری حفاظت کی گئی ہے یقیناً

---

[1] قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے کہ اس پابندی کی ایک وجہ غیر قوم سے تشبّہ بھی تھا (کتاب الخراج ص ۲۹۱)

[2] گستاولی بان: تمدنِ ہند (ترجمہ اُردو از سید علی بلگرامی) مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۶۲ء ص ۲۰۷

اس حفاظت کا ایک پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سے بچائے رکھا گیا، لیکن اس کو کیا کیجئے کہ غیر مسلمانوں نے خود اپنی تہذیب و تمدن کی حفاظت نہ کی اور مسلمانوں نے خود کو اس طرح بچائے رکھا کہ رفتہ رفتہ انہیں کی تہذیب سارے جزیرہ عرب میں پھیل گئی اور وہ سیاسی حیثیت کے ساتھ ساتھ تمدنی حیثیت سے بھی غالب آ گئے —— اگر فاروقِ اعظم اس دور اندیشی سے کام نہ لیتے تو شاید وہی کچھ ہوتا جو آج ہو رہا ہے یا جو پچھلی صدیوں میں ہندوستان میں ہُوا۔ یہی مؤرخ ہندوستان میں مسلمانوں کے اثر و نفوذ کے بارے میں لکھتا ہے۔

البتہ ہندوستان میں مسلمانوں نے ایسا گہرا اثر نہیں ڈالا جیسا کہ مصر میں —— یہاں مفتوحین کا اثر فاتحین پر بہت زیادہ پڑا جس کی مثال اسلامی دنیا میں نہیں پائی جاتی [۲]

دُوسرا الزام

شراب پینے اور خنزیر کھانے پر پابندی عائد کی

یہ پابندی صرف مسلمانوں کے علاقوں میں تھی، وہ مسلمان جو محکوم نہ تھے حاکم تھے ہندوستان میں تو اس قسم کی پابندیاں برطانوی دور میں بھی محکوم مسلمانوں کی خاطر لگائی گئیں تھیں —— اگر فاروقِ اعظمؓ نے مسلمانوں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے یہ پابندی لگائی تو کونسا ظلم کیا جب کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے اپنے محلوں میں شراب پینے اور خنزیر کھانے کی عام اجازت تھی —— کیا کوئی ہوش مند محکوم اپنے حاکم سے یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ چیزیں جو حاکم کے مذہب میں حرام ہیں اُن کے کھانے پینے کی کھلی چھٹی دے جب کہ وہ ملک کی نظریاتی

---

[۲] ایضاً ص ۳۰۸

اساس سے متصادم بھی ہوں؟

تیسرا الزام

ناقوس بجانے اور صلیب نکالنے کی اجازت نہیں دی

یہ پابندی صرف نماز کے اوقات میں تھی اور مسلمانوں کے علاقوں میں تھی ——— برطانوی دورِ حکومت میں نماز کے اوقات میں بلکہ ویسے بھی مساجد کے آگے ناقوس بجانے کی بالکل ممانعت تھی ——— پھر فاروق اعظم نے کونسا ظلم کیا؟ جبکہ ان کو اپنے علاقوں میں ناقوس بجانے اور صلیب نکالنے کی ہر وقت اجازت تھی، کوئی پابندی نہ تھی[1]۔ ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے ان پابندیوں کا عادلانہ اور منصفانہ جائزہ لیا ہے اور صاف صاف لکھا ہے:

They were allowed free and undisturbed exercise of their religion with some restrictions imposed for the sake of preventing any friction between the adherents of the rival religious, or arousingany fanaticizm by the ostentatious exibition of religious symbols that were so offensive to Muslims feelings.[2]

---

[1] مودودی: اسلامی ریاست، ص ۵۸۸ بحوالہ بدائع جلد ہفتم، ص ۱۱۳

2. T.W. ARNOLD. The preaching of Islam, P.56

(نوٹ) آرنلڈ نے لکھا ہے کہ Gotheil نے اپنی کتاب "Dhimis And Muslim IN EGYPT" میں سلطنتِ اسلامیہ میں ذمیوں کے حالات کے سلسلے میں دستاویزی شہادتوں کا قابلِ قدر ذخیرہ پیش کیا۔

ترجمہ:- ذمیوں کو چند پابندیوں کے ساتھ آزادانہ اور بلا روک ٹوک مذہبی مراسم ادا کرنے کی اجازت تھی، اور یہ پابندی اس لیے لگائی گئی تھی کہ کہیں دو حریف مذہبوں کے ماننے والے آپس میں نہ لڑیں یا مذہبی نشانات کی نمود و نمائش سے، جو مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچائیں تعصب و تشدد کی فضا نہ پیدا ہو جائے۔

۴ چوتھا الزام

بچّوں کو بپتسما (اصطباغ) دینے پر پابندی لگا دی

لیکن یہ پابندی صرف ان بچوں کے لیے تھی جن کے والدین مسلمان ہو چکے تھے۔ سن بلوغ تک ان کو اصطباغ دینے کی ممانعت تھی غالباً اس لیے کہ یہ اپنی دین و ملت کے بارے میں خود فیصلہ کر سکیں اس کے علاوہ اس پابندی سے بہت سی قانونی حکمتیں بھی وابستہ تھیں ——— اگر عیسائی والدین کے بچّوں پر یہ پابندی عائد ہوتی تو یقیناً ظلم ہوتا لیکن یہاں تو نو مسلم والدین کی اولاد کا ذکر ہے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کو مسلمان ہی گردانا جاتا لیکن عدل و انصاف کی حد ہے کہ ان بچّوں کو بھی مہلت دی جا رہی ہے کہ لا اکراہ فی الدین افسوس کہ مؤرخین نے اس رواداری کو کس طرح غلط رنگ میں پیش کیا ہے!

۵ پانچواں الزام

نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی ممانعت تھی

یہ ممانعت صرف ان شہروں میں تھی جو مسلمانوں نے آباد کیے تھے، جو شہر عیسائیوں

نے آباد کیے تھے وہاں نئے معابد تعمیر کرنے، پرانے معابد کی مرمت وغیرہ کرنے کی اجازت تھی، چنانچہ قاضی ابو یوسف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ نے ذمیوں کو ان شہروں میں معابد بنانے کی اجازت دی جو انہوں نے آباد کیے تھے لیکن جو مسلمانوں نے آباد کیے ان میں آزادانہ معابد بنانے کی اجازت نہ تھی[1]

کونسا عقلمند انسان ایسی پابندی کو نامعقول کہہ سکتا ہے خصوصاً اُس زمانے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جب کہ محکوم قومیں مجبور و مظلوم اور مقہور ہوا کرتی تھیں ———

یہی نہیں کہ عیسائیوں کو اپنے شہروں میں معابد بنانے کی اجازت تھی بلکہ ان معابد میں اسلام اور پیغمبر اسلام کو سب کچھ کہہ لینے کی بھی اجازت تھی۔

اس رواداری کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے:

ایک ذمی عیسائی نے سرِ بازار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کی، مسلمان سے رہا نہ گیا اور اس نے ایک تھپڑ رسید کیا ——— یہ معاملہ گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہُوا ——— ذرا غور تو کرو کس کمال کی رواداری و آزادی تھی کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات بھی کہتا ہے اور تھپڑ کھانے کے بعد عدالت میں فریادی بنتا ہے، کیسی دیدہ دلیری ہے۔ لیکن نہیں نہیں خلافتِ فاروقی میں زبان و دل پر قفل نہیں ڈالے گئے تھے ———

مسلمان جس نے تھپڑ مارا تھا پیش ہوا، اس نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا ہر عادل و منصف اس کی صداقت پر گواہی دے گا اور اس بے مثال جذبہ ارادی پر داد دیے بغیر نہ رہ سکے گا ——— اس نے کہا۔

"یہ عیسائی اپنے گرجاؤں میں جو چاہیں کہیں لیکن شارع عام پر ان کو یہ حق

---

[1] قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم: کتاب الخراج، (ترجمہ اردو) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء ص ۲۳۴ (ملخصاً)

نہیں پہنچتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرتے پھریں[1]
بات سچی تھی مسلمان بری ہو گیا اور اس گستاخی پر گورنر نے عیسائی سے کوئی باز
پرس نہ کی ——

مندرجہ بالا الزامات کے بارے میں ٹی ڈبلیو آرنلڈ لکھتا ہے۔

But di[1] Gorge and Caetani[2] have proved without doubt that they were the inventions of, a later age.[3]

چھٹا الزام

جزیہ نافذ کیا گیا!!

کیا جدید اور قدیم حکومتوں میں کوئی ایسی حکومت ہے جس نے اپنی رعایا سے ٹیکس نہ لیا ہو؟ اور بغیر ٹیکس لیے اس کے سارے کام بنا دیے ہوں؟ —— نہیں نہیں ہرگز نہیں تو پھر جزیہ لینا کونسا گناہ ہو گیا؟ —— کیا جزیہ کے نام سے چڑ ہے؟ —— اگر ایسا ہے تو اس کا بھی تدارک کر کے دکھا دیا گیا —— کاش عقل سے عاری اور دل سے خالی دیوانے اس ٹیکس کی حقیقت افادیت پر غور کرتے اور یہ سوچتے کہ اتنی حقیر رقم کے بدلے کیسے کیسے فوائد و منافع مل رہے ہیں۔

---

2. Memorise pur is canquete de la Syrie P.143.

1. Muhammad Ali: early caliphate. p. 182
2. Annali del islam, vol III p. 957
3. T.W. Arnold: The preaching of Islam. P. 57

(۱) جان کی حفاظت

(۲) مال کی حفاظت

(۳) ناموس کی حفاظت

(۴) مذہب کی حفاظت

(۵) جہاد سے استثناء (کوئی غم نہیں، ہمیشہ سکون و چین کی زندگی بسر کیجئے)

(۶) اپنے دشمنوں کی مدافعت اور مقابلے سے بے فکری (کہ یہ کام خود مسلمانوں کا ہے کہ وہ ذمیوں کے دشمنوں سے لڑیں، ذمیوں کا نہیں)

یہ دل بہلانے والی باتیں نہیں جیسی دورِ جدید کی سیاست میں ہوا کرتی ہیں، یہ جھوٹی ضمانت نہیں سچّی ضمانت ہے، خدا اور اس کے رسُول کی ضمانت ——— اس سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہو گی۔ آج ایک ٹیکس نہیں بیسیوں ٹیکس لیے جاتے ہیں لیکن پھر بھی جان کا خوف، مال کا خوف، ناموس کا خوف سر پر منڈلا رہا ہے ——— کوئی جان نہ لے لے، کوئی مال نہ لوٹ لے، کوئی ناموس کو خاک میں نہ ملا دے ——— یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خلافتِ اسلامی اور دوسری حکومتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ——— وہاں کم لیا جاتا ہے، بہت دیا جاتا ہے اور یہاں بہت لیا جاتا ہے اور کم دیا جاتا ہے ——— اس کے لینے میں معقولیت ہے اُن کے لینے میں معقولیت نہیں[1] ——— ڈاکٹر حسین نے جزیہ کی معقولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

---

[1] نہ معلوم عقلیت پرستی کے اس دَور میں اس حقیقت کی طرف کیوں غور نہیں کیا جاتا ——— زکوٰۃ ہی کو لیجیئے، مال پر سال گزرنے کے بعد فرض ہوتی ہے ——— سارے سال کیا کمایا اور کیا خرچ کیا، اس سے بحث نہیں ——— جتنا کمایا اتنا ہی خرچ کر دیا تو ایک کوڑی زکوٰۃ نہیں (گزشتہ سے پیوستہ) کہ ایسی حالت میں زکوٰۃ لینا معقولیت نہیں ——— لیکن دَورِ جدید کا ٹیکس آمدنی کو دیکھتا ہے جو کچھ کمایا اگرچہ وہ سب خرچ ہو چکا ہے اور کمانے والا مقروض ہو چکا ہے لیکن پھر بھی ٹیکس لیا جائے گا۔ اسلام کی نظر میں ایسا شخص مدد کا مستحق ہے (مسعود)

چوں کہ جزیہ خالصتاً غیر مسلموں کی فوجی حفاظت کے سلسلے میں لیا جاتا ہے [1] اس لیے جہاں وہ حفاظت نہ کر سکے جزیہ واپس کر دیا گیا، جنگِ یرموک سے قبل عساکرِ اسلامیہ حمص اور دمشق سے واپس ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے جزیہ کی تمام رقم واپس دینے کا حکم دیا۔[2]

فاروقِ اعظمؓ کے فراخدلانہ حکم کا یہ اثر ہوا کہ جب عساکرِ اسلامیہ حمص چھوڑ کر یرموک کی طرف روانہ ہوئیں تو وہاں کے غیر مسلم باشندوں نے عہد کیا اور گواہی دی۔

جب تک ہم زندہ ہیں رومی یہاں نہ آنے پائیں گے ——— خدا کی قسم رومیوں کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر تم ہم کو محبوب ہو۔[3]

ڈاکٹر حسین جزیہ کی معقولیت پر بحث کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں۔

اگر کسی ذمی نے کسی فوجی مہم میں حصہ لیا تو اس کا سال بھر کا جزیہ معاف کر دیا گیا اور اگر کسی نے کچھ عرصے کے لیے فوج میں خدمات انجام دیں تو اس عرصے کے لیے جزیہ معاف کر دیا گیا۔[4]

اگر غیر مسلموں کی طرف سے یہ سوال کیا جائے کہ فاروقِ اعظم نے تمام غیر مسلم رعایا کو جنگی خدمات کا مکلف بنا کر کیوں نہ جزیہ سے سبکدوش فرمایا؟ ——— تو میں عرض کروں گا کہ ایسی جنگ کے لیے غیر مسلموں کو مجبور کرنا جو خالص دینی و مذہبی تھی اور جس میں ان کے ہم مذہب مسلمانوں کے خلاف صف آرا تھے۔ کہاں کی دانائی تھی؟ ———

---

[1] ابتدا میں جزیہ نقد و جنس دونوں صورتوں میں لیا جاتا تھا کیونکہ فوجیوں کو دونوں کی ضرورت تھی لیکن جب حکومت کا نظام ذرا مستحکم ہوا تو پھر جنس کے بجائے نقد ہی کی صورت میں لیا جانے لگا (الفاروق ص ۳۴۴)

[2] Dr. S.A.Q. Husaini: The Arab Administeration. P.43. بحوالہ بلاذری فتوح البلدان، ص ۱۳۷ و قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۸۱

[3] شبلی نعمانی: الفاروق، ۳۴۴ ب Jamil Ahmad Hundred great Muslims. P.45

[4] Husaini: Arab Administeration. P.43

اگر ایسا کیا جاتا تو یقیناً ظلم ہوتا لیکن یہ ہرگز ظلم نہیں کہ فوجی خدمات سے سبکدوش کر کے صرف فوجی اخراجات میں ان کو شریک کیا جائے یہ تو عین کرم ہے ———

ڈاکٹر حسین نے بڑی دل لگتی بات لکھی ہے۔

جزیہ کی طرح ٹیکس اسلام سے قبل بھی رائج تھے لیکن اسلام سے قبل جزیہ لینے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسلام پوری ذمہ داری کے ساتھ جزیہ لیتا ہے اور انہوں نے کوئی ذمہ داری محسوس نہ کی[1]

دُور کیوں جائیے دورِ جدید کی حکومتوں کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ جس مد میں ٹیکس وصول کیا جاتا ہے پوری دیانت کے ساتھ اس میں خرچ نہیں کیا جاتا بلکہ بعض اوقات صرف لیا جاتا ہے، خرچ نہیں کیا جاتا۔

یہ جزیہ جس کا مخالفین نے بہت چرچا کیا ہے کوئی لمبی چوڑی رقم نہ تھی بلکہ بہت ہی معمولی، چنانچہ ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے لکھا ہے۔

But this Jizah was too moderate to contribute aburden, seeing that it released them from the compulsory military services that was incumbent on their Muslim fellowing subjects.[2]

ترجمہ: لیکن یہ جزیہ تو بہت ہی واجبی تھا، ایسا نہ تھا کہ اس کو بارِ گراں تصوّر کیا جاتا خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جائے کہ جزیہ کے بدلے لازمی فوجی خدمت سے ذمیوں کو چھٹکارا مل گیا تھا حالانکہ یہ فوجی خدمت ان کی ساتھی مسلم رعایا پر فرض تھی۔

ایک ہی حقیقت ہے جس کا دل صاف تھا اس نے اس طرح بیان کیا اور جس کے دل میں کھوٹ تھا۔ اس نے اس طرح بیان کیا۔ دیکھیئے فلپ کے ہٹی اسی حقیقت کو

---

1. Ibid, P.44 2. T.W. Arnold: The preaching of, Islam. P. 60

کس انداز سے بیان کرتا ہے۔

As Dhimis, the subject peoples, would enjoy the protection of the Muslims and have no military duty to perform, since they were barred by religious from service in the Muslim army; but they would have a heavy tribute to pay.[3]

یہ جزیہ جس کو ہٹی (Hitti) بارگراں سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی تفصیل تو ملاحظہ ہو —— آرنلڈ نے جزیہ کے تین درجات کا ذکر کیا ہے جو امراء متوسطین اور عام ذمیوں کے لیے مخصوص تھے۔

1. Five dinar for the rich.

ترجمہ:- امراء کے لیے ۵ دینار

2. Four for the middle classes.

متوسطین کے لیے ۴ دینار

3. And three for the poor.[1]

غرباء کے لیے ۳ دینار

پھر یہ معمولی رقم بھی جبراً و قہراً نہ لی جاتی تھی بلکہ ممکنہ حد تک رعایت کی جاتی تھی۔ آج کل ٹیکس کے معاملے میں یہ مراعات نہیں دی جاتیں —— فاروق اعظمؓ نے عاملین کو ہدایت کر دی تھی۔

لا یکلفوا فوق طاقتھم[۲]

---

3. P.K. Hitti: History of the Arabs, P. 170.

1. T.W. Arnold: The preaching of Islam, p.57.

۲ قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۸۲

سفرِ شام کے دوران فاروقِ اعظمؓ نے دیکھا کہ ایک عامل جزیہ وصول کرنے کے لیے ذمیوں کو سزا دے رہا ہے آپ نے اس حرکت سے اس کو باز رکھا اور فرمایا۔

لا تعذب الناس فان الذین یعذبون الناس فی الدنیا یعذبھم اللّٰہ یوم القیامۃ [۳]

ترجمہ:۔ انہیں تکلیف نہ دو، اگر تم ان کو عذاب دو گے تو قیامت کے دن اللّٰہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے گا۔

ذرا بتاؤ تو سہی یہ خدا ترسی آج کس جہاں ستاں میں ہے؟

ایک مرتبہ ایک ذمیّ کو بھیک مانگتے دیکھا، فرمایا۔ کیوں مانگتا ہے؟ —— عرض کیا گیا "جزیہ دینے کے لیے؟ —— آپ نے فوراً جزیہ معاف فرما دیا اور بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا اور افسر خزانہ کو کیا دل لگتی بات تحریر فرمائی۔

خدا کی قسم یہ ہرگز انصاف نہیں کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو رسوا کریں [۴]

جب ان کے آقا جانوروں کو امان دیں تو کیا وہ انسانوں کو بھی امان نہ دیں گے ان کے آقا کی شان تو یہ تھی ؎

وکذا الوحوش اتت الیک وسلّمت
وشکا البعیر الیک حین رآکا

بوڑھے ذمیوں کے لیے تو رعایت ہے ہی مگر وہ ذمیّ جس پر جزیہ واجب الادا ہو مر جائے تو اس کے ترکے سے جزیہ نہ لیا جاتا تھا اور نہ اس کے ورثا [۵] سے حالانکہ اگر کسی مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہو چکی ہے تو مرنے کے بعد اس کے ترکے سے ضرور ادا کی جائے گی —— اتنی سہولتوں اور رعایتوں کے باوجود بھی جزیہ کو

---

[۳] ایضاً ص ۱۷ [۴] مودودی: اسلامی ریاست، ص ۵۹۳ (بحوالہ کتاب الخراج، ص ۷۲ و فتح القدیر، دوم، ص ۳۷۲) [۵] ایضاً ص ۵۹۳

ظلم سے تعبیر کیا جائے تو یہ تعبیر بجائے خود ایک بڑا ظلم ہے۔

اگر بقول مغربی مورخین جزیہ اسلام قبول نہ کرنے کا جرمانہ ہے تو پھر زکوٰۃ کے متعلق کیا کہا جائے گا کیا وہ اسلام قبول کرنے کا جرمانہ ہے؟ جب کہ جزیہ صرف قابلِ جنگ مردوں سے لیا جاتا ہے اور زکوۃ صاحبِ استطاعت مرد و زن سب پر ہے [1]

اگر بعض مغربی مورخوں نے جزیہ کو جُرمانہ سمجھا یا اُس زمانے کے بعض قبائل نے ایسا سمجھا تو یہ ان کی سمجھ کا پھیر ہے، چنانچہ بنو تغلب نے جب جزیہ کے بجائے عشر دینے پر آمادگی ظاہر کی (یعنی جزیہ سے دوگنی رقم جو مسلمانوں سے لی جاتی تھی) تو فاروقِ اعظم نے اجازت دے دی۔ انکار کیوں کیا جاتا کہ اس میں لینے والے کا نقصان نہ تھا، دینے والے کا نقصان تھا اور وہ خوشی خوشی اس نقصان کو برداشت کر رہا تھا جب کہ اس کو رعایت بھی دے دی گئی تھی لیکن اس نے اپنی کم سمجھی کی وجہ سے اس رعایت کو ذلت و رسوائی سمجھا۔ ٹی پی ہیوز (T. P. Hughes) نے بنو تغلب کے اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

The tribe deeming in its tribe the payment of tribute (Jizyah) and indigrity, sent a deputation to the Khaliph declaring their willingness to pay the tax if only it were Levied under the some as that taken from the Muslims. Umar evinced his liberality by allowing the concession; and so the Banu Tughlib enjoyed the singular privilege of beeing assessed as christians of a double lithe (Ushr) instead of paying of Jizhah.[2]

---

[1] ایضاً ص ۵۹۵

[2] T.P. Hughes: Adictionary of Islam. P. 653
(b) S.W. Muir: Annals of the early Caliphate. p. 218

ترجمہ:- اس قبیلے (بنو تغلب) نے خود پسندی کی وجہ سے جزیہ ادا کرنا کسرِ شان سمجھا اور خلیفہ کے پاس ایک وفد بھیجا، اس وفد نے خلیفہ کو جا کر یہ بتایا کہ بنو تغلب ٹیکس دینے پر رضا مند ہیں بشرطیکہ یہ اسی نام سے لگایا جائے جس نام سے مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے (حضرت) عمرؓ نے اپنی وسعت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو یہ رعایت دی چنانچہ بنو تغلب نے یہ واحد اور غیر معمولی رعایت حاصل کی اور عیسائی ہوتے ہوئے جزیہ کے بجائے ان سے دوگنا عُشر لیا گیا (جو مسلمانوں سے لیا جاتا تھا) ان دلداریوں اور رعایتوں کے باوجود اب بھی اگر کوئی جزیہ پر اعتراض کرتا ہے تو پھر ہم اس سے پوچھیں گے۔

Is there a government any where to-day in this twentieth century that levies no taxes on its subjects for the mainte-nance of peace and order?[1]

ترجمہ:- کیا اس بیسویں صدی میں کہیں ایسی حکومت ہے جو ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے اپنی رعایا پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں لگاتی؟

ساتویں الزام کا جواب اُوپر کسی مقام پر دے دیا گیا ہے اب ہم آٹھویں الزام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

— یعنی —

فاروق اعظم رضؓ نے غلامی کو رواج دیا

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ فاروق اعظم نے غلامی کو رواج دیا، کوئی نسل اور کوئی زمانہ

1. Muhammad Ali: Early Caliphat p. 182

ایسا نہیں گزرا جس میں غلامی نہ رہی ہو ——— ارسطو اور افلاطون نے بایں ہمہ علم و حکمت غلامی کو جائز رکھا ——— یہودیوں، ایرانیوں یونانیوں سب ہی نے اس کو جائز سمجھا ——— دھرم شاستر میں غلام کو "دو پائی مویشی" سے تعبیر کیا گیا ہے ——— ماضی بعید کی بات کیوں کیجئے، ماضی قریب میں جب امریکہ دریافت ہوا تو صرف بیس سال (۱۶۸۰ء تا ۱۷۰۰ء) میں ۳ لاکھ غلام افریقہ سے حاصل کیے گئے اور پھر ۱۷۸۶ء تک صرف ایک علاقے میں ۶ لاکھ ۱۰ ہزار غلام بھیجے گئے[1] ان غلاموں کو بھیڑ بکریوں کی طرح جہازوں میں لادا جاتا تھا اور انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا ———

لیکن فاروق اعظمؓ نے صدیوں پہلے جو ان غلاموں کے ساتھ کیا آج انہیں کے حسن سلوک کے نتیجے میں ان کی گردنیں آزاد ہوتی ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر اور پھر انیسویں صدی کے شروع میں غلاموں کی تجارت پر قانوناً پابندی لگا دی گئی ——— لیکن پھر بھی چوری چھپے یہ کاروبار اب تک جاری ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمزوروں کو غلام بنانا انسان کی فطرت میں داخل ہے، فاروق اعظم نے فطرتِ انسانی کی اس کمزوری کو دیکھتے ہوئے جو کچھ کیا، بہت کچھ ہے اور اس وقت اس سے زیادہ ممکن نہ تھا ——— آپ نے اس سلسلے میں وہ اصلاحات کیں کہ غلامی، غلامی نہ رہی بلکہ فرزندی ہو گئی ——— ذرا ان اصلاحات کو ملاحظہ فرمائیں جن کا ذکر طبری، فتوح البلدان، کنز العمال وغیرہ میں کیا گیا ہے۔

(۱) غلامی کو ختم کرنے کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اہل عرب کا غلام بنانا قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔

(۲) مفتوحہ ممالک میں جو قیدی غلام بنا لیے گیے تھے (قیدیوں کو غلام بنانے کی رسم بہت قدیم ہے) ان میں پیشہ وروں اور کاشت کاروں کو آزاد کر دیا گیا اور آئندہ ایسے لوگوں کو غلام بنانا ممنوع قرار دے دیا۔

---

[1] سر سید احمد خاں: تہذیب الاخلاق، جلد دوم، مطبوعہ لاہور، ۱۳۱۲ ص ۵۹ - ۶۸

(۳) جس لونڈی کے ہاں اولاد ہو جائے اس کی فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔ گویا اب اس کی حیثیت ایک رفیقۂ حیات کی سی ہو گئی۔

(۴) غلام کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے آقا سے معاہدہ کر کے مخصوص رقم کے عوض آزادی حاصل کر لے۔

(۵) ایک خاندان کے غلام افراد کو مختلف مقامات پر رکھنا ممنوع قرار دیا گیا ایک ہی جگہ رکھنا لازم کر دیا گیا ——— اس سے پہلے باپ کسی کے پاس ہوتا تو بیٹا کسی کے پاس بیٹی کہیں ہوتی تو ماں کہیں ——— فاروق اعظمؓ نے مفارقت کی اس چبھن کو محسوس کیا اور وہ رعایت دی جو آج سرکاری ملازموں کو بھی حاصل نہیں۔ چنانچہ عہد فاروقی میں جب سرکاری ملازم باپ بیٹے کو دو مختلف مقامات پر متعین کیا گیا تو باپ (مسمط بن اسود) نے کہا کہ جب لونڈی غلام کو یہ حق حاصل ہے تو ہم کو کیوں نہیں[1]؟

پہلے جنگی قیدیوں میں شہزادوں اور شہزادیوں کی مٹی پلید ہوتی تھی (بلکہ صدیاں گزر جانے کے بعد ۱۸۵۷ء میں انگریز حاکموں نے مسلمان شہزادوں اور شہزادیوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ کتنا اذیت ناک اور دردناک ہے) ——— فاروق اعظمؓ نے قیدی شہزادوں اور شہزادیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا چنانچہ شاہ مصر مقوقس کی بیٹی ارمانوسہ کو ایک سردار قیس بن ابی العاص کے ساتھ واپس مقوقس کے پاس بھیج دیا۔

مجاہدین کی تنخواہوں کے ساتھ ساتھ ان کے غلاموں کی بھی اتنی ہی تنخواہیں مقرر کی گئیں ——— کیا آج دنیا کے کسی ملک میں فوجیوں اور فوجی افسروں اور ان کے ملازموں کی ایک ہی تنخواہ ہے؟

(۷) حاکموں اور افسروں پر لازم تھا کہ غلاموں کی عیادت کریں، نہ کرتے تو ملازمت

---

[1] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۴۵۰

سے برطرف کر دیے جاتے ——— کیا کسی حکومت نے اپنے افسروں کو یہ ہدایت کی ہے کہ اپنے غلاموں کی نہیں، ملازموں ہی کی عیادت کیا کریں اور کیا ایسا نہ کرنے پر کبھی کسی کو ملازمت سے برطرف کیا گیا ہے؟ ——— اللہ اللہ دورِ فاروقی میں غلاموں کی وہ شان تھی جو ہمارے ملازموں کی بھی نہیں۔

⑨ فاروقِ اعظمؓ غلاموں کو اپنے ساتھ کھلاتے پلاتے تھے اور دوسروں کو ترغیب دیتے تھے کہ غلاموں سے نفرت نہ کریں بلکہ اپنے ساتھ کھلائیں پلائیں۔ آپ فرماتے تھے۔

"خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جن کو غلاموں کے ساتھ کھانے سے عار ہے"[1]

آج اپنے ملازم کے ساتھ ایک معمولی افسر نہیں کھا سکتا ——— صدر، وزیرِ اعظم اور وزراء کی بات تو بہت اونچی ہے ——— ذرا بتاؤ تو سہی جس شخص کے ساتھ امیر المومنین کھا رہا ہے وہ معاشرے کا ذلیل ترین فرد ہے یا معزز ترین؟

یہ سارے حقائق و واقعات بتا رہے ہیں کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے غلامی کی حقیقت کو یکسر بدل کر رکھ دیا وہ غلامی نہ رہی آقائی ہو گئی اس کو یہ بھی حق دے دیا گیا کہ وہ اگر کسی دشمن سے معاہدہ کر لے تو وہ معاہدہ خلافتِ اسلامیہ کی طرف سے سمجھا جائے گا ——— آج بڑے سے بڑے ذمہ دار افسر کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی غیر ملک اور غیر قوم سے معاہدہ کرے ——— ان عظیم الشان رعایتوں سے اسلامی معاشرے میں غلام کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے ——— غلام کا نام رہ گیا، غلامی نہ رہی ——— عملاً غلامی کو مٹا دیا گیا اسی لیے غلاموں اور لونڈیوں کی اولاد میں بڑے بڑے ائمہ حدیث اور صاحبِ کمال پیدا ہوئے۔

---

[1] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۴۵۰ تا ۴۵۲

نوٹ: غلامی سے متعلق مندرجہ بالا تفصیلات الفاروق کے صفحہ ۴۴۴ تا ۴۵۲ سے اخذ کی

ہاں ایک بات رہ گئی اور وہ یہ کہ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ ان رعایتوں کے باوجود پھر غلام سے کام کیوں لیا جاتا تھا، گھر بیٹھے کیوں نہ کھلایا جاتا تھا تو ہم دورِ جدید کے ترقی یافتہ ممالک کے آقاؤں سے نہیں والدین سے پوچھتے ہیں کہ تم اپنی اولاد کو گھر بیٹھے کیوں نہیں کھلاتے ان کو کام کرنے پر کیوں مجبور کرتے ہو اور گھر کے اخراجات میں ان کو ذمہ دار کیوں بناتے ہو؟ —— یہ کیا ظلم کرتے ہو؟ —— غلام سے تو اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جاتا تھا اور کھلایا وہ جاتا تھا جو آقا کے گھر میں پکتا تھا پہنایا وہ جاتا تھا جو آقا کے گھر میں پہنا جاتا تھا —— لیکن تم تو اپنی اولاد کے ساتھ بھی یہ نہیں کرتے، جتنا وہ دیتا ہے اس سے زیادہ تم اس پر خرچ نہیں کرتے اور اگر منہ مانگے پیسے نہ دے تو تم اس کو نکال دیتے ہو —— آخر یہ کیا ظلم کرتے ہو؟ —— تم ایسے بے رحم باپ ہو کہ تمہارے بچے تم سے گریزاں ہیں اور وہ ایسے رحیم و کریم آقا تھے کہ آزاد ہونے پر بھی غلام ان کے پیچھے پیچھے لگے رہتے تھے۔

لیکن انسان محسن کش واقع ہوا ہے، وہ اپنے رب کا ناشکر گزار بندہ ہے —— ان الانسان لربہ لکنود —— جس محسنِ انسانیت نے غلاموں کو آقا بنا دیا اس محسن کو ایک غلام نے جامِ شہادت پلا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس حکایتِ خونچکاں کو کیا بیان کیا جائے کہ سننے کے لیے پتھر کا جگر چاہیئے —— فارس کے غلام بظاہر اطاعت گزار تھے لیکن عرب مسلمانوں کے خلاف ان کے دل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی کہ انہوں نے ان کی شاہی کو خاک میں ملا یا تھا اور ان کے تخت کو روندا تھا —— ان لوگوں نے فاروق اعظم سے انتقام لینے کی ٹھانی —— فارس کے انہیں غلاموں میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، کا غلام فیروز بھی تھا فاروق اعظم کے پاس اپنے آقا کی شکایت لے کر آیا شکایت نامعقول تھی رد کر دی گئی، چلا گیا لیکن دل میں غبار لے کر گیا —— دوسرے دن علی الصبح خنجر لے کر مسجد میں آیا اور چھپ کر بیٹھ گیا جوں ہی فاروقِ اعظم نمازِ فجر

کی امامت کے لیے آگے بڑھے کمین گاہ سے نکل کر اس سفاک نے دو دھاری خنجر سے پے در پے چھ وار کیے، فاروقِ اعظم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے کیا اور خود زخموں کی تاب نہ لا کر گر پڑے ——— درد و کرب کا عالم ہے۔ عزیز و اقارب یاد نہیں آرہے غیر مسلم رعایا کی یاد ہے وصیت فرما رہے ہیں تو انہیں کے حقوق کے بارے میں ——— ذرا یہ الفاظ تو ملاحظہ فرمائیں۔

واوصیہ بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ان یوفی لھم بعھدھم وان یقاتل من وراءھم وان لا یکلفوا فوق طاقتھم[1]

ترجمہ:۔ (ہونے والے خلیفہ کو) وصیت کی جاتی ہے کہ جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے (یعنی ذمی) ان سے جو عہد کیا گیا ہے وہ پورا کیا جائے۔ ان کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔

ذرا قلبِ فاروقی کی وسعت تو دیکھیے کہ غیر مسلم غلام شہید کر رہا ہے ——— عین ممکن تھا کہ بلکہ فطرتِ انسانی کا تقاضا تھا کہ جو کچھ کہا جاتا ان کے خلاف کہا جاتا، لیکن نہیں جو کچھ کہا گیا ان کے حق میں کہا گیا ——— اللہ اللہ ان حضرات کے جذبات پر شریعت کی کیسی عملداری تھی۔

جہاں کر دیا نرم، نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم، گرما گئے وہ

---

[1] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۴۲۷

(نوٹ) حضرت امام بخاری، ابوبکر بیہقی اور جاحظ وغیرہ نے وصیت کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۵۷ پر یہ وصیت نقل کی ہے مولانا محمد علی نے بھی اپنی کتاب "EARLY CALIPHATE" کے صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱ پر نقل کی ہے۔

ہاں ہاں یہ خلافتِ فاروقی ہے، ہنسی کھیل نہیں —— یہ شاہی نہیں جو جذبات کے سہارے چلتی ہے، یہ خلافت ہے جو محبّت وعشق کے سہارے چلتی ہے۔

زخم کاری تھا، جان بر نہ ہو سکے دس برس چھ مہینے مسندِ خلافت کو رونق بخشی اور ۶۳ سال کی عمر شریف میں ذی الحجہ ۲۳ھ میں جان عزیز جان آفریں کے سپرد کر دی انا للہ وانا الیہ راجعون

بہر بہار گل از زیر گل بر آرد سر
گلے برفت کہ نا ید بصد بہار دگر

کتابت :۔ قاضی زاہد اقبال مچھرالہ ضلع گوجرانوالہ

حکمتِ فاروقی کے جوہر پارے

تحریر

سیّد محمد فاروق القادری

دنیا میں کسی انسان کی عظمت کو دیکھنے کے عام طور پر دو ہی بڑے پیمانے ہیں پہلا تو یہ کہ اس کا فکر اور دعوت کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ اُس کی اپنی زندگی کہاں تک اُس فکر کی عکاسی کرتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں اگر کسی انسان کا فکرِ عالمگیر اس کی دعوت نجات دہندہ خلق، اس کا پیام فلاح وصلاحِ عالم کا ضامن اور اس کی زندگی ان اصولوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے تو وہ مقتدائے انسانیت سید الاولین و آلاخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے یا پھر وہ مبارک لوگ ہیں جنہوں نے انسانیت کے اس محسنِ اعظم سے محبت و شفقت اور جہانبانی کے سبق سیکھے۔ اسی درس گاہ کے نامور متعلم سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے نامِ نامی سے کون واقف نہیں آپ کی جامع اور متنوع زندگی کے ایک ایک پہلو پر مبسوط مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے اس سب سے بڑے ہیبت اور دبدبے والے درویش متواضع اور منکر المزاج خلیفہ کی زندگی کا ہر پہلو عظیم ہے ذیل میں ہم آپ کے بعض حکیمانہ مقولے پیش کرتے ہیں جو آپ کی جامع اور کامیاب زندگی کا راز اور لبِ لباب ہیں بظاہر یہ معمولی باتیں ہیں لیکن اگر ان پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دراصل یہی وہ زندگی کے پاکیزہ اُصول ہیں۔ جنہیں عمرؓ نے درس گاہ نبوی سے سیکھ کر امیر المومنین فاروقِ اعظم کا رتبہ حاصل کیا۔

آپ نے فرمایا۔

- جو شخص اپنا راز چھپاتا ہے، وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔
- جس سے تم کو نفرت ہو، اس سے ڈرتے رہو۔
- جو شخص برائی سے واقف نہیں وہ اس میں مبتلا ہوگا۔
- تین چیزیں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہیں (۱) سلام کرنا (۲) دوسروں کے لیے مجلس میں جگہ خالی کرنا (۳) مخاطب کو بہترین نام سے پکارنا۔
- آدمی کے نماز روزہ کو نہیں بلکہ اس کی دانائی اور راستبازی کو دیکھنا چاہیے۔
- خدا اس شخص کا بھلا کرے جو مجھے میرے عیوب سے مطلع کرتا ہے۔
- دنیاوی حرص کو کم کرو، آزادانہ زندگی بسر کر سکو گے۔
- اگر غیب دانی کے دعویٰ کا خیال نہ ہوتا تو میں کہتا کہ پانچ شخص بہشتی ہیں۔

(۱) وہ محتاج جو عیالدار مگر صابر ہو (۲) وہ عورت جس کا شوہر اس سے راضی اور خوش ہو (۳) وہ عورت جس نے اپنا حق المہر شوہر پر معاف کر دیا ہو (۴) وہ جس کے والدین اس سے راضی ہوں (۵) وہ جو اپنے گناہوں سے سچی توبہ کرے۔

- مقدمات کا فیصلہ جلد کرنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ دیر کے سبب انصاف کی افادیت ہی ختم ہو کر رہ جائے۔
- زیادہ ہنسنے سے عمر کم ہوتی ہے۔ رُعب دبدبہ جاتا رہتا ہے اور موت سے غفلت ہو جاتی ہے۔
- جو عیب سے مطلع کرے وہ دُرست ہے۔
- طمع کرنا مفلسی اور بے غرض ہونا امیری ہے۔
- بدترین آوازیں دو ہیں راگ کی اور نوحہ کی۔
- کم بولنا حکمت، کم کھانا صحت کم سونا عبادت اور کم آمیزی میں عافیت ہے۔
- مشغولیت سے پہلے فراغت اور موت سے پہلے زندگی کو غنیمت جان۔

● اسلامی افواج جب عجمی علاقوں میں داخل ہوئیں تو آپ نے اس خطرہ کے پیشِ نظر ریگستان عرب کے صحراؤں کی گود میں پلے ہوئے جفاکش، بہادر اور محنتی مجاہدوں کو عجم کی ٹھنڈی ہوائیں میٹھے پانی اور سرسبز و شاداب مرغزار بہادری کے اوصاف سے محروم نہ کر دیں آپ نے خط میں لکھا۔ فوج کا ہر افسر اور سپاہی لازمی طور پر دن کا کچھ حصّہ دھوپ میں گزارے، حماموں میں نہ نہائیں گھوڑوں پر رکاب کے سہارے سوار نہ ہوں نرم و گداز کپڑے نہ پہنیں، ہر فوجی اپنے ساتھ تمام ضروری سامان یہاں تک کہ سوئی دھاگہ اور قینچی تک رکھے۔ آپ کا خبر رسانی اور جاسوسی کا محکمہ اس قدر موثر تھا کہ میدانِ جنگ کی ایک ایک حرکت سے آپ مطلع ہوتے تھے علامہ طبری نے آپ کے متعلق لکھا ہے۔ وکان عُمر لا یَخفیٰ علیہ شیئٌ عمر سے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی تھی۔

● آپ کی زندگی کا ایک رُخ یہ ہے کہ روم و شام پر فوجیں بھیجی جا رہی ہیں قیصر و کسریٰ کے سفیر باریاب ہو رہے ہیں خالدؓ و امیر معاویہ سے باز پُرس ہو رہی ہے سعد بن ابی وقاص، ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کے نام احکام و فرامین لکھے جا رہے ہیں اور دوسرا رُخ یہ ہے کہ بدن پر جو کُرتہ ہے اُسے چودہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ سَر پر پھٹا ہُوا عمامہ ہے۔ پاؤں میں ٹوٹی پھوٹی جوتیاں ہیں اور اس حالت میں بھی مشک اٹھا کر بیوہ عورتوں کے گھروں کا پانی بھرنے جا رہے ہیں یا کہیں زمین پر اینٹ سرہانے رکھ کر آرام کر رہے ہیں۔

● آپ کے گھر کا یومیہ خرچ دو درہم تھا۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ علاقہ شام سے واپس آئے تو آپ تنہا ہو کر لوگوں سے حالات دریافت کرنے لگے اس اثنا میں آپ ایک بڑھیا کے پاس سے گزرے۔ اور اس سے اس کا حال دریافت کرنے لگے۔ بڑھیا نے پوچھا عمرؓ کا کیا حال ہے؟ آپ نے کہا وہ ابھی شام سے واپس آئے ہیں۔ بڑھیا نے کہا۔ اللہ تعالیٰ میری طرف سے انہیں جزائے خیر نہ دے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیوں؟ بڑھیا نے کہا جب سے وہ خلیفہ

ہوئے ہیں مجھے بیت المال سے ایک پیسہ نہیں ملا آپ نے فرمایا عمر کو تیرا حال کیا معلوم؟ اس نے کہا۔ آپ نے یہ کیا کہا؟ جو شخص خلیفہ رسول ہو اور اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ مشرق و مغرب کے درمیان کیا ہو رہا ہے؟ بڑھیا کے یہ الفاظ سُن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور کہنے لگے اے عمر تجھ پر افسوس ہے تیری رعایا تجھ سے کیسے جھگڑتی ہے؟ ہر شخص تجھ سے زیادہ فقیہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس بڑھیا سے پوچھا کہ تو اپنی داد خواہی کتنے میں فروخت کر کے اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو سکتی ہے۔ میں عمر کو اس پر راضی کر لوں گا بالآخر جرح قدح کے بعد آپ نے بیس درہم میں اس کی داد خواہی خرید لی! رخصت ہونے کو تھے کہ حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما السلام علیک یا امیرالمومنین کہتے ہوئے آموجود ہوئے آپ نے تحریر اس طرح لکھی۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ تحریر ہے اس امر کے متعلق ہے کہ عمر نے فلاں بڑھیا سے اپنی ابتدائے خلافت سے اب تک اس کی داد خواہی بیس درہم میں خرید لی۔ اب اگر وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور دعویٰ کرے تو میں اس سے بری ہوں علی اور عبداللہ بن مسعود اس پر گواہ ہیں۔

- جب حضرت عمر کسی شخص کو گورنری یا ایسا کوئی دوسرا اہم منصب سپرد فرماتے تو صحابہ کے ایک گروہ کے سامنے اس کو تقرری کا پروانہ عنایت کرتے اور صحابہ کرام کو گواہ بناتے ہر عامل سے عہد لیا جاتا تھا کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا، باریک کپڑے نہ پہنے گا۔ چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا۔ اہل حاجت کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا۔ تقرری کے وقت عامل کے مال و اسباب کی مفصل فہرست تیار کر کے محفوظ کر لی جاتی تھی اور گاہے گاہے اس فہرست سے اس کے اسباب کا موازنہ کیا جاتا تھا۔
- تمام عمال کو حکم تھا کہ ہر سال حج کے موقع پر حاضر ہوں۔ حج کی تقریب سے اطراف واکناف کے لوگ موجود ہوتے تھے اسی موقع پر حضرت عمر اعلان فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو کسی

عامل کے خلاف کوئی شکایت ہو وہ پیش کرے۔ چنانچہ بعض اوقات عمال کے خلاف معمول معمولی شکایتیں پیش ہوتیں اور تحقیقات کے بعد انہیں رفع کیا جاتا آپ کے محکمۂ احتساب کے چیف محمد بن مسلمہ بلاخوف لومہ لائم عمال کا احتساب کرتے تھے۔ عیاض بن غنم عامل مصر کو جو کہ باریک کپڑے پہننے اور دروازے پر حاجب بٹھانے کے جرم میں ماخوذ ہو کر آئے تھے۔ آپ نے بالوں کا کرتہ پہنا کر بکریوں کا گلہ سپرد کیا کہ اسے چرائیں، یہاں تک کہ انہوں نے توبہ کی اسی طرح سعدؓ بن ابی وقاص کی ڈیوڑھی آپ کے حکم سے محمدؓ بن مسلمہ نے جلادی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے جہاں حکمرانی اور سلطنت کے لیے مثالی اصول وضع کیے بعینہ وہاں آپ نے اسلامی طرزِ معاشرت سادگی، تواضع، مساوات عدل اور اخوت کا پیکر بن کر ثابت کر دیا کہ دینِ فطرت میں حکمرانی دراصل خدمتِ خلق کا نام ہے۔ آپ کی مثالی زندگی ہر دور کے حکمرانوں کے لیے مشعل راہ ہے اے کاش! دنیا کے مسلمان حکمران اپنے اس عظیم قائد کی زندگی کو اپنا آئیڈیل بنا کر چلیں تو آج بھی وہ اپنے اپنے ممالک کو امن وسکون، خوشحالی ومسرت کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔

مُحدَّث خیرِ اُمم

تحریر

غُلام رسُول سعیدی

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ رُشد و ہدایت کے پیکر اور نگاہِ فراست کے مالک تھے انہوں نے فیضانِ رسالت سے تربیت پائی تھی حضور پر وحی اترنے کی کیفیت کو دیکھا تھا۔ رموزِ قرآن کے محرم اور اسرارِ وحی سے واقف تھے اسی وجہ سے افراد صحابہ تعداد انبیاء کے مطابق اور ان کے اوصاف کے حامل تھے اسی لیے حضور نے فرمایا میرے تمام صحابہ آسمانِ ہدایت کے ستارے ہیں تم نے ان میں سے جس کو بھی مقتدا بنا لیا وہ ہدایت پالیگا یہ سارے صحابہ ہی رسُول کا اُسوہ اور نبوت کی تعبیر تھے۔ اُن کا کردار نبی کا کردار اور ان کی زبان نبی کی زبان تھی مگر جس کو نویدِ فراست ملی جس نے موافقت وحی کا مرتبہ پایا جس کی زبان الہام و تحدیث کا مرکز بنی وہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پہلی اُمتوں میں محدَّث ہوتے تھے اگر میری اُمت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمر ہے ایک اور مرتبہ فرمایا تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ ہوتے تھے جو نبی تو نہ تھے مگر صاحبِ کلام تھے، اس اُمت میں اگر کوئی ایسا ہے تو وہ عمر ہے۔ (صحیح بخاری)

محدَّث کا مفہوم

مفہوم محدث کے بارے میں اہل علم کے متعدد اقوال ملتے ہیں۔ بعض نے کہا محدَّث

صاحب الہام کو کہتے ہیں توربشتی نے کہا محدث وہ شخص ہے جس کی رائے صائب اور ظن صادق ہو۔ ابو احمد عسکری نے کہا جس کے قلب پر ملاء اعلیٰ سے فیضان ہو اُسے محدث کہتے ہیں بعض نے کہا جس کی زبان ہمیشہ نطق بالصواب کرتی ہو وہ محدّث ہے۔ ابن التین نے کہا محدث صاحب فراست ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا ملہم بالصواب کو محدّث کہتے ہیں۔ ابن حجر عسقلانی نے ایک مرفوع روایت سے بتلایا، محدّث کی زبان سے ملائکہ کلام کرتے ہیں۔ ملا علی قاری نے کہا، محدث سے مُراد وہ شخص ہے جو کثرتِ الہام کے سبب درجۂ انبیاء سے واصل ہو۔ ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ محدث کے قلب و نظر پر ملاءِ اعلیٰ کا فیضان ہوتا ہے اس کا اجتہاد صحیح اور اس کا کلام صائب اور ربانی تائید سے مؤید ہوتا ہے۔

محدّث کا مصداق

اس اُمت میں محدّث ہے یا نہیں؟ جمہور کی رائے یہی ہے کہ ہے اور یقیناً ہے کیونکہ جب امم سابقہ میں محدّث ہوتے تھے تو خیر امم میں محدث کیوں نہ ہوگا۔ نیز پچھلی اُمتوں میں کسی ایک رُسول کی شریعت کی تفہیم کے لیے تسلسل اور تواتر کے ساتھ انبیاء آتے رہتے تھے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نبوت ختم کردی تو اللہ تعالیٰ نے نبی کی جگہ محدّث کو مقرر کردیا۔ پس تمام اولیاء محمدیین محدث ہیں لیکن اس گروہ کے سرخیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے نطقِ رسالت سے محدث کا لقب پایا ہے۔

موافقتِ خداوندی

حضرت عمر نے فرمایا میں نے اپنے رب کی تین اُمور میں موافقت کی ہے۔ ابنِ حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔ تین میں حصر کی وجہ ان کی شہرت ہے۔ ورنہ موافقت کی تعداد پندرہ ہے۔ صاحب ریاض نے کہا ان میں سے نو لفظی، چار معنوی اور دو بطور توریہ کے ہیں۔ ابن حجر مکی نے کہا ایسی آیات سترہ ہیں اور سیوطی نے تتبع کر کے ان کا عدد بیس سے زائد تک پہنچا دیا ہے بعض

کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) ایک مرتبہ مقام ابراہیم کو دیکھ کر حضرت عمر نے کہا حضور ہم مقام ابراہیم کو مصلی نہ بنالیں؟ تو یہ آیت نازل ہوگئی وَاتَّخِذُوا مِن مقام ابراھیم مُصَلّٰی

مقام ابراہیم کو مصلی بنالو۔

(۲) احکام حجاب سے پہلے حضرت عمر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ آپ کی ازواج کے سامنے ہر قسم کے لوگ آتے ہیں آپ ازواج کو پردہ کا حکم دے دیں تو یہ آیت نازل ہوگئی۔ واذا سألتموھن متاعا فاسئلوھن من وراء حجاب

جب تم ازواج نبی سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کی اوٹ سے مانگو (بخاری)

(۳) حضورؐ اپنی کنیز ماریہ قبطیہ کے پاس جایا کرتے تھے جب بعض ازواج کو اس پہ غیرت آئی تو حضرت عمر نے ان سے کہا اگر حضور نے تمہیں طلاق دے دی تو اللہ حضور کو تم سے بہتر ازواج عطا کردے گا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ عسی ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجا خیرا منکن قریب ہے کہ اگر وہ تم کو طلاق دے دیں تو اللہ انہیں تم سے بہتر ازواج عطا کردے گا۔ (بخاری)

(۴) اسیران بدر کے بارے میں بعض لوگوں نے فدیہ کی رائے دی۔ اس کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے قتل کی تھی اور اس وقت رائے عمر پر تنزیل ہوگئی لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذ تم عذاب عظیم اگر تقدیر الٰہی میں پہلے سے یہ مقرر نہ ہوتا کہ اجتہادی خطا پر مواخذہ نہیں ہوتا تو فدیہ لینے پر تمہیں عذاب عظیم ہوتا۔ (مسلم)

(۵) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہاں جوئے اور شراب کا دور عام تھا حضرت عمر حضور کی خدمت میں آئے اور عرض کیا حضور ہمیں جوئے اور شراب کے بارے میں ہدایت دیں کیونکہ یہ مال اور عقل کو ضائع کرنے والی چیزیں ہیں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر یہ آپ سے شراب اور جوئے کا حال پوچھتے ہیں۔ کہئے ان میں بڑا گناہ ہے (آلوسی)

(۶) ایک دفعہ ایک شخص نے شراب کے نشہ میں نماز پڑھا دی اور قرآن غلط پڑھا۔
اس موقعہ پر حضرت عمر نے حضور سے پھر گزارش کی تو یہ آیت نازل ہوئی لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سکاریٰ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ (ابوبکر جصاص)

(۷) اس کے بعد حضرت عمر بار بار خدا سے دعا کرتے رہے اے اللہ شراب اور جوئے کے بارے میں کوئی واضح وحی نازل فرما۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ شراب اور جوا بت اور پانسے ناپاک ہی ہیں لو ان سے بچو۔ (ابوداؤد و ترمذی)

(۸) جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم نے انسان کو کیچڑ والی مٹی سے پیدا کیا تو حضرت عمر نے بے ساختہ کہا فتبارک اللہ احسن الخالقین چنانچہ انہی لفظوں سے یہ آیت نازل ہو گئی۔

(۹) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغی مصالح کے پیش نظر عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی تو حضرت عمر بار بار کہتے رہے حضور آپ منافق پر نماز پڑھیں گے اس کے بعد یہ آیت نازل ہو گئی ولا تصل علی احد منھم مات ابدا آئندہ آپ کبھی بھی منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں (سیوطی) یہاں حضرت عمرؓ کی رائے کا صحیح ہونا عام منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کے بارے میں ہے اور حضور کا ارادہ تبلیغی ضروریات کے سبب بالخصوص عبداللہ بن ابی کے بارے میں تھا اور یہ امر صحیح تھا۔ ورنہ وحی کے ذریعہ حضور کو اس کی نماز جنازہ سے روک دیا جاتا حضور کی اسی نماز کی وجہ سے عبداللہ بن ابی کی قوم کے ایک ہزار افراد اسلام لے آئے تھے اور اس نماز سے یہی سرکار کا منشا تھا۔ الغرض عمر کی رائے کا صحیح ہونا حضور کے مقابلہ میں نہ تھا۔ کیونکہ حضور کا عمل بالخصوص عبداللہ بن ابی کے بارے میں تھا اور قرآن نے عام منافقین کا حکم بیان کیا ہے۔

(۱۰) اسی نماز کے سلسلہ میں حضرت عمر نے عرض کیا ان کے لیے استغفار کرنا نہ کرنا برابر ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم ان کے حق میں برابر ہے۔ آپ استغفار کریں یا نہ کریں۔ (ابوعبداللہ شیبانی)

(۱۱) میدان بدر میں جانے کے لیے حضور نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ بعض نے منع کیا اور حضرت عمر نے جانے کا مشورہ دیا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کما اخرجک ربک من بیتک بالحق وان فریقا من المومنین لکارھون تمہارا رب تمہیں گھر سے (بدر کی طرف) لے گیا اور بے شک مسلمانوں کی ایک جماعت کو یہ ناپسند تھا (طبرانی)

(۱۲) جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بعض منافقین نے تہمت لگائی تو حضرت عمر نے کہا سبحانک ھذا بہتان عظیم پھر انہی لفظوں سے یہ آیت نازل ہوگئی (طبرانی)

(۱۳) ابتداء میں رمضان کی راتوں کا بھی روزہ ہوتا ہے ایک مرتبہ حضرت عمر سے رات کا روزہ ٹوٹ گیا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ احل لکم لیلۃ الصیام الرفث اب تمہارے لیے رمضان کی راتیں حلال ہیں (ابن حجر مکی)

(۱۴) ایک اسرائیلی نے حضرت عمر سے پوچھا تم پر وحی کون لاتا ہے؟ فرمایا جبرئیل کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ فرمایا جو اللہ فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہے وہ جان لے کہ اللہ بھی اس کا دشمن ہے اس جواب کی تائید میں یہ آیت نازل ہوگئی من کان عدو اللہ وملائکتہ ورسلہ وجبریل ومیکایل فان اللہ عدو للکافرین۔ (طبرانی)

(۱۵) ایک منافق نے حضور کے فیصلہ پر حضرت عمر کے فیصلہ کو ترجیح دی آپ نے اس کو قتل کر دیا۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ عمر نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا۔ آپ نے حضور سے عرض کیا حضور جو آپ کا فیصلہ نہ مانے وہ مسلمان کب ہے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک آپ کے رب کی قسم وہ مسلمان ہی نہیں جو آپ کا فیصلہ نہ مانے۔ (فخر رازی)

(۱۶) ایک مرتبہ حضرت عمر سو گئے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے بغیر اجازت داخل ہو کر آپ کو جگا دیا۔ آپ نے دعا کی اے اللہ بلا اجازت گھروں میں داخلہ کو حرام کر دے تو یہ آیت نازل ہوئی یاایھا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلمو

علی اھلھا اے ایمان والو! بغیر اجازت دوسروں کے گھروں میں نہ داخل ہو۔

(سیوطی)

ان شواہد سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ حضرت عمرؓ کی زبان وحی و کینہ کی ترجمان تھی۔ حضرت عمرؓ کی زبان پر جب بھی کوئی کلمہ آیا وہ ہمیں حق درست تھا اور اسکی فکر و رائے وحی کے موافق اور کلام الٰہی کے مطابق تھی۔

فراستِ عمر سے اصولِ اجتہاد کا استخراج

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف مقدمات کا فیصلہ اس بالغ نظری اور صحیح فکر کے ساتھ کیا جس سے صرف ان جزوی معاملوں پر ہی اثر نہیں پڑا بلکہ ان فیصلوں سے فکر و اجتہاد کے اصول معلوم ہوئے اور اُمت کے لیے استنباط احکام اور استخراج مسائل کی راہیں کھل گئیں۔ ان تمام واقعات کا احصار تو بہت مشکل ہے البتہ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں یہ معاملہ لایا گیا کہ مطلقہ عورت کو رہائش اور خرچہ ملیگا یا نہیں! آپ نے فیصلہ کیا کہ ملے گا۔ اس وقت فاطمہ بنت قیس نے یہ روایت کی کہ مجھے میرے خاوند نے طلاق دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تیرے لیے کوئی نفقہ اور سکنی نہیں حضرت عمر نے جواب میں فرمایا ہم کتاب اور سنت کو محض ایک عورت کے قول کی بنا پر نہیں چھوڑ سکتے۔ خدا جانے وہ سمجھ نہ سکی یا بھول گئی۔

(ابوبکر جصاص)

اس فیصلے سے یہ اُصول معلوم ہُوا کہ خبر واحد سے کتاب اور سنت متواترہ کے حکم کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہ نے اکثر احکام اسی اُصول سے مستنبط کیے ہیں۔

ملی شعائر کا تحفظ

عہدِ ابوبکر میں بہت سے قراء اور حفاظ جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے۔ اس وقت

حضرت عمر سیدنا ابوبکر کے پاس آئے اور کہا مجھے خوف ہے کہ اس طرح ایک ایک کر کے کہیں سارے حافظ اور قاری فوت نہ ہو جائیں اور قرآن ہمارے درمیان نہ رہے اس لیے آپ تمام قرآن کو ایک جگہ جمع کر کے محفوظ کر دیں حضرت ابوبکر نے کہا میں وہ کام کیسے کر لوں جسے رسول اللہ نے نہیں کیا۔ آپ نے جواب میں کہا رب کعبہ کی قسم اس کام میں خیر ہے۔ آپ یونہی بار بار فرماتے رہے حتیٰ کہ اللہ نے ابوبکر کے دل میں بھی وہ روشنی پیدا کر دی جو اس سے پہلے عمر کو عطا کی تھی پھر حضرت ابوبکر نے اس عظیم کام کے لیے قرار صحابہ کی ایک کمیٹی مقرر کی اور تمام قرآن کو ایک جگہ جمع کروا دیا۔ (بخاری)

اللہ نے عمر کو جو ملکوتی زبان اور تعمیری فکر عطا کی تھی۔ جس کام کے لیے اسے محدث اور ملہم بنایا تھا اسی وصف سے عمر نے اس موقعہ پر حفاظتِ قرآن کی تحریک اور آج جو اُمتِ مسلمہ کے ہاتھوں میں صحیفہ قرآن موجود ہے۔ یہ صرف عمر کی نظرِ صائب اور فکرِ راسخ کا ثمرہ ہے۔

اوائل عہدِ فاروقی تک لوگ الگ الگ تراویح پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمر نے انہیں امام واحد کی اقتداء میں جمع کر دیا اور سب مل کر جماعت سے تراویح پڑھنے لگے اور اس میں ختمِ قرآن کا اہتمام کر لیا گیا۔

(بخاری و بیہقی)

بظاہر یہ صرف اتنی سی بات تھی کہ حضرت عمر نے تراویح کو با جماعت کرا دیا۔ لیکن حقیقت میں اس کے بہت عظیم اور دُور رس فوائد پنہاں تھے بعض ازاں یہ ہیں۔

(۱) تراویح میں قرآن سنانے کے شوق سے لوگ بکثرت قرآن حفظ کرتے ہیں ایک مسجد میں تراویح ہو تو کئی حافظ قرآن سناتے ہیں اور بہت سے حافظ قرآن سنتے ہیں اور تجربہ سے یہ امر ثابت ہے کہ جو حافظ قرآن سنانا یا سننا چھوڑ دے اُسے قرآن بھول جاتا ہے اور آج دنیا میں جو حفاظِ قرآن کی اس قدر کثرت ہے یہ سب تراویح کی برکت اور فراستِ عمر کا صدقہ ہے۔

الغرض قرآن کریم کے محفوظ رہنے کی صرف دو شکلیں ہیں یا صورتِ مصحف میں

میں یا سینۂ حافظ میں اور قرآن مصحف میں محفوظ عمر کی فکر سے ہوا اور سینہ میں محفوظ عمر کی فراست سے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان میں جبریل کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے تھے۔ تراویح کے سبب اب ہر سال رمضان میں حافظ اور سامع قرآن کا دور کرتے ہیں اور حضور کی یہ سنت تازہ رہتی ہے۔

سال میں ایک مرتبہ پورا قرآن سُن لینے سے یہ موقعہ ملتا ہے کہ ہم اپنی ایک سال کی ڈائری کو دستور قرآن کے آئینہ میں دیکھ سکیں اور یہ فیصلہ کر سکیں کہ ہم نے قرآن کے کتنے احکام کی تعمیل کی ہے اور کتنے احکام کی مخالفت اور پھر قرآن کی روشنی میں ہم اپنے کردار کے بگڑے ہوئے خد و خال کو درست کر سکیں۔

حضرت عمر ہمیشہ اُمت کی تعمیر اور ملت کے استحکام کی لگن میں رہتے تھے۔ آپ کی فراست نے اُمت کو ہجری تقویم دی شراب نوشی پر اسی کوڑے حد مقرر کی۔ خلیفۂ رسُول کے لمبے چوڑے اضافی نام کی جگہ امیر المومنین کا لقب اختیار کیا، امیر کے لیے بیت المال سے وظیفہ کی ابتدا کی۔ ہجو پر تعزیر مقرر کی۔ رات کو اُٹھ کر احوال رعایا کے تجسّس کا عمل جاری کیا۔ تادیب کے لیے درہ ایجاد فرمایا۔ اطرافِ مملکت میں قضاۃ کا تقرر کیا۔ مساجد میں قنادیل کی روشنی کا انتظام کیا اور ایسے بہت کام کیے۔

حضرت عمر کی قد آور اور تاریخ ساز شخصیت کے سامنے ہر فراز نشیب معلوم ہوتا ہے۔ عمر فاروق کی عبقری نظر کا یہ عالم تھا کہ مدینہ میں دوران خطبہ بھی نہاوند کے امیر لشکر کو ہدایات دیتے رہتے تھے۔

دشت و جبل کی وسعتیں نگاہ عمر کے سامنے سمٹ جاتی تھیں۔ جزیرۂ عرب سے لے کر ساحل مکران تک تمام حکام ان کے رعب سے سہمے ہوئے رہتے تھے۔ حضرت عمر کی فہم و فراست اور عقابی نظر نے اس اُمت کو بہت کچھ دیا ہے۔ عہد عمر کی تہذیب قانون معیشت عوام کی خوشحالی اور فتوحات کی وسعت دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو ایک اور عمر مل جاتا تو آج دنیا میں اسلام کے سوا کوئی مذہب نہ ہوتا۔

فاروق اعظم

اور

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

تحریر: مولانا محمد معراج الاسلام بھیرہ

قدسیوں کی نورانی بستی میں ایک دبستانِ محبت کھلا، تشنہ کامانِ حسنِ ازل، ہمراہیانِ قافلۂ شوق، رہ نوردانِ کوچۂ محبت، وارفتگانِ جذبۂ اُلفت، دلدادگانِ جمالِ حقیقت، مشتاقانِ دیدیار اور قلب و رُوح کی گہرائیوں میں ایک نامعلوم خلاء اور دل فگار محرومی کا احساس کرنے والے ازلی خوش بخت اس میں داخلہ کے لیے ٹوٹ پڑے۔ سعادت یافتگانِ یوم الست کا تانتا لگ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس زرالے اور نورانی مکتبِ عشق میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ اُن عشاق کو داخلہ ملا جو خوش تر و زیبا تر و محبوب تر اور منتخب روزگار تھے۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی اس مکتبِ مبارک کے ہونہار اور لائق و فائق طلباء اور جلیل القدر فرزندوں میں سے تھے آپ کا شمار اُن ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا جن پر پورے مکتب بلکہ صاحب مکتب کو بھی ناز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محبت پاش نگاہیں ایک دوسرے کی طرف اُٹھتی رہتی تھی۔

سرکارِ مدینہ کی ذاتِ اقدس سے اس عقیدت و محبت کے اَن گنت واقعات تاریخ کی زینت ہیں۔

یہاں آپ کی حیاتِ عشق کے چند الواب پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہوسکے آپ کس پائے کے عاشق صادق اور محب جانباز تھے آپ کی حیاتِ عشق میں ساری اُمت کے لیے درسِ عشق پنہاں ہے۔

(۱) احادیث کی کتابوں میں ایک واقعہ کا ذکر ملتا ہے جو ایلاء کے نام سے مشہور ہے۔

ہوا یہ کہ کسی نے اطلاع دی، سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ازواج پاک کو طلاق دے دی ہے اور اب آپ سب سے ناراض ہوکر بالاخانے پر تشریف لے گئے ہیں۔

بالاخانے تک گئے، غلام سے کہا، اندر جاکر اجازت مانگے۔ مگر اُس نے واپس آ بتایا کہ حضور علیہ السلام نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر مایوس ہوکر اپنے ساتھیوں میں آکر بیٹھ گئے آنکھیں بہتی رہیں، دل سلگتا رہا اچانک پھر غلبہ حال ہوا، دوڑ کر غلام کے پاس گئے اور اجازت مانگنے کے لیے اندر بھیجا۔

اِس دفعہ بھی جواب عطا نہ ہوا،

پھر آکر بیٹھ گئے بے قراری حد سے بڑھ گئی ذہنی صدمہ نے جسم و رُوح کو جھنک کے رکھ دیا تیسری دفعہ ہمت کر کے پھر اُٹھے غلام کو اندر بھیجا اور اُونچی آواز میں عرض کی۔

یا رُسول اللہ! میں حفصہؓ کی سفارش کرنے نہیں آیا۔ اگر حکم ہو تو اس کا سر آتار کر لے آؤں میں تو فقط باریابی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

اجازت مل گئی۔ آہستہ آہستہ ادب سے قدم اُٹھاتے اندر پہنچے اور سر جھکا کر کھڑے ہوگئے، بارگاہِ محبت و ناز میں بیٹھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ہولے سے پوچھا

"میرے آقا! ازواج پاک کو طلاق دے دی ہے؟

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔
"نہیں"
یہ روح پرور خوش خبری آپ کے لیے دنیا وجہان کی نعمتوں سے بڑھ کر تھی،
خوشی سے بے قابو ہو گئے اور بے ساختہ منہ سے نکل گیا، اللہ اکبر!
(۲) دیکھا چٹائی بچھی ہے جس پر کھجور کی چھال سے بھرا ہوا تکیہ پڑا ہے ایک طرف
رنگ سازی کے کام آنے والے پتوں کا ڈھیر لگا ہے اور اوپر مشکیزہ لٹک رہا ہے۔
یہ تھی کل دنیاوی متاع جس میں کونین کا شہنشاہ بڑے استغناء سے بیٹھا تھا۔
عاشق کی نگاہ محبوب کے مقدس جسم پاک کی طرح اُٹھ گئی جس پر حریر کی ملائمت
اور پھولوں کی نزاکت قربان ہوتی تھی اس پر چٹائی کے واضح نشان دیکھ کر دل کی کیفیت
بدل گئی، روح ودماغ پر غم واندوہ کے سائے چھا گئے اور ناقابل برداشت صدموں
کے تُند و تیز جھٹکوں نے انگ انگ کو ہلا ڈالا بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔
اور جذبات الفاظ میں ڈھل گئے۔
"اے آقا یہ کیا شان استغناء ہے۔ دنیا کے بادشاہ تو عیش وعشرت میں
زندگی گزار رہے ہیں، اور دونوں جہاں کا بادشاہ اس حال میں رہ رہا
ہے آپ بھی دعا کریں تاکہ وسعت حاصل ہو اور زندگی کے دن فراغت و
ترفہ میں کٹیں۔
حضور علیہ السلام نے حقیقت سے آگاہ فرمانے اُن کی سوچ کا رُخ موڑنے
اور تسلی دینے کے لیے فرمایا۔
"اے عمر! کیا تمہیں یہ پسند نہیں، کہ دنیا دار بادشاہ اسی جگہ اپنی حسرتیں
نکال لیں اور آخرت میں اُن کے لیے کچھ حصہ نہ ہو۔ اور ہم اس صبر و قناعت
کے بدلے لازوال ابدی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں؟
فاروق اعظم کی سمجھ میں بات آگئی، انہوں نے جس نیک نیتی اور محبت سے مجبور
ہو کر بارگاہِ رسالت میں یہ عرض کی تھی، اس میں گرفت کے قابل کوئی بات نہ تھی مگر ان کی

محبت نے یہ بھی گوارا نہ کیا اور حضور کی بارگاہ میں عرض کی۔

میں نے جو یہ بات کہنے کی جسارت کی ہے اُس کے لیے استغفار کر دیجیے، کہ اللہ تعالیٰ میری یہ لغزش معاف فرمائے۔

(۳) ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک یہودی اور منافق کا جھگڑا ہو گیا۔ ثالث کی ضرورت پیش آئی، یہودی حق پر تھا، بولا۔

"میں مسلمانوں کے نبی کو ثالث تسلیم کرتا ہوں وہ جو فیصلہ دیں گے مجھے منظور ہوگا"

منافق جانتا تھا اس دربار میں حق و انصاف پر مبنی فیصلے ہوتے ہیں اگر اس عدالت میں مقدمہ گیا تو یہودی کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا اس لیے بولا۔

میں کعب بن اشرف یہودی کو ثالث مانتا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ کعب رشوت خور اور بد دیانت رئیس ہے رشوت لے کر اس کے حق میں فیصلہ دے دے گا مگر یہودی نہ مانا مجبور ہو کر منافق کو حضور علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہونا پڑا بیان لے کر قاضی برحق نے منافق کے خلاف فیصلہ دے دیا۔

یہودی بہت خوش ہوا مگر منافق بولا! میں یہ فیصلہ تسلیم نہیں کرتا عمرؓ جو فیصلہ دیں گے مجھے منظور ہوگا۔

یہودی بادلِ ناخواستہ ساتھ ہو لیا۔ درِ فاروقؓ پر حاضر ہو کر مقدمہ پیش کیا گفتگو کے دوران میں یہودی نے بتا دیا کہ پہلے یہ مقدمہ دربار نبوی میں پیش ہو چکا ہے اور آپ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا ہے۔

جناب فاروقؓ نے اس منافق سے پوچھا۔

کیا یہ درست ہے؟

منافق نے اقرار کیا تو آپ نے اس کا سر اڑا دیا۔

فرمایا۔ تیرا فیصلہ یہ ہے۔

(۴) جب حضور علیہ السلام کا وصال ہوا یہ صدمہ چونکہ محبت کے مطابق نہ تھا اس لیے

قابو میں نہ رہے اور بے خودی کے عالم میں تلوار نکال کر کہا جو کہے گا میرے نبی انتقال
فرما گئے ہیں، میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔

بڑی دیر بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سمجھانے اور دلاسا دینے سے
آپ ہوش و حواس میں آئے۔ آپ اپنے محبوب نبی علیہ السلام کے سرہانے کھڑے ہو گئے
اور رندھے ہوئے لہجے میں اپنے بے قرار اور محبت سے لبریز جذبات کا اظہار ان
الفاظ میں کیا۔

یا رسول اللہ! میرے ماں باپ نثار، جو عظمتیں اور قربتیں آپ کو نصیب
ہوئیں وہ کسے ملی ہوں گی قدرت نے وہ تمام خصوصیتیں اور فضیلتیں آپ کو
عطا فرما دی تھیں جو دیگر انبیائے کرام میں فرداً فرداً موجود تھیں۔
میرے عظیم اور بے مثال آقا۔ آپ کی کن کن خوبیوں کا تذکرہ کروں۔
اگر آپ اپنے ہی مرتبہ کے لوگوں میں بیٹھنا پسند فرماتے تو ہم مسکینوں کے
ساتھ نہ بیٹھتے۔ اگر آپ اپنی ہی شان کے خاندان میں نکاح کرنا پسند فرماتے تو ہم میں نکاح نہ فرماتے
اگر آپ اپنے ہی جیسوں کے ساتھ کھانا پسند فرماتے تو ہمارے ساتھ نہ کھاتے
مگر آپ کے خلقِ عظیم کا یہ مظاہرہ تھا کہ آپ ہمارے ساتھ بیٹھے ہم میں نکاح بھی
فرمائے، ہمارے ساتھ مل کر کھایا، ساتھ چلے، زمین پر بیٹھے یہ سب آپ کی تواضع
کا کمال تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم

دورِ خلافت

فاروق اعظم کی یہ شانِ محبت ہر دور میں قائم رہی۔ رسم عشق کو آپ نے خوب نبھایا
اور محبت پروری کا حق ادا کر دیا۔ اپنے رشتے پیچھے پھینک دیئے مگر جن قدسی نفوس
کا تعلق ذاتِ اقدس رسالت کے ساتھ تھا۔ انہیں سب پر فوقیت اور ترجیح دی اور کسی
اعتراض کی پروا نہ کی۔ ایسے محبت افروز واقعات آپ کی قلبی کیفیت کے ترجمان اور لازوال
عشق کے آئینہ دار ہیں۔

(۱) یمن سے چادریں آئیں، اپنی حسین بافت اور نزاکت اور خوبصورتی کی وجہ سے یہ سوغات

تصور کی جاتی تھیں، اتفاق ایسا ہوا کہ سب تقسیم ہو گئیں اور شہزادۂ خاتون جنت حضرت امام حسن اور نورِ نظر حیدر کرار جناب امام حسین رضی اللہ عنہ کو نہ ملیں، جب جناب امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی تو بے قرار ہو گئے۔ فوراً یمن سے چادریں منگوانے کے انتظامات کئے جب یہ خوبصورت چادریں دونوں شہزادوں نے اوڑھیں تب آپ کو چین آیا۔

(۲) آپ کے فرزند جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے آئے حضرت امام حسن اور امام حسین بھی ان کے ہمراہ تھے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس وقت کاروبارِ سلطنت میں مصروف تھے اس لیے اپنے فرزند کو اجازت نہ دی وہ لوٹ گئے اور ساتھ ہی دونوں شہزادے بھی چلے گئے جب آپ کو پتہ چلا تو فوراً سارے کام چھوڑ دیئے اور انہیں واپس بلایا اور پوچھا۔

"آپ واپس کیوں چلے گئے تھے؟"

انہوں نے جواب دیا۔

"جب آپ نے بھائی عبداللہ کو اجازت نہ دی تو ہم نے بھی مخل ہونا پسند نہ کیا"

آپ نے کہا، "عزیزان! کام آپ سے اہم نہیں اور نہ کوئی آپ کی مثل ہے آپ جب چاہیں تشریف لے آیا کریں۔ خلافت کا یہ تاج آپ ہی کی بدولت اس سر کی زینت ہے۔

(۳) آپ کے دل میں اپنے محبوب علیہ السلام کے رشتہ داروں کی کیا توقیر و عظمت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک دفعہ مدینہ میں قحط پڑ گیا۔ آپ نے حضور علیہ السلام کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو آگے کیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ کے توسل سے یوں دعا کی۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا کُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ نَبِیِّنَا صلی اللہ علیہ وسلم فَتَسْقِیْنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا فَاسْقِنَا [۱۲۷]

(بخاری)

اے اللہ! ہم اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پیش کیا کرتے تھے اور تُو ہمیں بارانِ رحمت عطا فرمایا کرتا تھا اب ہم تیرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا وسیلہ پیش کرتے ہیں۔ ہمیں بارش دے۔
جب بھی فاروقِ اعظمؓ یہ دعا کرتے تو بارش ضرور ہوتی۔ اللہ تعالیٰ محبّت سے معمور دل سے نکلی ہوئی دعا ردّ نہ فرماتے۔

فاروقِ اعظم اور اہلِ بیت رض

تحریر

پیر محمد کرم شاہ

اللہ تعالٰی کے محبوب، رحمت و محبت کے رسول، اخوت و مروّت کے داعی صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے جزیرۂ عرب کا آتش کدہ گلزارِ خلیل بن گیا۔ جہاں حسد و نفرت کے انگارے دہک رہے تھے وہاں الفت و ایثار کے پھول کھل اٹھے، جہاں فتنہ و فساد کی آندھیاں چل رہی تھیں وہاں انس و پیار کی بادِ نسیم اٹکھیلیاں کرنے لگی، خود بینی و خود پرستی کی جگہ ایثار و خلوص کا سکہ رواں ہوگیا، جہاں قدم قدم پر فسق و فجور کے عفریت زادڈھیر لگے تھے وہاں عفت و پاکبازی کے چمن آباد ہوگئے، جہاں خدا فراموشی کی ظلمتیں چھا رہی تھیں وہاں ذکرِ الٰہی کی قندیلیں فروزاں ہوگئیں۔

یہ انقلاب، بابرکت انقلاب، ہمہ گیر انقلاب کیوں اور کیسے رونپذیر ہوا، اس لیے کہ اس انقلاب کا داعی، حسن و جمال کا مرقع زیبا تھا۔ وہ انسانیت کے مقامِ رفیع سے کماحقہٗ آگاہ تھا۔ انسانوں کے فکر و عمل میں جو المناک بگاڑ رونما ہوا تھا اس سے اسے ازحد دُکھ اور رنج تھا۔ ان خرابیوں کو دیکھ کر اس کے دل میں حقارت یا انتقام کے جذبات نہیں بلکہ

ہمدردی اور خیر اندیشی کے تعمیری جذبات امڈ آئے تھے۔

اپنے حسن دلنواز سے، اپنے کمالات روح پرور سے، اپنی خوئے عفو و کرم سے، اپنی سیرت طیبہ کی تابانیوں سے اس نے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے والوں کے دلوں کو ہر قسم کے رذائل سے پاک کر دیا اور انھیں محبت کے بادۂ گلفام سے سرشار کر دیا۔ یہ محبت وہ نہ تھی جس کی علامت آہ سرد و رنگ زرد بتائی گئی ہے، یہ وہ محبت تھی جس میں خلوص و ایثار کی چمک تھی، جس کے حوصلے خیبر شکن، جس کی ہمت باطل افگن اور جس کے عزم کی تپش سے فولاد بھی پگھل جاتا تھا، اسی محبت نے ان کو بھائی بھائی بنا دیا تھا، اسی محبت نے ان کے دلوں میں ہمدردی کا وہ لطیف اور توانا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ اگر ایک کے پاؤں میں کانٹا چبھتا تھا تو دوسرے کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ اگر ایک کو کوئی گزند پہنچتی تو دوسرا تڑپ اٹھتا تھا، اسی الفت و موانست کی کیفیت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا۔ (پس اللہ تعالیٰ نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا اور اس کی مہربانی سے تم بھائی بھائی بن گئے۔)

محمد رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کے درویشوں کے پاس یہی سازو سامان تھا۔

ان کے دامن میں ایک ایسی دولت تھی جس کی ہر ملک کے انسانی معاشرہ کو ضرورت تھی اور یہ قدسی صفت انسان جہاں گئے بڑی دریا دلی سے اس دولت کو لٹاتے گئے۔

ان کی اس محبت کا مرکز ذات حبیب کبریا علیہ اطیب التحیۃ واجمل الثنا تھی۔ یہ اس کے حسن و کمال کے دیوانے تھے، انھیں ان گلیوں سے پیار تھا جو ان کے محبوب کے

خرامِ ناز سے مشرف تھیں۔ انھیں ان در و دیوار سے عقیدت تھی جہاں ان کا دلربا اقامت گزیں تھا، وہ پانی جو اس کے جسم اطہر کو چھو جاتا تھا فرطِ شوق سے وہ اسے اپنے چہروں پر اور اپنے سینوں پر مل لیا کرتے تھے۔ اسی کے باعث ان کے چہرے رشکِ آفتاب اور ان کے سینے مطلعِ انوار تھے۔

آج کے اس پُر آشوب اور پُر خطر دور میں، جب کہ ہم ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ گئے ہیں۔ وقت کا اہم تقاضا ہے کہ اسی درسِ محبت کی تلقین کی جائے، دل کے آئینہ پر بیگانگی اور نفرت کا جو غبار جم گیا ہے اسے صاف کیا جائے۔ ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے میں ہم نے کمال کر دکھایا، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، اب تو باز آجائیں، وہ امڈتے ہوئے طوفان اگر ہمیں ان کی گھن گرج بھی سنائی نہیں دے رہی جو ہمیں بہالے جانے کے لیے بجلی کی سی سرعت اور رعد کی سی تندی سے بڑھتے آرہے ہیں، کیا ہم بینائی اور سماعت دونوں سے تو محروم نہیں ہو گئے؟

یہ تندی، یہ تلخی، یہ بدگمانی اور غلط فہمی اسلام کے بدخواہوں اور ہمارے دشمنوں کی تلبیس و تزویر کا نتیجہ ہے۔ ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی انہی کی فراہم کردہ عینک سے کرتے ہیں اس وجہ سے وہ نورانی عہد بھی گدلایا ہوا نظر آتا ہے۔ جب آفتابِ محمدی کا جلوہ بار تھا۔ اس کے نور سے بلندیاں اور پستیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ جب چہرے بھی روشن تھے اور نورِ حق سے دل بھی منور۔ جو لوگ اس زہر آلود پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر حیاتِ انسانی کے اس تابناک روزِ سعید کو دیکھتے ہیں انھیں مطلع غبار آلود ہی نظر آتا ہے اور ہادیٔ برحق صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے آغوشِ تربیت میں پروان چڑھنے والے قدسی صفات لوگوں کا کردار بھی گھناؤنا دکھائی دینے لگتا ہے۔ (نعوذ باللہ) ہمیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اغیار کے ساتھ نیکی اور مروت تو

بڑی دور کی بات ہے اور ان کا برتاؤ تو اپنوں کے ساتھ بلکہ اپنے نبی کے خاندان کے ساتھ بھی غیر منصفانہ ہی نہیں سنگدلانہ تھا۔

تعجب ہے کہ ہم قرآن کریم کو علیم و خبیر خدا کا کلام یقین کرتے ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس قرآن میں ہم بار بار پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ جو ظاہر و باطن کو حال و مستقبل کو جاننے والا ہے وہ فرماتا ہے کہ میرے محبوب کی یہ امت خیر الامم ہے۔ مہاجرین و انصار کے لیے اجر عظیم اور فردوس بریں کی نوید جانفزا ہے، ان کے سروں پر لقد رضی اللہ عن المومنین کا تاج زرنگار سجایا جا رہا ہے، لیکن ہماری سادگی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دشمنوں، انہی دشمنوں جن کی صلیب کو ہلال نے سرنگوں کر دیا تھا، جن کے آتش کدوں کو اسلام کے ابر رحمت نے ٹھنڈا کر دیا تھا، کے پروپیگنڈے کو درست ماننے لگتے ہیں یہاں تک کہ سارے ارشادات ربانی اور آیات قرآنی اور ارشادات ربانی بھی ہمارے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارے دشمن کا پروپیگنڈا حق اور سچ ہے تو پھر کلام الٰہی کی صدہا آیات غلط اور جھوٹی ہو جائیں گی۔ العیاذ باللہ۔

اور لطف یہ ہے کہ جس نے اسلام کی جتنی زیادہ خدمت کی اعتراضات کی بوچھاڑ زیادہ اسی پر ہوئی۔ اسلام کی سطوت کا پرچم جس نے زیادہ اونچا لہرایا اُسی کو اس معاندانہ افترابازی کا زیادہ ہدف بننا پڑا۔ خلفائے راشدین نے اپنے اپنے مبارک زمانہ میں اسلام کی جو خدمات جلیلہ انجام دیں ان کی نظیر نہیں ملتی، لیکن ستم یہ کہ وہی سب سے زیادہ موردِ الزام ٹھہرے اور انہی پر من گھڑت جھوٹے الزامات تراشے گئے!

اس طریقہ کار سے دشمن دو فائدے حاصل کرنا چاہتا تھا ایک یہ کہ خود مسلمانوں میں اختلاف و انتشار کا دروازہ کھل جاتے اور وہ چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں میں بٹ

کر کمزور ہو جائیں دوسرا یہ کہ دنیا بھر کے پیاسے اپنی تشنہ لبی کا علاج کرنے کے لیے غول در غول اس چشمۂ شیریں کی طرف اُمڈے چلے جا رہے تھے وہ رک جائیں جب انھیں یہ سنایا جائے گا کہ اس نبی کے اولین شاگردوں کا یہ حال ہے تو وہ اس سے دور رہنے میں ہی اپنی عافیت خیال کریں گے۔

حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اولین شاگردوں اولین مرید اور اوّلین فیض یافتہ صحابہ کرام آپس میں کس طرح شیر وشکر تھے، ان کی محبّت و مودّت کے رشتے کتنے مضبوط تھے۔ یہ موضوع بڑا شیریں، سرور انگیز اور روح افزا ہے۔

اس صحبت میں مَیں فقط "فاروقِ اعظم اور اہلِ بیت"، کے موضوع پر اظہارِ خیال کروں گا۔ اس ضمن میں مَیں یہ عرض کروں گا کہ حضور نبیٔ مکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلیفہ ثانی، تمام اہلِ ایمان کے امیر، فاتح ایران و روم، بانیٔ مساجد و معابد حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ وارضاہ عنا جن کے نام کی ہیبت سے سارا کفر لرزہ براندام تھا، جن کے سایہ سے ابلیس ترساں و لرزاں تھا۔ ایسی جلیل المرتبت ہستی کے دل میں اپنے ہادیٔ برحق، مرشدِ کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کے خانوادۂ طاہرہ کی عظمت و محبت کا کیا عالم تھا۔ دوسری طرف ائمۂ اہلِ بیت اسلام کے اس فرزندِ جلیل کو کس احترام و تعظیم کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔

میں اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کروں گا:

(۱) عہدِ رسالت میں حضرت فاروقِ اعظمؓ اور اہلِ بیت کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔

(۲) اپنے عہدِ خلافت میں ان کی تعظیم و توقیر کس طرح کیا کرتے تھے۔ ان حضرات کا رویّہ آپ کے ساتھ کیسا تھا؛

(۴) فاروقِ اعظم کی شہادت کے بعد ائمہ اہلِ بیت آپ کے بارے میں کن خیالات کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

عہدِ رسالت پناہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

اگر آپ یہ اندازہ لگانا چاہیں کہ کسی کے دل میں آپ کے لیے محبت، احترام اور خیر سگالی کے جذبات کی نوعیت کیا ہے تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ یہ ملاحظہ کریں کہ وہ آپ کی عزت، آپ کی ناموری اور برتری کا کہاں تک خواہاں ہے؟ اور اس کے لیے کہاں تک سچے دل سے کوشاں ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس سے کسی کے دل میں اپنی قدر و منزلت اور خلوص و محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عہدِ رسالت میں بے شمار ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے دل میں حضرت سیدنا علیؓ کی بے پناہ محبت تھی اور آپ ان کو انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آپ کی عزت و برتری کے صدقِ دل سے خواہاں تھے اور اس کے لیے پورے خلوص سے کوشاں رہتے تھے، لیکن میں یہاں اس عہد کے صرف چند واقعات ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا جن کے مطالعہ سے ہر منصف مزاج صحیح فیصلہ پر پہنچ سکے گا۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں، چاروں سراپا نور اور پیکرِ یمن و سعادت تھیں۔ حضور کو سب سے قلبی انس اور دلی محبت تھی، لیکن ان سب میں خاتونِ جنت، بتولِ زہرا، سیدۃ النساء حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جو مقام تھا وہ بے مثل اور بے نظیر تھا۔ رازدانِ عالمِ کن فکان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آپ سے حد درجہ کی الفت و محبت

تھی۔ ان کے سیمائے سعادت پر جو انوار و تجلیات برستے تھے، ان کی شان ہی نرالی تھی علم لدنی اور معرفتِ الٰہی کے جو چشمے آپ کی ذاتِ اطہر سے نکل کر ایک دنیا کو سیراب کرنے والے تھے، ان کی بدولت نگاہِ مصطفوی میں آپ کا خاص مقام تھا۔ جب بھی کاشانۂ نبوت میں شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتیں تو اللہ تعالےٰ کے محبوب صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم مسکراتے ہوتے انھیں خوش آمدید کہتے اور فرطِ مسرت سے اٹھ کر ان کا استقبال کرتے۔

حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کی نسبت بھی باعثِ سعادتِ دارین ہے پھر جس کو حضور کی اس لختِ جگر اور نورِ نظر کا رشتہ مل جائے اس کی عظمتِ شان اور رفعتِ مرتبت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے اور اس سعادت کے حصول کے لیے کئی حضرات نے درخواست کی لیکن جواب ملا کہ یہ رشتہ حسبِ وحیٔ الٰہی طے پائے گا۔

ایک روز حضرت ابوبکر صدیق، حضرت فاروقِ اعظم اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم اکٹھے بیٹھے تھے۔ حضرت صدیق نے دونوں حضرات سے کہا کہ چلو، حضرت علی رضی اللہ عنہ مرتضیٰ کے پاس چلیں اور انھیں کہیں کہ وہ حضور سے یہ رشتہ طلب کریں اگر غربت اور افلاس کے باعث وہ یہ رشتہ طلب کرنے سے ہچکچا رہے ہوں تو ہمارے مال ان کے لیے حاضر ہیں۔ ہم ہر طرح ان کی مالی اعانت کریں گے۔ صاحبِ کشف الغمہ کے الفاظ یہ ہیں: فان منعه قلة ذات اليد واسيناه واسعفناه۔

حضرت سعد نے کہا، اے ابوبکر! اللہ تعالےٰ آپ کو ہمیشہ بہتر کاموں کی توفیق بخشتا ہے اٹھو اللہ تعالےٰ کی برکت و یمن پر توکل کرتے ہوئے علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلیں۔

حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں کہ تینوں حضرات آپ کی تلاش میں مسجد سے نکلے گھر سے دریافت کیا آپ وہاں پر موجود نہ تھے۔ آپ اپنے اونٹ کے ذریعے پانی نکال کر

ایک انصاری کا باغ سیراب کرنے گئے ہوئے تھے۔ سب اس باغ کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب حضرت علیؓ نے ان حضرات کو آتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کیسے تشریف آوری ہوئی؟ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، خیر و خوبی کی کوئی ایسی خصلت نہیں جس میں آپ کو سبقت اور فضیلت حاصل نہ ہو، حضورؐ کے ساتھ رشتہ میں، صحبت میں اور قبول اسلام میں جو آپ کا مقام ہے وہ بھی کسی پر مخفی نہیں، سرداران قریش نے حضورؐ سے حضرت فاطمہ کا رشتہ طلب کیا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوئے، آپ اس سعادت کے حصول کے لیے کیوں عرض نہیں کرتے۔ مجھے قوی امید ہے کہ اللہ تعالے اور اس کا رسول کریم اس رشتہ کو آپ کے لیے روکے ہوئے ہیں۔

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ تعالے عنہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ فرمایا اے ابوبکر! آپ نے میرے پرسکون جذبات میں ہیجان پیدا کر دیا اور ایک خوابیدہ تمنّا کو بیدار کر دیا۔ میں تہِ دل سے اس سعادت کے حصول کا متمنی ہوں، لیکن مفلسی اور تنگ دستی کے باعث اس خواہش کے اظہار کی جرأت نہیں کرسکتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

لَا تَقُلْ هٰذَا يَا اَبَا الْحَسَنِ فَاِنَّ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا عِنْدَ اللهِ تَعَالٰى وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ كَهَبَاءٍ مَنْثُوْرٍ۔

"اے ابوالحسن! ایسا مت کہو، اللہ تعالے اور اس کے رسول مکرم کے نزدیک دنیا و مافیہا کی قدر و منزلت ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں۔"

چنانچہ ان حضرات کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے سیدنا علی بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے۔ ان کی عرضداشت شرفِ قبولیت سے مشرف ہوئی، آپ فرماتے ہیں، میری خوشی کی

کوئی انتہا نہ رہی۔ میں جلدی سے باہر آیا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو منتظر پایا انھوں نے پوچھا، کیا ہوا؟ میں نے جب یہ خوشخبری انھیں سنائی تو ان کو بے انداز فرحت اور مسرت نصیب ہوئی اور ہم اکٹھے مسجد میں گئے۔

فَفَرِحَا بِذٰلِکَ فَرَحًا شَدِیْدًا وَ رَجَعَا مَعِیَ اِلَی الْمَسْجِدِ

میں نے یہ واقعہ کشف الغمہ جلد اوّل صفحہ ۴۷۸، ۴۸۳، ۴۸۴ سے نقل کیا ہے اور مصنف کی عبارت کے لفظی ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔

بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ یہ واقعہ ناسخ التواریخ جلد سوم جز اول کے صفحات ۳۷، ۳۸، ۴۶ پر مرقوم ہے۔

اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد آپ کے دل میں اس کے سوا اور کیا تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر، اسی طرح فاروقِ اعظمؓ کی یہ قلبی آرزو تھی کہ یہ سعادت حضرت سیدنا علی کو نصیب ہو، اس کے لیے ان حضرات نے ہی آپ کو مشورہ دیا، آپ کی حوصلہ افزائی کی۔ اور مالی اعانت کی پیشکش کی اور جب یہ سعادت آپ کو حاصل ہوئی تو اپنی انتہائی خوشی اور بے پایاں روحانی فرحت اور شدید مسرت کا اظہار کیا۔ کیا ایسی سعادت کے حصول کا مشورہ اپنے دشمن اور بدخواہ کو دیا جاتا ہے یا اُسے جو جان سے بھی عزیز تر ہو، ایسی لازوال سعادت کے حصول پر دوستوں کو خوشی ہوتی ہے یا دشمنوں اور بدخواہوں کو، آپ خود ہی فیصلہ فرما دیں!

ایک اور واقعہ سماعت فرمائیے:

غزوۂ خندق کے موقع پر عرب کا بہادر شہسوار اور نامور جنگجو عمرو بن عَبدِ وُدّ دعوتِ مبارزت دے رہا ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ اس کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے میدان میں اترتے ہیں۔ دونوں بہادر تھے، دونوں کی جنگی مہارت ضرب المثل تھی، جب آمنے سامنے ہوئے

تو عمرو بن عبدِ وُدّ نے کہا: میں تیرے جیسے کریم النفس کو قتل کرنا پسند نہیں کرتا نیز تیرا باپ میرا جگری دوست تھا۔ شیرِ خدا نے جواب دیا: لیکن میں تجھے قتل کرنا پسند کرتا ہوں۔ وہ اپنے گھوڑے سے اتر آیا۔ دونوں بہادر ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہے۔ اتنی گرد اڑی کہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اچانک شمشیر اسد اللّٰہی بجلی کی سرعت سے چمکی اور اس پر گری، اس کے خود، اس کی زرہ کو کاٹتی ہوئی، اس کے جسم میں پیر گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر آگرا۔ آپ نے اس کا سر کاٹا اور حضور کے قدموں پر لا کر ڈال دیا۔ لشکرِ اسلام نے شیرِ خدا کی اس کامیابی پر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اس کامیابی پر حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ کو کمال مسرت ہوئی۔ فرطِ مسرت سے دونوں اٹھے اور حضرت علیؓ کے سرِ مبارک کو آکر چوم لیا۔

فقام ابوبکر و عمر فقبلا راس علیؓ۔

(کشف الغمہ جلد اول ص ۲۴۳)

اظہارِ مسرت میں یہ وارفتگی دوست کے لیے ہوتی ہے یا اس کے لیے جس کے لیے دل میں کدورت اور حسد و عناد کے جذبات پرورش پا رہے ہوں؟

اگر آپ عہدِ رسالت کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو صدہا ایسے واقعات ملیں گے جن سے ان حضرات کی باہمی محبت، خلوص، ایثار اور خیر اندیشی کے تابندہ جذبات کا علم ہوگا۔

عہدِ فاروقی

آئیے! اب اس عہدِ ہمایوں کی طرف چلیں، جب اسلامی عظمت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا جب مملکت اسلامیہ میں داخلی طور پر مکمل امن و سکون تھا اور ہر صبح مختلف جنگی محاذوں سے نئی فتح و کامرانی کا مژدہ لے کر طلوع ہوتی تھی، جب اسلام کا جامع نظامِ حیات

پوری آب و تاب سے نافذ تھا اور اپنے فیوض و برکات سے اسلامی قلمرو کے ہر ہر گوشہ کو سیراب کر رہا تھا یعنی جب امتِ مسلمہ کی زمامِ قیادت امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہ کے دستِ مبارک میں تھی۔ آئیے! دیکھیں اپنی شہرت و عروج کے اس درویش صفت امیر المومنین کے دل میں خانوادۂ نبوت کی کتنی قدر و منزلت تھی، آپ کس طرح ان حضرات کا احترام اور عزت کیا کرتے تھے، کس طرح خلوص و شوق سے ان کی ہر طرح کی خدمت بجا لایا کرتے تھے۔ اس کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ملاحظہ کریں کہ ان ایام میں اہلِ بیت کرام کے آپ سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ ان واقعات کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ اس مختصر مقالہ میں اس کا ذکر ممکن نہیں۔ چیدہ چیدہ واقعات کی نشاندہی پر قناعت کرنا ہوگی۔ ان کے مطالعہ سے ہی بفضلہ تعالٰی حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

حضرت سیدنا علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ، حضرت فاروقِ اعظم کی مجلسِ شوریٰ کے رکنِ رکین تھے۔ جب بھی کوئی سیاسی، جنگی یا فقہی پیچیدہ مسئلہ پیش آتا آپ فوراً مجلسِ شوریٰ کا اجلاس طلب کرتے، ساری صورتِ حال اس مجلس کے سامنے رکھ دی جاتی۔ ہر شخص اپنی صوابدید کے مطابق بڑی آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ حضرت فاروق اعظم اسی فیصلہ کے مطابق عمل کرتے جو باہمی بحث و تمحیص سے طے پاتا۔ ان تمام مجالس میں سیدنا علی مرتضٰی بھی شرکت فرماتے۔ بڑے خلوص اور شوق سے بحث میں حصہ لیتے اور اپنی رائے کا اظہار فرماتے۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ اکثر آپ کی رائے کو ترجیح دیتے۔

پہلا واقعہ میں ناسخ التواریخ کی تاریخ الخلفاء جلد دوم مطبوعہ تہران سے نقل کر رہا ہوں۔

"پے در پے شکستیں کھانے کے بعد یزدجرد شہنشاہِ ایران نے اپنی عظیم سلطنت کو بچانے کے لیے آخری بار سر دھڑ کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا۔ ایران کا تجربہ کار، گرگ باراں دیدہ

سپہ سالار فیروزان جس کی جنگی مہارت اور شجاعت کی دھاک سارے ایران میں بیٹھی ہوئی تھی، نہاوند میں مقیم تھا۔ یزدجرد نے اپنی مملکت کے باقی ماندہ تمام صوبوں میں یہ احکام بھیجے کہ عربوں کو ہمیشہ کے لیے کچل کر رکھ دینے کے لیے ہر علاقے کے بہادر جنگجو فیروزان کے پرچم تلے نہاوند میں جمع ہوں۔ حکم سنتے ہی ایران کے دور دراز علاقوں سے ٹڈی دل لشکر ہر قسم کے سازوسامان سے لیس نہاوند پہنچنا شروع ہو گئے۔ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر جرار جمع ہو گیا۔ اس کے علاوہ جنگی ہاتھیوں کی ایک کثیر تعداد بھی وہاں پہنچ گئی۔ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ فیروزان کی امداد کے لیے ایرانی فوج کے دوسرے مشہور سالار سروشان بن اسفندیار، سفار بن خرزاد، جہانید بن فیروز بھی وہاں پہنچ گئے، انھوں نے قسمیں اٹھائیں کہ جب تک عرب غازیوں کو تہ تیغ نہ کر دیں گے اور ان کے دین کو پامال اور برباد نہ کر دیں گے، اس وقت تک وہ میدانِ جنگ سے منہ نہیں موڑیں گے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو جب ان کی تیاریوں کی اطلاع ملی تو فوراً مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا۔ سب اراکین تشریف فرما ہوئے، اس نازک صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے گفتگو شروع ہوئی۔ سیدنا علی مرتضیٰ بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ حضرات طلحہ، زبیر، عثمان اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ بعض نے یہ رائے دی کہ امیر المومنین خود تشریف لے جائیں اور اپنے لشکر کی قیادت کریں۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے جن الفاظ سے اپنی رائے کا اظہار کیا ناسخ التواریخ کے حوالے سے بعینہٖ نقل کر رہا ہوں۔

اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ لَمْ یَکُنْ نَصْرُہٗ وَلَا خِذْلَانُہٗ بِکَثْرَۃٍ وَلَا بِقِلَّۃٍ وَھُوَ دِیْنُ اللہِ الَّذِیْ اَظْھَرَہٗ وَجُنْدُہُ الَّذِیْ

اعدہ و امدہ حتیٰ بلغ ما بلغ وطلع حیث طلع ونحن علی موعود من اللہ و اللہ منجز وعدہ و ناصر جندہ والعرب الیوم وان کانوا قلیلاً فہم کثیرون بالاسلام وعزیزون بالاجتماع فکن قطبا و استدر الرحیٰ بالعرب واصلہم دونک نار الحرب الی آخرہ۔

ترجمہ: اس امر یعنی اسلام کی فتح و شکست کا دارومدار کثرت و قلت پر نہیں بلکہ یہ اللہ تعالےٰ کا دین ہے جس کو اس نے غالب کر دیا ہے۔ یہ اللہ تعالےٰ کا لشکر ہے جس کو اس نے تیار کیا ہے اور اس کی امداد فرمائی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ترقی و کامیابی کی اس منزل تک پہنچا ہے اور ہمارے ساتھ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور اپنے لشکر کی نصرت فرمائے گا.......

اہل عرب آج اگرچہ بلحاظ تعداد تھوڑے ہیں لیکن وہ اسلام کی برکت سے بہت زیادہ ہیں اور اپنے اتفاق و اتحاد کے باعث یہ طاقتور اور غالب ہیں۔ (اے امیر المومنین!) آپ قطب بن جائیے اور عربی لشکر کی چکی کو چلائیے۔ یہیں سے کفار کو جنگ کی آگ میں جھونکتے رہیے۔

اس کے بعد آپ نے اپنی اس حکیمانہ رائے کی حکمت بیان فرمائی۔

اس اندازِ تکلم اور اسلوبِ بیان میں خلوص و محبت کا جو نور جگمگا رہا ہے اسے ہر چشم بینا دیکھ رہی ہے۔

جو لوگ حضرت فاروق اعظم اور سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے تعلقات کو کشیدہ، مخاصمانہ بلکہ معاندانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس عبارت کے خط کشیدہ

جملوں کو پھر غور سے پڑھیں. علی مرتضیٰ حضرت فاروق کے دین کو اللہ تعالےٰ کا دین، آپ کے لشکر کو اللہ تعالےٰ کا لشکر کہہ رہے ہیں. نیز بڑی وضاحت سے اعلان فرما رہے ہیں کہ یہ وہ لشکر ہے جس کی مدد اور نصرت کا اللہ تعالےٰ نے وعدہ کیا ہوا ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا. آپ حضرت فاروق کو قطب فرما رہے ہیں جس کے ارد گرد چکی گھومتی ہے اگر وہ ذرا بھی اپنی جگہ سے سرک جائے گا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

یہی عبارت نہج البلاغۃ صہ ۲۸۳ جلد اول مطبوعہ مصر میں موجود ہے۔

(۲) جب ایران کے تقریباً سارے علاقے فتح ہو گئے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے خراسان پر لشکر کشی کی اجازت طلب کی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا، کیونکہ مسافت بہت طویل تھی، راستہ میں لق و دق صحرا، گھنے جنگل اور دشوار گزار پہاڑ تھے، آپ مسلمان مجاہدین کو اس تکلیف سے بچانا چاہتے تھے. لیکن جب حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ نے خراسان کی اہمیت بتائی اور اس کو فتح کرنے کا مشورہ دیا تو آپ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے خراسان پر حملہ کرنے کی اجازت دی۔

(ناسخ التواریخ، تاریخ الخلفاء جلد ۲ صہ ۳۵)

(۳) اسی طرح شام و فلسطین میں پے در پے شکستیں کھانے کے بعد رومی سپہ سالاروں نے بھی ایک مقام پر اپنا لشکر جرار جمع کیا تاکہ مسلمانوں سے فیصلہ کن لڑائی لڑیں، اس کی اطلاع جب امیر المومنین کو ملی تو آپ نے اپنی مجلس شوریٰ کا پھر ہنگامی اجلاس طلب کیا. سب اراکین مجلس شریک ہوئے خوب گرما گرم بحث ہوئی. آپ نے خود میدان جنگ میں جانے کا عزم کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کی تائید نہ کی. چنانچہ آپ نے ان کے مشورہ پر ہی عمل کیا. اس موقع پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان افروز ارشادات آپ کی خصوصی توجہ کے

مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا:

قد توکل اللہ لاھل ھذا الدین باعزاز الحوزۃ وستر العورۃ والذی نصرھم وقلیل لا ینتصرون ومنعھم ھم قلیل لا یمتنعون حی لا یموت ۰ (نہج البلاغۃ ص۲۷ جلد اوّل)

ترجمہ: یعنی اللہ تعالے نے ملت اسلامیہ کی سرحدوں کی حفاظت اور ان کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کا خود ذمہ لیا ہے۔ وہ ذات جس نے اس وقت ان کی نگہبانی کی جب وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اور ان میں مقابلہ کی سکت نہ تھی اور جس نے اس وقت ان کی نگہبانی کی جب وہ قلیل تھے اور اپنا تحفظ خود کرنے سے قاصر تھے وہ خدا مر نہیں گیا زندہ ہے، وہ اب بھی ان کی مدد فرمائے گا اور ان کی حفاظت کرے گا۔

بہت سے واقعات میں سے صرف چند واقعات کے ذکر پر اکتفا کر رہا ہوں ان کے مطالعہ سے ہی چند امور بالکل واضح ہو گئے ہوں گے کہ حضرت علیؓ مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے۔ ہر نازک مرحلہ پر اس کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے بڑے خلوص اور جرأت سے اپنا مشورہ پیش کرتے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے دین کو اللہ تعالے کا دین، آپ کے لشکر کو اللہ تعالے کا لشکر یقین کرتے تھے اور صاف صاف اعلان کرتے تھے، یہ وہ لشکر ہے جس کی نصرت کا وعدہ خداوند ذوالجلال نے کیا ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔ نیز یہ بھی پتہ چل گیا کہ حضرت فاروق اعظمؓ آپ کے مشوروں کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان پر عمل کرتے۔

آپ صرف مجلس حربیہ (وار کونسل) کے ممبر ہی نہ تھے بلکہ مجلس قانون ساز میں بھی آپ برابر شریک ہوتے تھے اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ آپ کے فقہی اجتہادات اور شرعی آرا کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جو مغربی محاذ کے کمانڈر انچیف تھے کو اطلاع ملی کہ عیسائیوں کی دیکھا دیکھی بعض مسلمان بھی شراب کی طرف راغب ہونے لگے ہیں آپ نے امیر المومنین کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پوچھا کہ ایسے لوگوں کو کیا سزا دینی چاہیے۔ حضرت فاروقِ اعظم کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ مجلس قانون ساز کے اعضا کو طلب کیا گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما تھے اور آپ کے مشورہ کے مطابق شرابی کے لیے اسی درّے کی سزا تجویز ہوئی جس پر تمام صحابہ نے اجماع کیا۔ آپ نے یہ حد مقرر کرنے کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی:

ان السکران اذا سکر ھذٰی واذا ھذٰی افترٰی
واذا افترٰی فعلیہ ثمانون۔

ترجمہ: یعنی جو نشے میں مدہوش ہوتا ہے وہ جو ہذیان بکتا ہے وہ افترا بازی کرتا ہے اور جو افترا بازی کرے اس کی سزا اسّی درے ہے اس لیے شراب خور کی سزا بھی اسّی درے ہوگی۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے یہی حکم حضرت ابو عبیدہ کی طرف لکھ بھیجا اور آج تک امت کا اسی پر عمل ہے۔

حضرت سیدنا علی کی اصابت رائے، اظہار رائے میں جرأت نیز بے پایاں خلوص اور محبت کے باعث حضرت فاروقِ اعظمؓ کو آپ پر اس قدر اعتماد اور وثوق تھا کہ مملکتِ اسلامیہ

کے تمام اہم معاملات میں آپ سے ضرور صلاح مشورہ کیا کرتے۔ آپ اکثر یہ دعا مانگا کرتے :

اللھم لا تبقنی لمعضلۃ لیس لھا علی رضی اللہ عنہ

الٰہی ! مجھے اس وقت زندہ نہ رکھنا کہ جب کوئی مشکل در پیش آئے اور اس کو حل کرنے کے لیے علی مرتضیٰ میرے پاس موجود نہ ہوں۔

یہ ساری باتیں باہمی محبت، باہمی اعتماد اور پیار کی ہیں ان روشن حقائق کو جب انسان دیکھتا ہے تو اللہ تعالےٰ کے اس فرمان کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا : فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔

ان واقعات سے کوئی فہم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ حضرت فاروق اعظمؓ معاملات کو سمجھنے سے قاصر تھے یا مہماتِ امور کو حل کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ وہ ہستی جن کی پیش کردہ تجاویز (حرمتِ شراب، امہات المومنین کا پردہ کرنا وغیرہ) کی تائید میں آیات قرآنی کا نزول ہوا جن کی آراء کو فرمانِ خداوندی نے حکم اور قانون کا درجہ دیا۔ خود حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جن سے مشورہ فرمایا کرتے تھے جن کے حسنِ تدبر اور سیاسی بصیرت کی بدولت اسلامی مملکت فردوس بریں کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ ایسی ہستی کے بارے میں ایسی غلط فہمی کا وہی شکار ہو سکتا ہے جو خود عقل و دانش سے بے بہرہ ہو جس کی اپنی چشم خرد کور ہو۔

حکومت سے متعلقہ امور کے علاوہ بھی آپ خاندانِ نبوت کا ہر طرح ادب و احترام کرتے چنانچہ جب بیت المال سے وظائف اور مشاہرات متعین کرنے کا وقت آیا تو بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ کیونکہ آپ امیر المومنین اور خلیفۃ الرسول ہیں اس لیے ان دفاتر میں آپ کا اور آپ کے اہلِ خاندان کے نام سرِفہرست ہونے چاہئیں۔ آپ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ فرمایا سب سے پہلے قبیلۂ بنی ہاشم کے افراد کے نام لکھے جائیں گے، کیونکہ یہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا

خاندان ذی احتشام ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمِ محترم حضرت عباسؓ، ان کے بعد حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کے اسماء گرامی لکھے گئے۔ پھر دوسرے ہاشمیوں کے نام درج ہوتے وظائف اور تنخواہوں میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی سب سے زیادہ تنخواہیں اصحاب بدر کے لیے مقرر کی گئیں۔ حضرات حسنین کریمین اگرچہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے لیکن قرابتِ نبوی کے باعث ان کے وظائف اہل بدر کے برابر رکھے گئے۔

اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں خاندانِ نبوت کا حد درجہ احترام نہ ہوتا تو آپ اپنا نام سرفہرست لکھواتے اور حضرات حسنین کے لیے بدریوں کے برابر وظیفہ مقرر نہ کرتے کیونکہ وہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ کوئی شخص آپ پر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن آپ کے دل میں اپنے آقا اور مرشد کریم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضورؐ کے خاندان کی جو محبت تھی، جو جذبۂ نیاز تھا۔ اس کے پیشِ نظر آپ نے جو کچھ کیا۔ یہ عین صواب تھا۔

ایک اور ایمان پرور اور بصیرت افروز واقعہ سماعت فرمائیے؛ حضرت فاروق اعظمؓ کے دل میں خاندانِ نبوت کی جو قدر و منزلت اور حضرت امام حسینؓ کی جو عزت اور محبت موجود تھی اس کو ثابت کرنے کے لیے اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آپ کے عہدِ مبارک میں ایران اسلامی قلمرو میں داخل ہوا۔ یزدجرد شہنشاہِ ایران کی شہزادی آپ کے دربار میں پیش کی گئی۔ اگرچہ آپ کے اپنے بچے موجود تھے جو صورت و سیرت میں، اخلاق و محامد میں اپنی مثال آپ تھے، اگر آپ چاہتے تو دختر یزدجرد کو کسی اپنے بیٹے کو دے دیتے لیکن آپ کی نگاہِ انتخاب صرف سیدنا امام حسین علیہ السلام پر پڑی اور حضرت مائی شہر بانو کا عقد آپ کے ساتھ کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو میں اصول کافی کے حوالے سے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں؛

عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ عَلَیْہِ السَّلَامُ لَمَّا قَدِمَتْ بِنْتُ یَزْدَ جَرْدَ

عَلٰی عُمَرَ اَشْرَفَ لَهَا عَذَارَی الْمَدِیْنَةِ وَاَشْرَقَ الْمَسْجِدُ بِضَوْءِهَا

لَمَّا دَخَلَتْهُ وَلَمَّا نَظَرَ اِلَیْهَا عُمَرُ غَطَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ اُفٍّ بِیْرُوْجْ

بَاذْ هُرْمُزْ وَقَالَ عُمَرُ اَتَشْتِمُنِیْ هٰذِهٖ وَ هَمَّ بِهَا وَقَالَ لَهٗ اَمِیْرُ

المؤمنین علیہ السلام لیس ذلك خیر لها رجلا من المسلمین

واحسبها بفیئہ وخیرها وجاءت حتی وضعت یدها علی

رأس الحسین علیہ السلام وقال امیر المومنین ما اسمك

فقالت جهانشاه فقال لها امیر المومنین بل شهر بانویہ

ثم قال للحسین یا ابا عبد الله لیلدن لك منها خیر

اهل الارض فولد علی بن الحسین۔

ترجمہ: حضرت امام باقر فرماتے ہیں کہ جب یزدجرد کی بیٹی حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوئی تو مدینہ طیبہ کی عورتیں اسے دیکھنے کے لیے جھرمٹ کر آئیں مسجد اس کی روشنی سے چمکنے لگی۔ حضرت عمرؓ نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: کیا یہ مجھے بُرا بھلا کہہ رہی ہے اور اس کو مارنے کا ارادہ کیا۔ (یہ اصول کافی کے راوی کے الفاظ ہیں جو حقیقت سے بعید ہیں۔) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ایسا نہیں آپ اسے اختیار دیجئے کہ مسلمانوں میں کسی آدمی کو چن لے اور پھر اسے مال غنیمت میں سے اس کا حصہ قرار دیجئے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اسے اجازت دی، اس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر پر رکھ دیا۔ حضرت امیر المومنین نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟

اس نے کہا: جہاں شاہ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ شہر بانو۔ پھر آپ نے حضرت امام حسین رضؓ سے کہا، تیرا اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمام اہلِ زمین سے بہتر ہوگا۔ چنانچہ حضرت شہر بانو کے بطن سے حضرت زین العابدین کی ولادت باسعادت ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام حسینی سادات حضرت شہر بانو رضی اللہ تعالٰی عنہا کے بطن سے ہیں مائی صاحبہ کا مشرف باسلام ہونا، خاندانِ نبوت کا فرد بننا اور حسینی سادات کی والدہ ماجدہ بننے کا فخر حاصل کرنا حضرت فاروقِ اعظم رضؓ کی بے شمار برکات اور ان گنت احسانات میں سے ایک ہے۔ اس کے لیے ساری امت آپ کی ممنون ہے۔ سادات کرام کو اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ملّا باقر مجلسی نے جلاء العیون سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اسے قوی کہا ہے اور لکھا ہے کہ آپ کا مہر بیت المال سے ادا کیا گیا۔ (جلاء العیون ص ۴۹۷ مطبوعہ ایران)

حضرت فاروقِ اعظم رضؓ کی شہادت کے بعد

ساڑھے دس سال مسندِ خلافت پر متمکن رہنے کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضؓ نے ایک مجوسی کے ہاتھ سے جامِ شہادت نوش کیا۔ حضرت علی مرتضیٰ کو اس کا شدید صدمہ ہوا۔ آپ کو غسل دے کر کفنایا گیا، اس وقت علی مرتضیٰ تشریف لائے۔ اس روح فرسا منظر کو دیکھ کر آپ کی زبانِ اقدس سے جو کلمات نکلے انہیں علماء اہلِ سنت نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے، لیکن آپ محض طوسی کی تلخیص الشافی میں مذکور روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن جعفر بن محمد عن ابیہ عن جابر بن عبد اللہ لما غسل عمر و کفن دخل علی علیہ السلام فقال صلی اللہ علیہ

ما علی الارض احب الی من ان القی اللّٰہ بصحیفۃ ھذا المسجی

بین اظھرکم۔ (تلخیص الشافی ص ۲۸ ج۲ مطبوعہ نجف اشرف)

ترجمہ: یعنی حضرت امام جعفر صادق نے اپنے ولد بزرگوار سے اور انھوں نے جابرؓ بن عبداللہ سے روایت کی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غسل دے کر کفن پہنایا گیا تو علی علیہ السلام تشریف لاتے فرمایا: ان پر اللہ تعالےٰ کی رحمت ہو، یہ شخص جو تمہارے سامنے کفن میں لپٹا ہوا ہے مجھے روئے زمین پر اس سے زیادہ کوئی اور چیز محبوب نہیں کہ میں اس جیسا صحیفہ عمل لے کر اللہ تعالےٰ کی ملاقات کروں۔

حقیقت یہ ہے کہ شانِ فاروقی کو پہچاننے کے لیئے نگاہِ مرتضوی کی ضرورت ہوتی ہے ہر کس و ناکس میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس مقامِ رفیع کا اندازہ کر سکے۔ جس پر اللہ تعالےٰ نے حضرت فاروقِ اعظمؓ کو سرفراز فرمایا تھا۔

سیدنا علی مرتضیٰ اپنے عہدِ خلافت میں اکثر حضرت فاروقِ اعظم کا ذکرِ خیر فرمایا کرتے اور آپ کی تعریف و توصیف کا حق ادا کر دیتے۔ آپ نے ایک مرتبہ اللہ تعالےٰ کی حمد اور حضور علیہ السلام کی ثنا کے بعد فرمایا:

ثم استخلف الناس ابا بکر ثم استخلف ابوبکر عمر و احسنا السیرۃ و عدلا فی الامۃ۔ (ناسخ التواریخ جزو دوم جلد سوم ص ۱۱۴)

ترجمہ: پھر حضور علیہ السلام کی رحلت کے بعد لوگوں نے ابوبکرؓ کو اپنا خلیفہ بنایا پھر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر کو خلافت کے لیئے تجویز کیا، ان دونوں حضرات کا کردار نہایت عمدہ تھا۔ دونوں نے امت میں عدل و انصاف قائم کیا۔

اسی جزو کے صفحہ ۲۲۲ پر حضرت امیر المومنین کا ایک مکتوب گرامی ہے جس میں آپ نے ہر اس کو مخاطب فرمایا ہے جو اس خط کو پڑھے اس میں ابتدائی پند و نصائح کے بعد حضور سرور عالم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام عرض کرتے ہیں پھر فرماتے ہیں :

ثم ان المسلمین من بعدہ استخلفوا امیرین منھم صالحین احیا السیرۃ ولم یعدوا السنۃ

ترجمہ : حضورؐ کے وصال کے بعد مسلمانوں نے اپنے میں سے دو ایسے امیروں کو اپنا خلیفہ منتخب کیا جو صالح اور نیک کردار تھے، ان دونوں نے سیرتِ نبوی کو زندہ رکھا اور سنتِ مصطفوی سے سرمو تجاوز نہ کیا۔

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں :

وتولی عمر الامر فکان مرضی السیرۃ میمون النقبیۃ۔

ترجمہ : یعنی حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ مسندِ خلافت پر تشریف فرما ہوئے، آپ کا کردار بڑا پسندیدہ تھا اور آپ کا بخت بڑا مبارک تھا۔ (ناسخ التواریخ صہ ۴۲۳ جز سوم)

نہج البلاغۃ میں آپ نے بڑی فصاحت اور صراحت سے حضرت فاروقِ اعظمؓ کے مناقب بیان فرمائے ہیں آپ کے عدل و انصاف، تقویٰ اور اتباعِ سنت کی بڑی تعریف کی ہے، آپ نے فرمایا :

للہ بلاد فلان فقد قوم الاود وداوی العمد۔ خلف الفتنۃ واقام السنۃ ذھب نقی الثوب قلیل العیب، اصاب خیرھا، وسبق شرھا وادی الی اللہ طاعتہ واتقاہ

بحقہ ٥ (نہج البلاغۃ جلد اول صہ ۴۸۵ مطبوعہ مصر)

ترجمہ: یعنی حضرت عمرؓ کے شہروں کو اللہ تعالیٰ برکت دے، آپ نے کجی کو درست کیا، بیماری کا علاج کیا، فتنہ و فساد کو پسِ پشت ڈالا، سنتِ نبوی کو قائم کیا۔ وہ یہاں سے پاک دامن رخصت ہوتے، ان کے عیب قلیل تھے، انھوں نے خیر کو پا لیا اور شر و فساد سے سبقت لے گئے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و تقویٰ کا حق ادا کر دیا۔

عبارت مذکورہ میں "فلاں" کا لفظ مذکور ہے۔ نہج البلاغۃ کے شارحین نے وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ۔ چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید اپنی شہرۂ آفاق شرح میں لکھتے ہیں:

وفلان المکنی عنه عمر ابن الخطاب وقد وجدت النسخته الذی بخط الرضی ابی الحسن جامع نہج البلاغة و تحت فلان "عمر"

یعنی فلاں سے مراد عمرؓ بن خطاب ہیں کہتے ہیں میں نے وہ نسخہ دیکھا ہے جو علامہ رضی جامع نہج البلاغۃ نے اپنے ہاتھ سے لکھا اس میں فلاں کے لفظ کے نیچے عمرؓ لکھا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ علامہ علی نقی فیض الاسلام نے اپنی شرح نہج البلاغۃ میں اس جگہ لکھا ہے:

"خدا شہرہائے فلاں (عمرؓ بن الخطاب) را برکت دہد و نگاہ دارد۔"

ترجمہ: اللہ تعالیٰ فلاں یعنی عمر بن خطاب کے شہروں کو برکت دے اور ان کی نگہبانی فرمائے۔

ایک اور شارح نہج البلاغۃ ملا صالح قزوینی لکھتے ہیں:

"کہ مراد عمرؓ است کہ بعد از او امیر خلافت از انتظام بیفتاد۔

(کہ فلاں سے مراد حضرت عمرؓ ہیں کیونکہ آپ کے بعد خلافت کا نظم و نسق درہم برہم ہو گیا۔)

کمال الدین میثم بحرانی نے بھی اس شرح میں لکھا ہے:

والمنقول ان المراد بفلان عمر۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اپنے عہد خلافت میں حضرت فاروق اعظمؓ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ آپ نے بطور توریہ یا تقیہ اس طرح کہا ہرگز قرین قیاس نہیں اور اگر یہ فرض کر لیا جائے تو بارگاہ مرتضوی میں اس سے بڑھ کر کوئی گستاخی متصور نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے حضرت امیر معاویہؓ کے خط کے جواب میں حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کو ان پاکیزہ اور دل افروز کلمات سے خراج تحسین پیش فرمایا:

وکان افضلھم فی الاسلام کما زعمت و انصحھم للہ ولرسولہ الخلیفۃ الصدیق وخلیفۃ الخلیفۃ الفاروق۔ ولعمری ان مکانھما فی الاسلام لعظیم وان المصاب بھما لجرح فی الاسلام شدید۔ یرحمھما اللہ و جزاھما باحسن ما عملا۔ (شرح نہج البلاغۃ ابن میثم البحرانی)

ترجمہ: آپ کا یہ خیال درست ہے کہ اسلام میں سب سے افضل اللہ اور اس کے رسول کے سب سے زیادہ مخلص حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم تھے۔ مجھے اپنی جان عزیز کی قسم! اسلام میں ان دونوں کا مرتبہ بڑا عظیم تھا۔ ان کی وفات حسرت آیات

سے اسلام کو گہرا زخم لگا۔ اللہ تعالے ان دونوں پر رحمت فرمائے اور جو نیک اعمال انھیں نے کیے ہیں اس کی انھیں جزا دے۔

حضرت علی مرتضیٰ کے بعد بھی ائمہ اہل بیت حضرت فاروق اعظمؓ کی تعریف فرماتے رہے اب یہاں صرف ایک واقعہ بطور مثال پیش خدمت ہے:

ایک دفعہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی خدمت اقدس میں عراق کے چند آدمی حاضر ہوئے اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں کچھ ناشائستہ گفتگو کی۔ جب وہ لوگ اپنے خبث باطن کو ظاہر کر چکے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم ان مہاجرین اولین میں سے ہو جن کی شان میں حق تعالے نے فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔

ترجمہ: یہ مہاجرین وہ لوگ ہیں جنھیں ان کے گھروں اور مال و متاع سے نکال دیا گیا، یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضا کا طلب گار ہیں اور اللہ تعالے اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں اور یہی لوگ سچے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا ہم اس گروہ سے نہیں ہیں۔

پھر آپ نے دریافت فرمایا، کیا تم ان میں سے ہو جن کے متعلق اللہ تعالے نے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔

ترجمہ: وہ لوگ جو مہاجرین سے محبت کرتے ہیں اور اپنے دل میں اپنے مال و دولت سے کوئی کشش نہیں پاتے اور حالت افلاس میں بھی مہاجرین کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

ان لوگوں نے کہا، ہم اس گروہ سے بھی نہیں۔

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں گروہوں میں سے نہ ہونے کا تم نے خود اعتراف کرلیا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم مسلمانوں کے تیسرے گروہ میں سے نہیں جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

ترجمہ: وہ لوگ جو ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں، اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے، اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اہل ایمان کے لیے ہمارے دلوں میں بغض مت ڈال۔

پھر آپ نے بڑے غضب ناک لہجے میں فرمایا:

اُخْرُجُوْا عَنِّیْ فَعَلَ اللّٰهُ بِكُمْ۔

میرے پاس سے نکل جاؤ۔ خدا تمھیں ہلاک کرے۔ (کشف الغمہ جلد دوم صفحہ نمبر ۲۶۷)

اللہ تعالےٰ جب کسی کو فرزند عطا کرتا ہے تو وہ اپنی سمجھ کے مطابق اس کے لیے بہترین نام تجویز کرتا ہے۔ عمل کی ہزار کوتاہیوں کے باوجود ہم آج بھی دین کے کسی بانی، اللہ تعالیٰ اور

اس کے پیارے رسولؐ کے کسی دشمن کا نام رکھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ ابولہب، ابوجہل، فرعون یا شمر کے نام کلیتہً متروک ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے لیے کسی مقبول بارگاہِ الٰہی کا نام ہی پسند کرتے ہیں۔

حضرت سیدنا علی مرتضیٰ اور آپ کی اولادِ امجاد جو حسن انتخاب میں اپنا جواب نہیں رکھتی یقیناً انھوں نے بھی اپنی اولاد کے لیے انہی کے نام تجویز کیے ہوں گے جو انھیں از حد دلربا اور پسند تھے اب ذرا ائمہ اہلِ بیت کی اولادِ امجاد کے ناموں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ انھیں حضرت فاروقِ اعظمؓ کے نام سے کتنی عقیدت و محبت تھی اور ان کے دلوں میں آپ کی کتنی قدر و منزلت تھی:

حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کے ایک صاحبزادے کا نام عمر تھا۔ (جلاء العیون، کشف الغمہ)

سیدنا امام حسن علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کا نام عمر رکھا۔ (جلاء العیون، کشف الغمہ)

سیدنا امام زین العابدین نے بھی اپنے لختِ جگر کے لیے عمر کا نام تجویز فرمایا۔ (جلاء العیون کشف الغمہ)

حضرت امام موسیٰ کاظم رضوان اللہ تعالےٰ علیہم کے ایک نورِ نظر کا نام بھی عمر تھا۔ (جلاء العیون، کشف الغمہ)

اگر خوفِ طوالت نہ ہوتا تو تاریخ انسانی کے اس زرّیں اور درخشاں عہد کے صدہا روح پرور اور دل افروز واقعات بیان کرتا لیکن اب اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر کسی کے دل کی آنکھ اندھی ہو چکی ہے یا اس نے تعصب کی پٹی خوب کس کر باندھ رکھی ہے تو اس کی قسمت، ورنہ

جس کے دل میں حق کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے کی کچھ صلاحیت موجود ہے بفضلہٖ تعالٰے اب اس پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو چکی ہو گی کہ خلفائے راشدین خصوصاً حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰے عنہم اور اہل بیت نبوت رضوان اللہ تعالٰے علیہم باہم شیر و شکر تھے۔ سب ایک دوسرے پر صدقِ دل سے فریفتہ تھے۔ شمع اسلام پر سب پروانہ وار نثار تھے۔ ان سب نفوسِ قدسیہ کی مشترکہ کوششوں سے اللہ تعالٰے کے دین کو غلبہ اور عزت نصیب ہوئی، باہمی کشیدگی اور دشمنی کے قصے سب جھوٹے ہیں، اللہ تعالٰے کا یہ فرمان سچا ہے جس میں کوئی مومن شک نہیں کر سکتا۔

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔

یعنی اللہ تعالٰے نے اپنے محبوب کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی برکت سے ان کے دلوں کو محبت اور پیار سے جوڑ دیا تھا اور اس کی مہربانی سے وہ بھائی بھائی بن گئے تھے۔

فاروقِ اعظم کا فقہی اجتہاد

تحریر :- ڈاکٹر سید عبد اللہ

ہمارے ہاں خصوصاً انگریزی دان طبقے میں (بے خبری بے اعتنائی اور غیروں کے نظام و نصاب تعلیم کے غلبے کی وجہ سے) اسلامی فقہ کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں لیکن جن لوگوں نے اس موضوع پر غائر نظر ڈال کر دیانت دارانہ مطالعہ و تجزیہ کی کوشش کی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ فقہ مسلمانوں کی اجتہادی اور قانونی غور و فکر کا عظیم الشان سرمایہ اور کارنامہ ہے۔

بعض لوگ اسے رومن لا سے ماخوذ بتا کر اپنی بے بصیرتی کا ثبوت دیتے ہیں حالانکہ بالکل ظاہر ہے کہ اسلامی فقہ کا مزاج ایک دوسرے سے بنیادی طور سے مختلف ہے۔ اگر ایک غیر مساواتی (امراؤ اشراف اور ان کے غلاموں میں فرق کرنے والا) ہے۔ تو دوسرا حد درجہ مساواتی عادلانہ اور انسان دوست تمیز بندہ و آقا سے بلند، عرب و عجم کے لیے یکساں اور زمان و مکان ارضی کی قید سے آزاد ہے اصلی وجہ یہ ہے کہ جہاں ایک کی بنیاد انسانوں نے رکھی ہے وہاں دوسرا اصلاً الٰہی قانون ہے۔

جدید دور کے بعض مغربی ماہرین قانون نے اس کی توثیق کی ہے کہ اسلام کا قانون (فقہ) مستقل بالذات مختص النوع اور اپنے مخصوص مزاج پر قائم ہے۔ اس کے ماخذ الہامی ہیں۔ کتاب و سنت اس کے اوّلین تعمیری و ترکیبی عناصر ہیں اور فقہی مذاہب اربعہ کی

بنیاد انہیں اصولوں پر ہے۔

صحابہ کرام میں جن برگزیدہ شخصیتوں نے فقہ اسلامی کی اصولی اجتہادی بنیادیں قائم کیں اور بدلتے ہوئے حالات میں قرآن وسنت کے اصولی احکام سے۔ استنباط واستخراج کر کے مہتم بالشان فیصلے کیے ان میں حضرت عمر فاروق کا درجہ نہایت بلند ہے، حقیقت یہ ہے کہ آج تک دنیا نے (رسول کریم کے بعد) ان سے بڑا قانونی ماہر ومفکر کوئی پیدا نہیں کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کو حضرت رسول کریم نے حق گو اور مصیب (یعنی اصابت رائے والا) کا خطاب دیا تھا کیونکہ ان کی متعدد آرا کی وحیٔ الٰہی کے ذریعے تائید ہوئی جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نور شمع نبوت سے حاصل ہوا اور یہ قرآن اور سرورکائنات ہی کا سرچشمہ تھا۔ جس سے حضرت عمرؓ کی بصیرت فیض یاب ہوئی اور یہ شرف فاروق اعظم ہی کو حاصل ہوا کہ آنحضرت نے انہیں صائب الرای کا خطاب عطا کیا۔

حضرت عمر کے اجتہادات کی شان یہ ہے کہ وہ قیاس کرتے وقت احکام سابقہ کے ظاہر کو نہ دیکھتے تھے بلکہ ان کی علت اور غایت اور چھپی ہوئی حکمت تک پہنچتے تھے ——— یہ ان کی فقہی بصیرت تھی کہ وہ مصالح عامہ میں انسانوں کے مابین عدل کے ظاہری تقاضوں کی بجا آوری کے علاوہ نفس انسانی کے چھپے ہوئے دواعی کا بھی خیال رکھتے تھے ان کی نظر میں قانون طبقات آنام میں تعدیل ومساوات پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ضرورتوں اور حاجتوں کا کفیل ہوتا ہے۔ تنگی کے بجائے آسانی پیدا کرتا ہے اور اس تکلیف سے انسان کو بچاتا ہے جو مالا یُطاق ہو۔

حضرت عمرؓ کے اجتہادات کی فہرست طویل ہے یہاں ایک مثال کافی ہوگی۔ ان کے بعض فیصلے اس اصول پر ہوئے کہ انسانی مجبوری واضطرار کی حالت میں بعض احکام ساقط کیے جا سکتے ہیں۔

عام الرمادہ میں یعنی شدید قحط کے ایک سال میں جب لوگ بھوک سے مر رہے تھے۔ حضرت عمر نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا موقوف کر دی تھی۔ کیونکہ اس وقت چوری کا ارتکاب بامرِ مجبوری ہو رہا تھا۔ اسی ایک فیصلے سے فاروق اعظم کی فقہی حکمت شناسی کا اندازہ ہو

سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا ایک اجتہاد یہ تھا کہ عراق اور مصر کی اراضی کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کی ممانعت فرمادی۔ اس سلسلے میں مجاہدین کا موقف نصوص کے ظاہری مفہوم کے مطابق تھا لیکن حضرت عمرؓ کی نظر میں فتوحات کے نتیجے میں حاصل شدہ املاک کسی ایک شخص یا ایک گروہ مجاہدین کے لیے مخصوص کرنے کے بجائے ان کا ملّت کے اجتماعی مقاصد کے لیے وقف ہونا مناسب تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے فیٔ (نہ کہ مال غنیمت) قرار دے کر ان اراضی کا مالک بیت المال کو قرار دے دیا اور ان سے پوری ملّت نے فائدہ اٹھایا۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمر کے نزدیک اجتماعی مقاصد انفرادی یا گروہی مقاصد پر ہر طرح افضلیت رکھتے تھے۔ فتح عراق کے بعد اراضی کی تقسیم کے سلسلے میں بہت سے صحابہ کے برعکس ان کا الگ موقف اسی اصُول کی تائید کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا ایک اور معرکہ آرا اور دور رس اجتہاد وہ تھا جو آپ نے مؤلفۃ القلوب کے سلسلے میں کیا۔ انہوں نے بیت المال سے ان کا مخصوص حصّہ بند کر دیا۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ جب تک اسلام کی اشاعت عام نہ ہوئی تھی۔ اور اس کا سلسلہ قوی نہ ہوا تھا۔ اس قسم کی امداد میں مصلحت تھی۔ لیکن جب اسلام پھیل گیا اور ایک قوت بن گیا تو تالیف قلب کے اس طریقے کو جاری کرنے کا مطلب بجز اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ قبول اسلام کو دوامی طور سے ایسی ترغیبوں سے وابستہ کر دیا جائے جن میں مال کی محبّت کا شائبہ نکلتا ہو۔ اصول اس سلسلے میں یہ تھا کہ حالات کے بدلنے سے بعض احکام کی صورتیں بدل جاتی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کرکے دنیا کے سامنے ایک ایسی مثال پیش کی جس کی حکمت کا آج برملا ہر جگہ اعتراف کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی آرا پر مبنی وہ فقہی مسلک قائم ہوا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے زیر اثر عراق میں اہل القیاس کے نام سے رائج ہوا۔ لیکن اس سے یہ رائے قائم نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ قرآن و سنت سے کسی طور انحراف کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں قرآن و سنت کا صحیح فہم و ادراک حاصل تھا۔ اور انہیں ان کے اسرار و غوامض کے بارے میں اتنی خداداد بصیرت حاصل تھی جس تک دوسرے ذرا دیر سے

پہنچ جاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے قول کے مطابق (جو ابن القیم نے اِعلام الموقعین میں نقل کیا ہے) اگر حضرت عمرؓ کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ساری دنیا کا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو حضرت عمرؓ کا علم وزن میں زیادہ ہوگا۔

حضرت عمرؓ کے بہت سے فیصلے (قانونی اور شرعی نقطۂ نظر سے) ایسے ہیں جو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان سے قانونِ شریعت کی بعض بنیادیں قائم ہوئیں مثلاً کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت یحییٰ مازنی کی اراضی قریب قریب تھی۔ حضرت مازنی کے باغیچے میں سے حضرت عبدالرحمٰن کی اراضی میں پانی کی نالی پہنچتی تھی۔ مگر مازنیؓ کے دادا نے روک دیا جب یہ مقدمہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس اصول پر کہ جس کام میں کسی کا ضرر نہ ہو اس میں رکاوٹ ظلم ہے فیصلہ حضرت عبدالرحمٰن کے حق میں دے دیا۔ یہ محض ایک مثال ہے۔ بیسیوں اجتہادی فیصلے ایسے ہیں جن میں حضرت عمرؓ کی رائے سے شرع کے بہت سے احکام آگے چل کر متفرع ہوئے (دیکھئے شاہ ولی اللہ دہلوی، رسالہ در مذہب فاروق اعظمؓ)

حضرت فاروق اعظم کا شعری و ادبی ذوق

تحریر

انوار صولت

شاعری کیا ہے؟

مولانا شبلیؒ نے شعر العجم میں شاعری کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔
"شاعری ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لیے اس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ مفید ہو گا ان سب کے مجموعے سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیشِ نظر ہو جائے، خدا نے انسان کو مختلف اعضاء اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں۔ ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادت کا سرچشمہ ہیں —— ادراک اور احساس —— ادراک کا کام اشیائ کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے، ہر قسم کی ایجادات تحقیقات، انکشافات اور تمام علوم و فنون اس کے نتائجِ عمل ہیں اس کے برخلاف احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت

میں صدمہ ہوتا ہے خوشی میں سرور ہوتا ہے حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو احساس یا انفعال FEELING سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاعری ہے یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے ۱۱۱

شعر کی خوبی

ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں اس میں وزن ہوتا ہے۔ محاکات موجود ہوتے ہیں۔ یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے خیال بندی ہوتی ہے الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں۔ بندش صاف ہوتی ہے۔ طرزِ ادا میں جدّت ہوتی ہے۔

شعر محاکات اور تخیل کے اجماع کا نام ہے یہ صرف محاکات یا صرف تخیل کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔

کسی مسئلے کا حل کسی پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے (بلکہ) اس کا کام صرف یہ باقی اوصافِ شاعری سلاست، صفائی، حسنِ بندش شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔

تخیل وہ قوت ہے جس کا کام ان اشیاء کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے نظر نہیں آتیں، ہماری نظر کے سامنے کر دے۔

محاکات کا اصل کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو یعنی جس چیز کو بیان کیا جائے کہ (اس کا) اس طرح اظہار بیان ہو کہ خود وہ مجسم ہو کر سامنے آجائے۔

شاعری صرف محسوسات کی تصویر ہی نہیں کھینچتی بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر رکھتی ہے۔ اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو صرف ایک دھندلا سا نقش پیشِ نظر ہوتا ہے۔ شاعری کا کام یہ ہے کہ ان پس پردہ چیزوں کو پیشِ نظر کر دیتی ہے اور اس سے دھندلی چیزیں چمک

اُٹھتی ہیں مٹا ہوا نقش اجاگر ہو جاتا ہے، کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے خود ہماری رُوحانی تصویر جو کسی آئینہ کے ذریعے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ شعر ہم کو دکھا دیتا ہے۔

(۲)

دورِ جہالت میں عربوں کے پاس فنِ شعر سے بہتر صحیح اور معیاری اور کوئی فن نہ تھا۔ یہی ان کا سب سے عظیم ادبی سرمایہ تھا۔ البتہ ظہورِ اسلام کے بعد جب اہلِ عرب جنگ و جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے شعر اور اس کی روایت سے غافل ہو گئے تو وقتی طور پر اس کا چرچا ماند پڑ گیا لیکن جب رُجوع ہو گئے لیا

ان کے پاس شعری سرمائے کو محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔ نہ کسی شاعر کا کوئی دیوان تھا نہ ان کی کوئی ادبی تصنیف تھی جو کچھ ان کے پاس تھا۔ وہ سینے اور حافظے میں محفوظ ہوتا تھا غزوات میں چونکہ عربوں کی معقول تعداد دونوں جانب سے موت سے ہمکنار ہو چکی تھی اِس لیے یہ ادبی سرمایہ ان کی موت کے ساتھ ہی ناپید ہو گیا۔ اور صرف وہی محفوظ رہا جو بقیۃ السلف کے سینوں میں محفوظ تھا۔

حضرت عمرؓ اور شعر

حضرت عمر فاروق شاعری کا نہایت عمدہ اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے آپ فرمایا کرتے کہ اہلِ عَرب کا بہترین فن شعر گوئی ہے انسان اپنی ضروریات میں شعر سے کام لیتا ہے۔ شعر سخی کو مائل اور بخیل کو مہربان بنا دیتا ہے۔
بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"بیٹیا، اپنا نسب یاد رکھو تاکہ تمہارے ادب میں اضافہ ہو، کیونکہ جو شخص اپنے نسب سے واقف نہیں، وہ صلۂ رحمی نہیں کر سکتا اور جسے اچھے اچھے شعر یاد نہیں وہ کوئی بھی حق ادا نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ادب حاصل کر سکتا ہے"

اہلِ شام کو آپ نے تحریر فرمایا۔
فتوحات کی کثرت ہو گئی اور اہلِ عرب شہروں میں مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تو پھر روایت

شعر کی طرف

"اپنے بچوں کو کتابت، تیراکی، تیر اندازی اور شہ سواری سکھاؤ، انہیں حکم دو کہ گھوڑوں پر کود کر چڑھیں اور مشہور امثال و اشعار یاد کریں۔

حضرت ابو موسیٰ کو ایک خط میں لکھا اپنے پاس والوں کو شعر سیکھنے کی رغبت دلاؤ کیونکہ شعر بلند اخلاق درست رائے اور معرفتِ انساب سکھاتا ہے۔"

ایک موقعہ پر فرمایا۔

"عفیف شعر اور اچھی باتیں یاد کرو اور انساب کی روایت کرو تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو اور صلہ رحمی کر سکو کیونکہ بہت سی نا معلوم قرابتیں معلوم ہو گئیں تو پہچان لی گئیں اور یہ صلہ رحمی کی دلیل ہے اس طرح عُمدہ اشعار مکارم اخلاق پر دلیل ہیں اور برے اخلاق سے روکتے ہیں۔"

برمحل اشعار پڑھنا

جو بات پیش ہوئی، آپ اس کے حسب حال فوراً موزوں ترین شعر سنا دیا کرتے تھے۔ اختصار کے ساتھ چند واقعات قارئین کے رُو برُو پیش ہیں جس سے اِس کا ثبوت مِل جاتا ہے اور ساتھ ہی آپ کی سُخن فہمی اور کمال ذوقِ شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک دفعہ آپ کے سامنے بنو اوس کی ایک دانا عورت (جس کا نام اوسیہ تھا) کا ذکر ہو رہا تھا جب حاضرین میں سے کسی نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ "اوسیہ" سے کسی نے پوچھا کہ منظر کونسا حسین ترین ہوتا ہے؟ تو اِس نے فوراً یہ جواب دیا تھا کہ "سبز باغات میں سفید محل کا منظر"

تو آپ نے سُنتے ہی فرمایا کہ عدی بن زید العبادی نے اس خیال کو زیادہ احسن طریقے سے بیان کیا ہے پھر آپ نے اس کا یہ شعر پڑھا۔

کدمی العاج فی المحاریب او کار

جیسے محراب میں ہاتھی دانت کے بُت دھرے ہُوں

بیض فی الروض زهرة مُستنیر

یا جیسے سفید محلّات پھُولوں سے لدے ہوئے باغ ہیں

اہلِ ذوق اندازہ کر سکتے ہیں کہ عدی کی تشبیہات لطیف تر اور کیف آور ہیں۔

(۲) ایک دفعہ آپ ایک اونٹنی پر سوار تھے، جو بڑی شریر تھی آپ اس کی شرارتوں سے تنگ تھے۔ آخر آپ نے دُوسری اونٹنی تبدیل کر لی جو بڑی سبک رفتار تھی۔ آپ نے یہ شعر پڑھا۔

کان راکبھا غصن بمروحة

گویا اس کا سوار پنکھے کے نیچے کی شاخ ہے جب وہ لگاتار حرکت

اذا استمرت به او شارب ثمل

یا نشّہ سے چُور شرابی ہے۔

ذرا نشہ سے چُور شرابی اور پنکھے کی ڈنڈی کی حرکت کو ذہن میں رکھیے اور اس کیفیت کا اندازہ لگائیے کہ دستی پنکھے کی ڈنڈی مٹھی میں قائم ہے لیکن کبھی دائیں جھکتی ہے۔ کبھی بائیں۔ اسی طرح شرابی جو نشہ سے چور ہے اور توازن قائم نہیں رکھ سکتا کبھی اِدھر ڈولتا ہے کبھی اُدھر۔ کتنی نادر تشبیہ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد مسلمانوں کی یہ کوشش رہی کہ گُفتہ شاعری کی بھی تطہیر کی جائے، چنانچہ شعراء کی نوک جھونک میں آپ حضرت حسان بن ثابت کو جواب دینے کے لیے آگے کر دیتے اور آپ لُطف اندوز ہوتے رہتے اور اختتام پر اپنی رائے کا اظہار فرماتے۔

چنانچہ جب آپ سے مختلف عرب شعراء کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ

"اس قافلے کا سالار بلاشبہ امراء القیس ہے کیونکہ سرچشمہ شاعری جو خشک پڑا تھا، اس میں امراء القیس نے بڑے نادر اور بصیر معنی ایجاد کیے"

حضرت مغیرہ بن شعبہ کو جب وہ کوفے کے گورنر تھے۔ آپ نے لکھا۔
" اپنے شہر کے شعراء سے وہ شعر سنو، جو انہوں نے اسلامی دور میں کہے ہیں"
نابغہ کا یہ شعر سن کر آپ نے فرمایا کہ وہ ایک عظیم شاعر ہے۔

حلفت فلم اترک لنفسک ریبۃ
ولیس وراء اللہ للمرء مذھب

میں نے قسم کھائی اور کوئی شک کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ انسان کے لیے اللہ سے بڑھ کر اور کون ہے۔
لوگوں نے آپ کے سامنے زہیر کا یہ شعر پڑھا۔

ولو ان حمداً یخلد الناس اخلدوا
ولکن حمد الناس لیس بمخلد

اگر نیکی کی بناء پر کوئی ہمیشہ زندہ رہتا تو وہ ضرور زندہ رہتے، مگر نیکی ہمیشگی نہیں بخشتی۔
تو آپ نے فرمایا بے شک وہ عظیم شاعر ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا۔ کیسے؟ اس کی کیا دلیل ہے؟ تو آپ نے وضاحت کی کہ وہ مغلق کلام نہیں لاتا ہے، نامانوس اشعار و الفاظ سے بچتا ہے اور اس وقت تک کسی کی مدح نہیں کرتا جب تک کہ اس میں وہ وصف نہ پایا جائے۔
لیکن جب لوگوں نے آپ کے سامنے زہیر کے وہ اشعار سنائے جو اس نے ہرم بن سنان کی تعریف میں کہے تھے۔ اور اس کی تمام خوبیاں بدرجہ احسن اس میں گنوائی گئی تھیں تو آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ ان صفات اور خوبیوں کی حامل تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہی ہو سکتی ہے اس قصیدے کی خوبی کا اندازہ صرف اس شعر سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

لوکنت من شئی سوی لبشر

اگر تو انسان کے سوا کچھ اور ہوتا

کنت المنوّر لیلۃ البدر

تو پھر چودھویں کا چاند ہوتا

کیا خبر کہ حضرت جلیل مانک پوری نے اسی سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا ہو۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

غرض کہ حضرت عمرؓ بلند خیالی کے مدّاح تھے۔ شعر کی لطافت اور نازک خیالی سے آشنا تھے اور بے ساختہ اس شعر کی داد دیتے تھے جو سچائی کا علم بردار ہو۔

فاروقِ اعظمؓ کی شہادت

ترتیب : خورشید احمد شیخ

ماہ ذوالحجہ ۲۳ھ کا واقعہ ہے ایک دن حضرت عمرؓ حسبِ معمول فجر کی نماز پڑھانے مسجدِ نبوی میں تشریف لائے آپ کے ہاتھ میں دُرہ تھا جو کبھی آپ سے علیحدہ نہ ہوتا تھا۔ آپ صفوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنی جگہ پر پہنچ گئے پہلے صفیں سیدھی کرائیں اس کے بعد اللہ اکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی یکایک مغیرہ بن شعبہ کا غلام، ابولؤلؤ، جو نمازیوں میں شامل تھا ایک دو دھاری خنجر لئے آگے بڑھا اور نہایت پھرتی سے آپ پر چھ وار کئے جن میں سے ایک ناف کے نیچے لگا۔ امیرالمومنین اسی وقت زمین پر گر پڑے

یہ حملہ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا کہ لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صفیں درہم برہم ہوگئیں لیکن کچھ دیر کے بعد لوگوں کو ہوش آیا اور بعض دلیر آدمی ابولولوٗ کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے لیکن اس نے دائیں بائیں خنجر چلانا شروع کر دیا جس سے تیرہ آدمی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ آخر ایک شخص نے آگے بڑھ کر پھرتی سے اپنا کمبل اس پر ڈال دیا اور اسے قابو میں کر لیا جب ابولولوٗ کو یقین ہو گیا کہ وہ اب بچ کر نہیں نکل سکتا تو اس نے اسی خنجر سے خودکشی کر لی۔

جب لوگ حضرت عمرؓ کی جانب بڑھے تو دیکھا کہ آپ کے خون سے تمام زمین سُرخ ہو رہی ہے انہوں نے آپ کی مرہم پٹی کرنے کا ارادہ کیا لیکن آپ نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور فرمایا۔

"کیا تم میں عبدالرحمٰن بن عوف موجود ہیں؟"

"عبدالرحمٰن لوگوں کو چیرتے آگے بڑھے اور کہا۔

"امیرالمومنین میں حاضر ہوں"

حضرت عمرؓ نے فرمایا

"آگے آجاؤ نماز پڑھاؤ"

چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے مختصر سی نماز پڑھائی لوگوں کی نظریں حضرت عمرؓ کی طرف تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ زمین پر ٹیک لگا کر نمازیوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں۔

جب نماز ختم ہو گئی تو لوگ آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر لے آئے اس وقت تمام آنکھیں اشکبار تھیں اور سب کے دل خون ہو رہے تھے۔

میغرہ بن شعبہ کا غلام ابولولوٗ فیروز نہاوند کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک روز بازار میں امیرالمومنین سے ملا اور کہنے لگا۔

"میرے آقا نے میری طاقت سے زیادہ مجھ پر محصول مقرر کر رکھا ہے۔ آپ کم کرا دیجیئے"

حضرت عمرؓ نے پوچھا

"تمہارا محصول کیا ہے"

اس نے کہا "دو درہم روزانہ"

آپ نے پوچھا

"تم کام کیا کرتے ہو"

اس نے کہا

"نجاری، نقاشی، آہن گری۔"

امیرالمومنین نے کہا۔

"تین پیشے تمہارے ہاتھ میں ہیں"، اس حال میں بھی تم شکایت کرتے ہو۔ میرے خیال میں تو یہ رقم تمہارے پیشوں کے مقابلہ میں زیادہ نہیں ہے۔"

باتوں باتوں میں امیرالمومنین نے ابولولؤ سے پوچھا۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ تم چکیاں بنانا جانتے ہو۔"

اس نے جواب دیا

"جی ہاں۔"

آپ نے فرمایا

"تو مجھے ایک چکی بنا دو"

ابولولؤ نے جواب دیا۔

اگر میں زندہ رہا تو ایسی چکی بنا دوں گا جس کی شہرت مشرق و مغرب تک پھیل جائے گی" یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا حضرت عمرؓ کی نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا اور آپ نے فرمایا "اس غلام نے مجھے دھمکی دی ہے۔"

عبدالرحمن بن ابی بکر بیان کرتے ہیں کہ حادثہ سے پہلے رات کو انہوں نے ہرمزان، جفینہ نصرانی اور ابولولؤ کو آپس میں سرگوشیاں کرتے دیکھا۔ ان لوگوں کی نظر جب آپ پر پڑی تو گھبرا گئے۔ اسی گھبراہٹ میں ان میں سے ایک ہاتھ سے ایک خنجر چھوٹ کر زمین پر گر پڑا جس کی دو دھاریں تھیں۔ یہ خنجر بعینہٖ وہی خنجر تھا جس سے ابولولؤ نے امیرالمومنین پر حملہ کیا تھا۔

اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تینوں نے حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کی سازش کی تھی ورنہ رات کے اندھیرے میں عجمی ایرانی، عربی عیسائی اور ایرانی غلام کو ایک جگہ جمع

ہو کر آپس میں سرگوشیاں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ حالانکہ ہرمزان نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ ہرمزان ان ایرانی سپہ سالاروں میں سے تھا۔ جنہیں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے شکست دی تھی۔ شکست سے قبل ہرمزان ایرانیوں اور عراق کے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مسلمانوں کے خلاف آمادہ پیکار کرنے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھا۔ اس نے اسلام اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک اِس بات کا یقین نہ ہو گیا کہ اس کا قتل یقینی ہے اور بچاؤ کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ اسلام لے آئے اس نے بار بار مسلمانوں سے معاہدے کئے کہ وہ آئندہ ان سے جنگ نہیں کرے گا لیکن ہر بار وہ ان معاہدوں کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں سے معاہدے کئے کہ وہ آئندہ ان سے جنگ نہیں کرے گا۔ لیکن ہر بار وہ اِن معاہدوں کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں کے مقابلے پر آتا رہا۔ ایسے لوگ عربوں سے اپنی عداوت کو نہیں چھپا سکتے تھے۔ نہ کبھی یہ بات ان کے ذہن سے محو ہو سکتی تھی کہ مسلمانوں نے شاہان کسریٰ کی عظیم الشان سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور ایران کے دیار و امصار پر قابض ہو گئے۔

جفینہ عیسائی نجران کا رہنے والا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اِسے وہاں سے اس لیے لے آئے تھے کہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایسے وقت میں جب کہ وہ ایرانیوں اور رومیوں سے مصروف پیکار تھے۔ نجران کے عیسائیوں کو جزیرہ عرب سے نکال کر اور انہیں نقل مکانی کا معاوضہ دے کر شام اور عراق میں آباد کر دیا تھا، اِس لیے کہ آپ کو اندیشہ تھا کہ ایسے نازک موقع پر یہ عیسائی نقض عہد نہ کر بیٹھیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ہرقل کے لشکروں کو زبردست شکست دی۔ ہرقل عیسائی تھا۔ اِس لیے عین ممکن ہے کہ جفینہ عیسائی بھی اپنے دل میں مسلمانوں کے خلاف کینہ لیے ہوئے ہو اور کچھ عجب نہیں کہ وہ ہرمزان کو اپنا حلیف پا کر اس کے ساتھ اس سازش میں شریک ہوا ہو۔

زخم کھانے کے بعد حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ ان کا قاتل کون ہے؟ جب آپ کو

پتہ چلا کہ قاتل ابو لولؤ ہے تو آپ کو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور فرمایا کہ الحمد للہ میرا قاتل اپنی زبان سے لا الہ الا اللہ کہنے والا مسلمان نہیں ہے۔"

مزید اطمینان کے لیے آپ نے ایک صحابی کو پوچھ گچھ کرنے بھیجا۔ وہ مہاجرین اور انصار سے جا کر پوچھتے تھے کہ کہیں قاتل ان میں سے تو نہیں؟ وہ روتے ہوئے نفی میں جواب دیتے یہ ہو بھی کس طرح سکتا تھا کہ کوئی مسلمان حضرت عمر بن الخطاب پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کر سکتا۔ آپ نے اسلام کو عزت بخشی آپ ہی کے عہد میں فتوحات پر فتوحات ہوئیں جن کے ذریعہ اسلام کا بول بالا ہوا۔ آپ ہی کے لشکروں نے قیصر اور کسریٰ کی عظیم الشان سلطنتوں کو روند ڈالا اور ہر جگہ اسلام کا طوطی بولنے لگا۔

جب لوگ آپ کو مسجد سے اٹھا کر گھر لائے تو طبیب آیا پہلے اس نے کھجوروں کا پانی آپ کو پلایا۔ لیکن وہ زخم کے راستے باہر نکل گیا اس کے بعد دودھ پلایا وہ بھی سارا کا سارا باہر نکل آیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر کو یقین آ گیا کہ اب ان کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ اس یقین کے بعد آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہلا بھیجا کہ وہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کے مزاروں کے پہلو میں دفن کرنے کی اجازت دے دیں حضرت عائشہ نے فرمایا۔

"یہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی لیکن میں اسے عمرؓ کے لیے قربان کرتی ہوں۔"

حضرت عمرؓ یہ سن کر بہت خوش ہوئے لیکن اپنے بیٹے عبداللہؓ کو بلا کر فرمایا۔

میں نے حضرت عائشہؓ سے کہلا بھیجا تھا کہ وہ مجھے اپنے دوستوں کے پاس دفن کرنے کی اجازت دے دیں۔ چنانچہ انہوں نے اجازت دے دی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں انہوں نے خلافت کے اثر یا تکلیف سے اجازت نہ دے دی ہو اس لیے جب میں مر جاؤں تو مجھے غسل اور کفن دے کر میرا جنازہ ان کے دروازے پر لے جانا اور کہنا۔

عمر اجازت چاہتا ہے کہ اسے اپنے کے حجرہ میں اس کے دو محترم رفیقوں کے برابر دفن کیا جائے اگر وہ اجازت دے دیں تو مجھے وہاں دفن کر دینا ورنہ جنت

البقیع لے جانا"۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ والد کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے بعد ہم ان کا جنازہ حضرت عائشہ کے حجرہ کے قریب لے گئے اور ان سے اجازت طلب کی انہوں نے خوشی سے اجازت دے دی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے پہلو پر دفن کئے گئے حضرت ابوبکر صدیق رسول اللہ کے کندھوں کے برابر دفن کئے گئے تھے اور حضرت عمر آپ کے پہلو کے متوازی۔

حضرت عمر کی وفات تریسٹھ سال کی عمر میں ہوئی تھی آپ کو ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ بروز اتوار دفن کیا گیا۔ آپ کی کل مدت خلافت دس سال پانچ مہینے اور اکیس دن ہے۔

آپ کو تین بار پانی اور بیری کے پتوں سے نہلایا گیا آپ نے وصیت کی تھی کہ انہیں مشک سے نہ نہلایا جائے نماز جنازہ مسجد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزار اور منبر کے درمیان ادا کی گئی۔

نماز جنازہ کے وقت حضرت عبداللہ بن سلام حاضر نہیں تھے وہ اس وقت پہنچے جب نماز ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے لوگوں سے کہا۔

تم نے میرے آنے سے پہلے نماز پڑھ لی ہے لیکن تم عمر کی تعریف کرنے میں مجھ سے سبقت نہ لے جا سکو گے۔

یہ کہہ کر آپ نے کہا۔

اے عمرؓ! تم بہترین اسلامی بھائی تھے حق کے بارہ میں بے حد سخی اور باطل کے بارہ میں بے حد بخیل تھے۔ رضا کے موقع پر راضی ہوتے تھے اور ناراضی کے موقع پر ناراض، تمہاری آنکھ عفیف تھی تمہارا ظرف بہت اعلیٰ تھا۔ نہ تم کسی کے مداح تھے۔ اور نہ غیب گو"۔

حضرت علی آپ کے جنازہ پر آئے اور فرمایا "دنیا میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ شخص تھا جو اس کپڑے میں لپٹا ہوا ہے[1]

---

[1] یہ روایت محمد بن سعد نے اپنی طبقات میں مختلف اسناد سے الفاظ کے بہت تھوڑے اختلاف کے ساتھ تیرہ مرتبہ بیان کی ہے۔

ام ایمن نے آپ کی وفات کے موقعہ پر روتے ہوئے کہا۔
"اب اسلام کمزور ہو گیا"۔
زید بن وہب روایت کرتے ہیں کہ ہم عبداللہؓ بن مسعود کے پاس آئے۔ حضرت عمرؓ کا ذکر چل پڑا جس پر وہ رو پڑے۔ اتنا روئے کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی اور آپ نے کہا عمرؓ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تھا جس میں لوگ داخل تو ہو جاتے تھے لیکن نکلتے نہیں تھے لیکن جب ان کی وفات ہو گئی تو قلعہ کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی اور لوگ اسلام سے نکلنے لگے۔
سعید بن زید نے حضرت عمرؓ کی وفات کے دن روتے ہوئے فرمایا۔
آج میں اسلام پر روتا ہوں عمرؓ کی موت نے اسلام کی عمارت میں ایک ایسی دراڑ ڈال دی ہے جو قیامت تک نہیں بھری جا سکتی۔
یہ کہنے میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ کوئی امام آج تک ایسا نہیں گزرا جس پر خدا تعالیٰ نے اتنی برکت نازل کی ہو جتنی حضرت عمر پر نازل کی۔ تمام خلفاء اور عادل بادشاہ مل کر بھی وہ کام نہ کر سکے جو حضرت عمرؓ نے اکیلے کیا۔ آپ کا نام آج تک عدل و انصاف، جرأت اور حق پرستی میں ضرب المثل بنا ہوا ہے۔ آپ کے زمانے میں آپ کی ہیبت سے عرب اور عجم کانپتا تھا اور چار دانگ عالم میں آپ کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ آنے والے زمانے میں بھی ہمیشہ کے لیے آپ کا نام تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گیا ہے جو قیامت تک زندہ رہے گا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اُمّ المومنین
حضرت حفصہ رضؓ بنت عمر بن خطاب

تحریر
عذرا نسلیم

اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی بیوی اور خلیفہ ثانی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں حضرت عمر کے لیے اُن کی زندگی کا یہ پہلو انتہائی باعث افتخار و مسرت ہے کہ ان کی صاحبزادی کو نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے شرف زوجیت بخشا حضرت عمرؓ نے ہر موقع پر حضرت حفصہ کو رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور اطاعت کی ترغیب دلائی اور ہمیشہ حفصہ رضؓ کے مقابلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کو پیش نظر رکھا۔

حضرت حفصہ رضؓ بعثت سے پانچ برس قبل مکہ میں پیدا ہوئیں آپ کی والدہ کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ حضرت حفصہ کا پہلا نکاح مکہ ہی میں خنیس بن حذافہ سے ہوا تھا۔ خنیسؓ بن حذافہ کافی عرصہ قبل اسلام لا چکے تھے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی اصحاب میں سے ایک تھے خنیس ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے پہلے حبشہ کو ہجرت کی اور پھر بعد میں دُوسری مرتبہ مدینہ طیبہ کی طرف اسلام کی راہ میں ہجرت کرنے کی سعادت حاصل کی۔

خنیس بن حذافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور شجاعت اور پامردی کے جوہر دکھاتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ ان کی شہادت کے وقت حضرت حفصہ کا قیام مدینہ ہی میں تھا۔ قدرتی طور پر حضرت حفصہ نے ایام بیوگی انتہائی حزن و ملال کے ساتھ گزارے چنانچہ ان کے والد محترم حضرت عمر فاروق اعظم نے ان کی دوسری شادی کرنا چاہی۔

ان کی نظر انتخاب اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر پڑی لیکن جب انہوں نے ان سے اس سلسلے میں گفتگو چھیڑی تو حضرت ابوبکرؓ نے خاموشی اختیار کر لی۔ حضرت ابوبکرؓ کے اس رویے سے حضرت عمرؓ کو نہایت افسردگی اور ملال ہوا۔

بعد ازاں حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب انہوں نے حضرت عثمان سے، جن کی اہلیہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کا کچھ ہی عرصہ قبل انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا۔ کہ میرا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

چند دن بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انکار کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو حضور نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ میں تم کو حفصہ کے لیے عثمان سے بہتر شوہر اور عثمان کے لیے حفصہؓ سے بہتر بیوی بتاتا ہوں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے خود نکاح کیا اور حضرت عثمان کا نکاح اپنی صاحبزادی حضرت ام کلثوم سے کر دیا۔ نکاح کے وقت حضرت حفصہؓ کی عمر ۲۲ سال اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف ۵۵ سال تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ انتہائی مدبرانہ اور حکیمانہ تھا۔ اس میں تو خیر کوئی شک ہی نہیں کہ حضرت حفصہؓ کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر شوہر کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے نبی اور دو جہاں کے سردار ہیں اور دوسری طرف حضرت عثمان کیلئے بھی حضرت ام کلثوم سے بڑھ کر بہتر بیوی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ محبوب خدا کی صاحبزادی تھیں۔

حضرت حفصہؓ کے لیے یہ بات کچھ کم باعث فخر و انبساط نہ تھی۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی رضا و رغبت سے ان کے ساتھ رشتہ مناکحت استوار کیا اور حضرت عثمانؓ

اس پر جتنا بھی فخر کرتے کم تھا کہ محبوب خدا نے اپنی صاحبزادی کو ان کے عقد میں دیا اور ان کو اپنی دامادی کا شرف بخشا۔

دوسری طرف ہم دیکھیں تو تدبر اور حکمت کے اعتبار سے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انتخاب اپنی مثال آپ ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں خلفائے اربعہ کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے اس کی وضاحت کے لیے دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں ہے آپ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ یہی چاروں اصحاب بعد میں خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے اور تحریک اسلامی کے عظیم علمبردار ثابت ہوں گے چنانچہ ان چاروں اصحاب میں سے تین کے ساتھ اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف زوجیت حاصل کر چکی تھیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دولت کدہ کو یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیوں کے نور سے فروزاں کیا۔ کاشانہ علی کو فاطمہ کے وجود سے رونق بخشی۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کیونکر اس حلقے سے باہر رہ سکتے تھے چنانچہ آپ نے ان کی صاحبزادی سے عقد کر کے ان کو بھی اس حلقہ قرابت میں شامل کر لیا۔ یہی چاروں اصحاب آگے چل کر حضور کے خلیفہ اور مسلمانوں کے امیر بنے یوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی بصیرت اور سیاسی حکمت و تدبر کی کھلی اور روشن دلیل لوگوں کے سامنے آ گئی۔

جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا۔ تو ایک روز حضرت ابوبکر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جب تک تم نے مجھ سے حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ذکر کیا تھا۔ اور میں نے خاموشی اختیار کی تھی تو شاید تمہاری طبیعت پر گراں گزرا ہو۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے نکاح کا ذکر کر چکے تھے۔ اس لیے نہ تو میں قبول کر سکتا تھا اور نہ ہی حضور کے راز کو افشاء کرنا میرے لیے ممکن تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ کہ

مجھے اس سے پہلے ابوبکرؓ کے سکوت کا عثمانؓ کے انکار سے بھی زیادہ رنج تھا لیکن پھر یہ رنج باقی نہ رہا۔

بلاشبہ حضرت حفصہؓ کی زندگی کے وہ لمحات انتہائی درخشندہ اور ان کی پوری زندگی کا ماحصل تھے جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں رہکر گزارے۔

تمام اُمہات المومنین کی طرح حضرت حفصہؓ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آرام و آسائش کا حد سے زیادہ خیال رکھتیں ——— اور آپ کی خدمت و اطاعت میں کوئی دقیقہ بھی فروگزاشت نہ کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ اسی جذبے کے تحت آپ نے رسول اللہ کے بستر کو دوہرا کرکے بچھا دیا تھا تاکہ جسم مبارک کو کچھ نرم اور گداز محسوس ہو۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حفصہؓ! تم نے میرے بستر کو زیادہ نرم اور آرام دہ بنا دیا۔ یہ نرم بستر میری شب بیداری میں مانع ہوا۔ اس لیے اس کو اسی طرح دوہرا کرکے بچھا دو۔ کہ روزانہ بچھا کرتا ہے۔

حضرت حفصہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلمؐ کے ساتھ انتہائی سادگی سے زندگی بسر کی۔ آپ کے گھر میں ٹاٹ کا ایک معمولی فرش تھا جس پر دو جہان کے سردار استراحت فرماتے تھے۔ کئی کئی دن گھر میں ایسے گزر جاتے تھے کہ آگ بھی نہ جلتی تھی۔ صرف کھجور اور پانی پر گزارا ہوتا تھا لیکن ان کو زوجۂ مطہرہ اور اُم المومنین ہونے کی جو دولت حاصل تھی، اس کے سامنے یہ تمام مصائب، ہیچ تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت حفصہ کو وقتاً فوقتاً ان کے اِس مقام و مرتبہ سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ جو ان کی زوجۂ مطہرہ ہونے کی وجہ سے حاصل تھا۔ انہوں نے کسی بھی موقع پر حضرت حفصہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کے خلاف کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ آپ گاہے گاہے وہ فرائض خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی تلقین فرماتے تھے جو اُم المومنین ہونے کی وجہ سے ان پر عائد تھے۔

ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وجہ سے ناراض ہو کر ایک ماہ کے لیے ازواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حفصہؓ

کو بہت زجرو توبیخ کی۔ اسی دوران میں ایک روز حضرت عمرؓ نے درِ دولت پہ حاضری دی۔ دربان نے اندر جانے سے روکا تو آپ نے فرمایا کہ قسم ہے۔ اس پاک ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں ہرگز حفصہؓ کی سفارش کے لیے نہیں آیا۔ بلکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں تو میں حفصہ کی گردن اڑا دوں کیا اطاعت، فرمانبرداری اور عشق رسولؐ کی اس سے زیادہ درخشاں نظیر کہیں ملتی ہے؟

حضرت حفصہؓ نہایت عابدہ، زاہدہ تھیں اور پرہیزگاری اور تقویٰ میں تمام امہات المومنین پر فضیلت اور فوقیت رکھتی تھیں۔ دن کو اکثر روزے رکھتیں اور رات کو عبادت خداوندی میں مصروف رہتیں۔

زہد اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ اس باب میں حضرت جبرئیل نے بھی آپ کی مدح سرائی کی جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور نے ان کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا اس پہ حضرت جبریل نے فرمایا کہ آپ ایسا قصد نہ فرمائیں کیونکہ یہ دن کو روزے رکھتی ہیں اور راتیں اپنے خالق کے ساتھ راز و نیاز میں بسر کرتی ہیں چنانچہ حضورؐ نے ارادہ بدل دیا۔

آپ حد سے زیادہ مہمان نواز اور با اخلاق تھیں اگر گھر میں کوئی مہمان آجاتا تو اس کو رحمت خداوندی تصور کرتیں اور ہر طرح سے اس کی خاطر تواضع میں مصروف رہتیں ایک مرتبہ آپ کے والد ماجد حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے گھر تشریف لائے آپ نے سالن میں زیتون کا تیل ملا کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔

حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہ کے درمیان عام سوکنوں جیسے تعلقات نہ تھے بلکہ دونوں کے درمیان وہی پیار، وہی محبت اور وہی اخوت تھی جو ان کے والدین محترمین حضرت فاروق اعظم اور حضرت صدیق اکبر کے درمیان تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضور نے ازواج کے درمیان عدل اور مساوات کی ایک نظیر قائم کر دی تھی۔ ایک ایسی نظیر جو رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ امہات المومنین کی کبھی آپس میں معمولی نوک جھونک بھی نہ ہوئی تھی۔ یہ وہ عام سوکنیں نہ تھیں بلکہ یہ آقائے دو جہان

صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اور فاروق اعظم اور صدیق اکبر کی اولادیں تھیں۔

حضرت حفصہؓ کی صلۂ رحمی بھی ضرب المثل ہے۔ آپ مساکین اور یتامیٰ کی ہر ممکن امداد سے بھی دریغ نہ کرتی تھیں۔ ضرورتمند قرابت داروں کی اعانت کا خاص طور پر خیال فرمایا کرتی تھیں۔ آپ نے اپنا گھر اپنی چچازاد بہن، حضرت زیدؓ بن خطاب کی بیٹی کو عمر بھر کے لیے دے دیا تھا۔

حضورؐ کے وصال کے بعد آپ کی جدائی کا حضرت حفصہؓ پر بے انتہا اثر ہوا تھا اور آپ گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ لوگوں سے بہت کم ملتی جلتی تھیں، اکثر و بیشتر آپؐ کے ساتھ گزاری ہوئی لطیف ساعتوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتیں۔

جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو حضرت عمرؓ کے ایماء پر آپ نے پہلی بار قرآن کے تمام اجزا کتابی شکل میں ایک جگہ جمع کر لئے۔ قرآن پاک کا یہ نادر نسخہ حضرت حفصہؓ ہی کے پاس امانت کے طور پر محفوظ تھا۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے جمادی الاوّل ۴۱ ہجری میں وفات[2] پائی۔ عمرِ مبارک اُنسٹھ سال تھی آپ کا روضہ اطہر مدینہ منورہ میں ہے۔

---

[1] بعض روایات کے مطابق خنیسؓ بن حذافہ جنگ اُحد میں شدید زخمی ہوئے اور اسی حالت میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

[2] بعض روایات کے مطابق حضرت حفصہؓ کا سنِ وفات ۴۵ ہجری ہے۔ (ادارہ)

حضرت عبداللہ بن عمر فاروق اعظم
کے
نامور
فرزند

تحریر: اختر راہی

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ بن الخطاب کا پہلا نکاح عثمان بن مظعون کی بہن زینبؓ سے ہوا۔ عثمان بن مظعون نے ۲ھ میں وفات پائی تھی اور اولین حلقہ بگوشانِ اسلام میں سے تھے۔ حضرت زینبؓ بھی حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر فوت ہوئیں اُن کے دوسرے بھائی قدامہؓ بن مظعون کا شمار بھی اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔

حضرت زینبؓ بنت مظعون کے بطن سے حضرت عمرؓ کی اولاد میں سے حضرت عبداللہ اور ام المومنین حضرت حفصہؓ تھیں۔ حضرت عمرؓ کے باقی پانچ بیٹے دوسری ازواج سے تھے[1]

حضرت عبداللہ کی تاریخ پیدائش میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق غزوہ بدر کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی[2] اس لحاظ سے وہ نبوت کے دوسرے سال مطابق ۶۱۱ عیسوی میں پیدا ہوئے حضرت عمرؓ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تو عبداللہ بن عمرؓ کو ایک ایسے خاندان میں تربیت پانے کی سعادت حاصل

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوا الفاروق شبلی نعمانی

[2] طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۲۸۵ (اُردو ترجمہ)

ہوئی جو اللہ و رسولؐ سے اُسے بے پناہ محبت رکھتا تھا اور یہی محبت ان کی زندگی میں جاری و ساری رہی۔

مکہ کے مشرکین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں پر اعلائے کلمتہ الحق کے "جرم" میں ظلم و تشدد شروع کر رکھا تھا آخر اپنے دین و ایمان کی مضبوطی کا ثبوت دینے کے لیے اہلِ ایمان کو دُنیا کے تمام مادی رشتے کاٹ دینے پڑے۔ اعزہ و اقربا اور وطن سے دُور مدینہ منورہ چلے گئے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کمسنی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ سفرِ ہجرت اختیار کیا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد جس قدر غزوات اور سرایا ہوئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان میں بہادرانہ کارنامے انجام دیئے جنگِ خندق میں اُن کی شمولیت پر بکثرت روایات ملتی ہیں ۶ھ میں بیعتِ رضوان کا اہم واقعہ پیش آیا۔ ابن قتیبہ کی روایت کے مطابق بیعتِ رضوان میں سب سے پہلے حضرت عبداللہ نے اپنا ہاتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں دیا تھا۔

اگرچہ صلح حدیبیہ دس برس کے لیے تھی مگر قریش نے دو برس کے اندر ہی معاہدہ توڑ دیا اور مسلمانوں پر تشدد شروع کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کی۔ حضرت عبداللہ تیز رو گھوڑے پر سوار اور نیزہ ہاتھ میں تھامے شریک حملہ دکھائی دیتے ہیں راستے میں ایک منزل پہ اپنے گھوڑے کے لیے چارہ کاٹ رہے تھے۔ رسولؐ اللہ آ گئے۔ اور انہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ یہ عبداللہ ہیں عبداللہ"

نبی اکرمؐ کو اُن سے بے پناہ محبت تھی اس کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے۔ کہ فتح مکہ میں نبی اکرم انہیں ساتھ لیے ہوئے تھے۔ اور حرم پاک میں داخل ہونے والے چوتھے شخص حضرت عبداللہ تھے۔ فتح مکہ کے بعد حنین طائف اور تبوک کے غزوات میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔

حضرت ابوبکر صدیق کے عہدِ خلافت میں مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف مہمات میں حضرت خالدؓ بن ولید کے زیر قیادت حصہ لیا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں جنگ ہائے ایران میں

شامل تھے مشہور جنگ نہاوند میں اُنہوں نے شرکت کی تھی۔ عہد شیخینؓ میں حضرت عبداللہ کی عسکری زندگی نمایاں نہیں ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ حضرت عمرؓ کا اپنے خاندان کے بارے میں سخت گیرانہ طرزِ عمل تھا حضرت عمرؓ اپنے خاندان کے افراد کو کلیدی مناصب دینا پسند نہ کرتے تھے اس لیے انہوں نے حضرت عبداللہؓ کو کسی لشکر کا سالار وغیرہ نہ بنایا۔ حتیٰ کہ انتخاب خلیفہ کے لیے جن با اعتبار حضرات کے نام تجویز کیے تھے۔ اُن میں سے حضرت عبداللہؓ کے خلیفہ چنے جانے کے حق کو ختم کر دیا تھا وہ صرف مشیر کے طور پہ اپنا مشورہ پیش کر سکتے تھے۔

حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں (۲۷ھ) حضرت سعیدؓ بن العاص کی زیر قیادت فتوحات افریقہ میں حصہ لیا۔ اس طرح ۳۰ھ میں خراسان اور طبرستان کے معرکوں میں شریک ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا نصف آخر افراتفری اور فتنہ پردازی کا زمانہ تھا حضرت عبداللہ اپنے زہد و تقویٰ اور معاملہ فہمی کی وجہ سے حضرت عثمان کے معتمد اور مخلص رفقاء میں سے تھے۔ انہوں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیٹی بنائی تھی اس میں حضرت عبداللہ شریک تھے۔

شہادت عثمانؓ کے بعد دار الخلافہ مدینہ اور بیرون مدینہ میں سخت ہیجان برپا تھا۔ ایک جماعت حضرت عبداللہ کو خلیفہ بنانا چاہتی تھی۔ وہ جماعت اُن کے پاس گئی اور عرض کی آپ امیر اور امیر زادے ہیں ہم سب آپ کی بیعت کرتے ہیں آپ نے فرمایا میں خلافت کے لیے مسلمانوں کا قتل برداشت نہیں کر سکتا۔ ارکان جماعت نے زور دیا کہ آپ ہماری پیش کش قبول کر لیجئے آپ نے فرمایا میں ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ ارکان جماعت نے کہا کہ اگر آپ قبول نہ کریں گے تو قتل کر دیئے جائیں گے! فرمایا مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

حضرت علی کے زمانے میں انتشار میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ مسلمانوں کے متحارب گروہ ایک دوسرے کے خلاف صف بستہ تھے۔ جنگ جمل اور صفین کے سانحے ہوئے حضرت عبداللہ اس عرصے میں غیر جانبدار تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُمتِ مسلمہ کا انتشار و اختلاف ختم ہو اور امتِ مسلمہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے۔ حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ کے

اختلاف رفع کرنے کے لیے دومۃ الجندل کی مشہور "مجلس تحکیم" منعقد ہوئی۔
اس میں حضرت علیؓ کے نمائندے حضرت ابوموسیٰ اشعری نے تو نئے خلیفہ کے طور پر حضرت عبداللہؓ کا نام تجویز کیا تھا لیکن یہ مجلسِ تحکیم کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی تھی اور اختلاف ختم نہ ہو سکا تھا۔
حضرت علی کی دردناک شہادت کے بعد سات ماہ حضرت حسن خلافت پر متمکن رہے۔ ۴۱ھ میں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری اختیار کی اور متحارب گروہوں کو باہم مربوط کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں حضرت عبداللہؓ نے معرکہ قسطنطنیہ میں شمولیت کی جس کے بارے میں نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ جو لوگ اس معرکہ میں شریک ہوں گے وہ مغفور ہیں حضرت معاویہؓ حضرت عبداللہؓ کی سردارانہ صلاحیتوں اور فہم و تدبّر کے معترف تھے۔
ان کی وفات کے بارے میں تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاج بن یوسف کو ان سے کد تھی اور وہ انہیں ختم کرانا چاہتا تھا کیونکہ حضرت عبداللہؓ اُسے غلط اقدامات پر ٹوکتے رہتے تھے علامہ شبلی کہتے ہیں۔

"ایک دفعہ حجاج بن یوسف کعبہ میں خطبہ پڑھ رہا تھا عین اسی حالت میں حضرت عبداللہؓ نے کھڑے ہو کر کہا کہ یہ خدا کا دشمن ہے کیونکہ اُس نے خدا کے دوستوں کو قتل کیا ہے چنانچہ اُس کے انتقام میں حجاج نے ایک آدمی کو متعین کیا جس نے اُنہیں مسموم آلہ سے زخمی کیا۔ اور اُس زخم سے بیمار ہو کر ۷۳ھ / ۶۹۳ء میں وفات پائی۔"

حضرت عبداللہؓ نے وصیت کی تھی کہ انہیں حدود حرم سے باہر دفن کیا جائے کیونکہ جس سرزمین سے ہجرت کی تھی اُس میں دفن ہونا اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن وفات کے بعد یہ آرزو بھی حجاج نے پوری نہ ہونے دی اور جنازہ پڑھا کر "فخ" کے مقام پر دفن کر دیا۔
حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فقہ و حدیث میں بلند پایہ رکھتے ہیں اور مدینہ کے اُن سات صحابہؓ میں سے ایک ہیں جن سے علم حدیث کی سب سے زیادہ روایات مروی ہیں۔

بخاری و مسلم میں اُن کی روایات اور مسائل بکثرت ہیں۔ اُن سے مروی احادیث کی مجموعی تعداد ۱۶۳۰ ہے۔ روایات کی کثرت کی وجہ یہ ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ باتوں کو غور سے سنتے اور ذہن نشین کرتے تھے۔ نبی اکرم کی وفات کے بعد تقریباً ساٹھ سال زندہ رہے۔ اس عرصے میں سینکڑوں افراد نے اُن سے احادیث سنیں۔ مدینہ منورہ میں اُن کا حلقہ درس خاصا وسیع تھا۔

جملہ محدثین کے نزدیک حدیث کے دو سلسلے سب سے زیادہ مستند ہیں اور محدثین اُن سلسلوں کو زنجیر زر (سلسلۃ الذہب) کا نام دیتے ہیں۔ یعنی اول وہ حدیث جس کی روایت امام مالک، نافع اور عبداللہ بن عمرؓ سے ہو۔ دوسری وہ حدیث جس کے سلسلہ میں زہری، سالم اور عبداللہ بن عمر واقع ہوں جس طرح فقہ حنفی حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایات پر مبنی ہے اس طرح فقہ مالکی کے موجد عبداللہ بن عمر ہیں۔ اُن کی روایات پر امام مالک کا دارومدار ہے حضرت عبداللہ فقہی مسائل میں نہایت محتاط تھے جب تک کسی مسئلہ کے بارے میں پورا یقین نہ ہو جاتا۔ فتویٰ نہ دیتے تھے۔ اُن کے فتاویٰ کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو سکتی ہے۔

اخلاق و آداب

حضرت عبداللہ بن عمر کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے اوصاف میں خشیتِ الٰہی، زہد و تقویٰ، حق گوئی و بے باکی، انفاق فی سبیل اللہ اور حُبِ رسول کے جذبات سب سے نمایاں تھے۔

قرآن کریم سے خصوصی شغف تھا اور اکثر قرآن کریم پڑھتے ہوئے اُن کی آنکھیں تر ہو جاتی تھیں جب کبھی آیت "الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ"
(کیا مومنوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل میں خشیت الٰہی پیدا ہو)
پڑھتے بے اختیار رونے لگتے۔ اُن کے فارغ اوقات کا بیشتر حصہ عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ رات کا بیشتر حصہ نوافل پڑھنے میں گزارتے اسی طرح عموماً روزہ رکھتے

البتہ حالتِ سفر میں روزہ رکھنے سے اجتناب کرتے تھے۔ ہر سال حج کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ اتباعِ سُنّت اور حُبِ رسول کا جذبہ بدرجہ اُتم ان میں موجود تھا ایک بار سفر میں کسی چرواہے کی بانسری کی آواز سُنی تو کانوں میں اپنی اُنگلیاں دے لیں اور سواری کو راستے سے موڑ لیا۔ اپنے غلام نافع سے پوچھتے جاتے تھے کہ ابھی تک آواز آ رہی ہے یا نہیں۔ فرمایا میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس طرح عمل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بشیر بن سیار سے مروی ہے کہ کوئی شخص سلام کہنے میں حضرت عبداللہ پر سبقت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں بازار صرف اِس لیے جاتا ہوں کہ مسلمانوں کو سلام کروں۔ روزمرہ معاملات میں اتباعِ سُنت کا خاص خیال رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اُس کے اظہار میں اُنہیں کوئی باک نہ تھا۔ اس سلسلے میں بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ایک مرتبہ حجاج خطبہ دے رہا تھا اور حضرت عبداللہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ نماز کے انتظار میں بیٹھے تھے اس نے خطبہ اس قدر طویل کر دیا کہ نماز کا وقت ختم ہونے کی طرف توجہ دلائی لیکن اُس نے خیال نہ کیا۔ اُنہوں نے دوبارہ کہا پھر بھی حجاج اپنی گفتگو میں مصروف رہا تیسری بار توجہ دلانے پر بھی حجاج نے پروا نہ کی تو حاضرین سے دریافت کیا کہ اگر میں کھڑا ہو جاؤں تو آپ لوگ بھی کھڑے ہوں گے؟ حاضرین نے اتفاق کیا۔ یہ رنگ دیکھ کر حجاج منبر سے نیچے اُتر آیا۔ نماز پڑھانے کے بعد حضرت عبداللہ سے وجہ پوچھی۔ انہوں نے فرمایا۔

"ہم لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں تمہاری خرافات سننے نہیں آتے"

انفاق فی سبیل اللہ میں کبھی لیس و پیش نہ کی ہر حال میں سائل کی مدد کرتے تھے۔ اور اسے واپس نہ جانے دیتے تھے۔ سادہ زندگی پر قناعت تھی میمون بن مہران بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ کے پاس گیا۔ اُن کے گھر کا اثاثہ اور اُن کے بدن کے کپڑے سو درہم سے بھی کم قیمت کے تھے۔ دوسری مرتبہ پھر اُن کے پاس گیا تو میں نے اتنا بھی نہ پایا کہ میرے لباس کے برابر ہوتا۔

فاروقِ اعظم

اور

حدیثِ نبویؐ

تحریر

پروفیسر خالد علوی

ہمارے ہاں ایک مخصوص طرزِ فکر کے لوگ حدیث کے متعلق بدگمانیوں کو مختلف طریقوں سے ہوا دے رہے ہیں انہوں نے قرآنِ مجید کی عظمت کے خوشنما الفاظ کے پردے میں حدیثِ پاک کی بساط لپیٹنے کی کوشش کی۔ اختلافِ روایت کو بہانہ بنا کر حدیثِ نبوی کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا جھوٹی حدیثوں کا بہانہ بنا کر حدیث کے خلاف زہر اگلا اور تدوینِ حدیث کے طریق کار کو محلِ نظر قرار دے کر ذخیرۂ حدیث کو عجمی سازش کا نام دیا لیکن ان سب سے زیادہ کامیاب حربہ اور کارگر تدبیر یہ سوچی گئی کہ اکابرینِ اُمت کو منکرینِ حدیث ثابت کیا جائے چنانچہ نظرِ انتخاب دو محتاط بزرگوں پر پڑی۔ ایک حضرت عمر فاروق اور دوسرے امام ابوحنیفہ[1] یہ دونوں بزرگ اُمت میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت عمرؓ اپنے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے بھی اور رسالتمآب سے تعلق و نسبت کی وجہ سے بھی مقدم ہیں اس لیے اس وقت ہم اس

---

[1] امام ابوحنیفہ کے رویۂ حدیث پر مولینا محمد علی کاندھلوی نے مفصل کتاب لکھی ہے "امام اعظم اور علمِ حدیث"۔

بحث کریں گے کہ آیا حضرت عمرؓ روایتِ حدیث کے مخالف تھے؟ کیا اشاعتِ حدیث میں ان کا انداز معاندانہ تھا؟ اس سے قبل کہ ہم اس کا علمی تجزیہ، تحقیقی اصولوں کے مطابق کریں اور ان کی جانچ پڑتال کر لینے کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ تمام اقوال اور اُمور مجتمع کریں، جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کے مخالف تھے اور وہ دلائل بھی سامنے رکھیں جن سے آپ کا مسلکِ انکارِ حدیث مترشح ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہم علامہ ذہبی کا وہ بیان لکھتے ہیں جو انہوں نے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت عمرؓ کے حالات میں لکھا۔

عن قرظہ بن کعب قال لما سیرنا الی العراق مشٰی معنا عمر وقال اتدرون لم شیعتکم؟ قالو انعم! مکرمۃ لنا قال ومع ذلک فانکم تاتون علی اھل القریہ لھم دوی کدوی النحل فلا تصدوھم بالاحادیث فتشغلوھم جودوا القرآن واقلوا الروایۃ عن رسول اللہ وانا شریککم فلما قدم قرظہ قالوا حدثنا! قال نھانا عمر[1]

قرظہ ابن کعب سے مروی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ہمیں عراق روانہ کیا۔ تو خود مشایعت کو نکلے اور فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ میں کیوں تمہارے ساتھ ساتھ آتا ہوں لوگوں نے کہا ہماری عزت افزائی کی۔ فرمایا ہاں! لیکن اس کے ساتھ یہ غرض بھی ہے کہ تم ایسے مقام میں جاتے ہو جہاں لوگوں کی آواز شہد کی مکھی کی طرح قرآن مجید پڑھنے میں گونجتی رہتی ہے قرآن کو تجوید سے پڑھو۔ تم ان کو حدیثوں میں نہ روک لینا کہ تم ان کو مشغول رکھو۔ اور حضور سے روایت کم کرو اور میں تمہارا شریک ہوں جب قرظہ پہنچے تو لوگوں نے کہا بیان کیجیے انہوں نے کہا ہمیں حضرت عمرؓ نے حدیث بیان کرنے سے منع کر دیا ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷ مطبوعہ مصر

عن ابی سلمة عن أبی هریرة قلت له کنت تحدث فی زمان عمر هکذا؟

فقال: لو کنت أحدث فی زمان عمر مثل ما أحدثکم لضربنی بمخفقته[1]

ابوسلمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ سے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اس طرح احادیث بیان کرتے تھے تو انہوں نے کہا اگر میں ایسے کرتا تو عمرؓ مجھ کو دُرّے مارتے۔

ان عمر حبس ابن مسعود و ابا الدرداء وابا مسعود الانصاری فقال قد أکثرتم الحدیث عن رسول اللہ[2]

حضرت عمرؓ نے عبداللہ ابن مسعودؓ، ابوالدرداؓ اور ابومسعود انصاری کو محبوس کیا اور اور کہا تم نے آنحضرت سے بہت زیادہ روایتیں بیان کرنا شروع کیں۔

اس سے ملتی جلتی باتیں علامہ ابن عبدالبر نے "جامع بیان العلم" میں بیان کی ہیں اسی کتاب میں مشہور محدث سفیان بن عیینہ کے حالات میں لکھا ہے کہ لوگ جب حلقہ حدیث میں آتے تو ان کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے۔

لو أدرکنا وایاکم عمر لا وجعنا ضربا[3]

اگر ہمیں اور تمہیں عمرؓ پا لیتے تو مار سے ضرور ڈراتے۔

تقریباً یہی باتیں ادل بدل کر پیش کی جاتی ہیں اور انہی پر منطقی استدلال کا تانا بانا بن کر لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی سے لے کر برق اور پرویز صاحب تک سب لوگ حضرت عمرؓ کو انکارِ حدیث میں امام قرار دیتے چلے آرہے ہیں یہ مسئلہ کوئی ایسا دقیق نہیں جس کے لیے گہرے فکر اور عمیق نظر کی ضرورت ہو، سرسری مطالعہ عبارات اور سیاق و سباق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ تاہم مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] [2] تذکرة الحفاظ ج ۱ ص ۷ مطبوعہ مصر [3] جامع علم البیان ج ۱ ص ۱۲۵

ہمارے علماء کرام نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے اور انہوں نے ایک طالب علم کے لیے تسلی بخش اشارات و توضیحات اکٹھی کر دی ہیں۔

عملاً تو ایسے تمام اقوال سے فقط یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کثرتِ روایت سے منع فرماتے ہیں لیکن سہولتِ تجزیہ کے لیے ہم اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

(ا) قرظہ بن کعبؓ، ابوہریرہؓ اور سفیان ابن عیینہ کے اقوال

(ب) حبس صحابہ کرام

(ا) سب سے پہلے ہم ان تین اقوال سے بحث کرتے ہیں۔

میں نے ان اقوال کو بار بار پڑھا اور ان سے گہرا مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے ان تینوں اقوال میں سے ایسے کسی انکارِ حدیث کا کوئی سراغ ملا نہ کسی قول سے مخالفت حدیث کی بو آئی۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ میرا ذہن اخذ کر سکا یہ ہے کہ حضرت عمر نے یہ سب احتیاط اس لیے کی کہ کہیں قرآن و حدیث میں اختلاط نہ ہو جائے۔

قرظہ بن کعب والی حدیث پر مولانا ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں۔

"معاذ اللہ یہ مطلب نہیں تھا کہ حدیثِ نبوی حجت نہیں ہے اور روایتِ حدیث گناہ ہے۔ ورنہ اگر یہ معنی ہوں تو مطلب یہ ہو گا کہ زیادہ روایت کر کے زیادہ گناہ مت کرنا تمہارا گناہ کرنے میں میں تمہارا شریک ہوں [۵]

اسے حضرت عمرؓ کا محتاط رویہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن انکارِ حدیث کا طرزِ عمل قرار نہیں دیا جا سکتا یہ رائے قائم کرنے میں میں اکیلا نہیں۔ تمام اکابرِ اُمت اور علمائے اُمت بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ خود علامہ ذہبی نے بھی جن کے حوالے سے تینوں اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ تنبیہاً جو کچھ فرمایا ہے۔ اسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

---

[۵] حجیتِ حدیث ص ۱۴۷ مطبوعہ لاہور

وقد كان عمرؓ من وجله یخشیٰ الصاحب علی رسول اللہ یا مرھم ان یقلوا الروایۃ
عن نبیھم ولئلا یتشاغل الناس بالاحادیث عن حفظ القرآن[6]

حضرت عمرؓ اس ڈر سے کہ صحابہؓ حضور سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں۔ ان کو حکم دیتے تھے کہ رسول اللہؐ سے روایت کم کریں تاکہ لوگ حدیث میں مشغول ہو کر حفظِ قرآن سے غافل نہ ہو جائیں۔

مورخ بلاذری نے "انساب الاشراف" میں روایت نقل کی ہے کہ لوگوں نے جب حضرت عمرؓ سے یہ مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا۔

لولا انی اکرہ ان ازید فی الحدیث او انقص منہ لحدثتکم بہ[7]

اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ روایت حدیث میں مجھ سے کمی بیشی ہو جائے گی تو میں تم سے حدیث بیان کرتا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے "ازالۃ الخفاء" میں حضرت عمرؓ کے قول کی تاویل کی ہے کہ اس سے مراد شمائل و عادات کی احادیث ہیں[8]

صاحب دارمی نے اپنی مسند میں قرظہ بن کعب کی حدیث نقل کر کے لکھا ہے کہ اس سے مراد غزوات کی خبریں ہیں[9] لیکن بقول علامہ شبلی یہ دور از کار تاویلات ہیں[10] حضرت عمرؓ کا یہ طرزِ عمل جس احتیاط پسندانہ حکمتِ عملی پر مبنی تھا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُمت کے اندر قرآن و حدیث کے درمیان فرق نمایاں ہے۔ نیز قرآن کی حفاظت اور احادیث کی تنقیح و تعدیل بھی بنیادی طور پر حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل کا نتیجہ تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل دراصل ہادی کونین کے عمل کا اتباع تھا کیونکہ خود حضورؐ حفاظت قرآن میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ تو متن حدیث کو فقیہانہ اور محدثانہ نظر سے جانچا بھی کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا اُمتِ مسلمہ پر یہ احسان ہے کہ

---

[6] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص۶ [7] انساب الاشراف بحوالہ الفاروق شبلی ج ۲ ص۲۷۷ مطبوعہ لاہور
[8] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص۱۴۱ [9] دارمی ص۴۵-۴۸ مطبع کانپور [10] الفاروق ص۲۷۶

انہوں نے کھرے اور کھوٹے، صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرنے کا قرینہ سکھایا۔ لیکن ان حضرات نے انہیں بھی منکرِ حدیث قرار دیا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ہمارے اس خیال کی تائید علامہ ابن عبد البر کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"جن لوگوں کو واقعات کا صحیح علم نہ تھا اور بدعات کے پیدا کرنے کا جن میں زیادہ شوق پایا جاتا تھا۔ سُنت سے جن قلوب میں گرانیاں تھیں انہوں نے مذکورہ بالا روایتوں سے جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں۔ یہ نتیجہ پیدا کرنا چاہا کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے ذہن سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کر دینا چاہتے تھے [۱]

علامہ ابن عبد البر نے اس پر بڑی مفصل بحث کی ہے۔ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ حضرت عمرؓ اکثار روایات سے مصلحتہً روکتے تھے کہ جھوٹ اور سچ کی آمیزش نہ ہو جائے۔ نیز قرآن و حدیث کی تمیز برقرار رہے۔ علامہ ابن عبد البر کے الفاظ یہ ہیں۔

ھذا یدل علی أن نھیہ عن الاکثار وأمرہ بالاقلال من الروایۃ عن رسول اللہ ﷺ انما کان خوف الکذب علی رسول اللہ وخوفاً أن یکون مع الاکثار [۲]

یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کا کثرتِ روایت سے منع کرنا اور کم روایت کا حکم دینا یہ صرف آنحضرت پر جھوٹ گھڑے جانے کا خوف تھا اور اس خطرے کے پیشِ نظر کہ کثرتِ روایت میں اس کے امکانات ہیں۔

آگے چل کر فرماتے ہیں۔

---

[۱] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۱ [۲] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۲

ولو کرہ الروایۃ وردمنہ النھی عن الاقلال منھا اوالاکثار[۱۳]

اگر آپ روایت ہی کو ناپسند کرتے تو قلت وکثرت دونوں کے متعلق نہی وارد ہوتی۔

صاحب جامع بیان العلم نے اس لطیف بحث میں عمدہ نکتہ بیان فرمایا ہے وہ کہتے ہیں کہ کثرت روایت کی مخالفت اور قلت روایت کا حکم حضرت عمرؓ نے اس لیے دیا تھا کہ کثرت کی صورت میں آنحضرتؐ کی طرف غلط بات منسوب ہو جانے کا اندلیشہ تھا اور یہ خوف بھی تھا کہ جو حدیثیں لوگوں کے پاس اچھی طرح محفوظ نہ ہوں اور حافظے پر بھی عبور نہ ہو تو لوگ محض قول بیان کرنے میں جری ہو جائیں گے۔ انہوں نے استدلال میں یہ بات فرمائی۔

ان ضبط من قلت روایتہ اکثر من ضبط المستکثر وھوالا بعد من السھو الغلط الذی لا یومن مع الاکثار[۱۵]

بے شک اس آدمی کا ضبط جس کی روایتیں کم ہیں اس آدمی سے زیادہ ہے جس کی روایتیں زیادہ ہیں اور کم روایت والا آدمی اس بھول اور غلطی سے بہت دور ہے جس سے کثرت روایت میں محفوظ نہیں رہا جا سکتا۔

اسی بنا پر آپ روایت قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔

مثلاً ایک دفعہ سقط کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا مغیرہؓ نے اس کے متعلق ایک روایت بیان کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کے لیے کوئی گواہ لاؤ محمد بن مسلمہ نے اس کی تصدیق کی تو فاروق اعظم نے تسلیم کر لیا[۱۶] اسی طرح حضرت عباس کے مقدمہ میں ایک حدیث پیش کی گئی تو آپ نے اس کی تائید کی شہادت طلب کی اور جب بہت سے لوگوں نے تائید کی شہادت دی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مجھ کو تمہاری نسبت بدگمانی نہ تھی لیکن میں نے حدیث کی نسبت اپنا اطمینان کرنا چاہا تھا[۱۷]

---

[۱۳] جامع بیان العلم ج ۲ صہ [۱۴] [۱۵] بخاری ج ا ص ۲۱ باب من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۱۶] [۱۷] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۸

ایک دفعہ ابوموسیٰ اشعری حضرت فاروق سے ملنے آئے اور تین بار استیذان کے طور پر کہا: السلام علیکم ابوموسیٰ حاضر ہے! حضرت عمرؓ اس وقت کسی کام میں مصروف تھے۔ اس لیے متوجہ نہ ہو سکے۔ کام سے فارغ ہوئے تو فرمایا ابوموسیٰ کہاں ہے؟ وہ آئے تو کہا واپس کیوں گئے؟ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ تین دفعہ اذن مانگو اگر اس پر بھی اجازت نہ ملے تو واپس آجاؤ۔ امیرالمومنین نے فرمایا کہ اس روایت کا ثبوت دو ورنہ سزا دوں گا۔ ابوموسیٰ صحابہ کے پاس گئے اور حقیقتِ حال بیان کی چنانچہ ابوسعید نے آکر شہادت دی کہ میں نے رسول اللہ سے یہ حدیث سنی ہے جناب ابی بن کعب نے کہا کہ عمرؓ! تم رسول اللہ کے صحابہ کو عذاب دینا چاہتے ہو؟ فرمایا نہیں! میں نے تو روایت سنی تھی اس کی تصدیق کرنا چاہی ہے[18]

روایتِ حدیث میں احتیاط کا سبب

حضرت عمرؓ کا یہ طرزِ عمل ان کا اپنا اختیار کردہ نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں وہ خاص تربیت کام کر رہی تھی، جو نبی کریمؐ نے اپنے رفقاء کی فرمائی تھی اس کا اثر تقریباً ہر فیض یافتہ صحابی پر تھا۔ حضرت عمرؓ چونکہ منتظم تھے اور باقی لوگوں کی نسبتہً زیادہ ذمہ دار تھے اس لیے آپ کی تدابیر زیادہ نمایاں ہوگئیں۔ ورنہ روایتِ حدیث کے بارے میں اس طرح کی احتیاط ہمیں اور بزرگوں سے بھی ملتی ہیں مثلاً ابوہریرہؓ جو مکثرینِ صحابہ میں سے ہیں حضرت عمرؓ کو یوں جواب دیتے ہیں۔

روی ان عمر قال لابی ھریرۃ حین بدا ریکثر من الحدیث اکنت معنا حین کان فی مکان کذا؟ قال نعم! سمعت رسول اللہ یقول من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ فقال لہ عمر اذا ذکرت ذلک فاذھب فحدث[19]

---

[18] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶، مسلم کتاب الآداب، باب الاستیذان ج ۲ ص ۲۱۰ [19] ایضاً

روایت ہے جب حضرت ابو ہریرہ نے بکثرت حدیثیں بیان کرنا شروع کی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تم فلاں جگہ ہمارے ساتھ تھے؟ تو حضرت ابو ہریرہ نے کہا ہاں میں نے رسول کریم کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ گھڑے گا اُسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے تو حضرت عمرؓ نے کہا اگر تمہیں یہ یاد ہے تو جاؤ حدیثیں بیان کرو۔

اسی طرح حضرت انسؓ اور حضرت زبیرؓ کے متعلق آتا ہے۔

قال انس انہ یمنعنی ان احدثکم حدیثاً کثیراً ان النبی قال من تعمد علی کذباً فلیتبوأ مقعدہ من النار[۲۰]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے روکتی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا جو کوئی مجھ پر عمداً جھوٹ گھڑے گا اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنانا چاہیئے۔

قال ابن زبیر قال قلت لزبیر انی لا اسمعک تحدث کفلان و فلان قال اما انی لم افارقہ ولکن سمعتہ یقول من کذب علی فلیتبوأ مقعدہ من النار[۲۱]

ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت زبیر سے پوچھا کہ میں آپ کو فلاں فلاں شخص کی طرح حدیثیں بیان کرتا ہوا نہیں سُنتا تو انہوں نے کہا جہاں تک میرا تعلق ہے میں حضور سے کبھی جدا نہیں ہوا۔ لیکن میں نے اُن سے یہ سُنا ہے جو شخص مجھ پر جھوٹ گھڑے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔

بخاری کی "کتاب العلم" اور مسلم کے "باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ" میں اس طرح کی احادیث بکثرت ہیں۔ مجھے اس موقع پر صرف یہ بتانا ہے کہ صحابہ کرام کو جہاں ارشادات نبوی پھیلانے اور اپنے محبوب رہنما کے اقوال و افعال کے تذکرے کا

---

۲۰ ایضاً ۲۱ ایضاً

اشتیاق تھا۔ وہاں یہ احتیاط بھی ان کے پیشِ نظر تھی کہ جھوٹی بات منسوب کرنے سے ایمان و آخرت دونوں ضائع ہو جائیں گے یہ ہے وہ پس منظر جس میں حضرت عمرؓ ہی نہیں ہر صحابی محتاط تھا۔ اور محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا۔ کہ لوگ جھوٹ اور سچ ملا کر حضورؐ کی طرف منسوب کرتے جیسا کہ بعد میں ہوا۔ لیکن حضرت عمرؓ کی اس پالیسی کا کم از کم یہ اثر ضرور ہوا کہ کوئی شخص بغیر احتیاط کے حدیث بیان نہ کرتا تھا۔ علامہ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں حضرت امیر معاویہؓ کا یہ قول کیا ہے کہ۔

علیکم من الحدیث لما کان فی عهد عمر فانه قد اخاف الناس فی الحدیث عن رسول الله [۲۲]

حضرت عمرؓ کے عہدِ مبارک میں جو حدیثیں رائج تھیں ان کو لازم پکڑو۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے بلا احتیاط حدیث کی روایت سے ڈرا دیا تھا۔

مسلم میں حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"شیطان ایک مرد کی صورت میں جماعت کے پاس آئے گا اور ان سے جھوٹی احادیث بیان کرے گا جس کی وجہ سے لوگ متفرق ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک شخص کہے گا۔ کہ میں نے یہ حدیث ایسے شخص سے سنی ہے جس کا چہرہ میں جانتا ہوں لیکن اس کو نہیں جانتا۔" [۲۳]

"ایک زمانہ تھا کہ جب کوئی شخص ہمارے سامنے کہتا قال رسول اللہؐ تو ہماری نگاہیں فوراً اٹھ جاتی تھیں اور ہم پوری توجہ سے اس کی روایت سنتے تھے مگر اب لوگوں نے سچ اور جھوٹ ثقہ اور غیر ثقہ خلط ملط کر دیا ہے" [۲۴]

یہ احساس اس دور کے صاحبِ علم کو تھا کہ عقیدت کا غلو لوگوں میں جھوٹی حکایات نشر نہ کرا دے۔ اس لیے بھی محتاط تھے ورنہ حضرت عمرؓ اس احتیاط سے زیادہ نظریہ

---

[۲۲] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص۷ مطبوعہ مصر [۲۳] مسلم ج ا ص۹۔ باب النہی عن الروایۃ الضعفاء [۲۴] ایضاً

نہ رکھتے تھے۔

ب حبس صحابہؓ

اب رہی حبس صحابہ کرامؓ والی روایت جسے منکرینِ حدیث بہت زیادہ اچھال رہے ہیں۔ سب کے نزدیک موضوع ہے۔ علامہ ابن حزم ظاہری جو روایت بالحدیث اور تمسک حدیث میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اپنی کتاب میں اس روایت کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس کی روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں۔ ان کا آخری جملہ قابلِ غور ہے فرماتے ہیں۔

ان الخبر فی نفسہ ظاھر الکذب والتولید [۲۵]

یہ روایت بنفسہٖ کذب و افتراء کا نمونہ ہے۔

اس لیے کہ اس سے ایک طرف کبار صحابہ کرامؓ پر اتہام ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف تبلیغ کے بارے میں روکنا اور دین کے احکام کا اخفاء لازم آتا ہے اور یہ کسی عام مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ چہ جائیکہ حضرت عمر جیسا شخص اس کا ارتکاب کرے۔

ڈاکٹر مصطفےٰ اسباعی اپنے مقالے میں اس روایت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میں نے کوشش کی ہے کہ کسی حقیر کتاب میں مجھے یہ روایت مل جائے لیکن میں ناکام رہا ہوں۔ اور روایت کا موضوع ہونا واضح ہے۔"

ابنِ مسعودؓ ایک جلیل القدر صحابی اور سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے دل میں ان کی بڑی عزت تھی حتیٰ کہ جب ابنِ مسعود کو انہوں نے باہر بھیجا تو فرمایا کہ میں انہیں اپنے پاس رکھنے کے بجائے تمہارے پاس بھیجنے میں بڑے ایثار سے کام لے رہا ہوں۔ جہاں تک حضرت ابو دردائؓ کا تعلق ہے ان

---

[۲۵] کتاب الاحکام لابن حزم ظاہری ج ۲، صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۶

سے اتنی احادیث مروی بھی نہیں ہیں کہ انہیں مکثرین میں شمار کیا جائے۔ علاوہ ازیں ابوالدرداءؓ بھی ابنِ مسعودؓ کی طرح شام میں مسلمانوں کے معلم تھے[26]

عقلاً یہ بات بڑی تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف مکثرین صحابہؓ ابوہریرہؓ عبداللہؓ بن عمر اور عبداللہ ابن عباسؓ کو کچھ نہ کہا جائے اور دوسری طرف تھوڑی روایت کرنے والوں کو دھر لیا جائے ایک طرف انہیں معلم المسلمین بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ عقل عام پر بھی یہ بات بڑی گراں گزرتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عمرؓ کا مقصد قطعاً یہ نہ تھا کہ لوگوں کو حدیث سے کلیتہً روک دیا جائے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ انہی حدیثوں تک لوگ اپنے بیان کو محدود رکھیں جن کے متعلق انہیں پورا اطمینان ہو۔ آپ نے غالباً ایک موقعہ پر فرمایا تھا۔

من دعاھا وعقلھا وحفظھا فلیحدث بھا [27]

جس نے اسے محفوظ رکھا اور اسے یاد رکھا اسے چاہیے کہ اسے بیان کرے۔

حضرت عمر کے متعلق سطحی پروپیگنڈہ کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم حضرت عمرؓ کا مثبت رویہ پیش کرتے ہیں اور اس میں گفتگو دو طرح ہو سکتی ہے۔

(ا) اشاعتِ حدیث میں حضرت عمرؓ کے احکام

(ب) کیا حضرت عمرؓ نے خود بھی روایتِ حدیث کی؟

ا۔ احکامِ عمرؓ

حضرت عمرؓ نے اشاعتِ حدیث میں کافی دلچسپی لی ہے۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں جلیل القدر صحابہ کرامؓ بھیج کر وہاں کے باشندوں کو طریقِ تعلیم کے سلسلے میں ہدایات دیں۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

---

[27] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۴

چنانچہ فاروق اعظم عبداللہ بن مسعود را با جمعے بکوفہ فرستاد و معقل بن یسار و عبداللہ بن معقل و عمران بن حصین را بہ بصرہ و عبادہ بن صامت و ابو درداء را بشام و معاویہ بن ابی سفیان کہ امیر شام بود مدعن بلیغ نوشت کہ از حدیث ایشاں تجاوز نہ کنند[28]

چنانچہ فاروق اعظمؓ نے عبداللہ بن مسعود کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ بھیجا معقل بن یسار عبداللہ بن معقل اور عمران بن حصین کو بصرہ بھیجا اور عبادہ بن صامت و ابو درداء کو شام، اس کے ساتھ ہی امیر شام معاویہؓ کو سخت تاکید لکھی کہ ان حضرات کی بیان کردہ احادیث سے تجاویز نہ کیا جائے۔

اگر ہم صرف ان کے خطبات و ہدایات ہی کو دیکھیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت عمرؓ کو حدیث سے کتنی دلچسپی تھی۔ ابن عبدالبر اور امام جلال الدین سیوطی نے حضرت عمرؓ کا جو قول نقل کیا ہے۔ اس سے ان کی محبت حدیث کا پتہ چلتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

یاایھا الناس ان الرای انما کان من رسول اللہ مصیباً لان اللہ کان یریہ وانما ھومنا الظن والتکلف۔[29]

لوگو! جہاں تک حضورؐ کی رائے کا تعلق ہے سو وہ درست ہے۔ کیونکہ اللہ کو یہی منظور تھا۔ لیکن ہماری رائے تو گمان اور تکلّف ہے۔

علامہ ابن عبدالبر نے حدیث قرظہؓ پر بحث کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ کہتے ہیں۔

فکیف یامرھم بالحدیث عن رسول اللہ وینھاھم عن ھذا؟ لا یستقیم بل کیف ینھاھم عن الحدیث عن نفسہ؟ بقولہ من حفظ مقالتی ووعاھا فلیحدث بھا حتی تنتھی بہ راحلتہ ثم قال ومن خشی ان لا یعیھا فلا یکذب علی[30]

---

[28] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۶ [29] [30] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۳۴ مفتاح الجنۃ للسیوطی ص ۲

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ حضور سے حدیث بیان کرنے کا حکم بھی دیں۔ اور منع بھی کریں؟ یہ بات درست نہیں بلکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ مطلق روایت کرنے سے روک دیں جبکہ آپ کی یہ بات بھی موجود ہے کہ جس شخص نے میری بات کو یاد کیا اور محفوظ کیا تو اسے بیان کر دے۔ حتیٰ کہ اس سے اس کا زادِ راہ بھی ختم ہو۔ پھر فرمایا کہ جسے یہ ڈر ہو کہ وہ محفوظ نہ رکھ سکے گا۔ تو اسے محمدؐ پر جھوٹ نہیں گھڑنا چاہیئے۔

حضرت فاروقؓ کے زمانے میں صحابہ کرام کتابتِ حدیث کی ضرورت و اہمیت پر متفق ہو چکے تھے۔ حضرت عروہؓ کہتے ہیں۔

ان عمر ابن الخطاب اراد ان یکتب السنن فاستفتی اصحاب رسول اللہ فی ذلک فاجمعوا علیہ ان یکتب [۱]

حضرت عمرؓ نے چاہا کہ حدیثیں لکھ دی جائیں آپ نے اصحاب رسول اللہ سے مشورہ کیا تو انہوں نے بالاتفاق لکھنے کی رائے دی۔

حضرت عمر فاروق کا خود اپنا بھی یہی خیال ہو رہا تھا کہ احادیث و سنن کتابی شکل میں جمع کر دی جائیں۔ لیکن آپ نے اس خیال سے کہ کہیں اس کی وجہ سے قرآنِ حکیم کی جانب سے عدم التفات نہ ہو جائے اس پر عمل نہ کیا لیکن بعد کو یہ شبہ جاتا رہا اور اس کی اہمیت واضح ہو گئی تو آپ نے حکم دے دیا کہ:۔

قیدوا العلم بالکتاب

علم کو احاطۂ تحریر میں لے آؤ۔

امام شاطبی نے موافقات میں حضرت عمرؓ کے وہ مکتوب نقل کیے ہیں جو انہوں نے قاضی شریح کے نام بھیجے تھے ان میں سے دو اقتباس ہم پیش کر رہے ہیں جن سے حضرت عمرؓ کے ردیۂ حدیث پر روشنی پڑتی ہے۔

---

[۱] جامع بیان العلم ص ۳۳

اذا اتاک امر فاقض بما فی کتب اللہ فان اتاک ما لیس فی کتاب فاقض بما سن فیہ رسول اللہ ۳۲ انظر ما تبین لک فی کتاب اللہ فلا تسئل فیہ احدًا وما لم یتبین لک فی کتاب اللہ فاتبع فی سنت رسول اللہ ۳۳

جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو تم جو کچھ کتاب اللہ میں ہے اس کے مطابق فیصلہ دو۔ اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آئے جو کتاب اللہ میں نہیں تو تم اس طریق پر فیصلہ کرو۔ جو رسول کریمؐ کا اِس میں تھا تم دیکھو جو چیز کتاب اللہ میں تمہارے لیے واضح ہے۔ اس بارے میں کسی سے مت سوال کرو اور جو چیز کتاب اللہ میں واضح نہیں ہے اس میں سنتِ رسُول کا اتباع کرو۔

پھر حضرت عمرؓ نے حج کے موقع پر جو خطبات ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں بھی واضح اشارات ملتے ہیں۔

ایھا الناس لم استعمل عمالاً لیضربوا ابنارکم ولا لیاخذ وا اموالکم وانما ارسلتھم الیکم لیعلموکم دینکم وسنۃ نبیکم ۳۴

لوگوں میں اِس لیے والی نہیں بناتا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو ماریں اور نہ اِس لیے کہ تمہارے مال چھین لیں۔ میں نے اِن کو صرف اِس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں دین سکھائیں اور تمہارے نبیؐ کی سنت۔

حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ کو والیٔ بصرہ بنایا تو ابوموسیٰ نے مجمعِ عام میں تقریر کی ان کا یہ جملہ قابلِ غور ہے۔

بعثنی عمر لاعلمکم کتاب ربکم وسنۃ نبیکم ۳۵

مجھے عمرؓ نے بھیجا ہے کہ میں تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سُنت سکھلاؤں آپ نے ایک مرتبہ خطبہ فرمایا

---

۳۳ ایضاً ۳۴ تاریخ ابن الاثیر ص ۲۰۸
۳۵ سنن دارمی ج ۱ ص ۶۵

ایک اور مواقع پر فرمایا۔

تعلموا الفرائض والسنۃ کما تعلمون القرآن [27]

فرائض اور سنت کو اسی طرح سیکھو جس طرح قرآن سیکھتے ہو۔

آپ حدیث کی روایت کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے۔ اس کا پتہ ذیل کے قول سے ہو سکتا ہے۔ قیس بن عباد کہتے ہیں۔

سمعت عمر بن الخطاب یقول من سمع حدیثاً فاداہ کما سمع فقد سلم [28]

میں نے عمر بن خطاب سے سُنا کہ جس نے حدیث سُنی اور جو کچھ سُنا تھا۔ اسی کو اس نے ادا کر دیا تو وہ محفوظ ہو گیا۔

حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعری گورنر کوفہ کے نام اُصول و آئین پر ایک فرمان لکھا جس میں صیغۂ عدالت کے تمام اصولی احکام درج تھے۔ ہم اس خط کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

امابعد فان القضاۃ فریضۃ محکمۃ وسُنۃ متبعۃ سَوّ بین الناس فی وجھک ومجلسک وعدلک ولا یطمع الشریف فی حیفک البینۃ علیٰ من ادعی والیمین علیٰ من انکر والصلح جائز الا صلحاً احل حراماً او حرم حلالاً۔ لا یمنعک قضاء قضیتہ بالامس فراجعت فیہ نفسک ان ترجع الی الحق الفھم الفھم فیما یختلج فی صدرک مما لم یبلغک فی الکتاب والسنۃ واعرف الامثال والاشباہ ثم قس الامور عند ذلک واجعل لمن ادعی بینۃ امداً ینتھی الیہ فان احضر البینۃ اخذت لہ بحقہ والا وجھت القضاء علیہ والمسلمون عدول بعضھم علیٰ بعض الا مجلوداً فی حدٍ او مجرماً فی شھادۃ زور او ظنیناً فی ولاءٍ

---

[26] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۸۷ [27] [28] ایضاً ص ۱۲۲

اودراشة [۲۹]

خدا کی تعریف کے بعد قضا ایک ضروری فرض ہے لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں اور اپنے انصاف میں برابر رکھو تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہو اور زور آور کو تمہاری رورعایت کی امید نہ پیدا ہو۔ جو شخص دعویٰ کرتا ہے اس پر بار ثبوت ہے اور جو شخص منکر ہو اس پر قسم صلح جائز ہے بشرطیکہ اس سے حرام حلال اور حلال حرام نہ ہونے پائے کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو آج غور کے بعد اس سے رجوع کر سکتے ہو جس مسئلہ میں شبہ ہو اور کتاب وسنت میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس میں غور کرو اور پھر غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر خیال کرو۔ پھر قیاس لگاؤ اور جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لیے ایک میعاد مقرر کرو اگر وہ ثبوت دے دے تو اس کا حق دو۔ ورنہ مقدمہ خارج، مسلمان سب ثقہ ہیں باستثنائے ان اشخاص کے جن کو حد کی سزا میں درے لگائے گئے ہیں یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا ولاء اور وراثت میں مشکوک ہوں۔

ابوموسیٰ اشعری ہی کو ایک مرتبہ لکھا۔

اما بعد فتفقهوا فی السنة [۴۰]

اللہ کی تعریف کے بعد۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم سنت کا فہم حاصل کرو۔

اسی طرح قاضی شریح کو ایک فرمان میں لکھا کہ مقدمات میں اوّل قرآن مجید کے مطابق

---

[۲۹] علامہ شبلی نے یہ عبارت طبقات الفقہاء کے حوالے سے لکھی ہے اور یہ خط الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سنن دار قطنی مطبوعہ ہند ۵۱۲، عیون الاخبار ج ۱ ص ۶۶ مطبوعہ مصر، البیان والتبیین ج ۲ ص ۲۴ مطبوعہ مصر، اعلام الموقعین ج ۱ ص ۷۱، ۷۲ مطبوعہ مصر، مبسوط سرخسی ج ۱۶ ص ۶۰ مطبوعہ مصر، نصب الرایہ ج ۴ ص ۸۱، ۸۲ صبح الاعشیٰ ج ۱ ص ۱۹۳، ۱۹۴ مقدمہ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۸۴ اور کنز العمال ج ۳ ص ۱۲۴ وغیرہ میں مفصل مذکور ہے۔

[۴۰] کنز العمال ج ۵ ص ۲۲۸

فیصلہ کرو، قرآن پاک میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث اور حدیث نہ ہو تو اجماع (کثرت رائے) کے مطابق اور کہیں پتہ نہ لگے تو خود فیصلہ کرو۔ اصل الفاظ یہ ہیں۔

عن شریح ان عمر بن الخطاب کتب ان جاءک شئ فی کتاب اللہ فاقض بہ ولا یلفتنک عنہ الرجال فان جاءک مالیس فی کتاب اللہ فانظر سنۃ من رسول اللہ فاقض بہا فان جاءک مالیس فی کتاب اللہ ولم یکن فیہ سنۃ من رسول اللہ فانظر ما اجتمع علیہ الناس فخذ بہ فان جاءک مالیس فی کتاب اللہ ولم یکن فی سنۃ رسول اللہ ولم یتکلم فیہ احد قبلک فاختر ای الامرین شئت ان شئت ان تجتہد برایک ثم تقدم وان شئت ان تتاخر فتاخر ولا اری التاخر الا خیرا لک [41]

شریح روایت کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب نے انہیں لکھا اگر تمہیں کتاب اللہ میں کوئی حکم ملے تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور لوگ تمہیں اس سے نہ روک سکیں گے اگر کوئی ایسی چیز آئے جو کتاب اللہ میں نہیں سنت رسول کو دیکھو اور اس کے مطابق فیصلہ کرو اگر ایسا معاملہ ہو کہ کتاب اللہ میں بھی نہ ہو اور سنت رسول سے بھی پتہ نہ چلے تو لوگوں کے اجتماعی فیصلہ پر انحصار کرو اور اگر صورت حال ایسی ہو کہ کتاب اللہ سے بھی کچھ نہ ملے، سنت رسول سے بھی پتہ نہ چلے اور تجھ سے پہلے کسی شخص نے بھی کوئی بات نہ کی تو تمہیں دو معاملوں میں اختیار ہے تم چاہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو تو پھر آگے بڑھو اور اگر چاہو تو گریز کرو اور میں اس گریز میں ہی تمہاری بھلائی سمجھتا ہوں۔

ان واقعات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ فاروق اعظم سنت رسول ؐ کو ماخذ دین و شریعت سمجھتے تھے۔ آپ نے ہمیشہ قرآن کے بعد اور سنت سے پہلے سنت کا خصوصی تذکرہ کیا ہے علامہ شبلی نے حدیث کے ضمن میں فاروقی مسلک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ آنحضرت کے زمانے میں احادیث کے استقصاء کا خیال نہیں کیا گیا تھا جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا تو خود آنحضرت سے دریافت کر لیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ کسی ایک صحابی کو

---

[41] ایضاً ج ۳ ص ۱۷۴، سنن دارمی ج ۱ ص ۶۰

فقہ کے تمام ابواب کے متعلق حدیثیں محفوظ نہ تھیں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں زیادہ ضرورتیں پیش آئیں اس لیے مختلف صحابہ سے استفسار کرنے کی ضرورت پیش آئی اور احادیث کے استقراء کا راستہ نکلا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں چونکہ زیادہ کثرت سے واقعات پیش آئے کیونکہ فتوحات کی وسعت اور نومسلموں کی کثرت نے سینکڑوں مسائل پیدا کر دیے تھے۔ اس لحاظ سے انہوں نے احادیث کی زیادہ تفتیش کی تاکہ یہ مسائل آنحضرتؐ کے اقوال کے مطابق طے کیے جائیں اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی صورت پیش آئی تو حضرت عمرؓ مجمع عام میں اکثر صحابہ موجود ہوتے تھے پکار کر کہتے تھے کہ اس کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے؟ تکبیر جنازہ غسلِ جنابت، جزیہ، مجوس کی حیثیت اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جن کی نسبت احادیث میں نہایت تفصیل سے مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجمع صحابہ میں دریافت کر کے احادیثِ نبوی کا پتہ لگایا[۴۲]

حضرت عمرؓ کے احکام وقضایا آخری اور حتمی حیثیت رکھتے تھے وہ کسی طرح بھی یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ آپ کے ارشادات واحکام کے مقابلے میں کسی اور انسان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جائے حیاتِ نبوی میں حضرت عمرؓ کا جو مسلک تھا وہ سنت کے بارے میں آپ کے طرزِ فکر و عمل کی بنیاد ہے اس کا ثبوت وہ واقعہ بھی ہے جسے ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔

قال ابن ابی حاتم: حدثنا یونس بن عبد الاعلیٰ قراءۃً اخبرنا ابن وھب اخبرنی عبد اللہ بن ابی لھیعۃ، عن ابی الاسود قال اختصم رجلان الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقضیٰ بینھما، فقال المقضی علیہ: ردنا الی عمر بن الخطاب فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعم۔ انطلقا الیہ فلما اتیا الیہ فقال الرجل یا ابن الخطاب قضیٰ لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ھذا فقال ردنا الی عمر بن الخطاب فردنا الیک فقال اکذٰلک، قال نعم۔ فقال عمر مکانکما حتیٰ اخرج

---

[۴۲] الفاروق ج ۲ ص ۲۷۲

الیکما فاقضی بینکما فخرج الیھما مشتملاً علی سیفہ، فضرب الذی قال ردنا الی عمر فقتلہ وادبر الاخیر فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل عمر واللہ صاحبی ولولا انی اعجزتہ لقتلنی فقال رسول اللہ صلی علیہ وسلم ماکنت اظن ان یجترئ عمر علی قتل مومن فانزل اللہ فلا ربک لایومنون الآیہ فھدر دم ذلک الرجل وبری عمر من قتلہ۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صـ۲۲۱)

دو آدمی اپنا معاملہ رسول اللہ کی خدمت میں لائے آپ نے فیصلہ فرما دیا جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے کہا ہمیں عمر بن الخطاب سے فیصلہ کروانے دیجیے۔ حضورؐ نے اجازت دے دی۔ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور ایک نے کہا رسول اللہ علیہ وسلم نے ہمارے جھگڑے کا فیصلہ کر دیا اور اب اُن کی اجازت سے ہم اپنا معاملہ آپ کے پاس لائے ہیں حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا واقعہ یوں ہی ہے؟ اس نے کہا ہاں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ٹھہرو میں ابھی آکر فیصلہ کرتا ہوں آپ گھر سے تلوار لے کر آئے اور اسے قتل کر دیا دوسرا آدمی بھاگ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ تمام ماجرا بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں بھاگ آیا ہوں۔ ورنہ وہ مجھے بھی قتل کر دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں عمرؓ کے بارے میں ایسا گمان نہیں رکھتا کہ وہ ایک مومن کو قتل کرنے کی جرأت کرے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فلا وربک لایومنون الخ نازل فرمائی اس آدمی کا خون معاف کر دیا گیا اور حضرت عمرؓ بری قرار پائے۔

اسی طرح اور بھی واقعات ہیں جن سے حضرت عمرؓ کا رویۂ حدیث متعین ہوتا ہے۔

ب روایتِ حدیث میں حضرت عمرؓ کا مقام

اب دوسرے امر کا جائزہ لیں کہ کیا حضرت عمرؓ نے خود بھی احادیث بیان کی ہیں؟ اگر ان کی روایات بھی ثابت ہو جائیں تو پھر اس امر میں کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ حضرت عمر منکر حدیث نہ تھے۔ علامہ ابن حزم نے "جوامع السیرۃ" میں ترتیب وار ان صحابہ کرامؓ کی فہرست

دی ہے جنہوں نے مختلف تعداد میں احادیث کی روایت کی ہے۔ ابن حزم کے بیان کے مطابق حضرت عمر کی روایات پانچ سو ہیں۔ علامہ شبلی نے "الفاروق" میں حضرت عمرؓ کی خدماتِ حدیث سے بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر ان کی مرویات کی کاٹ چھانٹ بھی کر دی جائے تو بھی کم از کم ستر مرفوع احادیث باقی رہ جاتی ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ کا حدیث کے متعلق کیا رویہ تھا۔ علامہ شبلی کمیٔ حدیث والی حدیث کو غلط فہمی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عام غلط فہمی یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی روایات کی تعداد اور زیادہ نہیں ہے انہوں نے اس موقعہ پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا حوالہ بھی دیا کہ شاہ صاحب" ازالۃ الخفاء میں بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی روایات ستر ہیں۔ شاہ صاحب کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن پاک کی تعبیر و تشریح اور احکام و مسائل کی توضیح و تبیین میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے استدلال کیا ہے۔ اور ایسے استدلالات کی تعداد بہت زیادہ ہے نیز یہ عام فقیہانہ دوُر اندیشی اور محدثانہ جرح و تعدیل کے سانچوں سے نکلے ہوئے اقوال ہیں۔

اشاعتِ حدیث میں آپ کی دلچسپی، حفاظتِ حدیث کے ضمن میں آپ کے حکیمانہ طرزِ عمل اور روایتِ حدیث میں آپ کا طریق اس امر کی بین شہادت ہے کہ حدیث کے بارے میں وہ نقطہ نظر نہیں رکھتے تھے جسے ہمارے منجد دین آپ کی طرف منسوب کر رہے ہیں حضرت عمرؓ نہ صرف خود روایت کرتے تھے بلکہ حدیث معلوم ہونے پر اپنی رائے واپس لے لیتے تھے مثلاً

حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ بی بی کو اپنے شوہر کی دیت سے وراثت نہ ملنی چاہیے لیکن جب ضحاک بن سفیانؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت نے دیتِ زوج سے بھی وراثت دلوائی ہے تو حضرت عمرؓ نے اپنے قول سے رجوع فرما لیا۔ اسی طرح مجوس سے جزیہ لینے کے متعلق بھی حضرت عمرؓ کو تردد تھا لیکن جب عبدالرحمٰن بن عوف نے بیان کیا کہ آنحضرت نے مجوسِ ہجر سے جزیہ لیا ہے۔ تو آپ نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔ طاؤس روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کیا کسی شخص نے آنحضرتؐ سے

اس بارے میں کچھ سُنا ہے کہ جھگڑے میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہیئے؟ تو حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ دو عورتوں میں لڑائی ہو گئی۔ ایک نے دوسرے کے خیمے کی چوب ماری جس کے صدمے سے دُوسری عورت کا حمل ساقط ہو گیا۔ مقدمہ آپ کے سامنے آیا تو آپ نے اس پر پانچ سو درہم بطور دیت لازم فرمائے۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب مانعین زکوٰۃ سے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ اس میں مانع ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے حدیث سے اپنے اقدام پر استدلال کیا تو حضرت عمرؓ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا [۴۲]

اس مختصر تجزیے سے یہ بات از خود ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ دراصل محتاط روش کے بزرگ تھے۔ ورنہ روایتِ حدیث سے مطلقاً منع نہ کرتے تھے۔ روایتِ حدیث سے مطلقاً منع کرنا آپ کی شان سے بعید ہے۔

---

[۴۲] یہ تمام واقعات کتب سُنن مشہورہ میں موجود ہیں اور امام شافعی نے باسناد روایت کیا ہے۔

مسئلہ فدک

تحریر

پیر محمد کرم شاہ ایم اے

ہمارے بعض دوست بڑے طمطراق سے یہ کہتے رہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے باغ فدک چھین لیا۔ ان پر ظلم کیا، ان کی دل آزاری کی اور حضرت عمرؓ بھی اس کام میں آپ کے ہمنوا اور مؤید تھے وغیرہ وغیرہ اس موقع پر جس طرح شائستگی اور شرافت کی تمام حدود کو وہ پھاند جاتے ہیں ان کے ذکر سے میں دانستہ احتراز کرتا ہوں۔

میرے پیش نظر مسئلہ کو الجھانا نہیں سلجھانا ہے میں شکوک و شبہات کو ہوا دے کر ماحول کو غبار آلود نہیں کرنا چاہتا بلکہ نگار حقیقت کے رخِ زیبا سے نقاب الٹنا چاہتا ہوں حق و باطل میں امتیاز کرنا آپ کا کام ہے۔ سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فدک کیا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے! اسکے بعد قدم بقدم سوئے منزل بڑھتے چلے جائیں گے۔

اہل اسلام کو جو اموال و املاک کفار سے حاصل ہوتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔
(۱) غنیمت (۲) فئی مال غنیمت اس کو کہتے ہیں جو لڑائی اور لشکر کشی کے بعد حاصل ہو۔ اور مال فئی اس کو کہتے ہیں جو لشکر کشی کے بغیر حاصل ہو۔ مال غنیمت اور مال فئی کی یہ تعریف متفقہ ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں دونوں قسم کے اموال کا شرعی حکم قرآن کریم میں وضاحت سے مذکور ہے اس کے لیے ہمیں پریشان ہونے اور ورق گردانی کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

دسویں پارے کی پہلی آیت میں اموالِ غنیمت کے احکام صراحتہً ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰہِ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا۔ الآیہ (سورۃ انفال ۴۱)

ترجمہ

اور جان لو! کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو۔ اللہ تعالےٰ کے لیے اس کا پانچواں حصّہ۔ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسُول کے لیے رشتہ داروں اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جسے ہم نے اتارا اپنے محبوب بندہ پر۔

اس آیت میں غور کرنے سے واضح ہو گیا کہ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے چار حصے حسب الحکم مجاہدوں اور غازیوں میں تقسیم کیے جائیں گے اور پانچواں حصّہ کے مصارف اس آیت میں کھول کر ذکر کر دیئے گئے ہیں۔

مالِ فئی کے احکام سورہ حشر کی آیت نمبر ۷ میں ذکر کیے گئے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

مَاۤ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ط

اس سے واضح ہو گیا کہ جو اموال فئی ہوں۔ ان میں اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کا...... حصّہ ہے۔ حضور کے رشتہ داروں کا، امُت کے یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کا۔ اموال فئی میں ان تمام لوگوں کو حصّہ دار بنانے کی حکمت ساتھ ہی بیان فرما دی۔ تاکہ مال چند اغنیاء میں ہی گردش نہ کرتا رہے اور سمٹ کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع نہ ہو جائے۔ بلکہ اس کی گردش کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو تاکہ دولت کی تقسیم سے ملت کے زیادہ سے زیادہ افراد مستفید ہوتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ کے مختصر جملہ میں اسلامی نظام معیشت کی روح اور

اس کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں دولت سمٹ کر چند افراد کے پاس جمع ہو جاتی ہے۔ ملک کے مٹھی بھر لوگ از حد متمول ہو جاتے ہیں اور قوم کے باقی افراد عسرت و تنگ دستی کا شکار بن جاتے ہیں اسلام نے سرمایہ داری کی پہلے ہی بیخ کنی کر دی اور اسلامی معاشرہ کا مزاج اس طرح تیار کیا کہ وہاں سرمایہ داری پنپ ہی نہ سکے۔ دولت کو چند ہاتھوں میں مجتمع ہونے سے روکنے کے لیے قبل از وقت احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور حفاظتی بند باندھ دیئے اس طرح نہ دولت سمٹے گی اور نہ قوم از حد امیر اور از حد غریب طبقوں میں بٹے گی نہ ان میں حسد و تباغض کی آگ سلگے گی اور نہ وہ وقت آئے گا کہ غربت کے ماروں کا پیمانہ صبر چھلکنے لگے اور وہ بے اختیار و بے قابو ہو کر آمادۂ بغاوت ہو جائیں اور اپنے ہاتھوں اپنی قوم کے خون کے دریا بہا دیں۔

غنیمت اور فئی کا مفہوم اور ان کے قرآنی احکام ذہن نشین کرنے کے بعد آگے چلیئے۔

اہل سنت و جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ کیونکہ اموال فئی کے حق دار بہت سے اقسام کے لوگ ہیں ان کو متعین کرنا ممکن نہیں۔ آج ایک لڑکا یتیم ہے کل وہ بالغ ہو کر خوشحال ہو جاتا ہے آج ایک شخص مسکین ہے کل وہ دولت مند بن جاتا ہے جب تک پہلا یتیم تھا اور دوسرا مسکین تھا۔ وہ ان اموال میں حصہ دار تھے آج ان کی جگہ دوسرے لوگ جو یتیمی اور غربت سے متصف ہیں وہ حصہ دار بن جائیں گے۔ یہی حال ذوی القربیٰ کا ہے یہی حکم ابن السبیل کا ہے، جب صورت احوال ایسی ہو تو وہ اموال وقف کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان اموال و املاک کا نظم و نسق خود حاکم وقت یا اس کی طرف سے مقرر کردہ شخص کیا کرتا ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ فدک جنگ اور لشکر کشی سے نہیں بلکہ صلح سے مسلمانوں کے تصرف میں آیا تھا اور آیت میں بیان کردہ حکم کے مطابق یہ کسی ایک شخص یا ایک خاندان کی نجی ملکیت نہیں بلکہ اس میں مذکورہ بالا سارے اصناف حصہ دار ہیں ورنہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجائے گی۔ قرآن نے کی لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً

بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ سے ارتکاز زر سے بچنے کے لیے جو احکام نافذ کیے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب تک اس جہان فانی میں رونق افروز رہے حضور اپنی نگرانی میں اس علاقہ کی آمدنی کو حقداروں میں تقسیم فرماتے رہے اور حضور کی رحلت کے بعد جب حضرت صدیق اکبر مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ تو ان باغات اور مزروعہ اراضی کی نگہداشت اور اس کی آمدنی کی تقسیم آپ کے سپرد ہوئی آپ اپنے عہد خلافت میں حسب ارشاد خداوندی اور ——— حسب سنت نبوی اس فریضہ کو سرانجام دیتے رہے اور یہ سلسلہ حضرت فاروق اعظم اور بعد میں آنے والے خلفائے راشدین کے زمانوں میں بھی اسی طرح جاری رہا اور اس طرح اسلامی نظام معیشت کی برکتوں اور سعادتوں سے اسلامی معاشرہ سیراب اور بہرہ مند ہوتا رہا۔ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم کا یہ عمل حقیقت میں ارشاد خداوندی کی تعمیل تھی۔ اور سنت نبوی کی صحیح معنوں میں اطاعت تھی اور ان حضرات پر کسی قسم کا الزام و اتہام وارد نہ ہو سکتا تھا بلکہ وہ لائق صد تبریک و تحسین تھے کہ انہوں نے ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کیا لیکن فرمان الٰہی اور سنت محمدی سے سرمو انحراف نہ کیا۔ ہاں اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ قابل سرزنش ہوتے بلکہ اس وقت کا زندہ اور بیدار معاشرہ احکام الٰہی اور سنت نبوی کی اس خلاف ورزی کو ہرگز برداشت نہ کرتا لیکن ہمارے ہاں تو گنگا الٹی بہ رہی ہے۔ تنقید کے تیروں سے ان مردان پاک سرشت کو گھائل کیا جارہا ہے جنہوں نے عہد وفا کو نبھایا۔ راہ حق پر استقامت و ثبات کے انمٹ اور درخشاں نقوش ثبت کئے۔

یہ تو ہوا اہل سنت کا موقف۔ نظری بھی اور عملی بھی۔

اب رہے معترضین تو ان کا عقیدہ شریفہ یہ ہے کہ فدک جو فئی ہے۔ یہ حضور کی ذاتی ملکیت تھی۔ حضور کی رحلت کے بعد اس کی وارث صرف حضرت سیدہ تھیں اور شیخین نے ان کو فدک کی اراضی سے محروم کر کے حضور کی نور نظر اور لخت جگر پر بڑا ظلم کیا اور ان کی حق تلفی کی۔ اب خود انصاف فرمایئے اگر ایسا ہوتا تو آیت یوں ہوتی:۔ مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَهُوَ لِرَسُوْلِهٖ۔ کہ ان گاؤں والوں

سے جو مال فئ حاصل ہوا اس کا مالک اس کا رسول ہے بات ختم ہو جاتی اور کسی کو چوں و چرا کی مجال تک نہ رہتی لیکن قرآن کی آیت تو اس طرح وہاں نہیں وہاں تو وَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کی لمبی چوڑی عبارت بھی موجود ہے۔

یہ لوگ اپنے دل سے پوچھیں کہ یہ کلمات کیا قرآن کی آیت کا حصہ نہیں ؟ اور کیا ان کلمات کا واضح مدعا نہیں جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں یا یہ الفاظ صرف سنانے کے لیے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے ہیں عمل سے ان کا کوئی سروکار نہیں؟

جب تک ہم قرآن کو اپنے خداوند کریم کا کلام مانتے ہیں ہم اس آیت کا انکار نہیں کر سکتے اور اگر انکار نہیں کر سکتے تو پھر اس داستان سرائی کے لیے وجہ جواز کیا ہے۔

یہ ایک سیدھی اور صاف بات ہے اس میں کوئی کجی نہیں کوئی زیغ نہیں کوئی ایچ پیچ نہیں یہ ایک روشن حقیقت ہے جو شک وشبہ سے بالاتر ہے پھر ہم آفتاب سے تابندہ تر حقیقت کا کیوں انکار کریں اور بے سروپا تاویلات اور من گھڑت مزعومات کی دلدل میں پھنس کر کیوں خود بھی قیامت کے روز شرمسار ہوں اور قرآن و اسلام کی تعلیمات کو زک پہنچا کر باطل کو بلا وجہ غرانے کا موقعہ دیں۔

لیکن جہاں بات کا تبنگڑ بنانا اور بال کی کھال اتارنا محبوب مشغلہ ہو وہاں حق کی سادگی اور پرکاری کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ سچی بات کو سنا کون گوارا کرتا ہے۔ وہاں تو ایسی ایسی ایچ اور دور از کار تاویلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اپنی غلطی کا اعتراف تو بڑے دل گردے کا کام ہے جن کے پیش نظر صرف ملت کا شیرازہ منتشر کرنا ہو جن کے پیش نظر اپنی لیڈری کو چمکانا ہو۔ جس لغزش کے پیچھے دیرینہ جذبۂ انتقام کی آگ سلگ رہی ہو وہاں عقل عیار ایسی ایسی اختراعیں کرتی ہے۔ حقائق اور حقوق کو پس پشت ڈال کر محض جذبات کو ابھارتی ہے اور اس کے لیے دروغ بافی میں کمال کا مظاہرہ کرتی ہے کہ اچھے بھلے سراب

کو چشمہ آب حیوان سمجھنے لگتے ہیں۔

اگر ایک لمحہ کے لیے یہ مان بھی لیا جائے (اگرچہ ایسا ماننا حکم خداوندی کی صریح نا فرمانی ہے)

کہ فدک حضور کی ملکیت تھا۔ اور وصال کے بعد ان املاک کی حیثیت ایسی تھی۔ جو وارثوں میں بانٹ دی جاتی ہے تو پھر وراثت کا حق صرف حضرت سیدہ بتول سلام اللہ علی ابیہا و علیہا کو کیسے پہنچتا ہے اس میں تو سارے وارث حصہ دار ہوں گے۔ حضرت عباس۔ امہات المومنین اور دیگر ورثا بھی شریک ہوں گے صرف حضرت سیدہ کو وارث تسلیم کرنا اور باقی ورثا کو محروم کر دینا متعدد آیات قرآنی کی صریح خلاف ورزی ہے اور ہم سیدہ بتول کے بارے میں اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

جب ان لوگوں کے یہاں بھی قدم نہیں جمتے اور مقصود بر آتا دکھائی نہیں دیتا تو پھر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی حیات طیبہ میں ہی فدک کی وسیع و عریض املاک اپنی بیٹی کو ہبہ کر دی تھیں اور انہوں نے اسے قبول کر لیا تھا۔ اس لیے فدک وغیرہ کی واحد حقدار حضرت سیدہ ہی تھیں۔

آپ غور فرمائیں کہ بارگاہ رسالت میں یہ کتنی بڑی گستاخی ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ معاذ اللہ حضور نے باقی تمام ورثا کو محروم کرنے کے لیے فدک اپنی حیات طیبہ میں ہی حضرت سیدہ کو دے دیا۔ اور دوسرے ورثاء کو محروم کر دیا اس گئے گزرے زمانے میں بھی اگر کوئی شخص ایسی بات کرتا ہے کہ اپنے ایک وارث کے نام ساری جائداد کا انتقال کرا دیتا ہے اور باقی وارثوں کو محروم کر دیتا ہے تو اس کے اس عمل کو انتہائی مذموم اور صریح ظلم قرار دیا جاتا ہے اور اس کی اس بات سے سارے خاندان کا امن و سکون برباد ہو جاتا ہے۔

ان میں خونریزیوں اور مقدمہ بازیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچیے وہ نبی برحق جو آیا ہی ظلم و زیادتی کو مٹانے کے لیے تھا جو آیا ہی عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تھا۔ اس کی آمد کی برکت سے ٹوٹے

ہوئے دل جڑ گئے دریدہ قباؤں کے چاک رفو ہو گئے خاندانی عداوتوں کے آتش کدے گلزار بن گئے۔ ایسے یمن وسعادت کے پیغامبر کے بارے میں ایسا تصوّر تک کرنا بھی انتہائی رذالت اور کمینگی ہے اہل بیت کی عقیدت کا بہروپ دھار کر ناموس نبوت پر حملہ آور ہونا کہاں کی ایمانداری ہے۔ اگر نبی نے خود نعوذ باللہ اپنے خاندان کے افراد میں ظلم وعدوان کا آغاز کیا تو ظلم وستم کی ستائی ہوئی مخلوق اپنے درد کا درماں کرنے اور اپنے زخموں پر مرہم لگوانے کہاں جائے؟

کئی دوسری باتیں بھی ہبہ کے دعویٰ کی تردید کرتی ہیں۔

فدک کا علاقہ جو بطور فئ حضور کے تصرّف میں آیا کوئی معمولی سا علاقہ نہ تھا۔ یہ ایک وسیع وعریض خطہ ہے جس میں زرخیز میدان شاداب باغات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ بقول ملا باقر مجلسی اس کی سالانہ آمدنی چوبیس ہزار دینار تھی یعنی اس وقت کے حساب کے مطابق دو لاکھ چالیس ہزار روپیہ۔ اگر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے یہ خطہ حضرت سیدہ کو ھبہ کر دیا تھا تو پھر آپ مدینہ طیبہ کی متمول اور دولت مند خواتین میں سرفہرست ہوں گی حالانکہ عہد رسالت میں آپ کی عسرت اور تنگی گزران کے قصّے زبان زد خاص و عام ہیں۔ آٹا خود اپنے دست مبارک سے پیستیں۔ گھر میں جھاڑو خود دیتیں کھانا پکاتیں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات پانی کا بھرا ہوا مشکیزہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر لایا کرتیں۔

جس کی سالانہ آمدنی ڈھائی لاکھ روپیہ ہو۔ وہ تو دس بیس غلام اور کنیزیں خرید کر رکھ سکتا ہے نیز یہ روایت بھی عند الفریقین مسلم ہے کہ ایک دفعہ چند کنیزیں اور غلام بارگاہِ رسالت میں لائے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایما پر حضرت سیدہ لونڈی مانگنے کے لیے حضور کی خدمت میں گئیں حضور نے ارشاد فرمایا اے فاطمہ! اے میری لختِ جگر! جب تک اہل صفہ کی ضرورتیں پوری نہ ہو جائیں میں تمہیں لونڈی کیسے دے سکتا ہوں البتہ تمہیں لونڈی سے بھی بہترین تحفہ پیش کرتا ہوں، جب سونے لگو تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔

اس کے علاوہ کئی بار ایسے مواقع آئے کہ سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو خدمتِ دین کے لیے مال پیش کرنے کی دعوت دی اور ہر صحابی نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر بطیب خاطر مالی قربانی پیش کی لیکن کسی روایت میں یہ موجود نہیں کہ حضرت سیدہؓ نے (ان کے قول کے مطابق) جن کی سالانہ آمدنی اڑھائی لاکھ روپیہ تھی۔ انہوں نے بھی کبھی اس میں حصہ لیا ہو۔ غزوہ تبوک کا واقعہ تو بالاتفاق خیبر و فدک کی فتح کے بعد کا ہے، اس وقت تو یقیناً آپ اتنی بڑی جاگیر کی مالک تھیں۔

مسلمانوں کی مالی حالت بڑی مخدوش تھی۔ تبوک کی مہم اخراجات کا تقاضا کر رہی تھی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی تیاری کے لیے مالی قربانی پیش کرنے کا جب اعلان کیا تو حضرت عثمان ہزاروں دینار لے کر آئے اور حضور کے قدموں میں آکر ڈھیر کر دیے حضور انہیں اپنی جھولی میں ڈال کر مسجد کے صحن میں پھرتے تھے اور حضرت عثمان کو دعاؤں سے نوازتے تھے حضرت عمر اپنا نصف مال لے کر حاضر ہوئے اور حضرت صدیق کی تو شان ہی نرالی تھی اپنا سارا اثاثہ اٹھایا اور اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنا لباس بھی اتارا اور بوریا کا لباس پہنا۔ ان حضرات کے علاوہ دیگر صحابہ نے بھی ایثار و خلوص کے خوب خوب مظاہرے کئے۔

لیکن کیا کوئی ایسی روایت آپ ہمیں دکھا سکتے ہیں جس میں درج ہو کہ حضرت خاتون جنت رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے بھی اس میں کوئی حصہ ڈالا ہو۔ ایسا بھی نہیں کہ صحابہ کرام کے چندوں کے بعد ضرورت نہ رہی بلکہ قرآن تو صاف بتاتا ہے کہ بعض مجاہد میدان جنگ میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے لیکن سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے فرمایا لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ میرے پاس تمہاری سواری کے لیے کوئی جانور نہیں ہے ناچارا نہیں واپس ہونا پڑا اس وقت ان کے رنج والم کی یہ حالت تھی۔ کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ رہے تھے اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا" کہ وہ لوٹے اس حالت میں کہ ان کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔

اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو حضرت سیدہ اتنی جاگیر کی مالک ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک پیسہ خرچ کرنے کی روادار نہ تھیں اس بات کو کوئی ایماندار تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جس گھرانے سے دنیا نے جودو کرم اور بخشش وعطا کا سبق سیکھا ہو۔ وہاں بخل اور کنجوسی کا کیا گزر) دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا محبوب اس کے اہل بیت اور اولاد کو دنیا کی لذتوں سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا، وہاں تو آخر دم تک کئی کئی دن فاقہ سے گزرتے تھے۔

کئی کئی ماہ چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی ان روشن حقائق کے سامنے کیا اس کذب و افترا کا پردہ چاک نہیں ہو جاتا کہ حضور نے اپنی صاحبزادی کو تمام دوسرے حق داروں کو محروم کرتے ہوئے اتنی بڑی جاگیر ہبہ کر کے مالک بنا دیا۔ محبت کے بلند بانگ وعادی کے شور و غل میں ناموس مصطفیٰ علیہا طیب التحیۃ و الثنا اور عظمت اہل بیت رضوان اللہ علیہم پر اس بیدردی اور بے خوفی سے شبخون ہمارے ان دوستوں کو ہی زیب دیتا ہے۔

اب آیئے ان روایات کی طرف جن کا سہارا لے کر گلشن اسلام کے ان سدا بہار اشجار ثمر بار پر یورش کی جاتی ہے، کہتے ہیں کہ حضور کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت سیدہؓ صدیق اکبر کے پاس گئیں اور میراث کا مطالبہ کیا اور یہاں تک کہا: یا ابن ابی قحافہ اترث اباک ولا ارث ابی "، اے ابو قحافہ کے بیٹے آپ تو اپنے باپ کے وارث بنیں اور میں اپنے باپ کے ورثہ سے محروم رہوں یہ بات قرین قیاس نہیں کہ حضور کی جدائی کا زخم ابھی تازہ ہو اور آپ نے حصول میراث کے لیے تگ و دو شروع کر دی ہو۔ نیز آپ کی شان سے بعید ہے کہ آپ خود بنفس نفیس عدالت صدیقی میں تشریف لے گئی ہوں اور دعویٰ دائر کیا ہو جس طرح عام طور پر بعض کم علم خیال کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کسی آدمی کے ذریعہ اپنے اس مطالبہ کو خلیفہ برحق کے گوش گزار کیا۔ امام بخاری کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔

عن عائشۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا ان فاطمۃ رضی اللّٰہ عنہا ارسلت الی ابی بکر تساله میراثها من النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم مما افاء اللّٰہ علیہ۔

ترجمہ :۔ یعنی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضرت سیدہ فاطمہ نے حضرت ابوبکر کے پاس آدمی بھیجا اور حضور کی میراث کا مطالبہ کیا۔

اس تصریح کے بعد بعض دوسرے مقامات پر جہاں مطالبہ کرنے کی نسبت خود حضرت سیدہ کی طرف کی گئی ہے وہ مجاز ہوگا۔

جب حضرت سیدہ کا پیغام حضرت صدیق اکبر کو پہنچا تو آپ نے جواب دیا۔ وہ بھی امام بخاری کے الفاظ میں سن لیجئے :۔

فقال ابوبکر ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال لا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ انما یاکل آل محمد من ھذا المال ..... وانی واللہ لا اغیر شیئاً من صدقات النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم التی کانت علیھا فی عھد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ولا عملن فیھا لما عمل فیھا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فتشھد علی ثم قال انا قد عرفنا یا ابابکر فضیلتک وذکر قرابتھم من رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وحقھم وتکلم ابوبکر فقال والذی نفسی بیدہ لقرابۃ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم احب الی ان اصل من قرابتی۔

(بخاری شریف جلد اوّل ص۵۲۶)

ترجمہ

حضرت سیدہ کے جواب میں حضرت ابوبکر نے عرض کیا اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہماری مالی وراثت نہیں ہوتی جو مال ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے اور آل محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس مال سے کھا سکتی ہے (ابوبکر نے کہا) بخدا میں حضور کے صدقات میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا جس طرح وہ عہد نبوت میں تھے۔ ویسے ہی رہیں گے اور میں ان میں ایسا ہی کروں گا جس طرح ان میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیا کرتے تھے سیدنا علی نے ان اسباب کی تصدیق کی اور فرمایا اے ابوبکر! ہم آپ کی فضیلت و بزرگی کو جانتے ہیں پھر آپ نے اس رشتہ داری

کا ذکر کیا جو انہیں حضور کے ساتھ تھی اور ان کے حق کا ذکر کیا حضرت صدیق اکبر نے یہ سن کر فرمایا کہ اس ذات پاک کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی سے کہیں یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کروں۔

آپ خود سوچئے کہ اس جواب میں کوئی قابل اعتراض بات ہے بے ادبی کا ادنیٰ شائبہ بھی اس میں پایا جاتا ہے کیا اس سے اہل بیت کی حق تلفی کی نسبت کا گمان ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ آپ نے حضرت بتول جنت کی خدمت میں یہ عرض کی کہ اللہ تعالےٰ کے پیارے رسول، آپ کے ابا جان اور میرے آقا و مولیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے اور مجھ میں یہ تاب نہیں کہ میں ارشادات نبوی سے سرمو انحراف کر سکوں۔ آپ خود ہی انصاف فرمائیے کہ اس جواب میں کون سا جملہ یا لفظ قابل اعتراض ہے۔

بعض لوگ فرط جوش اور شدت غضب میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت صدیق کی خود ساختہ ہے۔ انہوں نے فقط حضرت سیدہ کا حق غصب کرنے کے لیے یہ حدیث گھڑی ہے حیرت ہے کہ ایسے بے سروپا کلمات زبان سے نکالتے ہوئے انہیں غضب خدا کا خوف یا جگ ہنسائی کی فکر نہیں ہوتی، یہ حدیث صرف حضرت صدیق سے ہی مروی نہیں۔ صرف کتب اہل سنت میں ہی مرقوم نہیں بلکہ صحابہ کی کثیر تعداد سے مروی ہے اور معترضین حضرات کی معتبر کتب حدیث میں بھی ائمہ اہل بیت سے مرقوم ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اصول کافی ص۱۸ اس پر حضرت امام جعفر صادق حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی روایت کرتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان العلما ورثة الانبیاء ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن اورثوا العلم فمن اخذ منہ اخذ بحظ وافر۔
(اصول کافی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں ، بیشک انبیاء دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ علم ورثہ میں دیتے ہیں جس نے ان کے علم سے حصہ لیا اسے بڑا وافر حصہ ملا۔

دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت سیدنا علی مرتضیٰ شیر خدا اپنے فرزند ارجمند حضرت محمد بن حنفیہ کو ازراہ وصیت فرماتے ہیں۔

وتفقہ فی الدین فان الفقہاء ورثۃ الانبیاء ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکنھم ورثوا العلم ومن اخذ منہ اخذ بحظ وافر۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد دوم ص ۳۴۶۔

اے میرے فرزند دین میں فہم حاصل کرو کیونکہ فقہا ہی انبیاء کے وارث ہیں بے شک انبیاء دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ علم ورثہ میں دیتے ہیں اور جس نے علم نبوت سے کچھ حاصل کیا اس کو حظ وافر نصیب ہوا۔

تیسری روایت ملاحظہ ہو

یہ حضرت امام جعفر صادق کا اپنا ارشاد ہے، اس سے حدیث نبوی کی تصدیق اور وصیت مرتضوی کی تصویب ہوتی ہے۔

حضرت امام نے فرمایا۔

ان العلماء ورثۃ الانبیاء وذاک ان الانبیاء لم یورثوا درھما ولا دینارا ولکنھم اورثوا احادیث من احادیثھم فمن اخذ بشئ منھا فقد اخذ حظا وافرا"

(اصول کافی ص ۱۷)

"بے شک علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ انبیاء درہم و دینار ورثہ میں نہیں چھوڑتے بلکہ وہ احادیث (احکام شریعت) اور اسرار کتاب) ہی اپنی وراثت میں چھوڑ جاتے ہیں پس جس شخص نے اس بحر علم سے کچھ حاصل کیا اس کو حظ وافر نصیب ہوا۔"

اہل سنت کی کتب میں یہ ارشاد نبوی کثیر التعداد صحابہ سے مروی ہے بعض کے اسمائے گرامی ذہن نشین کر لیجیے حضرت خذیفہ بن یمان - زبیر بن عوام عباس، علی، عمر، عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، ابو درداء اور ازواج مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جب یہ بات نہیں بنتی تو کہتے ہیں کہ یہ حدیث آیات قرآنی کے خلاف ہے کیونکہ قرآن میں یوصیکم اللہ فی اولادکم، تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے اور کُم میں نبی اور امتی دونوں داخل ہیں اور حدیث صرف وہ معتبر ہوتی ہے جو قرآن کے مطابق ہو بجا فرمایا آپ نے مخالف قرآن حدیث معتبر نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا رسول قرآن کی تصدیق کے لیے تشریف لاتا ہے اس کی تردید اور تکذیب کے لیے نہیں اس لیے جو حدیث قرآن کی کسی آیت کے معارض ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کے نبی کا ارشاد نہیں ہو سکتی۔

لیکن میرے محترم! کبھی آپ نے قرآن کی تفسیر اور قرآن کی تردید میں جو فرق ہے۔ اس پر بھی غور کیا اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اگرچہ وہ اس کا بیٹا ہے لیکن کیا اس آیت کی رو سے آپ اس کو وارث بنائیں گے اسی طرح خدا نخواستہ اگر کسی مسلمان کا بیٹا مرتد ہو جائے تو اس کا بیٹا ہونے میں تو شک نہیں لیکن کیا وہ مرتد بیٹا اپنے مسلمان باپ کا وارث ہو گا؟ ہرگز نہیں کیا وہ احادیث جن میں قاتل اور مرتد کے وارث نہ ہونے کا حکم مذکور ہے کیا آپ اس لیے انہیں مسترد کر دیں گے کہ وہ قرآن کی اس آیت کے منافی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ ان احادیث کے متعلق یہ کہا جائے کہ ان احادیث نے اس بات کی تفسیر کر دی کہ کون سا بیٹا اپنے باپ کا وارث ہو سکتا ہے اور کون سا نہیں یہ احادیث آیت قرآنی کے مفسر ہیں مغیر یا ناسخ نہیں۔ اسی طرح ایک اور آیت میں غور کریں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ احل اللہ البیع وحرم الربوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیع (خرید و فروخت) کو حلال کر دیا لیکن سود کو حرام اگر اس آیت کو سند بناتے ہوئے کوئی شخص شراب، سؤر اور مردار کی خرید و فروخت اور کاروبار شروع کر دیتا ہے کیا آپ اس کے استدلال کو صحیح مانیں گے اور وہ احادیث جن میں ان حرام چیزوں کے کاروبار سے روکا گیا ہے انہیں قرآن

کی ناسخ اور مخالف گردان کو مسترد کر دیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ آپ یہ فرمائیں گے۔ کہ ربیع حلال ہے لیکن ان احادیث نے تغیر کر دی کہ کن اشیا کی بیع حلال ہے اور کن کی حرام ہے اسی طرح ان احادیث میں جو معترضین حضرات کی کتب میں بھی بروایت ائمہ معصومین منقول ہیں اس آیت کی مفسر ہیں نہ ناسخ

نیز جہاں خطاب ہو وہاں ہر جگہ حضور اور امت دونوں مراد نہیں ہوا کرتے بلکہ بعض مقامات پر صرف امت کو خطاب ہوتا ہے مثلاً اسی آیت سے چند سطر پہلے ارشاد ہے۔

وان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلث ورباع۔

اس آیت میں مخاطبین کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت ہے لیکن ان میں حضور داخل نہیں کیونکہ حضور کو نو تک شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔

یہاں معترضین حضرات فرماتے ہیں کہ انبیاء کے اموال میں اگر احکام وراثت جاری نہیں ہوتے تو پھر ورث سلیمان داؤد کا کیا مطلب ہوگا سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث بنے؟ نیز حضرت زکریا علیہ السلام کیوں یہ دعائیں مانگتے رہے حب لی من لدنک ولیا یرثنی ویرث من آل یعقوب۔

الہٰی مجھے ایک فرزند عطا فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو اس کے متعلق گزارش ہے کہ پہلی آیت میں جس وراثت کا ذکر ہے وہ داؤد علیہ السلام کے اموال کی وراثت نہیں بلکہ کتاب و شریعت کی وراثت ہے کیونکہ اگر مال کی وراثت کا ذکر ہوتا تو آپ کے دوسرے اٹھارہ بھائی بھی آپ کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہوتے صرف ایک بیٹے کو اپنی جائیداد کا دے دینا اور باقی بھائیوں کو سرے سے محروم کر دینا شان نبوت کے سراسر خلاف ہے اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام ایسے بیٹے کے لیے دامن طلب پھیلا کر دعا مانگا کرتے تھے جو ان کی نبوت کی ذمہ داریوں اور علوم و حکمت کا وارث ہو۔ ورنہ ان کے پاس ایسے خزانے کہاں تھے جن کے لیے وہ اتنے بے چین رہتے ہوں اور یعقوب

علیہ السلام کو گزرے تو صدیاں بیت چکی تھیں اور ان کے بارہ فرزند تھے ہر ایک فرزند کی کثیر اولاد تھی اور ان صدیوں میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہو گی اگر کوئی بہت بڑا خزانہ حضرت یعقوب نے چھوڑا ہو گا تو وہ تقسیم در تقسیم سے ناپید ہو چکا ہو گا۔ تو آل یعقوب کی وراثت جس کے لیے آپ التجا کر رہے ہیں وہی نبوت کے فرائض ہیں اور علوم و حکمت کے جواہر آبدار ہیں جن کے ضائع ہونے کا آپ کو اندیشہ رہا کرتا تھا اور جو ان کے نزدیک دنیا کے تمام خزانوں سے زیادہ بیش بہا تھے۔

آخر میں یہ فقیر بخاری شریف کی ایک حدیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے، اسے بکثرت اچھالا جاتا ہے اور سادہ لوح لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ حضرت سیدہ حضرت صدیق اکبر پر ناراض ہو گئیں اور عمر بھر کے لیے ان سے قطع تعلق کر لیا۔

بخاری شریف میں پانچ مرتبہ فدک کا تذکرہ ہے۔ بخاری ص ۵۲۶ جلد اوّل کی حدیث کے الفاظ بھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ ورق الٹ کر ایک بار پھر یاد تازہ کر لیجئے اس میں حضرت سیدہ کی ناراضگی کا کوئی ذکر نہیں بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، صدیق اکبر کے موقف کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہیں اور صدیق اکبر آخر یہ کہتے ہیں کہ مجھے اس ذات پاک کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے حضور کے رشتہ دار مجھے اپنے رشتہ داروں سے کہیں زیادہ عزیز ہیں

اسی طرح ص ۵۷۵ جلد دوم پر حدیث مذکور ہے جس میں صراحتاً سے ذکر ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان املاک کو حضرت علی اور حضرت عباس کے تصرف میں اس شرط پر دیا تھا کہ وہ ان سے حاصل ہونے والی آمدن کو اسی طرح خرچ کریں جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق خرچ کیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ ساری املاک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قبضے میں آئیں پھر آپ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن آپ کے بعد حضرت امام حسین کے قبضہ میں رہیں اور یہ حضرات اپنے اپنے اوقات میں اس آمدنی کو سنت نبوی کے مطابق صرف کرتے رہے حضرت سیدنا امام حسین کی شہادت کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت علی بن زین العابدین اور حضرت امام حسن کے صاحبزادے حسن

دونوں ان کا باری باری انتظام کرتے رہے پھر زید بن حسن کو یہ خدمت تفویض کی گئی بخاری شریف کے الفاظ ہیں۔

فکانت ھذہ الصدقۃ بید علی منعھا علی عباس فغلبہ علیھا ثم کان بید حسن بن علی ثم بید حسین بن علی ثم بید علی بن حسین و حسن بن حسن کلیھما کان بید اولا ثم بید زید بن حسن۔

اس حدیث میں بھی کہیں حضرت سیدہ کی ناراضگی کا ذکر نہیں بلکہ یہاں سے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت سیدنا عمر نے ان علاقوں کا انتظام حضرت علی مرتضٰے کے سپرد کر دیا تھا اور یہ سلسلہ چلتا رہا اور مذکورہ بالا حضرات اس کی آمدن کو سنت نبوی کے مطابق صرف کرتے رہے۔ انہوں نے بھی اس مرتبہ کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اگر یہ ورثہ ہوتی تو حضرت سیدہ کے سارے وارثوں میں ان کے حصص کے مطابق تقسیم ہو جاتی حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ ان حضرات کے مسلسل عمل نے حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم کے اس فیصلہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور دل میں اگر خوف خدا موجود ہے تو انہیں قطعاً ان حضرات پر زبان طعن دراز کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

ایک لطیفہ سماعت فرمائیے۔ خلیفہ عباسی سفاح جب پہلا خطبہ دینے کے لیے کھڑا ہوا تو ایک آدمی جس نے اپنے گلے میں قرآن مجید حمائل کر رکھا تھا اٹھا اور کہنے لگا: انا شدك الله الا حكمت بيني و بين خصمي بھذا المصحف اے خلیفہ! میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میرے درمیان اور میرے دشمن کے درمیان اس قرآن کی رو سے فیصلہ کرو۔ خلیفہ نے پوچھا تمہارا دشمن کون ہے؟ کہنے لگا۔ "ابوبکر فی منعہ فدک" ابوبکر میرا دشمن ہے جس نے فدک اہل بیت کو نہیں دیا۔ سفاح نے پوچھا اظلمك: کیا ابوبکر نے تجھ پر ظلم کیا ہے؟ اس نے کہا ہاں اس طرح پھر عثمان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور اس نے کہا کہ عثمان نے بھی مجھ پر ظلم کیا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کیا علی نے بھی تم پر ظلم کیا۔ اب اس پر سکتہ طاری ہو گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن آیا۔ عملی طور پر حضرت علی مرتضٰے اور ائمہ اہل بیت نے بھی وہی کچھ کیا جو حضرت صدیق اور حضرت فاروق

نے کیا تھا نہ اس زمین کی حیثیت میں تبدیلی کی نہ اس زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کسی قسم کا رد و بدل کیا نہ کسی کے لیے ازراہ وراثت مالکانہ حقوق تسلیم کئے تو پھر بے انصافی کی حد ہے کہ آپ ان حضرات کو تو کچھ نہ کہیں اور اپنا سارا غصہ حضور کے پیارے محبوب اور وفا شعار ساتھیوں پر نکالیں جن کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے سنت نبوی سے انحراف نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کا یہ جرم نہیں ورنہ اس جرم میں تو کئی اور حضرات بھی شریک ہیں اور ان سے یہ لوگ اپنی محبت و عقیدت کا دم بھرتے ہیں۔

ابوبکر اور عمر کا اصلی قصور یہ ہے جسے وہ کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکے کہ انہوں نے مشرق و مغرب میں اسلام کا نام بلند کر دیا۔ آتشکدے سرد کر دیئے۔ صلیبوں کو سرنگوں کر دیا۔ شام کے لالہ زاروں اور ایران کے مرغزاروں سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی دلنواز صدائیں بلند ہونے لگیں۔

اسی طرح بخاری شریف کے دوسرے مقامات پر بھی جو احادیث ہیں ان میں کہیں حضرت سیدہ کے غصے اور ناراضگی کا ذکر تک نہیں کیا البتہ ایک حدیث جو صـ۴۳۵ پر مذکور ہے وہ غور طلب ہے۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے انہیں بتایا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضور کی وفات کے بعد ابوبکر صدیق سے میراث کا مطالبہ کیا حضرت صدیق اکبر نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث پیش کی۔ لا نورث ما ترکنا صدقۃ الخ اور پھر معذرت خواہی کرتے ہوئے گزارش کی:۔ لست تارکا شیئاً کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یعمل بہ الا انی عملت بہ فانی اخشی ان ترکت شیئا من امرہ ان ازیغ۔

یعنی میں کسی ایسی چیز کو ترک نہیں کر سکتا، جس پر حضور کا عمل تھا مگر میں اس پر عمل کروں گا کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ اگر میں نے حضور کے کسی کام کو چھوڑا تو مجھ میں کجی پیدا ہو جائے گی۔

کتنی صاف بات ہے اور کس حسین انداز سے اپنی معذوری کا اظہار کیا ہے آپ کی ساری زندگی اتباع کا زندہ ثبوت ہے۔

اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں :۔

فغضبت بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فھجرت ابابکر ولم تزل مھاجرتہ حتی توفیت ۔ کہ حضرت سیدہ ابوبکر صدیق کی اس بات پر ناراض ہوگئیں اور صدیق اکبر سے قطع تعلق کرلیا۔

ان الفاظ میں غور طلب چند امور ہیں کیا یہ حضرت سیدہ کا قول ہے کہ میں ابوبکر پر ناراض ہوں ہرگز نہیں اور نہ ہی یہ حضرت عائشہ کا قول ہے بلکہ ان کے بعد کے راویوں میں سے کسی راوی نے اپنے خیال کے مطابق یہ قیاس آرائی کی لیکن یہ قیاس آرائی شان بتول کے سراسر خلاف ہے کیونکہ یہ تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ کے سامنے رسول کریم کا قول پیش کیا جائے اور آپ اسے بخوشی قبول نہ کریں بلکہ الٹا ناراضگی کا اظہار کریں آپ ذرا قرآن کریم کی اس آیت پر غور کریں اللہ تعالے فرماتے ہیں۔ فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

اے میرے محبوب ! تیرے رب کی قسم وہ لوگ مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے متنازعہ امور میں آپ کو حکم تسلیم کریں اور جو آپ فیصلہ فرمادیں اس کے بارے میں ان کے دل میں ناگواری کا کوئی اثر نہ ہو اور وہ آپ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کردیں۔

جب ایک عام انسان پر لازم ہے کہ وہ حضور کے فیصلہ کے سامنے بلا چوں وچرا سپر انداز ہوجائے اور اس کے بارے میں کسی قسم کا ملال دل میں نہ لائے تو حضرت خاتون جنت کے متعلق یہ کہنا کہ آپ ارشاد نبوی سن کر ایسی خشمناک ہوگئیں کہ قطع تعلق کرلیا ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ راوی کا یہ بیان ہے اور نیک سے نیک آدمی بھی غلط فہمی کا شکار ہوسکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور سے واپس آئے اور اپنی قوم کو بچھڑے کی پرستش کرتے ہوئے دیکھا تو غصہ سے بے قابو ہوگئے اور یہ خیال کیا کہ شاید اس میں حضرت ہارون کی غفلت کا دخل ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا تو اس طرح کی غلط فہمیاں جب اکابر کو ہوجاتی ہیں تو راوی حدیث بیشک عادل اور ثقہ کیوں نہ ہو اس قسم کی غلط

فہمی کا شکار ہو جائے تو قطعاً بعید از فہم نہیں لیکن اگر ان الفاظ کو حقیقت پر محمول کیا جائے تب بھی ایسی روایات بکثرت موجود ہیں جن سے حضرت سیدہ کی خوشنودی کا ثبوت ملتا ہے۔ صرف ایک حوالہ پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

علامہ کمال الدین میثم البحرانی نہج البلاغۃ کی شرح جلد خامس میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت سیدہ کی گفتگو سن کر صدیق اکبر نے کہا۔

" یا خیرۃ النساء وابنۃ خیر الآباء واللہ ما عدوت رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا عملت الا بامرہ "۔

اے خواتین عالم کی سردار! اے تمام باپوں کے تاجدار کی لخت جگر، خدا کی قسم! میں نے حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رائے سے ذرا تجاوز نہیں کیا میں نے وہی کچھ کیا جس کا حضور نے حکم دیا اس کے بعد آپ نے عرض کیا:

کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یاخذ من فدک قوتکم ویقسم الباقی ویحمل منہ فی سبیل اللہ ولک علی اللہ ان اصنع بھا کما کان یصنع فرضیت بذالک واخذت العھد علیہ بہ۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فدک سے آپ کی ضروریات زندگی (خوراک) لیا کرتے تھے اور باقی کو مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور مجاہدین کو سواریاں اس سے مہیا فرماتے اور میں اللہ تعالیٰ کو ضامن بنا کر اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی وہی کچھ کروں گا جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کیا کرتے تھے یہ سن کر آپ راضی ہو گئیں اور اس بات پر عمل پیرا رہنے کا پختہ وعدہ کر لیا۔

اس کے بعد علامہ کمال الدین لکھتے ہیں جس سے امام بخاری کی روایت کی بھی تصدیق ہوتی ہے:

وکان یاخذ غلتھا فیدفع الیھم منھا ما یکفیھم ثم فعلت الخلفاء بعدہ کذالک

یعنی حضرت ابوبکر صدیق کا یہ معمول تھا کہ فدک وغیرہ کا غلہ لیتے اور اہل بیت کے افراد میں حسب ضرورت تقسیم کرتے آپ کے بعد آنے والے خلفاء بھی اسی طرح کرتے رہے۔

(شرح نہج البلاغۃ جلد ۵ صفحہ ۱۰۷)

جب ان حقائق کا آپ نے مطالعہ فرمالیا تو حضرت صدیق اکبر پر لگائے جانے والے الزام کی مکمل طور پر بیخ کنی ہوگئی اور اسی طرح حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ذات اقدس واطہر پر جو بہتان تراشی کی جاتی تھی اس کا بھی نام ونشان باقی نہ رہا۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی الہ الطاھرین وازواجہ الطاھرات وامھات المومنین وعلی سائر الصحابہ والتابعین اجمعین۔

حدیثِ قرطاس

تحریر

مولانا محمود احمد رضوی

مسئلہ قرطاس پر غور و فکر کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اصل واقعہ کو سمجھ لیا جائے یہاں ہم اس واقعہ سے متعلق دو روایتیں پیش کرتے ہیں جس سے اصل صورت حال واضح ہوتی ہے۔

عن عبد اللہ بن عباس قال لما حضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ففی البیت رجال فیہ عمر ابن الخطاب قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اکتب لکم کتابا لا تضلو بعدہ قال عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب اللہ فاختلف اھل البیت فاختصموا امنھم من یقول قربوا یکتب لکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتابا لن تضلو البعدہ ومن ھم من یقول ما قال عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ توموا عنی۔

ترجمہ

جب حضور کی وفات کا وقت قریب آیا تو دولت خانہ نبوی میں لوگ جمع تھے جن میں حضرت عمر بن الخطاب بھی تھے حضور نے فرمایا کہ آؤ تم کو ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا حضور کو اس وقت

بیماری کی تکلیف زیادہ ہے تمہارے پاس قرآن ہے اور قرآن ہمارے واسطے کافی ہے پس گھر والوں نے اختلاف کیا بعض کہتے تھے کہ سامان کتابت حضور کے پاس رکھ دو تاکہ وہ تمہارے لیے ایسی تحریر لکھ دیں کہ جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے اور بعض وہی بات کہتے تھے جو حضرت عمر نے کہی تھی پس جب ان کا اختلاف زیادہ ہوا اور باتیں بڑھیں تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس سے اُٹھ جاؤ۔ (بخاری)

دوسری روایت یہ ہے۔

عن سعید ابن جبیر قال قال ابن عباس یوم الخمیس وما یوم الخمیس اشتد برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ فقال ایتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ ابدا فتنازعوا ولا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا ما شانہ اھجر استفھموہ فذھبوا یردون عنہ فقال دعونی انا فیہ خیر مما تدعوننی الیہ واوصاھم بثلاث قال اخرجوا الیھود من جزیرۃ العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم وسکت عن الثالثۃ او قال فنسیتھا۔

(بخاری جلد دوم)

سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے کہا جمعرات کا دن اور کیسا جمعرات کا دن کہ اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد زیادہ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا (سامان کتابت) میرے پاس لاؤ تاکہ تمہارے لیے ایسی تحریر لکھ دوں کہ جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے پس حاضرین نے اختلاف کیا اور کسی پیغمبر کے پاس تنازع مناسب نہیں پس بعض نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کیا ہے کیا جدائی کا وقت قریب آگیا ہے آپ سے دریافت تو کر لو پس وہ معاملہ کتابت کو آپ پر دوبارہ پیش کرنے لگے اس پر آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو کیونکہ میں جس حالت میں ہوں (مراقبہ حق میں) وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔ آپ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی۔

(۱) مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو (۲) وفود کو اسی طرح انعام دیا کرو جیسے میں دیا کرتا ہوں تیسری بات سے سعید ابن جبیر چپ رہے یا ابن جبیر تو بیان کر دی اور میں اس کو بھول گیا۔ (بخاری و مسلم)

جو بات لکھوانا چاہتے تھے اس کی کیا حیثیت تھی؟

واقعہ قرطاس کی یہ دو روایتیں اصل واقعہ کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم نے نقل کی ہیں اب جو امور اس سلسلہ میں قابل غور و فکر ہیں۔ وہ بیان کئے جاتے ہیں۔ قارئین کرام تعصب سے بالاتر ہو کر بغور مطالعہ فرمائیں۔

واقعہ قرطاس کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو بات لکھوانا چاہتے تھے اس کی کیا حیثیت تھی؟ کیا وہ کوئی ایسی بات تھی جو آپ کے فرائض نبوت میں سے تھی۔ اور جس کے اظہار کے بغیر دین نامکمل رہ جاتا تھا؟ واقعہ قرطاس کی روایات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے جو بات حضور لکھوانا چاہتے تھے اس کی یہ حیثیت نہ تھی جس کے دلائل یہ ہیں۔

اوّل:۔ یہ ایک اصولی بات ہے کہ انبیاء کرام خدا کی طرف سے جن امور کی تبلیغ کے لیے مبعوث ہوں اور جس بات کی تبلیغ ان کا فرض نبوت ہو وہ اس میں قطعاً حتماً کسی حال میں کوتاہی نہیں کر سکتے حضور کو حکم تھا:۔

یاایھا الرسول بلغ مآ انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔ (القرآن)

اے نبی خدا کی طرف سے جو احکامات آئیں ان کی تبلیغ فرماؤ۔ اگر ایسا نہ کیا تو تم نے اپنا فرض نبوت ادا نہ فرمایا اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرماتا ہے۔

یہ آیت بتائی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم احکام الہیہ کی تبلیغ میں کوتاہی نہیں فرما سکتے تو اگر یہ تحریر دین کی نہایت ہی اہم ضروری بات پر مشتمل ہوتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس کو لکھوا دیتے خواہ کوئی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرتا۔

دوم:۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمرؓ نے سامانِ کتابت پیش نہیں ہونے دیا تو یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حضور اکرم نے سامانِ کتابت لانے کا حکم صرف حضرت عمر کو نہیں دیا تھا بلکہ تمام حاضرین کو دیا تھا کیونکہ اِئْتُوْنِی جمع کا صیغہ ہے جو یہ بتا رہا ہے کہ جیسی اس حکم کی تعمیل کی ذمہ داری حضرت عمر پر آتی تھی۔ اسی قدر ان تمام حاضرین مجلس پر آتی تھی جس میں حضرت علی بھی شامل تھے بلکہ حضرت علی پر اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ آتی تھی کیونکہ بزعم شیعہ یہ تحریر انہیں کی خلافت سے متعلق تھی۔ اور دولت خانہ نبوی میں کتابت وحی کا کام بھی انہیں کے سپرد تھا لہذا ان کا فرض تھا کہ وہ سامان کتابت بحضورِ نبوی پیش کر دیتے مگر انہوں نے بھی نہ کیا بلکہ حاضرین میں سے کسی نے بھی سامان کتابت پیش نہ کیا۔ البتہ بعض نے حضور سے کئی بار یہ پوچھا کہ ہم سامان کتابت پیش کر دیں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر عدم تعمیل حکم کا الزام حضرت عمر پر آتا ہے تو حضرت علیؓ پر بھی آئے گا بلکہ تمام وہ طعن اور الزامات جو شیعہ حضرات عمر پر قائم کرتے ہیں وہ سب کے سب تمام حاضرین مجلس پر قائم ہوں گے اور حضرت علی نہیں بچیں گے۔

سوم اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علیؓ (معاذ اللہ) ایسے بزدل تھے کہ حضرت عمرؓ کی موجودگی میں ایسا نہ کر سکتے تھے تو یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ جمعرات کے دن کا ہے حضورؐ کا وصال پیر کے دن ہوا حضرت علیؓ اس مدت میں جب کہ حضرت عمرؓ نہ ہوتے تحریر لکھواتے یا حضور ہی لکھوا دیتے۔

چہارم اور اگر یہ کہا جائے کہ معاذ اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت عمرؓ سے ڈر گئے تھے اور تحریر نہ لکھوا سکے تو اوّل تو یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو اعلیٰ درجہ کا منافق ہو ایک مسلمان تو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصوّر نہیں کر سکتا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم دین کی نہایت ضروری بات کسی سے ڈر کر نہ بیان کریں اور اگر نبی کے متعلق ایسا مان لیا جائے تو پھر تو نبوت ایک کھیل ہو جائے گی اور سارا دین ہی نا قابل اعتبار قرار پائے گا کہ نامعلوم نبی اکرم نے (معاذ اللہ) کتنے احکام ربانی خوف کی وجہ سے امّت تک نہیں پہنچائے کیا یہ بات کسی کی عقل میں آ سکتی ہے کہ وہ رسول جس نے مخالفوں کی

بھیڑ میں توحید کا اعلان کیا اور تلواروں کی جھنکاروں میں حق کا اظہار فرمایا اور باطل کا ابطال کیا وہ حضرت عمرؓ سے ڈر جائے کہ اپنی امت کے لیے ایسی ضروری تحریر نہ لکھوائے۔

پنجم

یہ بھی ظاہر ہے کہ حاضرین کا اختلاف کرنا بھی حضور کو دین کی کسی اہم بات کی تبلیغ سے نہیں روک سکتا کیونکہ جب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان کتابت لانے کا حکم فرمایا تو حاضرین میں سے کسی نے بھی حضور سے بحث و تکرار نہیں کی۔ کسی ایک نے بھی حضور سے یہ نہیں کہا کہ آپ تحریر کا ارادہ ملتوی فرما دیں جو بحث و تکرار ہوئی وہ آپس میں ہوئی ایک فریق تحریر لکھوانے کے حق میں تھا اور دوسرے کی رائے یہ تھی کہ حضور اس وقت تکلیف میں ہیں

اس لیے تحریر کی تکلیف نہ دی جائے ظاہر ہے کہ اگر حضور چاہتے تو حاضرین کے آپس میں اختلاف کرنے کے باوجود سامان کتابت لانے کا حکم دوبارہ فرما دیتے اور اگر حضور تحریر کا دوبارہ ارادہ فرما لیتے ہیں تو کس میں طاقت تھی کہ وہ آپ کو روک سکتا مگر حضور نے دوبارہ تحریر کا ارادہ ہی نہیں فرمایا کیا نبی جس بات کی تبلیغ کے لیے مبعوث ہوا۔ اس کو محض حاضرین میں سے چند افراد کے اختلاف کرنے کی وجہ سے ترک کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ششم

جب حاضرین میں سامان کتابت پیش کرنے میں جھگڑا ہوا تو حضرت عمر کے حسبنا کتاب اللہ کہنے کے بعد حاضرین مجلس میں سے بعض نے معاملہ کتابت کو دوبارہ حضور پر پیش کیا حضور چاہتے تو اس وقت بڑی آسانی سے تحریر لکھوا سکتے تھے۔ مگر آپ نے نہ لکھوائی۔

ہفتم

واقعہ قرطاس سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقع پر آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہو چکی تھی یعنی دین کی تکمیل تو تین ماہ قبل ہو چکی تھی اور امت کو گمراہی سے بچانے والے جس قدر امور تھے۔ وہ سب بیان ہو چکے تھے اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم

نے یہ بتا دیا تھا کہ اب دین کامل و مکمل ہو گیا اب کسی حکم کی تبدیلی، منسوخ کمی و بیشی نہیں ہو سکتی یعنی اس کے نزول کے بعد دین کی کوئی ایسی بات باقی نہیں رہی تھی جو کتاب و سنت میں نہ آ گئی ہو۔

اور حضور نے اس کی تبلیغ نہ فرما دی ہو تو اب اگر یہ مانا جائے کہ جو بات حضور لکھوانا چاہتے تھے وہ دین کی ایسی ضروری بات تھی کہ جس کے بغیر دین مکمل نہیں ہو سکتا تھا تو پھر تو تکمیل دین کا اعلان صحیح قرار نہیں پائے گا اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم کی تکذیب ہو جائے گی۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے نزول اور دین کی تکمیل و تبلیغ کے بعد جو بات حضور لکھوانا چاہتے تھے وہ امور بطور تاکید ہی لکھوانا چاہتے تھے۔

اور ان کی حیثیت صرف یہ تھی جیسے کوئی بزرگ کسی جگہ سے یا دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے متعلقین کو چند اہم امور کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ سو ایسا ہو بھی گیا حضور نے اپنی حیات کے انہی ایام میں بیان فرمائے وہ وہی ہیں جن کا ذکر کسی نہ کسی طرح پہلے ہی سے کتاب و سنت میں آ چکا ہے۔

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کیا تحریر کرانا چاہتے تھے؟

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ :۔

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن امور کے لکھوانے کے لیے سامان کتابت طلب فرمایا تھا وہ کیا تھے؟

(۲) اور جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسبنا کتاب اللہ کہا تو اس کے بعد بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور کو لکھوایا یا زبانی ارشاد فرمایا۔

تو صحیح روایتوں سے بلکہ خود اسی روایت سے جس سے واقعہ قرطاس مذکور ہے اسی میں یہ بھی ہے کہ پھر آپ نے اوصاھم بثلاث قال اخرجوا المشرکین من

جزیرۃ العرب و اجیزوا الوفد بنحو

ما کنت اجیزھم وسکت عن الثالثۃ او قال نسیتُھا

(مصری) بخاری جلد ۲ ص۶۵

تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ اول مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ وفود کو اسی طرح انعام دو جس طرح میں دیا کرتا تھا تیسری وصیت سے سعید ابن جبیر چپ رہے یا انہوں نے تو بیان کر دی مگر میں بھول گیا۔

لیکن یہ تیسری وصیت جس کو راوی حدیث بھول گئے ہیں وہ موطا امام مالک بلکہ بخاری مصری جلد ۲ صفحہ نمبر ۶۶ سے معلوم ہو جاتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

کان اخر ما تکلم بہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان قال قاتل اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد۔

حضور نے اپنی زندگی پاک میں سب سے آخری کلام یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کو قتل کرے انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا ہے۔

تو جب وہ امور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبانی ارشاد فرما دیئے تو اب حضرت عمر پر یہ الزام کیسے قائم ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسی ضروری بات نہیں لکھی جو اُمت کو گمراہی سے بچاتی

پس جب واقعہ قرطاس کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ جن امور کے لکھوانے کے لیے حضور اکرم نے دوات قلم طلب فرمایا تھا وہی امور آپ نے زبانی بیان فرما دیئے تو ایسی صورت میں جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کسی طعن کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور حضرت علی کی خلافت کے متعلق تحریر لکھوانا چاہتے تھے حالانکہ اس کی تصریح کسی صحیح و معتبر روایت میں نہیں ملتی۔ لہٰذا یہ محض ان کا ایک دعویٰ ہے جو بلا دلیل ہے۔ البتہ بخاری و مسلم کی حدیثوں سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ حضور حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے متعلق تحریر لکھوانے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور نے اپنے مرض وفات میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے

فرمایا۔

اُدعی لی ابابکرٍ واخاکِ حتی اکتب کتاباً فانی اخافُ ان یتمنی متمنٍ ویقولُ قائلٌ انا

ولا ویابیٰ اللّٰہ والمومنون اِلّا ابابکرٍ بخاری و مسلم

(مشکوٰۃ باب المناقب ابوبکر)

اپنے باپ اور بھائی کو میرے پاس بلاؤ تا کہ میں ایک تحریر لکھ دوں۔ کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے اور کہنے والا کہے (کہ میں خلافت کا مستحق ہوں اور اللہ تعالیٰ اور مومنین دونوں انکار کرتے ہیں۔ ابوبکر کے سوا کسی دوسرے شخص کی خلافت سے۔

وحیٔ خداوندی یا اجتہادِ نبوی

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر لکھوانے کا ارادہ وحی خداوندی کے ماتحت فرمایا تھا یا اپنے اجتہاد کے ماتحت میرے نزدیک صحیح یہ ہی ہے کہ حضور نے تحریر لکھوانے کا ارادہ اپنے اجتہاد کے ماتحت فرمایا تھا کیونکہ اگر آپ کا یہ ارادہ وحیٔ الٰہی کے مطابق ہوتا تو تحریر لکھوانا آپ کا فرض نبوت قرار پاتا اور نبی اپنے فرض نبوت میں کوتاہی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آپ حکم الٰہی کے ماتحت بہر صورت تحریر لکھواتے رہے حاضرین یا حضرت عمرؓ تو حضور ان کو صاف صاف فرما سکتے تھے کہ میری علالت اس تحریر کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تم میری ناسازگی طبع کا خیال کر کے تحریر نہ لکھوانے کا مشورہ دے رہے ہو مگر یہ تحریر تو حکم خداوندی ہے۔

یہ بہر صورت لکھوائی جائے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضور نے تحریر نہ لکھوائی لہٰذا یہ ماننا پڑے گا۔

کہ حضور کا تحریر لکھوانے کا ارادہ فرمانا اجتہاد پر مبنی تھا۔ اور پھر اس کو ملتوی فرما دینا بھی اجتہاد ہی پر مبنی تھا۔

لفظ ہجر کی تحقیق اور یہ لفظ کس نے کہا؟

واقعہ قرطاس سے حضرات شیعہ حضرت عمر پر جو الزامات قائم کرتے ہیں ان میں سب سے اہم اور سب سے شدید الزام ان کا یہ ہے کہ جب حضور نے سامان کتابت لانے کا حکم دیا تو حضرت عمرؓ نے کہا۔

اَھَجَرَ شیعہ کہتے ہیں کہ ہجر کے معنی یہاں صرف ہذیان کے ہیں اور یہ لفظ حضرت عمرؓ نے رسول کریمؐ کی شان میں کہہ کر آپ کی سخت وشدید توہین کی ہے جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ ہی غلط اور افترا محض ہے کہ لفظ ہجر حضرت عمرؓ نے کہا بخاری میں یہ حدیث سات جگہ آئی ہے مگر کہیں بھی یہ لفظ حضرت عمر سے منقول نہیں۔ بلکہ قالوا جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے" یہ لفظ لوگوں نے کہا مگر کس نے کہا؟

کسی بھی صحیح ومعتبر روایت میں اس کا نام مذکور نہیں البتہ شارحین نے اپنے قیاس سے کام لیا ہے کسی نے لکھا یہ قول اس جماعت کا ہے جو تحریر لکھوانے کے حق میں تھی اور کسی نے لکھا کہ کچھ لوگ نومسلم تھے ان کا یہ مقولہ ہے غرض کہ حضرت عمر کی طرف اس قول کو منسوب کرنا بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے چنانچہ ایک عرصہ سے مجتہدین شیعہ اس تلاش میں سرگرداں ہیں کہ کوئی ایسی روایت مل جائے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ لفظ حضرت عمر کا مقولہ تھا مگر نہیں ملی اور انشاءاللہ العزیز قیامت تک یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت عمرؓ نے لفظ ہجر کہا تھا۔ لہٰذا جب حضرت عمر کا لفظ ہجر کہنا ثابت ہی نہیں تو ان پر الزام کیسا؟

دُوم ھَجَرَ یَھْجُرُ باب نَصَرَ یَنْصُرُ کے وزن پر لازم ومتعدی دونوں طرح مستعمل ہے۔

(۱) جب یہ متعدی استعمال ہو تو ھجران سے مشتق ہوگا۔ اور اس کے معنی کسی چیز کے چھوڑ دینے کے ہوں گے۔

(۲) اور جب یہ لفظ لازم استعمال ہو تو اس وقت اس کے معنی بلا ارادہ بات کرنے کے ہوں گے خواہ نیند میں آدمی بات کرے یا غلبہ مرض کی وجہ سے بے اختیار زبان

سے جملے نکالے جس کو ہذیان کہتے ہیں ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں لفظ ہَجَرَ کے کیا معنی ہیں اور کون سے معنی یہاں اولیٰ ہیں تو حدیث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے ۔ یہاں ہَجَرَ کے معنی ہذیان کے نہیں بلکہ جدائی کے ہیں چنانچہ یہ لفظ بمعنی جدائی قرآن مجید میں بھی استعمال ہوا ہے ۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ط

اور عربی اشعار میں تو اس کثرت سے یہ لفظ جدائی اور فراق کے معنی میں آیا ہے کہ دوسرے معنی کی طرف ذہن ہی منتقل نہیں ہوتا ۔

صراح وغیرہ کتب لغت میں ہے ہَجَرَ ھجران جدائی کردن از نصر اسی لیے ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا کہ اھجر فعل ماضی من الھجر بفتح الھاء سکون الجیم والمفعول محذوف ای الحیاۃ اور لغات حدیث کے امام صاحب مجمع البحار نے لکھا ان معناہ ھجر کم رسول اللہ من الھجر ضد الوصل یعنی ھجر کے معنی یہاں جدائی کے ہیں ۔

لہٰذا آھجر استفھموہ کا ترجمہ یہ ہوا کہ حضور سے پوچھو تو کیا جدائی کا وقت قریب آگیا ہے؟ یعنی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر لکھوانے کا ارادہ فرمایا اور چونکہ یہ تحریر اسی مرض میں لکھوانی چاہی جس میں آپ کا وصال ہوا تو حالات کو دیکھ کر صحابہ کرام کے قلوب پر ایک بجلی سی گری اور ان میں سے کسی نے کہا آھجر استفھموہ حضور سے دریافت تو کرو کیا جدائی اور فراق کا وقت قریب آگیا ہے کہ حضور آخری وصیت لکھوانا چاہتے ہیں) چنانچہ حاضرین میں سے کسی کا یہ کہنا کہ "استفھموہ"، حضور سے پوچھو تو؟) یہ پوچھنے کا مضمون صاف اس امر پر قرینہ ہے کہ یہاں ہجر بمعنی ہذیان نہیں ہے کیونکہ جس کو ہذیان ہو جائے اس سے پوچھنا کیسا؟

رضی اللہ عنہ
فاروق اعظم اور تحریم متعہ

تحریر

مولانا عطا محمد بندیالوی

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عبقری شخصیت اسلام کی تاریخ میں ایک زریں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کا دور خلافت، حکومت کی وسعت عدل و انصاف کی فراوانی عوام کی خوش حالی اور اسلامی علوم و فنون کی ترویج و ترقی کا دور تھا کفار اور مشرکین کے ایوانوں پر حضرت عمر کی ہیبت اور دہشت و جبل پر ان کی حکومت تھی۔ ان کے رعب سے حکام لرزہ بر اندام تھے اور صحرا و دریا کو بھی حکم عدولی کی جرأت نہ تھی۔

حضرت فاروق اعظم کے محاسن و کمالات جتنے زیادہ ہیں اسی قدر حاسدین کی بھی کثرت ہے، حضرات امامیہ یوں تو تمام صحابہ سے عداوت رکھتے ہیں لیکن جناب فاروق سے ان کو جس قدر بغض اور حسد ہے اس کا بیان اندازہ سے باہر ہے حضرت عمر کی وہ تمام خدمات جن سے عمارت اسلام کو استحکام ملا انہیں مجموعۂ عیوب نظر آتی ہیں۔

حضرت عمر کی ذات گرامی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلامی احکام کے علی الرغم محض اپنی رائے سے متعہ کو حرام کر دیا اور ان کی ڈکٹیٹر شپ کے سامنے

کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی تھی کہ حضرت علی بھی تقیہ کا سہارا لے کر خاموش ہو گئے عقل و خرد حیرت سے دم بخود رہ جاتی ہے کہ حضرت علی کو جان اتنی پیاری تھی کہ ان کے سامنے بروایت شیعہ حضرت سیدہ کی بے عزتی کی گئی اور وہ خاموش دیکھا کئے کلام اللہ میں تحریف کر دی گئی اور ان کے لب نہ ہلے شریعت مصطفوی میں عمر کی رائے سے ترمیم ہوتی رہی اور علیؓ ساکت وجامد رہے! عزت و آبرو کے تحفظ اور ناموس ملت کے لیے اگر جان نہ دی جا سکے تو پھر اس جان کا اور کیا مصرف ہے؟

تقیہ کے موضوع پر اظہار خیال سردست ہمارا موضوع نہیں ہے عنوان گفتگو اس وقت یہ ہے کہ جب حضرت عمر کے دامن کو تنفیذ حرمت متعہ کے سبب ترمیم دین اور تحریف شریعت کے غلط الزام سے پاک وصاف کیا جائے بلکہ ان آنکھوں کے لیے دلائل کی بصیرت مہیا کی جائے جنہیں اس دامن کی پاکیزگی نظر نہیں آتی۔

متعہ کی تعریف اور اس کے احکام

متعہ اس عقد کو کہتے ہیں جس میں مقررہ معاوضہ سے معینہ مدت کے لیے کسی عورت کو قضاء شہوت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے اس عقد کے لیے نہ گواہوں کی ضرورت ہے نہ ممتوعہ عورتوں کے لیے تعداد کی کوئی قید ہے نہ نفقہ نہ سکنیٰ، نہ نسب نہ میراث، ایلا، ظہار، طلاق اور عدت، متعہ ان سب میں آزاد ہے جہاں فریقین راضی ہوئے مدت اور اجرت طے ہوئی وہیں جنسی تسکین کا عمل شروع ہو گیا۔

رواج متعہ اور حضرت عمر

متعہ زمانہ جاہلیت کی قبیح رسموں میں سے ایک رسم تھی۔ اسلام نے جس تدریجی عمل کے ذریعہ دوسری برائیوں کو رفتہ رفتہ ختم کیا اسی طرح متعہ کو بھی فتح مکہ کے بعد حرام کر دیا اور کتاب وسنت میں اس کی حرمت کے دلائل پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔

حضرت عمر نے جس طرح شریعت کے دوسرے قوانین پر سختی سے عمل کرایا۔ شراب وزنا

پر حدود جاری کیں چوروں کے ہاتھ کاٹے جھوٹے گواہوں کو سزائیں دیں اسی طرح آپ نے پوری شدت اور تندہی سے حرمت متعہ کی بھی تبلیغ اور تنفیذ کی جو لوگ بے علمی اور غفلت کی بنا پر متعہ کرتے رہے تھے۔ انہیں سخت الفاظ سے تنبیہ اور تہدید کی جس طرح حضرت ابوبکر نے زکوۃ نہ دینے والوں کو للکارا اور سختی سے ان کا محاسبہ کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ زکوۃ کے شارع ہیں اسی طرح حضرت عمر نے متعہ کرنے والوں کو بروقت ٹوکا اور اپنے دور خلافت میں حدود الہٰی کی حرمت کو پامال نہیں ہونے دیا۔ پس حضرت عمر بھی حضرت ابوبکر کی طرح شارع نہیں مبلغ تھے۔

شریعت اسلامیہ نے متعہ کو قطعی طور پر قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے ہم اس کے ثبوت میں قرآن کریم کی آیات اور احادیث صحیحہ ہدیہ رقم کریں گے اور امامیہ کی طمانیت کی خاطر ان کی صحاح سے بھی شواہد لائیں گے اور اخیر میں امامیہ کے معرکۃ الآرا دلائل و براہین پر نقد و نظر کریں گے فنقول و باللہ التوفیق۔

حرمت متعہ کتاب اللہ سے

اللہ عزوجل فرماتا ہے۔

فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث وربٰع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم ؕ

"جو عورتیں تم کو پسند ہیں ان سے نکاح کرو، دو دو سے تین تین سے اور چار چار سے اور اگر تمہیں ان کے درمیان ناانصافی کا خدشہ ہو تو صرف ایک سے نکاح کرو یا اپنی کنیزوں پر اکتفا کرو۔"

یہ آیت سورۂ نساء سے لی گئی ہے جو مدنی ہے اور ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل استطاعت سے خطاب فرمایا۔

اور ان کے لیے قضاء شہوت کی جائز صورتیں بیان فرما دیں کہ وہ ایک سے چار تک نکاح کر سکتے ہیں اور اگر ان میں عدل قائم نہ رکھ سکیں تو پھر اپنی کنیزوں اور باندیوں

سے نفع اندوزی کر سکتے ہیں اور بس اگر متعہ بھی قضاءِ شہوت کی جائز شکل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کا بھی ان صورتوں کے ساتھ ذکر فرما دیتا اور اس جگہ متعہ کا بیان نہ کرنا ہی اس بات کا بیان ہے کہ وہ جائز نہیں ہے اور اس طرح اوائل اسلام سے لے کر فتح مکہ تک متعہ کی جو شکل معمول اور مباح تھی اس آیت کے ذریعہ اس کو حرام کر دیا گیا۔

امامیہ حضرات کو اگر یہ شبہ لاحق ہو کہ اس آیت میں لفظ نکاح متعہ کو بھی شامل ہے لہٰذا نکاح کے ساتھ متعہ کا جواز بھی ثابت ہو گیا تو اس کے ازالہ کے لیے گزارش ہے کہ اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ نکاح کی حد صرف چار عورتوں تک ہے اور متعہ میں عورتوں کی تعداد کے لیے کوئی قید نہیں ہے پس جب کہ یہ دو متضاد حقیقتیں ہیں تو ظاہر ہے کہ ایک لفظ سے ان دونوں کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا ورنہ اجتماع ضدین لازم آئے گا اور اللہ تعالیٰ کا کلام اس قسم کی خرافات کا محل بننے سے بلند و برتر ہے۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ نکاح اور متعہ دو الگ الگ حقیقتیں ہیں نکاح میں عقد دائمی ہوتا ہے۔ متعہ میں عارضی نکاح میں ممنوعات کی تعداد محدود ہے اور متعہ میں ممنوعات کی تعداد کی کوئی حد نہیں۔ نکاح میں نفقہ سکنیٰ نسب اور میراث لازم ہوتے ہیں اور ایلاء، ظہار، لعان، طلاق اور عدت عارضی ہوتے ہیں اور متعہ میں نہ ان میں سے لازم ہوتا ہے اور نہ عارض پس نکاح اور متعہ اپنی حقیقت لوازم اور عوارض کے اعتبار سے دو مختلف چیزیں ہیں البتہ اگر نکاح کا مفہوم متعہ سے عام ہوتا تو اس کا متعہ کو شامل ہونا معقول ہوتا لیکن جب نکاح اور متعہ دو بالکل متضاد حقیقتیں ہیں۔ تو ایک ضد کا دوسری ضد کو شامل ہونا قطعاً غیر متصور اور سراسر غیر معقول ہے۔

بعض امامیہ حضرات کہہ دیتے ہیں کہ نکاح کی دو قسمیں ہیں دائمی اور عارضی، دائمی نکاح معروف ہے اور عارضی متعہ ہے اور مطلق نکاح دونوں کو شامل ہے جواباً عرض ہے کہ نکاح کی یہ تقسیم امامیہ حضرات کی محض طبعزاد اور خانہ ساز ہے۔ قرآن کریم نے جس عقد کو نکاح قرار دیا ہے اس میں تعداد منکوحات کی ایک حد ہے اور اسے نفقہ سکنیٰ نسب اور میراث لازم ہے اس کے علاوہ کسی اور عقد پر قرآن نے نکاح کا اطلاق

نہیں کیا اس لیئے نکاح عارضی محض ایجاد بندہ اور باطل اختراع ہے ایک بے دلیل دعویٰ اور سراسر مخالفِ قرآن تصوّر ہے۔

سورۃ نساء کی ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے۔

ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات المومنات فمن ماملکت ایمانکم من فتیاتکم المومنات (الی ان قال) ذالک لمن خشی العنت منکم و ان تصبروا خیر لکم

"اور جو شخص تم میں سے آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو مسلمان کنیزوں سے نکاح کرے اور یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو (غلبہ شہوت سے) اپنے نفس پر زنا کا خوف رکھتا ہو"

غور فرمائیے اس آیت میں غلبہ شہوت رکھنے والے نادار شخص کے لیے صرف دو طریقے تجویز کئے ہیں ایک یہ کہ وہ باندیوں سے نکاح کرے دوسرا یہ کہ وہ ضبط نفس کرے اور تجرد کی زندگی گزارے اگر متعہ بھی مشروع ہوتا تو کنیزوں سے نکاح کی طاقت نہ رکھنے کی شکل میں اسے متعہ کی ہدایت دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا پس معلوم ہوا کوئی شخص متعہ نہیں کر سکتا اسے نکاح ہی کرنا پڑے گا خواہ باندیوں سے کرے اور اگر ان سے بھی نکاح کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر اسے صبر کرنا پڑے گا۔ متعہ کے لیے کوئی سبیل جواز نہیں ہے۔

سورہ نور بھی مدنی سورت ہے اس کی ایک آیت ملاحظہ فرمائیں۔

ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحا حتی یغنیہم اللّٰہ من فضلہ ٥

اور جو لوگ نکاح کی طاقت نہیں رکھتے ان پر لازم ہے کہ وہ ضبط نفس کریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی کردے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالےٰ نے غیر مبہم الفاظ میں دوٹوک فیصلہ فرما دیا ہے کہ اگر نکاح نہیں کر سکتے تو ضبط نفس کرو۔ اب جواز متعہ کی کوئی وجہ نہیں رہی ورنہ استطاعت نکاح نہ ہونے کی صورت میں متعہ کی اجازت دے دی جاتی اور جبکہ اجازت متعہ کی جگہ ضبط نفس کا حکم دیا تو ظاہر ہو گیا کہ اسلام میں جواز متعہ کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ان تین آیتوں کی روشنی میں حرمت متعہ کی وضاحت کے بعد ایک منصف مزاج شخص کے لیے اس حقیقت کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت فاروق اعظم نے حرمت متعہ کو قرآن کی ہدایت سے نافذ کیا تھا اپنی رائے سے نہیں۔

حرمت متعہ صحاح اہل سنّت سے

امام بخاری اپنی صحیح میں روایت فرماتے ہیں۔

عن علی بن ابی طالب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن متعۃ النساء

(بخاری ج ۲ ص ۶۰۶)

حضرت علی سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے دن متعہ کرنے سے منع فرما دیا۔

غزوہ خیبر کے بعد فتح مکہ کے موقعہ پر تین دن کے لیے متعہ پھر مباح ہوا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک کے لیے متعہ کو منسوخ فرما دیا چنانچہ امام مسلم اپنی صحیح میں روایت فرماتے ہیں۔

عن ابی سلمۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام اوطاس فی المتعۃ ثلاثا ثم نھا عنھا وبل سناد اخر قال یا ایھا الناس انی قد کنت اذنت لکم فی الا من النساء وان اللہ قد حرم ذالک الی یوم القیامۃ

(مسلم ج ۱ ص ۴۵۱)

ابی سلمۃ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقعہ پر تین دن متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے اس کو ممنوع فرما دیا ہے۔

احادیث صحیحہ میں حرمت متعہ کی بکثرت روایات موجود ہیں لیکن ہم نے طوالت کی وجہ سے ان دو حدیثوں پر اکتفا کیا ہے فہم مستقیم کے لیے ان میں یہ ہدایت ہے کہ متعہ کے حرام کرنے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور عمر تو صرف اس حرمت کو نافذ

کرنے والے ہیں۔

حرمتِ متعہ صحاح امامیہ سے

عن زید بن علی آبائہ عن علیہم السلام قال حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحوم الحمر الاھلیۃ ونکاح المتعۃ

(الاستبصار ج ۲ ص ۷۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھوں کے گوشت کو اور متعہ کو حرام فرما دیا۔

استبصار کے علاوہ امامیہ کی دوسری کتب صحاح میں بھی حرمتِ متعہ کی روایات موجود ہیں۔ شیعہ حضرات ان کے جواب میں بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ حضرت علی نے ایسی روایات تقیۃً بیان فرمائی ہیں۔

اور جان کے خوف سے تقیہ (جھوٹ بولنا) عین دین ہے۔ کیونکہ کافی کلینی میں ہے من لا تقیۃ لہ لا دین لہ جو ضرورت کے وقت تقیہ نہ کرے بے دین ہے...... سوال یہ ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے جب یزید کے خلاف آوازۂ حق بلند کیا اور ہزار ہا مخالفوں کے سامنے تلواروں کے جھنکار اور تیر و تفنگ کی بوچھاڑ میں بیعت یزید سے انکار کیا تو کیا اس وقت امام حسین ترک تقیہ کی وجہ سے معاذ اللہ بے دین ہو گئے تھے۔ اور اگر ایسے شدید ابتلا میں بھی تقیہ نہ کرنا ہی حق و صواب تھا تو حضرت علی کا بغیر کسی ابتلا کے بے حساب روایات تقیۃً بیان کرنا کس طرح حق و صواب ہوگا کاش امامیہ حضرات میں سے کوئی شخص اس نکتہ کو حل کر کے لاکھوں انسانوں کی ذہنی خلش کو دور کر سکے۔

حرمتِ متعہ پر امامیہ کے استدلال کا جواب

حضرات امامیہ نے جوازِ متعہ پر قرآن کریم کی حسبِ ذیل آیت سے استدلال کیا ہے۔
فما استمتعتم بہ منھن فاتوھن اجورھن فریضۃ ●

امامیہ حضرات کہتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن عورتوں سے تم نے متعہ کر لیا ہے ان کو اس کی اجرت ادا کر دو اور یہ استدلال متعدد وجوہ سے باطل ہے۔ اولاً اس لیے کہ متعہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں مدت متعین ہو اور اس آیت میں تعین مدت کا اصلاً ذکر نہیں ہے لہذا استمتعتم کا معنی متعہ کرنا صحیح نہیں ہے اصل میں یہ لفظ استمتاع سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے نفع حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا اور آیت کا صاف اور صریح مطلب یہی ہے۔

کہ جن بیویوں سے تم نے عمل زوجیت کر کے جسمانی نفع حاصل کر لیا انہیں ان کا پورا مہر ادا کر دو، ثانیاً اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیات میں نکاح کا بیان اور اس کے احکام ذکر کیے گئے ہیں۔ اب درمیان میں اس آیت کو متعہ پر محمول کرنے سے نظم قرآن کا اختلال اور آیات کا غیر مربوط ہونا لازم آئے گا ثالثاً اس آیت سے متصل پہلی آیت میں فرمایا۔

احل لکم ماوراء ذالکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین یعنی محرمات کے سوا باقی عورتیں تمہارے نکاح کے لیے حلال کر دی گئی ہیں تم مہر دے کر ان سے فائدہ اٹھاؤ بشرطیکہ تم انہیں حصن بناؤ اور سفاح نہ کرو حصن کا معنی ہے قلعہ۔ یعنی عورت سے نفع اندوزی تب حلال ہے جب وہ تمہارے نطفہ کی حفاظت کے لیے قلعہ بن جائے اور متعہ سے عورت قلعہ نہیں بنتی ہر ہفتہ دوسرے کے پہلو میں ہوتی ہے، اسی وجہ سے متعہ سے نسب محفوظ نہیں رہتا، اب اگر فما استمتعتم کا معنی متعہ کر لیا جائے تو قرآن کریم کی دو متصل آیتوں میں کھلا تصادم لازم آئے گا کہ پہلی آیت سے متعہ حرام ہوا اور دوسری سے حلال اور قرآن کریم اس تضاد کا متحمل نہیں ہے۔ رابعاً سفاح کا معنی ہے محض قضاء شہوت اور نطفہ گرا دینا اور مطلب یہ ہے کہ عورت سے نفع اندوزی حلال ہے بشرطیکہ تمہارا مقصد محض قضاء شہوت اور جنسی تسکین نہ ہو بلکہ اولاد کو طلب کرنا مقصود ہو اور ظاہر ہے کہ متعہ میں سوائے قضاء شہوت اور جنسی تسکین کے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا پس متعہ جائز نہ رہا اور جب اس آیت سے متعہ حرام ہو تو اس سے اگلی آیت میں حلت متعہ کا معنی کرنا باطل ہو گیا۔

الی اجل مسمّٰی کی قرآت کا جواب

امامیہ حضرات کہتے ہیں کہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ بعض قرائتوں میں فما استمتعتم بہ منھن کے بعد الی اجل مسمی بھی پڑھا گیا ہے، اب معنی یوں ہوگا جن عورتوں سے تم نے مدت معینہ تک فائدہ اٹھایا ان کو اجرت دے دو اور یہ بعینہ متعہ ہے کیونکہ اب آیت میں مدت اور اُجرت دونوں کا ذکر آگیا اور یہی متعہ کے ارکان ہیں یہ ٹھیک ہے کہ یہ روایت خبر واحد ہے اور اس روایت سے یہ الفاظ قرآن کا جزء نہیں بن سکتے لیکن متعہ ثابت کرنے کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ بعض قرائتوں میں الی اجل مسمی کے الفاظ موجود ہیں۔

اس استدلال کے جواب میں اولاً معروض ہے کہ الی اجل مسمی سے استدلال تب تام ہوگا جب اسے فما استمتعتم بہ کے ساتھ لاحق کر کے قرآن کا جزء و مانا جائے اور شیعہ حضرات کو بھی یہ تسلیم ہے کہ بغیر تواتر کے محض خبر واحد سے کوئی لفظ قرآن کا جزء نہیں بن سکتا لہٰذا اس قرآت سے جواز متعہ پر استدلال صحیح نہ رہا۔

ثانیاً تفاسیر میں جہاں اس روایت کو ذکر کیا ہے وہیں تصریح کر دی کہ یہ روایت معتمد نہیں ہے اور قرآن کریم میں اس کی تلاوت کرنا اور اس سے کوئی حکم ثابت جائز نہیں ہے چنانچہ ابوبکر رازی الجصاص المتوفی (۳۷۰ھ) فرماتے ہیں۔

فانہ لا یجوز اثبات الاجل فی التلاوۃ عند احد من المسلمین فالاجل اذا غیر ثابت فی القرآن

(احکام القرآن ج ۲ ص ۱۴۸)

"تلاوت میں اجل پڑھنا کسی مسلمان کے نزدیک جائز نہیں ہے اور یہ لفظ قرآن میں ثابت نہیں ہے"

اور ابن جریر طبری المتوفی (۳۱۰ھ) فرماتے ہیں۔

واما ماروی عن ابی بن کعب وابن عباس من قراتھما فما استمتعتم بہ منھن

الی اجل مسمی فقذ ا بخلاف ماجاءت بہ مصاحف المسلمین وغیر جائز لاحد ان یلحق فی کتاب اللہ تعالیٰ شیئاً لم یات بہ الخبر القاطع - تفسیر طبری جز ۵ ص ۱۳)

ابی ابن کعب اور ابن عباس سے جو ایک قرأت میں الی اجل مسمی کے الفاظ مروی ہیں وہ تمام مصاحف المسلمین کے خلاف ہیں اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کتاب اللہ میں بغیر خبر متواتر کے کسی چیز کا اضافہ کرے۔

ثالثاً صرف کسی روایت کا موجود ہونا اس کی ثقاہت کے لیے کافی نہیں۔ روایت تو صحیح سے لے کر موضوع تک ہر قسم کی موجود ہیں کیونکہ رافضی قدری جہمی ہر طرح کے بدعقیدہ لوگوں نے اپنے مذہب کے موافق وضع کر کے شائع کر دی تھیں یہ محدثین کرام کا ملت اسلامیہ پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے علم رجال ایجاد کر کے ہر حدیث کی صحت اور وضع پرکھنے کا ذریعہ مہیا کر دیا۔

جس روایت کے سہارے امامیہ حضرات نے الی اجل مسمی کی قرأت کو تسلیم کیا ہے ہم آپ کے سامنے اسی روایت کے طرق اور اسانید کا حال بیان کر دیتے ہیں جس سے روایت کی حقیقت سامنے آجائے گی۔ ابن جریر طبری اس روایت کی سند بیان کرتے ہیں۔

حدثنا محمد بن الحسین قال حدثنا احمد بن المفضل قال ثنا اسباط عن اسدی فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی فاتوھن اجورھن۔

(تفسیر طبری ج ۵ ص ۱۲)

اس سند کا ایک راوی احمد بن مفضل ہے ازدی نے کہا یہ منکر الحدیث ہے اور ابو حاتم نے بیان کیا کہ یہ رؤسا شیعہ میں سے تھا (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۹۶) اس سند کا تیسرا آدمی اسباط ہے امام نسائی نے کہا یہ قوی نہ تھا ابن معین نے کہا لیس بشیء یہ کچھ بھی نہیں ابو نعیم نے کہا بہت ضعیف تھا (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۸) اس سند کا چوتھا راوی اسماعیل بن عبدالرحمٰن اسدی ہے جوزجانی نے کہا یہ کذاب تھا صحابہ کرام کو سب وشتم کرتا تھا حسین بن واقد نے کہا میں سماع حدیث کے لیے اس کے پاس آیا جب

دیکھا کہ یہ حضرت ابوبکر و عمر کو برا بھلا کہتا ہے تو میں چلا آیا اور پھر کبھی اس کے پاس نہیں گیا ابن ابی سلیم نے کہا کہ یہ شیخین کی شان میں بدگوئی کرتا تھا طبری نے کہا اس کی روایات لائق استدلال نہیں ہیں (تہذیب التہذیب ج ا ص ۲۱۷)

اس روایت کی دوسری سند ملاحظہ ہو۔

حدثنا ابو کریب قال حدثنا نصیر بن ابی الاشعث قال حدثنی حبیب بن ابی ثابت اعطانی ابن عباس مصحفا فقال ھذا علی قراۃ ابی قال ابو بکر قال یحیی فرایت المصحف عند نصیر فیہ فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی (تفسیر طبری جز ۵ ص ۱۲)

اس سند میں ایک راوی ہے یحیی بن عیسی نسائی نے کہا یہ قوی نہ تھا (میزان الاعتدال ج ۴ ص ۴۰۱ تا ۴۰۲) سلمہ نے کہا لیس بشئ یہ کچھ نہ تھا عجلی نے کہا اس میں تشیع تھا۔

تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۶۳)

ان دونوں سندوں میں رافضی منکر الحدیث اور کذاب راوی موجود ہیں پس ایسے لوگوں کی بنیاد پہ کوئی روایت کس طرح قابل قبول ہو سکتی ہے ان دونوں سندوں کے بعد ایک اور سند پیش خدمت ہے۔

حدثنا ابن المثنی قال ثنی داؤد عن ابی نضرۃ قال سالت ابن عباس عن المتعۃ فذکر نحوہ طبری جز ۵ ص ۱۲)

اس سند میں ایک راوی ہے عبدالاعلی ابن سعد نے کہا یہ قوی نہ تھا۔ ابن حبان اور امام محمد نے کہا یہ قدریہ عقائد کا حامل تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹۶) اس سند کا ایک اور راوی ہے داؤد بن ابی ہند اس کے بارے میں تصریح ہے کہ اس کی روایات میں اضطراب تھا اور یہ کثیر الخلاف تھا۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۰۵) ان حوالوں سے ظاہر ہو گیا۔ کہ اس روایت کے طرق میں بکثرت رافضی قدری جیسے بدعقیدہ اور

اور کذاب منکر الحدیث کثیر المخلاف اور ضعیف راوی موجود ہیں لہٰذا یہ روایت قطعاً باطل اور جعلی ہے۔

رابعاً ابن عباس اس آیت کو کس طرح پڑھتے تھے اور استمتاع سے ان کی مراد متعہ تھی یا نکاح اس بارے میں ابن جریر نے جو روایت صحیح سند کے ساتھ ذکر کی ہے وہ یہ ہے۔

حدثنی المثنی قال ثنا عبداللہ بن صالح قال ثنی معاویہ بن صالح بن علی بن ابی طلحۃ عن ابن عباس قولہ فما استمتعتم بہ منھن فاٰتوھن اجورھن فریضۃ یقول اذا تزوج الرجل المرأۃ ثم نکحھا مرۃ واحدۃ وجب صداقھا کلہ الاستمتاع ھو النکاح۔ (تفسیر طبری جز ۵ ص ۱۱)

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے فما استمتعتم بہ منھن فاٰتوھن اجورھن پڑھا (بغیر الی اجل مسمی کے) اور اس کی تفسیر میں فرمایا جب شادی کے بعد کوئی شخص ایک بار بھی عمل زوجیت کرے تو اس پر پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور فرمایا استمتاع سے مراد نکاح ہے۔

اگر فما استمتعتم کے بعد الی اجل مسمی پڑھا جائے تو استمتاع سے مراد نکاح کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ متعہ ہی مراد لینا پڑے گا اور جب ابن عباس نے فرمایا استمتاع سے مراد نکاح ہے اور بغیر الی اجل مسمی اس آیت کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ الی اجل مسمی پڑھنے کی نسبت ان کی طرف کرنا سراسر افترا ہے اور یہ روایت صحیح السند ہے اور مصاحف مسلمین کے مطابق ہے اسے چھوڑ کر رافضیوں اور قدریوں کی روایت کو لینا جو مصاحف مسلمین کے مخالف اور نظم قرآن سے متصادم ہے۔ صریح ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا ہے۔

ابن عباس کے فتویٰ کا جواب

امامیہ حضرات کہتے ہیں کہ ابن عباس جواز متعہ کا فتویٰ دیتے تھے۔

اور چونکہ اہل سنت کے نزدیک۔

حضرت ابن عباس کی شخصیت واجب التسلیم ہے اس لیے ان پر لازم ہے کہ ان کے فتویٰ کا احترام کریں ہماری گزارش یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مطلقاً جواز کا فتویٰ نہیں دیا وہ متعہ کو مردار اور خنزیر کی طرح حرام سمجھتے تھے۔ اور جس طرح حالت اضطرار میں مردار اور خنزیر کھانا ہے۔ اسی طرح ان کے نزدیک حالت اضطرار میں متعہ کرنا بھی جائز تھا۔ چنانچہ علامہ نیشاپوری المتوفی ۷۲۸ھ فرماتے ہیں۔

ان الناس لما ذکروا الاشعار فی فتیا ابن عباس فی المتعۃ قال قاتلہم اللہ انی ما افتیت باباحۃ المتعۃ علی الاطلاق لکنی قلت انہا للمضطر کما تحل المیتۃ والدم ولحم الخنزیر۔

جب لوگوں نے ابن عباس کے فتویٰ کی وجہ سے ان کی ہجو میں اشعار کہے تو انہوں نے کہا خدا ان کو ہلاک کرے میں نے علی الاطلاق متعہ کی اباحت کا فتویٰ نہیں دیا بلکہ میں نے کہا تھا کہ متعہ مضطر کے لیے حلال ہے جیسے مردار خنزیر اور خون کا حکم ہے۔

اس روایت کو ابوبکر رازی (الجصاص) نے احکام القرآن ج ۲ ص ۱۴۷ پر اور ابن ہمام المتوفی (۸۶۱ھ نے فتح القدیر ج ۲ ص ۳۸۶) اور علامہ آلوسی المتوفی (۱۲۷۰ھ) نے روح المعانی جز ۵ ص ۶ پر ذکر کیا ہے۔

حضرت ابن عباس کا مضطر کے لیے اباحت متعہ کا فتویٰ دینا بھی ان کی اجتہادی خطا پر مبنی تھا اور جب ان پر حق واضح ہو گیا تو انہوں نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کی چنانچہ علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں۔

انہ رجع عن ذا اللہ عنہ قبل موتہ وقال انی اتوب الیک فی الصرف والمتعۃ

(غرائب القرآن جز ۵ ص ۱۶)

"ابن عباس نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے فتویٰ سے رجوع کیا اور کہا میں صرف اور متعہ سے رجوع کرتا ہوں الٰہی ہوں"

اور ابوبکر جصاص فرماتے ہیں

فالصحیح حکایت من حُکی عنہ الرجوع عنہا

صحیح بات یہ ہے کہ ابن عباس نے رجوع کر لیا تھا۔

نیز فرماتے ہیں۔

نزل عن قولہ فی الصرف و قولہ فی المتعۃ۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ۱۴۷،۱۷۹)

ابن عباس نے صرف اور متعہ سے رجوع کر لیا تھا۔

علامہ بدر الدین عینی المتوفی (۸۵۵) نے عمدۃ القاری جز ۱۷ ص ۲۴۶ پر اور علامہ ابن حجر عسقلانی المتوفی (۸۵۲) نے فتح الباری ج ۱۱ ص ۷۷ پر حضرت ابن عباس کا متعہ سے رجوع بیان فرمایا ہے۔

اور اہلسنت کے تمام محققین نے اسی پر اعتماد کا اظہار فرمایا ہے پھر کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ جس بات سے حضرت ابن عباس رجوع فرما چکے اسے ان کا مسلک قرار دے کر اس کی بنیاد پر اپنے مسلک کی دیوار استوار کی جائے۔

ہم نے بدلائل واضح کر دیا ہے کہ اسلام میں متعہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق نے متعہ کو حرام کر دیا ہے۔ اللہ کا سلام ہو حضرت عمر پر جنہوں نے حرمت متعہ کو نافذ کر کے اور اس پر عمل کرا کے ملت اسلامیہ کو ایک مکروہ غلاظت سے محفوظ کر دیا ہے۔

یہ متعہ ہی کا تصور تھا جس نے مسلمانوں میں کسبیوں کے رواج کو جنم دیا۔ اسی اصطلاح نے بازارِ حسن کو تحفظ دیا اور متعہ کی آڑ میں عصمت فروشی کا چور دروازہ کھول دیا۔

آج قوم جس طرح اخلاقی جرائم اور بدکاری میں مبتلا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ فحاشی اور جنسی ناہمواری کے سارے سہارے ختم کر دیئے جائیں اور ہر وہ قانون

جس سے جنسی کجی کو تقویت ملتی ہو مٹا دیا جائے۔ مسئلہ متعہ کا وجود فحاشی کے فروغ کا ضامن ہے فاروق اعظم کی ایمان افروز شخصیت پر خدا کی بے شمار رحمتیں ہوں۔ جنہوں نے حرمت متعہ کی تبلیغ اور تنفیذ کرکے سفینہ ملت کو معصیت کے گرداب سے نکالا۔
آج اس معصیت زدہ اور پنجہ شہوت میں اسیر قوم کو پھر فاروقی بصیرت کی ضرورت ہے:

مسئلہ تراویح

تحریر

صاحبزادہ عزیز احمد سیال شریف

حضرت فاروق اعظم کے معترضین آپ کی ذات اقدس پر ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں، کہ آپ نے اُمت میں تراویح کی بدعت کو جاری کیا جو کام حضور نے نہیں کیا تھا مسلمانوں کو اس کام پر مجبور کیا اور دین میں اپنی طرف سے اضافہ کیا جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں چنانچہ اس کا آپ کو خود بھی احساس تھا آپ نے ایک رات جب تمام مسلمانوں کو ایک امام کی اقتداء میں نماز تراویح ادا کرتے ہوئے دیکھا تو آپ کی زبان سے بھی طوعاً و کرھاً نکل گیا۔

"نعمت البدعۃ ھٰذہٖ"

یہ بڑی اچھی بدعت ہے۔ حالانکہ بدعت کے اچھا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ارشاد نبوی ہے۔ کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ "کہ ہر بدعت گمراہی ہے"۔

اس کے متعلق گزارش ہے کہ دیگر اتہامات کی طرح فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مقدس شخصیت پر یہ بھی ایک افتراء اور کھلا بہتان ہے کہ آپ نے نماز تراویح کو جاری کیا جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا نہیں کیا تھا ہماری تمام کتب احادیث میں مروی ہے۔ بخاری شریف کے الفاظ پیش خدمت ہیں۔

اِنَّ عائشۃَ اَخبرتہُ اِنَّ رسُولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج لیلۃً من جوف اللیلِ فصلّی فی المسجدِ وصلّی رجالٌ بصلاتہ فاصبح النّاس فتحدّثوا، فاجتمع اکثر منھم فصلّی وصلّوا معہٗ فاصبح النّاس فتحدّثوا فکثر اھل المسجد من اللیلۃِ الثالثۃِ فخرج رسولُ اللہ فصلّی فصلّوا بصلاتہٖ فلما کانت اللیلۃ الرابعۃ عجز المسجد عن اھلہٖ حتی خرج لصلاۃِ الصبح فلما قضی الفجر اقبل علی النّاس، فتشھّد ثم قال اَمّا بعد فانہ لم یخف علی مکانکم ولکنی خشیتُ ان تفرض علیکم فتعجزوا عنھا فتوفّی رسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والامر علی ذٰلک۔

ترجمہ

حضرت عروہؓ فرماتے ہیں۔ حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کو بتایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات آدھی رات کے وقت تشریف لائے اور مسجد میں نماز ادا کی چند لوگ جو اس وقت وہاں موجود تھے انہوں نے بھی حضورؐ کی اقتدا میں نماز پڑھی صبح ہوئی تو لوگوں نے رات کی نماز کے بارے میں بات چیت کی دوسری رات پہلی رات سے زیادہ لوگ جمع ہوئے اور حضورؐ کے ساتھ نماز ادا کی۔ دوسری صبح پھر لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا تیسری رات مسجد میں جم غفیر اکٹھا ہو گیا حضورؐ تشریف لائے حضور نے بھی نماز پڑھی اور حضورؐ کے ساتھ حاضرین نے بھی نماز ادا کی۔

چوتھی رات آئی تو مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی حضورؐ گزشتہ راتوں کی طرح تشریف نہ لائے یہاں تک کہ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا اور آپ مسجد میں تشریف لائے جب نماز فجر ادا کر چکے تو رُخ انور لوگوں کی طرف پھیرا اور تشہد کے بعد فرمایا کہ رات کو جو تمہاری حالت تھی وہ مجھ سے پنہاں نہ تھی لیکن میں اس اندیشہ سے نہ آیا کہ مبادا تم پر یہ نماز فرض کر دی جائے اور تم اس کی ادائیگی سے قاصر رہو۔ حضورؐ نے اِس دنیا سے رحلت فرمائی اور مسلمانوں کا یہی معمول رہا۔

اس حدیث سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا۔ کہ نماز تراویح کا آغاز حضورؐ نے خود فرمایا اور لگاتار تین شب آپ جماعت کراتے رہے اور حاضرین کی تعداد میں ہر رات بے پناہ اضافہ ہوتا رہا اور سب حضور کی اقتدا میں یہ سعادت حاصل کرتے رہے جب چوتھی رات آئی تو مسجد کھچا کھچ بھر گئی۔ حضورؐ تشریف نہ لائے فرمایا۔

"کہ میں تمہاری بے چینی اور اضطراب کو دیکھتا رہا لیکن اس لیے باہر نہ نکلا کہ کہیں تم پر یہ نماز فرض نہ کر دی جائے"

یہ چیز اہل علم سے مخفی نہیں۔ کہ عہد رسالت میں نزول وحی کا سلسلہ جاری تھا۔ نئے نئے احکام نازل ہوتے تھے احکام شریعت میں نئی باتوں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن حضورؐ کے رفیق اعلیٰ سے وصال کے بعد نزول وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا نئے احکام اور جدید اضافوں کا امکان نہ رہا۔ اصول فقہ کا یہ قاعدہ ہے اور شیعہ علماء بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح علت کے پائے جانے سے معلول کا پایا جانا ضروری ہے اسی طرح علت کے منتفی ہونے سے معلول بھی منتفی ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں عدم مواظبت (ہمیشہ نماز ادا نہ کرنا) کی علت یہ اندیشہ تھا کہ کہ اس نماز کی فرضیت کا حکم نازل نہ ہو جائے حضور کی رحلت فرمانے کے بعد جب یہ اندیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ تو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس سنت نبوی کو زندہ کرنے کے لیے سب مسلمانوں کو ایک قاری کے پیچھے نماز تراویح ادا کرنے کی ہدایت کی اور تمام صحابہ اکرام رضوان علیہم اجمعین نے آپ کے اس اقدام کو سراہا اور اس پر اتفاق کیا خصوصاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی پسندیدگی کی عجیب شان تھی۔ لوگ مسجد میں نماز تراویح ادا کر رہے ہوتے۔ مسجد میں ہر سو چراغاں ہوتا۔ اس روح پرور منظر کو دیکھ کر اُن کی زبان پر بے ساختہ یہ دعائیہ جملہ آجاتا۔

"اے عمرؓ! خدا تیری قبر کو روشن کرے۔ تو نے ہماری مسجدوں کو روشن کر دیا"

"نور اللہ مضجعک یا عمر کما نورت مساجدنا"

مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی تراویح کے بارے میں حضرت علیؓ کا عمل ان الفاظ میں منقول ہے۔

ہم نصلی فی رمضان من رکعۃ

حدثنا وکیعٌ عن حسن ابن صالح عن عمرو ابن قیس عن ابی الحسناء اَنّ علیاً اَمر رجلاً یُصلی بھم فی رمضان عشرین رکعۃ" [1]

روایت کی ہے وکیع نے حسن ابن صالح سے اور انہوں نے عمرو ابن قیس سے اور انہوں نے ابی الحسنا سے کہ حضرت علی نے حکم دیا ایک آدمی کو کہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعتیں پڑھائے۔

تراویح کے بارے میں صحابہ اور تابعین کا معمول - امام ترمذی باب قیام رمضان میں بایں الفاظ بیان فرماتے ہیں۔

واکثر اھل العلم علی ما روی عن علی وعمرٌ وغیرھما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشرین رکعۃً وھو قول ثوری وابن المبارک والشافعی وقال الشافعی

وھکذا ادرکت ببلدنا مکۃ یُصلون عشرین رکعۃ"۔

یعنی اکثر اہل علم کی وہی رائے ہے جو حضرت علی عمرؓ اور دیگر صحابہ کرام سے مروی ہے کہ وہ سب بیسؔ رکعت تراویح پڑھا کرتے فقہا میں سے ثوری ابن مبارک اور شافعی کا یہی مذہب ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہمارے شہر مکہ مکرمہ میں لوگ بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے ہیں۔

محمد بن نصر المروزی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہی عمل نقل کیا ہے ابن ابی شیبہ نے اُسے حضرت عمرؓ حضرت علی حضرت ابیؓ بن کعب اور متعدد دوسرے صحابہ کا اثر بتایا ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ جمہور علماء بیس رکعت ہی کے قائل ہیں اور صحابہ سے اس

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ صفحہ ۳۹۲

بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہوا ہے۔

المغنی میں ابن قدامہ لکھتے ہیں۔[1]

"امام احمد بن حنبل کے نزدیک تراویح کے معاملہ میں ۲۰ رکعت ہی کا مسلک راجح ہے اور اسی کے قائل سفیان ثوری اور ابو حنیفہ اور شافعی ہیں مگر امام مالک ۳۶ کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ قدیم سے اسی پر عمل چلا آرہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارا استدلال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب متفرق طور پر تراویح پڑھنے والے تمام لوگوں کو ابی بن کعب کی امامت میں جمع کیا تو حضرت ابی بن کعب بیس رکعتیں پڑھاتے تھے اور حضرت علی سے بھی یہی ثابت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو رمضان میں ۲۰ رکعت تراویح پڑھانے پر مامور کیا تھا اور یہ عمل قریب قریب اجماع کا ہم معنی ہے۔

اس سے آپ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اقدام کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

معترض کا یہ کہنا کہ تراویح کے بدعت ہونے کا اعتراف خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زبان سے کیا ہے اور حضورؐ کا فرمان ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔ تو پھر تراویح بھی گمراہی

اس کے متعلق گزارش ہے کہ معترض کا یہ قول اس کی کم علمی کی دلیل ہے۔ لفظ بدعت کے دو معنی ہیں لغوی اور شرعی۔ لغت میں ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں اور شریعت میں ہر وہ نیا کام جو سنت کے خلاف ہو۔

اور یہی وہ بدعت ہے جسے گمراہی کہا گیا ہے۔ تراویح کو بدعت شرعی تو کہا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ سنت نبوی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس سے ایک سنت کا احیا مقصود ہے اس لیے یہاں بدعت کا لغوی معنی مراد ہے۔ جس میں کوئی قباحت نہیں۔

جلد اوّل ص ۹۸، ۹۹ ۷

ارباب بصیرت پر یہ مخفی نہیں کہ حضرت فاروق نے سنت تراویح کو منظم کر کے قرآن کے حفظ کا شوق لوگوں کے دلوں میں اس طرح پیدا کیا کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہر ملک میں حفاظِ قرآن موجود ہیں۔

اور یہ بھی ایک مشاہدہ ہے کہ جو طائفہ نماز تراویح پر اعتراض کرتا ہے وہ حفظِ قرآن کی سعادت سے محروم ہے۔

حقیقت میں یہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بے شمار احسانات میں سے ایک بڑا احسان ہے۔

عجیب شان ہے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کہ قرآن کریم کو ایک مصحف میں جمع کرنے کا سہرا بھی آپ کے سر ہے اور سنتِ تراویح کو جاری کرنے حفاظ کا ایک لشکرِ جرار تیار کرنے کی سعادت بھی آپ کو ارزانی ہوئی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں آپ اہل سُنت کی کتب سے نماز تراویح کے سُنتِ نبوی ہونے کے دلائل پڑھ چکے ہیں اور تمام صحابہ کا اجماع بشمول علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ حیرت اس امر پر ہے کہ جو طائفہ حضرت فاروقِ اعظم پر اعتراض کرتا ہے۔ اُن کی اپنی کتب میں بے شمار روایات موجود ہیں، جو ائمۂ اہل بیت سے منقول ہیں جن سے حضرت فاروقِ اعظم کے مسلک کی تائید ہوتی ہے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کثیر التعداد احادیث سے صرف چند احادیث کتب شیعہ سے پیشِ خدمت ہیں۔

سب سے پہلے میں وہ حدیث نقل کرتا ہوں جو حضرت امام جعفر صادق سے مروی ہے۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم یزید فی صلوٰتہ فی شھر رمضان اذا صلی العتمۃ صلی بعدھا فیقوم الناس خلفہ فیدخل ویدعھم ثم یخرج ایضا فیجیئون و یقومون خلفہ فیدخل و یدعھم مرارا قال وقال لاتصل بعد العتمۃ فی غیر شھر رمضان۔

اب اس کا لفظی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت ابی عبداللہ جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ماہ رمضان میں نمازِ عشاء کے بعد اور اضافہ فرماتے۔ لوگ حضور کے پیچھے کھڑے ہو جاتے پھر حضور گھر تشریف لے جاتے اور انہیں وہیں چھوڑ جاتے پھر واپس تشریف لاتے۔ صحابہ بھی حاضر ہو جاتے اور حضورؐ کی اقتدا میں نماز پڑھتے پھر حضور انہیں وہیں چھوڑ کر گھر تشریف لے جاتے اس طرح کئی بار کیا کرتے تھے۔ حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا:۔ ماہ رمضان کے علاوہ نمازِ عشا کے بعد کوئی نماز نہ پڑھو:

اس روایت سے مندرجہ ذیل اُمور واضح ہو گئے۔

(۱) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رمضان شریف میں نمازِ عشاء کے بعد اور نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔

(۲) یہ نماز مسجد میں ادا کی جاتی تھی۔

(۳) یہ نماز با جماعت ادا کی جاتی تھی۔

(۴) لوگ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام کی اقتداء میں یہ نماز ادا کرتے تھے۔

اب یہ آپ کی مرضی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سُنت جو امام معصوم سے مروی ہے اس کو آپ بدعت کہیں یا اس پر عمل کر کے حضور سرورِ دو عالم کی اطاعت کی سعادت حاصل کریں۔

دوسری روایت ملاحظہ ہو، یہ بھی حضرت جعفر صادق سے مروی ہے۔

عن جابر بن عبد اللّٰہ قال ان ابا عبد اللّٰہ علیہ السّلام قال لہ ان اصحابنا ھؤلاء ابوا ان یزید وا فی صلوتھم فقد زاد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم فی صلوتہ فی رمضان

(ترجمہ)

جابر ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھے امام جعفر صادق نے فرمایا کہ ہمارے یہ دوست انکار کرتے ہیں کہ وہ اپنی نماز میں اضافہ کریں حالانکہ ماہِ رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز میں اضافہ کیا۔

ان اصحابنا ھُوٗلاءِ (ہمارے یہ دوست) میں جھوٹے مدعیان محبت پر جو بھرپور طنز ہے اُس پر بھی غور فرمائیے یعنی دعویٰ تو ہمارے دوست ہونے کا کرتے ہیں لیکن جو ہم کہتے ہیں اور جو کام حضور نے کیا اس پر عمل کرنے سے گریزاں ہیں۔

تیسری حدیث حضرت امام زین العابدین سے مروی ہے یہ بھی سماعت فرمائیے۔

قال کتبت الی ابی محمد علیہ السلام ان رجلا روی عن آبائک علیھم السلام ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماکان یزید من الصلوٰۃ فی شھر رمضان علی ماکان یصلیہ فی سائر الایام فوقع علیہ السلام کذب فض اللہ فاہ صل فی کل لیلۃ من شھر رمضان عشرین رکعۃ الی عشرین من الشھر۔

میں نے حضرت امام ابو محمد (امام زین العابدین) کی طرف لکھا کہ ایک شخص آپ کے آبا سے یہ روایت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں اتنی ہی نماز پڑھا کرتے تھے۔ جتنی باقی مہینوں میں اس پر زیادتی نہ کرتے حضرت سجاد نے فرمایا اس نے جھوٹ بکا ہے اللہ اس کا منہ پھوڑے اور اس کے دانت توڑے تو رمضان شریف کی ہر رات میں بیس رکعت نماز ادا کیا کر۔

اب آخر میں بلا تبصرہ یہ حدیث ملاحظہ فرمائیے

ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق سے ماہ رمضان میں مسجد میں نماز ادا کرنے کے بارے میں دریافت کیا آپ نے فرمایا: جب امیر المومنین کوفہ تشریف لائے تو حضرت امام حسن کو حکم دیا کہ وہ جا کر لوگوں میں منادی کر دیں کہ رمضان کے مہینہ میں مساجد میں باجماعت نماز (تراویح) ادا نہیں کی جائے گی حضرت امام حسن نے حسب ارشاد اس حکم کا اعلان کر دیا۔ جب لوگوں نے یہ سُنا تو چیخ چیخ کر واعمراہ واعمراہ کہنے لگے جب امام حسن لوٹ کر حضرت امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا یہ آواز کیسی تھی قال لہ یا امیر المومنین الناس یصیحون واعمراہ واعمراہ فقال امیر المومنین علیہ السلام قل لھم صلوا۔ تو امام حسن نے عرض کیا۔ اے امیر المومنین! یہ اعلان سُن کر لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں۔ ہائے اے عمر، ہائے اے عمر امیر المومنین نے فرمایا۔ اے حسن

جائو، اور ان سے جا کر کہو۔ نماز (تراویح) پڑھو۔[1]

آپ خود سوچیئے کہ حضرت امیر المومنین کی اپنی خلافت کا دور ہے، کوفہ کا شہر جہاں آپ کے معتقدین کی کثرت ہے آپ نماز تراویح کو (شیعہ کے خیال کے مطابق) بدعت اور گناہ سمجھتے ہیں اور اس کی ممانعت کا اعلان کرنے کا حکم حضرت امام حسن کو دیتے ہیں اور لوگوں کی تھوڑی سی چیخ اور پکار پر اپنا فیصلہ واپس لے لیتے ہیں اور پھر حضرت امام حسن کو حکم دیتے ہیں کہ جا کر لوگوں سے کہیں کہ تم بے شک نماز تراویح ادا کیا کرو۔ ایک معمولی درجے کا مسلمان بھی حضور کی سُنت کو بدلنے کی جرأت نہیں کر سکتا کیا اسد اللہ الغالب حیدر کرار پر یہ کھلا بہتان نہیں کہ آپ نے لوگوں کے شور و غوغا کو سن کر ایک بدعت کو جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ مدعیانِ محبت اگر یہ گوارا کر سکتے ہوں تو کریں۔ ہم تو یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

○

---

[1] کتاب الوافی المجلد الثانی صفحات ۶۶ تا ۲۸ باب ما یزاد من الصلوٰۃ فی شہر رمضان

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

اور

مستشرقین

تحریر مولانا محمد بخش مسلم

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیکر جلالت مجسمۂ عظمت شخصیت تاریخی شخصیت ہے سیرت فاروق خواب نہیں، سراب نہیں، کسی شاعر کے ذہنی افکار کا خیالی شاہکار نہیں، کسی قلم کار افسانہ نگار کا متصورہ حصہ نہیں۔ آپ کی زندگی افسانوی نہیں آپ کا ہر کارنامہ حقیقی، واقعی تاریخ اسلامیت و معرفت کا باب ہے۔ آپ کا ہر پیغام و اقدام ہدایت کا نصاب ہے۔ آپ کی میری فقیری دینی ڈنیوی محاسن کا ایک مرقع ہے۔ ایک روشن کتاب ہے۔

آپ کی جلالت شان کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ ذی شعور اغیار بھی آپ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوئے۔

مہاتما گاندھی کو ہم نے دیکھا، ان کی گفتگو سُنی ان کی نگارشات پڑھیں۔ آپ نے فرمایا

Let us take the example of UMAR. Though he was the monarch of a vast Empire. Yet he lived life of a pauper. "young India,1935

ترجمہ

آؤ حضرت عمرؓ کی مثالی زندگی کو آئینہ توجہ کے سامنے لائیں وہ وسیع سلطنت کے فرمانروا تھے مگر ان کی زندگی ایک مفلس کی زندگی تھی "۔

مہاتما گاندھی ۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو بہ مقام پونہ (ہند) تقریر کر رہے تھے آپ کی تقریر کا موضوع تھا سادگی آپ نے فرمایا۔

Simplicity is not the monopoly of the Congress sites. I am not going to mention the names of rama and krishna, as they were not the Historical Personalities. I am compelled to mention the names of AbuBakr and Umar. Though they were monarches of vast Empires, yet they lived the life of a pauper."

(Harigon 1937)

ترجمہ

سادگی ارباب کانگرس کا خاصہ واجارہ نہیں ہے میں رام چندر جی اور کرشن جی کا نام نہیں لے سکتا وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کی شخصیتیں تاریخی شخصیتیں نہیں ہیں میں مجبور ہوں کہ (حضرت) ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے نام لوں۔ وہ عظیم الشان فرمانروا تھے مگر انہوں نے فقیرانہ زندگی بسر کی "۔

(ہری جن ۳۷ء)

حضرت عمرؓ میر تھے "فقیر" تھے سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہ نعمت کہاں سے حاصل کی؟ انہیں فاروق اعظم کس نے بنایا؟ ان کا وطن تھا مکہ مکرمہ وہ تھے عرب، وہ ۵۸۴ء میں پیدا ہوئے اسی زمانے کے عربوں کی نسبت فاضل پروفیسر ایچ اے، جی فشر (Fisher) اپنی کتاب (A History of Europe) تاریخ یورپ کے صفحہ ۱۲۷ اور ۱۲۸ پر لکھتا ہے۔

"No where was then a vestige of an Arabian state, of a regular army or of a common political ambition."

ترجمہ
"کوئی سراغ نہیں ملتا، کہ کوئی عربی ریاست بھی تھی یا کوئی باقاعدہ فوج تھی یا یہ کہ وہاں کوئی مشترکہ سیاسی تمنا ہی تھی"

مطلب یہ ہے کہ جس زمانے میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے یا حضرت عمرؓ پیدا ہوئے، اس زمانے میں کوئی عربی ریاست نہیں تھی، نہ اس ملک کے گوشے میں کوئی باقاعدہ فوج تھی، یہ بھی تو نہیں پایا جاتا کہ کسی قبیلہ یا فرد نے اس جذبہ کا اظہار کیا ہو، کہ ان کی آرزو ہے کہ انہیں مشترکہ طور پر سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے۔

"The Arabs were poets, dreamers, fighters traders, they were not politicians."

"عرب شاعر تھے، خواب بین تھے لڑاکے تھے، تاجر تھے، مگر سیاستدان نہیں تھے"

سر ولیم میور (Sir William Muir) اپنی تصنیف Muhammad (حیاتِ محمد) میں تحریر کرتا ہے،

"There was no Govt. no army no police no administration"

ترجمہ "نہ وہاں حکومت، نہ مرکزی نظام، نہ فوج نہ پولیس"

حضرت عمرؓ کی ابتدا

تاریخ عالم کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ ۵۸۴ء میں مکہ شریف میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام تھا خطاب، حضرت عمرؓ کی کنیت تھی ابو حفص، ان کا لقب تھا فاروقِ اعظم وہ عرب کے معزز خاندان قریش کے چشم و چراغ تھے۔

قریش کوئی ایک قبیلہ نہ تھا، وہ چھوٹے چھوٹے دس خاندانوں پر مشتمل تھا ان میں سے ایک قبیلہ بنی عدی تھا حضرت عمرؓ گلشنِ عدی کے پھول تھے۔

اس زمانہ میں مکہ مکرمہ میں تعلیم وتدریس کا کوئی نظام یا رواج نہ تھا، شہر مکہ میں کل ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان میں سے ایک حضرت عمرؓ بھی تھے۔

آپ قد آور تھے، تنومند تھے، چاق و چوبند تھے، شہ زور تھے۔ پہلوان تھے قومی میلہ عکاظ کے دنگل میں کشتی لڑا کرتے تھے۔ لڑاکے تھے، تیر انداز تھے۔ تلوار کے دھنی تھے۔ اعلیٰ درجے کے نساب تھے، اس باب میں ان کے معلم ان کے والد خطاب تھے۔

آپ فصیح اللسان تھے سخن شناس تھے شہر میں کوئی مدرسہ نہ تھا جہاں نوجوانوں کو لڑنے کا ڈھنگ یا فن حرب سکھایا جاتا ہو، اس ملک میں کوئی باضابطہ حکومت نہ تھی نہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ کوئی ان پر حملہ آور ہوگا۔

۳۲۵ قبائل تھے، ہر قبیلہ کا ایک بُت تھا، ایک شیخ تھا، ایک شاعر تھا۔

حضرت عمرؓ کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ آپ نے کاروبار کے سلسلہ میں عراق و شام دیکھا تھا۔

مکہ سے ۱۳ میل دُور ایک وادی بنام ضجنان تھی، وہاں آپ اپنے والد کے اُونٹ چرایا کرتے تھے، آپ کے والد سخت گیر اور تیز مزاج تھے۔

آپ آس پاس کے حاکموں کے درباروں میں اپنے وطن کی سفارت بھی کرتے تھے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت اپنی نبوت کا اعلان کیا حضور کی عمر ۴۰ سال کی تھی اس وقت حضرت عمرؓ ۲۷ سال کے تھے آپ بھی اسلام کی تسبیح کے دانے بن گئے۔

سٹینلے لین پُول (STANLEY LANE POOLE) اپنی کتاب "آنحضرت اور اسلام" (The prophet & Islam) میں لکھتا ہے:۔

"Umar afterwards Khalif' whose fierce impulsine nature had hither to marked him as a violent opponent of the New faith, but who after wards proved himself, one of the main stays of Islam.

(Page 13, Abridged upon an Edition of 1879)

ترجمہ

(حضرت) عمرؓ طبیعت کے تیز تھے، بڑے جذباتی قسم کے انسان تھے شروع میں اسلام کے شدید دشمن تھے لیکن جب مسلمان ہو گئے تو آپ نے خود کو اسلام کا ایک مضبوط اور بنیادی ستون ثابت کیا۔

حضرت عمرؓ کی خلافت

آپ نے ۵۲ سال (۶۳۴ء) کی عمر میں اسلامی مملکت کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لی آپ دس سال تک یہ فریضہ سرانجام دیتے رہے ۶۴۴ء میں شہید ہو گئے آپ کو وقت کی دو طاقت ور سلطنتوں کا مقابلہ کرنا پڑا، ان میں سے ایک تھی قیصر روم کی سلطنت دوسری تھی تاجدار ایران کسریٰ کی مملکت۔

سر ولیم میور اپنی ضخیم کتاب "خلافت" Caliphate میں رقمطراز ہے:

"Abu Bakr beat down the apostate tribes, but at his death the armies of Islam had just crossed the SYRIAN fronties, Umar began his reign as master of the whole of Arabia. It was all with the years of his wisdom, patience, vigoris, dominion, was acheived on Syria, Egypt, persia. He died as caliph of an Empire embracing some of the finest provinces under Pyzintin rule & with Persia to boot." (Page,190)

ترجمہ

(حضرت) ابوبکر نے عرب کے مرتد قبائل کا زور توڑا، ان کے وصال پر اسلامی افواج نے بھی شام کی سرحد کو عبور کیا تھا، (حضرت) عمرؓ نے حکومت کا آغاز کیا اس وقت تمام عرب آپ کے تصرف میں تھا۔ لیکن آپ نے اپنی فراست اپنے صبر و تحمل اور اپنے کس بل سے شام، مصر اور ایران پر تصرف حاصل کر لیا اور اسی حیثیت میں اپنی جان خلاقِ عالم کے سپرد

کی جب آپ اس عظیم مملکت کے امیر المومنین تھے جس میں بازنطینی حکومت اور ایرانی سلطنت کے بعض عمدہ ترین صوبے شامل تھے۔

سر ولیم میور بہت بڑا فاضل تھا، وہ یوپی کا گورنر بن کے آیا۔ اس نے دو کتابیں Life of Muhamma (حیاتِ آنحضرت) اور Caliphate (خلافت) اس خیال سے لکھیں کہ عیسائی مبلغین اُن کا مطالعہ کریں اور مسلمانوں سے مناظرات کے وقت ان سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ پرلے درجے کا متعصب تھا، اسلام کا شدید دشمن تھا۔ نصرانیت کی اشاعت اس کا مقصدِ حیات تھا۔ لیکن وہ اس بات پر مجبور ہو گیا کہ آپ کی عظمت کا اعتراف کرے۔

اللہ کی تلوار

ہند کا مایہ ناز داعیٔ انقلاب فاضل، اشتراکیت کا ممتاز عالم ہے، "ایم، این رائے" (M.N. Roy) اپنی مشہور تصنیف "Historical Role of Islam" اسلام کا تاریخی کردار کے صفحہ ۶ پر رقمطراز ہے۔

"The Roman Empire of Augustas, as later enlarged lay the valiant Trajan was the result of great and glorious victories, won over a period of seven hundred years, still it had not attained the proportions of the Arabian Empire established in less than a century. The expire of Alexander represented, but a fraction of the vast domians of Khalifs. To nearly a thousand years, the Persian Empire resisted the arms of Rome, only to be subdued by the sword of God in less than a decade.

ترجمہ

رُومہ کی سلطنت، جس کی داغ بیل اگستس نے ڈالی، جانباز تراجن نے جس کو وسیع کیا۔ اس اقلیم کی وسعت و عظمت، سات سو سال کی عظیم الشان

اور رفیع الوقار فتوحات کا ثمرہ تھی، تاہم اس کی وسعت اس عرب حکومت کے چند حصص کے برابر بھی نہ تھی جو حضرت عمر کے زمانے میں قائم ہوئی) حالانکہ یہ عربی حکومت سو سال سے کم عرصہ میں قیام پذیر ہوئی (اس طرح) سکندر اعظم کی اقلیم خلفائے اسلام کی سلطنت کی پہنائیوں کے ایک گوشہ کے برابر بھی نہیں تھی، ایران کی ولادت نے رومہ کے اسلحہ کی تقریباً" ایک ہزار سال تک کامیابی سے روک تھام کی، مگر اسی ولایت فارسی کی گردن دس سال سے کم عرصے میں "سیف اللہ کے سامنے اطاعت کے لیے جھک گئی"

ڈیوش (Deutsch) ولندیزی فاضل لکھتا ہے۔

"The Quran is a book, by the aid of which the arabs conquered a world greater than that of Alexander the great, greater than that of Rome, in as many tens of years as the latter had wanted hundreds to accomplish".

ترجمہ

قرآن مجید وہ کتاب ہے جس کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم رومہ کی دنیا سے زیادہ دنیا فتح کرلی، رومہ نے جس کام کو صدیوں میں کیا۔ عربوں علم (برادران اسلام) نے دس سال میں سرانجام دیا"

ہندوؤں کے ممتاز فاضل پروفیسر رام دیو کا بیان ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مکہ میں محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عربوں میں وہ بجلی بھر دی، جو بجلی انسانوں کو دیوتا بنا دیتی ہے۔

ڈی اے وی کالج لاہور کے پرنسپل پنڈت ہنس راج کہتے ہیں۔

اسلام اور عربوں کے عروج کا سبب محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم ہے"

لالہ لاجپت رائے نے کہا۔

ہندوستان کو عمر (رضی اللہ عنہ) درکار ہے۔

ایڈورڈ گبن کی تصریحات

عظیم مورخ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) اپنی تصنیف "عروج و زوال روما" "The rise & fall of Roman Empires" میں اپنی تحقیق یہ بیان کرتا ہے۔

"From a study of the ups & downs of the wordly power of Islam, one shining fact emerges-wherever, the Islamic Kingdom declined a fresh race succeed the Islamic armies to revive the fading glory of Islam. Such happened not once, but many times in the annuals of Islam. The story of those barbarions in fierce, setting their feeton the necks of the followers of the prophet and at the same time accepting the religion of muslims and becoming its ardent champions, was not a unique instance. In the darkest hour of political Islam, religious Islam, has been able to chieve some of its most briliantive to rise. Islam in one of the great revolution, which has impressed, anew and lasting character on the nations of the globe."

ترجمہ

اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ روشن حقیقت نکھر کر اور ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جہاں تک دنیوی اقتدار و تفوق کا تعلق ہے۔ اسلام کے دریا میں بڑے مدو جزر آئے وہ انتہائی عروج کی چوٹیوں پر بھی متمکن ہوا اور عمیق ترین پستیوں میں بھی گرا، مگر ہوا یہ کہ اگر ایک قوم اقبال سے گری، زوال سے دوچار ہوئی اس کے بجائے کوئی اور مسلم قوم سطوت کی بلندیوں پر چمکی یہ اپنی نوعیت کا واحد واقعہ نہیں ہے کہ جن وحشی کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادت کیشوں کی گردنوں کو دبایا وہی خود فرزندانِ توحید بن گئے۔

اور اسلام کے پرجوش و پر اخلاص حامی و شیدائی و فدائی بن گئے، ایسا بھی ہوا کہ سیاسی اسلام کا مطلع مکدر ہوا اسی وقت مذہبی اسلام نے روشن تر بن فائز المرامیاں حاصل کیں"

سیدنا حضرت عمرؓ کی نسبت اپنے تاثرات و تصورات کا اظہار سر ولیم میور ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"The never lost the balance of a wise leader judgment nor exalted himself above the frugal habit of Arab Chief. Simplicity & duty were his guiding principles and impartiality & devotion the leading features of his administration."

ترجمہ:۔ اس کا ہر فیصلہ دانش و تدبر و دور اندیشی کے میزان و پیمانہ کا آئینہ تھا وہ ایک عام شیخ عرب کی مانند کفایت شعار تھا۔ منزل پر پہنچنے کے لیے اس کے خضر راہ دو اصول تھے، سادگی اور فرض شناسی اس کے نظم و نسق کے امتیازی مقصد نما خدوخال عدل و اخلاص تھے"

ایم۔ این رائے اپنی کتاب "اسلام کا تاریخی کردار" کے صفحہ ۱۵ پر تحریر کرتا ہے۔

"The second Caliph, Umar, made his triumpal entry into Jerusalam, , on a camel which also carried the entire Royal provision and equipment a small tent of course halt a bag of corn, a bag of dates, a wooden bowl and leather flask of water."

ترجمہ:۔ اسلام کے دوسرے خلیفہ راشد (حضرت) عمرؓ کے بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ کا منظر یہ ہے، آپ نے مدینہ منورہ سے شام تک کا سفر ایک اونٹ پر کیا جس پہ شاہانہ سامان کی کل کائنات اونٹ کے کھردرے بالوں کا ایک خیمہ، ستو اور جو کا ایک تھیلہ، کھجوروں کا دوسرا تھیلہ، ایک چوبی پیالہ، پانی پینے کا ایک چرمی کٹورا تھا۔

دیگر معتقد اغیار نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ ایک خادم بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ سفر یوں طے ہوا کہ

اگر ایک منزل تک اُونٹ پر حضرت عمرؓ سوار ہوتے تھے تو اس کی مہار خادم کے ہاتھ میں ہوتی تھی، اور دوسری منزل پر خادم سوار ہوتا تھا اور مہار بردار حضرت عمرؓ ہوتے تھے، امیری میں فقیری، سادگی اور مساوات کے فاروقِ اعظم حضرت عمرؓ تھے۔

حضرت عمرؓ، فیاض عمرؓ

فاضل جون ڈنہم پارسنز (John Den)

اپنی کتاب before christ

SON

ہمارا فرزند خدایا عیسائیت قبل از مسیح (مطبوعہ لندن ۱۸۹۵ء) صفحہ ۲۵ اور ۲۶ پر لکھتا ہے۔

"Umar was great & magnonimous. Umar and his followers in the seventh century were more civilised than the christian even of the eleventh century, as can be seen by comparing the just behaviour of the muslims when they captured Jerosalam in the year A.C 637, with the barbraties which the crusa ders inflicted upon muslims, of Jero alike, when they captured the city in the years A.C. 1099. And during all the inter-vening centuries it was the muslims and not the christians, who had held alight the torches of science and civilisation."

ترجمہ:۔ حضرت عمرؓ عظیم تھے، فیاض تھے، حضرت عمرؓ اور آپ کے پیروؤں نے ۶۳۷ء میں بیت المقدس فتح کیا، اُنہوں نے عادلانہ و کریمانہ طرزِ عمل کا اظہار کیا عیسائیوں کے صلیبی ستیزہ کاروں نے یروشلم کو ۱۰۹۹ء میں فتح کیا، انہوں نے مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں کو بھی اپنے وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا، چھٹی صدی کے مسلمان گیارہویں صدی کے عیسائیوں سے بھی زیادہ مہذب تھے،

ان صدیوں کے درمیانی عرصہ میں جن اشخاص نے سائنس اور تہذیب کے چراغوں کو درخشاں و تاباں رکھا، وہ عیسائی نہیں تھے، مسلمان تھے۔

سیرتِ فاروقؓ کے چند گوشے

The Catif,ate, its Rise, Decline سر ولیم میور اپنی کتاب and FALL کے صفحہ ۱۹۰ پر تحریر کرتا ہے۔

"Umars life required, but few lines to sketch. Simplicity and duty were his quiding principles, Impartiality and devotion the leading features of his administration. His sense of justice was strong. The choice of his captains, governers were free from favouritism, which in hand, the would perambulate the streets and markets of Medina, ready to pun-ish offenders on the spot and so the proverb "Umars whip is more terrible than others sword." But with all this he was tender hearted and number less acts of kindness are recorded of him, such as relieving the wants of the widow, and the fatherless. For example, journeying in Arabia, during the femine he came upon a poor woman and her hungry weeping children seated round a fire, where on was an empty pot, Umar, hastend on to the next village, procured bread and meat, fired the pot, cooked an ample meat and left the little ones laughing and at

ترجمہ:

حضرت عمرؓ کی حیات کے چند گوشے یہ ہیں سادگی اور فرائض کی سرانجام دہی پر آمادگی، اُن کے دو رہنما اصول تھے، آپ کے نظم و نسق کے دو روشن ترین جوہر بغیر جانب داری اور اخلاص تھے۔ آپ کا احساسِ معدلت بڑا مضبوط تھا

سپہ سالاروں اور حاکموں کے باب میں آپ کا انتخاب رد و رعایت سے بالکل پاک تھا، آپ درہ بدست مدینہ کی گلیوں اور منڈیوں میں گھومتے تھے۔ مجرموں کو بر سرِ عام سزا دیتے تھے بنا بریں یہ بات ضرب المثل ہو گئی۔ کہ درۂ عمرؓ اپنی دہشت آفرینی میں تلوار سے زیادہ اثر خیز ہے، اس کے باوجود آپ کا دل رقیق تھا شفیق تھا، یہ حقیقت ان گنت شواہد پر مبنی ہے۔ بیوگان و یتامیٰ کے دکھوں کا دور کرنا اور ان کے لیے سکھوں کا اہتمام کرنا آپ کا نصب العین تھا، ایک مثال ان حقائق کو آئینہ کرنے کے لیے کافی ہے قحط کا زمانہ تھا۔

آپ عرب میں سفر کر رہے تھے آپ کی نظر ایک غریب عورت اور اس کے بھوکے گریہ کناں بچوں پر پڑی، کیفیت یہ تھی کہ آگ جل رہی تھی، بچے اس کے ارد گرد بیٹھے تھے چولہے پر ایک برتن تھا جو خالی تھا، حضرت عمرؓ اس سے آگاہ ہوئے تو بڑی تیز قدمی سے روٹی خریدی، گوشت خریدا، ضرورت مند خاندان میں آ کر اپنے ہاتھ سے گوشت بھونا، شوربا تیار کیا اور بھوکے بچوں کو کھلایا بچے کھا پی کر ہنسنے اور کھیلنے میں مصروف ہو گئے حضرت عمرؓ انہیں اس حال میں چھوڑ کر تشریف لے گئے۔

"امورِ انتظامیہ و عدلیہ"

مشہور شیعہ عالم سید امیر علی مرحوم اپنی "مختصر تاریخ عرب SHORT HISTORY OF THE SARACENS" میں رقم طراز ہیں۔

"Justice was administered by civil judges, who were appointed by the Caliph and were independent of governers. Umar was the first ruler in Islam to fix salaries for his judges, and to make their office distinct from those of executive officers.

ترجمہ: نظمِ عدالت کا فریضہ دیوانی ججوں کے سپرد تھا، انہیں خلیفہ وقت مقرر کرتا تھا اور وہ گورنروں کے اثر سے آزاد ہوتے تھے حضرت عمرؓ اوّلین اسلامی فرمانروا ہیں جنہوں نے اپنے ججوں کی تنخواہیں مقرر کیں اور انہوں نے ان کے فریضہ منصبی کو انتظامی کار پرداز افسروں کے فرائض سے علیحدہ قرار دیا۔

اس مختصر مضمون میں اغیار علماء کے جو اقتباسات درج کیے جا سکے وہ ان تحریروں کا ایک ادنیٰ حصہ بھی نہیں جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جلالت شان ظاہر کرنے کے لیے لکھی گئیں لیکن ان سے ہمیں یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ اس آفتاب عظمت کی روشنی نے اغیار کے کاشانوں کو بھی نورانی کیا تھا اور وہ اس بات پر مجبور ہو گئے تھے کہ آپ کی عظمتوں کا اعتراف کریں۔

فاروق اعظم رض

پر مختلف زبانوں میں کتابیں

تحریر

پروفیسر رحیم بخش شاہین

حضرت عمر بن الخطاب (ولادت: ۱۳ ولادتِ نبوی) محسنِ انسانیت کے عظیم صحابی تھے حضرت ابوبکر صدیق کے بعد خلیفہ ثانی اسلام منتخب ہوئے آپ کے عہدِ مبارک (۱۳ھ تا ۲۴ھ) میں ایران، عراق، شام، اور مصر کی سلطنتیں اسلام کے زیرِ اقتدار آگئیں۔ اپنے دس سالہ دورِ حکومت میں آپ نے اسلامی حکمران کا جو نمونہ پیش کیا بڑے سے بڑے سیاستدانوں عالموں اور مورخوں نے ہمیشہ اسے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور دنیا بھر کے حکمرانوں کے لیے لائقِ تقلید قرار دیا ہے۔ تاریخِ عالم کے عادل حکمران، نامور فاتح، ماہر قانون ساز زیرک سیاستدان، تجربہ کار منتظم، مخلص خادمِ عوام آپ کے سامنے محض طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج جب کہ خوش قسمتی سے عالمِ اسلام ایک صحت مند انقلاب سے دو چار اور عظمتِ گم گشتہ کی بازیافت میں مشغول ہے، عوام اور خواص کے لیے عمر فاروق کے کارناموں شخصیت اور کردار سے آگاہی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے وقت کے اس اہم تقاضا کی تکمیل کے لیے حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب ایم اے (آنرز) الازہر، سجادہ نشین بھیرہ شریف نے ماہنامہ "ضیائے حرم" کا فاروق اعظم نمبر شائع کر کے برمحل قدم اٹھایا

ہے۔ ان کے ارشاد کے مطابق ان کی خاص راہنمائی میں ان کتابوں کی ایک فہرست اس عاجز نے مرتب کی ہے اگر وہ نظر کرم نہ فرماتے تو اردو عربی فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، المانوی وغیرہ زبانوں میں تقریباً" ایک سو کتابوں کی فہرست مرتب کرنا شاید ممکن نہ ہوتا۔ جو مستقلاً حضرت عمر فاروق پر لکھی گئی ہیں یا جن میں آپ کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے اس سلسلے میں مکرم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس) محترم سید عبد القدوس ہاشمی صاحب (اسلام آباد) اور برادرم محمود احمد غازی صاحب (اسلام آباد) اور عابد نظامی صاحب کی امداد کا بے حد شکر گزار ہوں

(رحیم بخش شاہین ایم اے)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات

اردو

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات
۱	الفاروق	شبلی نعمانی	ایم ثناء اللہ خاں	—	۶۷۶
۲	سیرۃ الفاروق	قاضی سراج الدین فاروقی	—	۱۸۹۴	۳۳۶
۳	سیدنا عمر فاروق	ڈاکٹر محمد حسین ہیکل	مکتبہ جدید لاہور	بار دوم ۱۹۵۹	۷۶۵
۴	فقہ عمر	شاہ ولی اللہ دہلوی	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	—	۳۲۵
۵	حضرت ابوبکر صدیق اور فاروق اعظم	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	نفیس اکیڈمی کراچی	—	۲۷۲
۶	دربار عمر کے فیصلے	مظفر حسین اظہر	نوبہار بک ڈپو	—	۱۵۹
۷	حضرت عمر کے سرکاری خطوط	خورشید احمد فاروق	الجمعیۃ پریس دہلی	جون ۱۹۶۵	۴۳۱
۸	حضرت عمر کے سرکاری خطوط	خورشید احمد فاروق	الجمعیۃ پریس دہلی	دسمبر ۱۹۶۵	۲۵۲
۹	سیاسی وثیقہ جات	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۰	۳۴۴
۱۰	خلفائے راشدین	معین الدین ندوی	دار المصنفین اعظم گڑھ	۱۹۴۷	۳۲۸
۱۱	تاریخ اسلام	اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	نفیس اکیڈمی کراچی	—	۵۹۲

نمبر شمار	نام کتاب	نام مُصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات
۱۲	فتوح البلدان	البلاذری	نفیس اکیڈمی کراچی	——	۶۶۸

احمد بن یحییٰ بن جابر الشہید بالبلاذری (م ۲۷۹ھ) کی مشہور و مبسوط تصنیف فتوح البلدان (عربی) کے پہلے اور دوسرے حصے کا ترجمہ ہے جس میں متعدد مقامات پہ عمرؓ کی فتوحات بیان کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مُصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات
۱۳	تاریخ اسلام	ابونعیم عبدالحکیم خاں نشتر عبدالحمید ایم اے ایم او ایل	کتاب منزل لاہور	——	۱۰۸۰

کتاب کا پانچواں باب حضرت عمر فاروق کے لیے مختص ہے (صفحات ۱۲۵ تا ۱۸۳)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مُصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات
۱۴	تاریخ طبری	ابی جعفر طبری	نفیس اکیڈمی کراچی	جولائی ۶۷	حصہ دوم ۵۴۶ حصہ سوم ۵۴۴

علامہ ابی جعفر جریر طبری کی مفصل اور مبسوط تاریخ اسلام کا حصہ دوم صفحات ۲۷۹ تا ۵۲۶ اور حصہ سوم صفحات ۲۲ تا ۲۸۷ حضرت عمرؓ کے حالات فتوحات شہادت نام و نسب پیدائش وعمر، اہل وعیال سیرت وخصائل خطبات وغیرہ کے بیان پر مشتمل ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مُصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات
۱۵	سیرۃ الخلفاء	شیخ محمد خضری بک	قرآن محل کراچی	۱۹۶۴ء	۳۲۰

مصری مصنف شیخ محمد خضری بک (انسپکٹر وزارت تعلیمات) کی عربی تالیف "اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء" کا اُردو ترجمہ جس کے صفحات ۹۶ تا ۲۲۵ پر عمر فاروق کا تذکرہ ہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مُصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات
۱۶	کتاب الاخبار الطوال	الدینوری	مرکزی اُردو بورڈ لاہور	۱۹۶۶ء	۵۱۰

محمد حنیفہ احمد بن داؤد الدینوری کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ۔ ابتداء میں ڈاکٹر حمید اللہ کا مبسوط مقدمہ ہے صفحات ۲۲۸ تا ۲۶۹ پر عمرؓ کے دور میں اسلامی فتوحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مُصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات
۱۷	مشاہیر اسلام	ڈاکٹر ابراہیم حسن	پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی	۱۹۵۵ء	۲۵۳

تین مشاہیر اسلام کا تذکرہ جسے مشہور مسلم مورخ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن پروفیسر تاریخ

اسلام، فواد یونیورسٹی (قاہرہ) نے اعلام الاسلام" کے نام سے مرتب کیا تھا یہ اس کا اردو ترجمہ ہے۔ صفحات ۱۲ تا ۲۲ حضرت عمرؓ کے کردار اور نظامِ حکومت کی تفصیل کے لیے وقف ہیں۔

۱۸۔ سنین الاسلام (مصنف نے تین چار صفحوں میں حضرت عمر کے حالات سن وار بیان کر دیے ہیں)

۱۹ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۴۸ ۲۹۵

حضرت عمر کے سوانح صفحات ۱۵۸ تا ۲۲۴ پر پھیلے ہوئے ہیں قبول اسلام، فتوحات کے بیان کے بعد "فاروقی کارنامے" کے زیرِ عنوان آپ کی جمہوریت پسندی، عدل و انصاف خدمت عوام، نظامِ حکمرانی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۰ خلافت راشدہ اور جمہوری قدریں رشید اختر ندوی ادارہ معارف ملی لاہور اپریل ۶۶ ۱۰۶۴

حضرت عمرؓ کی فتوحات کی تفصیل اور آپ کے جمہوری مزاج اور کردار کی بلندی کی وضاحت ۲۲۵ تا ۷۷۶) پر کی گئی ہے۔

۲۱ تاریخ ابن خلدون علامہ ابن خلدون نفیس اکیڈیمی کراچی جون ۱۹۶۶ ۵۶۰

علامہ ابن خلدون (۷۳۲ھ ۸۰۸ھ) کی مشہور تصنیف کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر من احوال العرب و العجم والبربر و من عاصرہم من ملوک التتر" کا اردو ترجمہ سات جلدوں پر مشتمل ہے حضرت عمرؓ کا ذکر پہلی جلد کے باب ۱۲ تا ۱۶ (صفحات ۲۸۲ تا ۴۰۴) میں کیا گیا ہے۔

۲۲ تاریخ اسلام سید امیر علی اردو اکیڈیمی سندھ ۱۹۶۵ ۵۵۹

مشہور شیعہ مؤرخ جسٹس سید امیر علی کی تصنیف A SHORT HISTORY OF SARACENS کا ترجمہ ہے اس کے صفحات ۴۲ تا ۵۵ پر آپ کی فتوحات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضمناً عظمت کردار پر بحث کرتے ہوئے بعض مستشرقین کے لغو اعتراضات پر مدلل تنقید کی گئی ہے۔

۲۳۔ تاریخ الخلفاء جلال الدین سیوطی نفیس اکیڈیمی کراچی - ۵۲۰

جلال الدین سیوطی (۸۴۹ھ ۹۱۱ھ) کی کتاب کا ترجمہ اس میں خلفائے راشدین کے علاوہ انہوں نے دیگر خلفاء (سلاطین) کا بھی ذکر کیا ہے حضرت عمر فاروقؓ کے حالات و مناقب صفحات ۱۲۸ تا ۱۴۷ پر درج ہیں۔

۲۴۔ خلفائے اربعہ — محمد عبدالحیٔ فاروقی — قومی کتب خانہ لاہور — نومبر ۵۰ — ۱۴۸
حضرت عمرؓ کی فتوحات اور اخلاق و کردار پر تقریباً چالیس صفحات (۴۸ تا ۸۹) میں بحث کی گئی ہے۔

۲۵ محسنِ اعظم و محسنین — فقیر سید وحید الدین — لائن آرٹ پریس لاہور — ۱۹۶۳ — ۱۷۶
حضور اور خلفائے راشدین کے سوانح حیات بہت خوبصورتی سے مرتب اور شائع کیے گئے ہیں اس کے صفحات ۱۲۵ تا ۱۴۶ حضرت عمر کے لیے وقف ہیں۔

۲۶ مہاجرین و انصار — سید نصیر احمد جامعی — احسن برادرز لاہور — مارچ ۱۹۶۲ء — ۳۱۲
تصنیف ہذا کے صفحات ۱۸ تا ۲۵ پر حضرت عمرؓ کے اخلاق و کردار پر خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۷ عشرہ مبشرہ — قاضی حبیب الرحمٰن — مکتبہ نذیریہ — ۱۹۷۳ء — ۱۲۵
اس میں ان دس جلیل القدر صحابہ کے سوانح درج کیے ہیں جنھیں حضور نے دنیا ہی میں جنتی ہونے کی بشارت دی تھی۔ امیر المومنین سیدنا عمر فاروق کے آثار و احوال صفحات ۵۱ تا ۵۶ پر بیان کیے گئے ہیں۔

۲۸ بدر البدور المعروف بہ اصحاب بدر، قاضی محمد سلیمان منصور پوری مکتبہ نذیریہ چیچا وطنی ستمبر ۱۹۶۹ — ۱۴۴
۳۱۳ اصحاب رسول کا تذکرہ اس میں "فاروق" کے خطاب کی وجہ اور ان صحابہ کے اسماء دیے گئے ہیں جنہوں نے فاروق اعظمؓ سے روایتِ حدیث کی ہے۔

۲۹ حکایات خلفائے راشدین سید نظر زیدی احسن برادرز لاہور اپریل ۱۹۶۴ء ۱۶۸
صفحات ۵۵ تا ۹۱ پر حضرت عمر کے انصاف، خدمتِ عوام، اوصافِ حکمرانی وغیرہ پر مشتمل حکایات درج ہیں۔

سیرۃ الفاروق — منشی نذیر احمد سیماب — — — —

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ	صفحات
	عمر فاروق	بشیر بیگ بریلوی	-	-	۳۲
	″	-	مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی	-	۴۸
	″	ساحل بلگرامی	اردو اکیڈمی سندھ	1951	۳۲
	″	-	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	-	۲۵۶
۳۵	حضرت عمر فاروق	-	″	۱۹۶۰	۲۷۲
۳۶	-	-	″	۱۹۵۴	۳۲
۳۷	سوانح حضرت عمر فاروق	ریاض حسین شر	شیخ غلام حسین لاہور	-	۲۰۸
۳۸	سیرت عمر	-	تاج کمپنی لاہور	-	۲۰۸
۳۹	عمر فاروق	-	″	-	۳۲
۴۰	چراغ حسن حسرت	″	″	-	۴۷
۴۱	سیرت حضرت عمر فاروق	″	″	-	۱۴۴
۴۲	عادل حکمران (عمر فاروق)	چوہدری بشیر احمد	مکتبہ اشاعت ادب لاہور	-	۴۰
۴۳	فاروق اسلام	عبدالرحمن شوق	ملک دین محمد لاہور	-	۶۴
۴۴	فاروق اعظمؓ	-	ویسٹ پاک پبلشنگ ہاؤس لاہور	-	۶۴
۴۵	عمر فاروق	-	بساط ادب لاہور	-	۶۴
۴۶	″	محمد صدیق	ناشران قرآن پاک لمیٹڈ لاہور	-	۶۳
۴۷	″	-	فیروز سنز لاہور	-	۹۶
۴۸	″	مائل خیر آبادی	ادارہ بتول لاہور	-	۸۰
۴۹	″	درد کاکوروی	آئینہ بک ڈپو لاہور	-	۱۶۰

عربی

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ	صفحات
۱	الفاروق عمرؓ	محمد حسین ہیکل	شرکت مساہمہ مصریہ	۱۳۶۴ھ	۶۸۸
۲	اخبار عمر و اخبار عبداللہ بن عمر	علی الطنطاوی، ناجی الطنطاوی	دار الفکر بدمشق	۱۹۵۹ء	۶۲۴

۳ ۔ الشیخان طٰہٰ حسین دارالمعارف بمصر (قاہرہ) ۱۹۶۱ ۳۰۴
۴ ۔ عصر خلفائے الراشدین الدکتور عبدالحمید دارالمعارف بمصر (قاہرہ) ۱۹۶۵
حضرت عمر کے حالات صفحات ۹۰ تا ۲۰۳ پر مشتمل ہیں۔
۵ ۔ التاریخ الاسلامی والحضارۃ الاسلامیہ، الدکتور احمد سلبی مکتبہ النہضتہ المصریہ (القاہرہ) ۱۹۵۹ء ۴۰۰
صفحات ۲۰۲ تا ۲۲۸ پر حضرت عمرؓ کی فتوحات بیان کر کے انہیں بانی سلطنت اسلامیہ قرار دیا ہے۔
۶ ۔ سیرۃ عمر بن الخطاب، ابن الجوزی (اول حاکم فی الاسلام)
۷ ۔ مجموعہ الوثائق السیاسیہ وکتور محمد حمید اللہ الحیدر آبادی، مطبعہ لجنتہ التالیف و الترجمہ والنشر القاہرہ ۶۱ ، ۴۰
مشہور مسلم مورخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مقالہ برائے ڈاکٹریٹ ہے جو فرانسیسی میں تھا اس میں انہوں نے حضرت عمرؓ کے عہد کے وثیقہ جات پیش کیے ہیں، جن کی تعداد ۶۶ ہے۔

فارسی

۱ ۔ الفاروق شبلی نعمانی مسلم پرنٹنگ پریس لاہور ۴۰۰
۲ ۔ عمر بن الخطاب باقر قائمقامی
۳ ۔ زندگانی سیاسی و مذہبی عمر بن خطاب، اکساندرو فارس، علاوہ ازیں مندرجہ ذیل کتب میں حضرت عمر کا ذکر ملتا ہے۔
۴ ۔ دائرہ المعارف عمومی سعید یان صفحہ ۳۶۵
۵ ۔ تاریخ تمدن اسلام - صفحات ۱۱، ۱۳، ۱۴
۶ ۔ میہن ما - صفحہ ۳۶
۷ ۔ خلفائے راشدین محمد علی خلیلی
۸ ۔ ادیان بزرگ جہاں صفحہ ۶۵۷

ترکی

۱۔ الفاروق"	شبلی نعمانی	ترجمہ عمر رضا	استانبول	۱۹۳۶	۵۲۰
یہ ترجمہ عربی اور رومن دونوں خطوں میں شائع ہو چکا ہے۔					
۲۔ عمر فاروق رض	خلیل ادہم		استانبول	۱۹۳۹	-
۳۔ فاروقِ اعظم	حسین حلمی الشیک		"	۱۹۶۸	-

ماہنامہ ضیائے حرم کے خوبصورت نمبرز

... میلادُ النّبیؐ نمبر

... صدّیقِ اکبرؓ نمبر

... فارُوقِ اعظمؓ نمبر

... شمسُ العارِفین نمبر

... شیخُ الاسلام نمبر

... ضیاءُ الاُمّت نمبر

ماہنامہ "ضیائے حرم" بھیرہ شریف ضلع سرگودھا